تذکرۂ مشائخِ شیرازِ ہند

(جونپور)

جس میں شرقی سلاطین جونپور کے علمی، ادبی، مذہبی اور ثقافتی کارناموں اور شرقی سلطنت کے مختلف شہروں اور قصبوں کے علماء و فضلا اور سلاسلِ سہروردیہ، چشتیہ، اشرفیہ، صابریہ، قلندریہ، مداریہ، شطاریہ اور مہدوی تحریک کے صوفیائے کرام کے حالات اور مذہبی افکار و عقائد بڑی تحقیق کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

مع ضمیمہ

جس میں شرقی عہد کے ہندی ادب کے ہندو اور مسلم علماء و شعراء، شرقی حکماء، شرقی امراء و وزراء، شرقی عہد کی موسیقی اور فنِ خوش نویسی پر بھی قیمتی معلومات جمع کی گئی ہیں۔

— تالیف —

میاں محمد سعید ایم اے، پی ایچ۔ ڈی (لندن)

پروفیسر تاریخ و ثقافتِ اسلامیہ

جارج میسن یونیورسٹی — فیئرفیکس - ورجینیا - امریکہ

تذکرۂ مشائخِ شیرازِ ہند

(جونپور)

جس میں شرقی سلاطین جونپور کے علمی، ادبی، مذہبی اور ثقافتی کارناموں اور شرقی سلطنت کے مختلف شہروں اور قصبوں کے علماء و فضلا اور سلاسلِ سہروردیہ، چشتیہ، اشرفیہ، صابریہ، قلندریہ، مداریہ، شطاریہ اور مہدوی تحریک کے صوفیائے کرام کے حالات اور مذہبی افکار و عقائد بڑی تحقیق کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

مع ضمیمہ

جس میں شرقی عہد کے ہندی ادب کے ہندو اور مسلم علماء و شعرائ، شرقی حکماء، شرقی امراء و وزراء، شرقی عہد کی موسیقی اور فنِ خوش نویسی پر بھی قیمتی معلومات جمع کی گئی ہیں۔

— تالیف —

میاں محمد سعید ایم اے، پی ایچ۔ ڈی (لندن)

پروفیسر تاریخ و ثقافتِ اسلامیہ

جارج میسن یونیورسٹی — فیئرفیکس۔ ورجینیا۔ امریکہ

طبعِ اوّل .... رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ مطابق ستمبر ۱۹۷۶ء
طبعِ دوم .... (مزید ترمیم واضافہ کے ساتھ) رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ مطابق مئی/جون ۱۹۸۵ء
تعداد ۱,۰۰۰
پرنٹرز ....
ناشر ....
قیمت .... -/۲۲۵ روپے

اسلامک بُک پبلشرز
فضل الٰہی مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

تذکرہ مشائخ شیراز ہند جونپور

BY

Dr. MIAN MUHAMMAD SAEED

M.A. Ph.D. (LONDON) F.R.A.S.
PROFESSOR EMERITUS
GEORGE MASON UNIVERSITY
FAIRFAX, VIRGINIA. U.S.A

جونپور ! ارباب علم و فضل کے "دارالسرور"
کہتے تھے "شیرازِ ہند" اکثر تجھے اہلِ شعور

اِنتساب

اپنے پیارے ماموں جان

الحاج پیر محمدؒ مرحوم

و

برادرانِ محترم

چوہدری عبدالرشید رشید مرحومؒ

چوہدری عبدالمجید

چوہدری عبدالحمید مرحومؒ

کے نام

جن کی محبت و شفقت اور دعاؤں نے میری رُوحانی اور ذہنی صلاحیتوں کو بیدار کیا اور مجھے اس کتاب کی تالیف کے قابل بنایا۔

جنّت عدن جونپور بود
کاندر آنجا مقامِ حُور بود
مسکنِ علم و فضل و دانش و رائی
نبود آنچناں بملکِ خدائی
فخرِ هر کس درو بعلم و هُنر
بی هُنر اندر و نیا بد فر
گلشنِ جونپور خُرّم باد
و اندر و هر که هست بیغم باد
دستِ اُو سر بسر گلستان باد
جائی مستاں مے پرستاں باد[1]

[1] صُبحِ صادق از محمد صادق - قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن
ادرینٹل - ۱۷۲۸
ورق ۱۱۸ ب - ۱۱۹ ل

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ
انتساب	۵
پیش لفظ	۲۱
تعارف	۲۵
اظہارِ تشکر	۲۹
حصہ اوّل ـ باب اوّل	
شرقی سلطنت کے دو شہروں کی کہانی	۳۵
ظفر آباد	۳۵
جونپور	۳۸
باب دوم	
شرقی سلطنت کا قیام	۴۴
تاریخ پاک و ہند میں مرکز اور صوبوں کے درمیان کشمکش	۴۴
سلاطینِ دہلی کی صوبائی اور علاقائی پالیسی	۴۵
سلطان محمد بن تغلق کا طرزِ حکومت	۴۵
غلط حاکموں کا تقرر اور اُن کی بغاوتیں	۴۶
اقتصادی بدحالی	۴۸
تغلق نظامِ حکومت کے نقائص	۴۹

عنوان	صفحہ
ہندوؤں کا طرزِ عمل اور بغاوتیں	۵۱
سلطان فیروز شاہ کا محکمہ غلاماں	۵۳
سلطان فیروز شاہ کا جاگیرداری نظام	۵۴
تغلق فوجی نظام کے نقائص	۵۵
کمزور جانشین اور ان کی خانہ جنگیاں	۵۶
حملۂ تیمور اور صوبائی حکومتوں کی خود مختاری	۵۷
باب ۳ سوم	
شرقی سلطنت کا تاریخ پاک و ہند میں مقام	۵۸
شرقی سلطنت سے پیشتر صوبہ اودھ و بہار کے علمی، دینی اور ثقافتی مراکز	۵۸
حملۂ تیمور کے بعد صوبائی، علمی، دینی اور ثقافتی مراکز	۶۰
سلطنتِ بہمنی کی علمی و ادبی اور ثقافتی اہمیت	۶۱
سلطنتِ خاندیش کی ثقافتی اہمیت	۶۳
سلطنتِ مالوہ کی علمی و ادبی اور ثقافتی اہمیت	۶۳
سلطنتِ گجرات کے علمی و ادبی اور ثقافتی کارنامے	۶۵

عنوان	صفحہ
شرقی سلطنت جونپور کی سیاسی، علمی، ادبی، اور مذہبی و ثقافتی اہمیت	۷۰
باب چہارم	
شرقی سلاطین جونپور کے علمی و ادبی، سیاسی اور ثقافتی کارنامے	۸۱
سلطان الشرق ملک سرور (۱۳۹۴ء-۱۳۹۹ء)	۸۱
سلطان مبارک شاہ شرقی (۱۳۹۹ء-۱۴۰۱ء)	۸۶
سلطان ابراہیم شاہ شرقی (۱۴۰۱ء-۱۴۴۰ء)	۸۹
سلطان محمود شاہ شرقی (۱۴۴۰ء-۱۴۵۷ء)	۱۰۶
ملکہ بی بی راجی	۱۱۱
سلطان محمد شاہ شرقی (۱۴۵۷ء-۱۴۵۸ء)	۱۱۴
سلطان حسین شاہ شرقی (۱۴۵۸ء-۱۵۰۵ء)	۱۱۶
باب پنجم	
شرقی سلاطین جونپور کے مذہبی رجحانات	۱۳۱
سلطان الشرق ملک سرور	۱۳۱
سلطان الشرق کا علماء و صوفیہ سے نیک سلوک	۱۳۱
مولانا شرف الدین لاہوریؒ اور سلطان الشرق	۱۳۲
قاضی نصیر الدین گنبدیؒ اور سلطان الشرق	۱۳۲
مخدوم جہانیاںؒ اور سلطان الشرق	۱۳۳
مخدوم اخی راجگیریؒ اور سلطان الشرق	۱۳۳

عنوان	صفحہ
سلطان ابراہیم شاہ شرقی	۱۳۶
سلطان ابراہیم شاہ کا اپنی رعایا سے نیک سلوک	۱۳۶
بنگال، ترہت اور کالپی کے مسلمانوں کی حفاظت	۱۳۶
قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ اور سلطان ابراہیم شاہ	۱۳۷
مولانا صفی جونپوریؒ اور سلطان	۱۳۸
قاضی نظام الدین کیکلانیؒ اور سلطان	۱۳۹
قاضی عبدالمقتدرؒ اور سلطان	۱۳۹
خواجہ سید صدر جہاں اجملؒ اور سلطان	۱۴۰
مخدوم رکن الدین سہروردیؒ اور ابراہیم شاہ	۱۴۱
مخدوم شیخ محمدؒ اور سلطان	۱۴۱
امراء و صوفیاء کو تحفظ اسلام کے لیے جاگیریں	۱۴۲
میر سید علم الدینؒ کو پلاون کی جاگیر	۱۴۳
خواجہ ابوالفتح سونبرسیؒ اور سلطان	۱۴۳
شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ اور ابراہیم شاہ	۱۴۴
میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے مذہبی دورے اور مناظرے	۱۴۵
میر سید اشرف جہانگیر سمنانی اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی باہمی عقیدت	۱۴۵

عنوان	صفحہ
میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ سے سلطان ابراہیم شاہ کی عقیدت	۱۴۶
شیخ احمد عبدالحقؒ اور سلطان ابراہیم شاہ	۱۴۷
شاہ مدارؒ اور سلطان	۱۴۸
کمن پور میں مدرسہ اور خانقاہ کی تعمیر میں مدد	۱۴۸
شاہ عبداللہ شطاریؒ اور سلطان	۱۴۹
شاہ عبداللہؒ کی جونپور سے ہجرت	۱۵۰
سلطان محمود شاہ شرقی	
سلطان محمود کا علماء وصوفیاء سے نیک سلوک	۱۵۲
ہمسایہ حکومتوں کے مسلمانوں کا تحفظ	۱۵۲
جہادِ اڑیسہ	۱۵۳
پہاڑ پور میں مساجد کی تعمیر اور تبلیغِ اسلام	۱۵۳
والی اودھین کی گوشمالی	۱۵۳
شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ اور سلطان محمود	۱۵۳
سلطان محمود کے امراء کے دینی کام	۱۵۴
ملکہ بی بی راجی	۱۵۵
ملکہ کے ثقافتی کام	۱۵۵
علماء وصوفیاء سے اظہارِ عقیدت	۱۵۵
عورتوں کے واسطے عبادت وریاضت کی سہولتیں	۱۵۶
تعلیمِ نسواں کے لیے کالج	۱۵۶

عنوان	صفحہ
عورتوں کی سہولت کے لیے اسلامی مہینوں کے نقشے اور آسان نام	۱۵۶
سلطان حسین شاہ شرقی	۱۵۷
سلطان حسین کے رفاہِ عام کے کام	۱۵۷
جامع مسجد جونپور کی تعمیر	۱۵۷
عیدگاہ کی تعمیر	۱۵۸
سید محمد جونپوریؒ اور سلطان حسین	۱۵۸
شاہ مدارؒ سے اظہارِ عقیدت	۱۵۸
مولانا صفی جونپوریؒ اور سلطان حسین	۱۵۹
مولانا الہداد محشیؒ جونپوری اور سلطان حسین	۱۵۹
قاضی صلاح الدین خلیلؒ اور سلطان حسین	۱۶۰
قاضی سماء الدینؒ اور سلطان حسین	۱۶۰
شیخ بڈھن شطاریؒ اور سلطان حسین	۱۶۱
مخدوم جہانگیر سہروردیؒ اور سلطان حسین	۱۶۱
شاہ نظام الدین قلندر بہاریؒ اور سلطان حسین	۱۶۱
شیخ قطبن اور سلطان	۱۶۲
بابِ ششم	
شرقی سلاطینِ جونپور کا غیر مسلموں سے برتاؤ	۱۶۳
صوبہ اودھ کے ہندوؤں کا مسلمانوں سے برا سلوک	۱۶۳
سلطان اشرف اور ہندو باغیوں کی سرکوبی	۱۶۴

عنوان	صفحہ
سلطان ابراہیم شاہ کے عہد میں علماء وصوفیا کی آمد اور اشاعتِ اسلام	۱۶۵
میر سید جہانگیر سمنانیؒ کے وعظ ومناظروں کا ہندوؤں پر اثر	۱۶۶
قاضی عبدالمقتدرؒ کے مواعظ ومناظروں کا ہندوؤں پر اثر	۱۶۶
ہندوؤں کے علاقوں میں مسلمانوں کے تحفظ کیلئے امراء وصوفیا کو جاگیریں	۱۶۶
ترہت کے باغی ملک ارسلان کی گوشمالی	۱۶۶
راجہ کنس کے ظلم وتشدد کا انسداد	۱۶۷
ترہت کے راجہ شیو سنگھ کی گوشمالی	۱۶۷
اور راجہ دیوسنگھ کی بحالی	۱۶۷
والیٔ اوجین کی گوشمالی	۱۶۷
باجگزار راجاؤں سے نیک سلوک	۱۶۷
ہندوؤں کو ملازمتیں	۱۶۸
ہندو معماروں کی حوصلہ افزائی	۱۶۸
ہندوؤں کے مقدمات میں برہمنوں سے مدد	۱۶۹
ہندو علماء وادباء اور شعراء کی قدر افزائی	۱۶۹
ہندوؤں کی دادرسی	۱۶۹
مہمان سراؤں میں ہندوؤں کے لیے ہندو ملازمین	۱۷۰
سلطان محمود کی ہمسایہ حکمرانوں کے مظالم کے خلاف جنگ	۱۷۰
ہندو عمارتوں کو مسمار کرنے کا غلط الزام	۱۷۱
ہندو مسلم ملاپ کی روایات اور سلطان حسین	۱۷۲

عنوان	صفحہ
باجگزار راجاؤں کی سلطان حسین سے وفاداری	۱۷۳
ہندو رعایا کا سلطان حسین سے سلوک	۱۷۳
سلطان حسین اور ہندو موسیقی	۱۷۴
ہندوؤں کو مذہبی آزادی	۱۷۵
بھگت کبیر	۱۷۵
ستیا پیر تحریک	۱۷۵
ہندو مسلم علماء وصوفیا کے علمی وادبی اور ثقافتی کام	۱۷۵
ہندی ادب کی ترقی کیلئے علماء وصوفیا کی خدمات	۱۷۶
حصہ دوم	
شرقی عہد کے علماء	۱۷۷
باب اول	
علمائے ظفرآباد	۱۸۱
ملا نظام الدین علامیؒ	۱۸۱
سید نورالدین ابی محمدؒ	۱۸۳
سید قطب الدین ابوالغیبؒ	۱۸۴
شیخ غلام رکن الدین رکن عالمؒ	۱۸۵
قاضی تاج الدین ابراہیم ناصحیؒ	۱۸۶
ملا رکن الدین یک لکھیؒ	۱۸۸
مولانا سید یعقوب شامیؒ	۱۸۹
ملا آدمؒ	۱۹۰

عنوان	صفحہ
مولانا بدرالدینؒ	۱۹۰
ملا بہرامؒ	۱۹۱
شاہ مسعود خلوتیؒ	۱۹۲
باب دوم علمائے جونپور	۱۹۴
مولانا شرف الدین لاہوریؒ	۱۹۴
ملا شیخ عثمان صالحؒ	۱۹۵
قاضی نصیر الدین گنبدیؒ	۱۹۵
مولانا قاضی شہاب الدین ملک العلماءؒ	۱۹۷
ملا شیخ عبدالملک عادلؒ	۲۰۴
ملا علاءالدین عطاءالملکؒ	۲۰۴
شیخ چندن شہیدؒ	۲۰۶
مولانا صفی جونپوریؒ	۲۰۶
مولانا الہداد محشی جونپوری	۲۰۸
قاضی نظام الدین کیکلانی جونپوریؒ	۲۱۱
قاضی صلاح الدین خلیلؒ	۲۱۲
قاضی سماءالدینؒ	۲۱۴
شیخ عبدالصمدؒ	۲۱۵
باب سوم علمائے کالپی	۲۱۷
مولانا خواجگی کالپویؒ	۲۱۷

عنوان	صفحہ
مولانا احمد تھانیسری کالپویؒ	۲۱۹
شیخ ابوالفتح علامی قریشی کالپویؒ	۲۲۰
باب چہارم علمائے خیرآباد	۲۲۱
شیخ سعدالدین خیرآبادیؒ	۲۲۱
شیخ الہدیہ خیرآبادیؒ	۲۲۳
باب پنجم علمائے لکھنو	۲۲۴
شیخ اعظم ثانی لکھنویؒ	۲۲۴
شیخ سعدالدین لکھنویؒ	۲۲۵
حصہ سوم شرقی عہد کے صوفیا	۲۲۶
باب اول	
سہروردیہ سلسلہ	۲۳۱
باب دوم سہروردیہ مشائخ ظفرآباد	۲۳۹
مخدوم سید اسدالدین آفتاب ہندؒ	۲۳۹
مخدوم آفتاب ہند کے خلفاء	۲۴۴
سید صدرالدین مکیؒ	۲۴۵
شیخ چاند سہروردیؒ	۲۴۶
شاہ عالم سہروردیؒ	۲۴۷

عنوان	صفحہ
شاہ محمدی سہروردیؒ	۲۴۷
میراں شاہ قلندرؒ	۲۴۸
مُلّا قیام الدین سہروردیؒ	۲۴۸
سیّد حسن جلال بخاری سہروردیؒ	۲۴۹
سیّد نظام الدین سہروردیؒ	۲۵۰
مخدوم شیخ صدر الدین چراغِ ہند	۲۵۰
مخدوم چراغِ ہندؒ کے خلفاء	۲۵۲
شیخ شمس الحق عرف بڈھنؒ	۲۵۵
بابا عبد الرحمٰن سہروردیؒ	۲۵۶
شاہ یمن سہروردیؒ	۲۵۶
سیّد ضیاء الدین محمد سہروردیؒ	۲۵۸
باب ۳ سوم	
سہروردیہ مشائخ جونپور	۲۶۰
خواجہ سیّد صدر جہاں اجملؒ	۲۶۰
مخدوم شیخ رکن الدین سہروردیؒ	۲۶۲
مخدوم شیخ جہانگیر سہروردیؒ	۲۶۵
مخدوم شیخ محمد جونپوریؒ	۲۶۶
باب ۴ چہارم	
سہروردیہ سلسلہ کے دُوسرے مشائخ	۲۶۹
شاہ موسیٰ سلطانِ عاشقان ادھی	۲۶۹
شیخ پیارے حسام پوری	۲۶۹

عنوان	صفحہ
مخدوم شیخ اخی جمشید راجگیریؒ	۲۷۰
میر سیّد علم الدین پلاونی سہروردیؒ	۲۷۴
شیخ سراج سوختہ کالپویؒ	۲۷۷
حصّہ چہارم	
باب اوّل	
چشتیہ سلسلہ	۲۷۹
باب ۲ دوم	
چشتیہ مشائخ جونپور	۲۸۴
خواجہ ابو الفتح سوبرنیس چشتیؒ	۲۸۴
شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ	۲۹۰
شیخ شمس الحق بدہ حقانیؒ	۲۹۴
شیخ بہاء الدین ننھو جونپوریؒ	۲۹۶
مخدوم شیخ ادھن چشتیؒ	۲۹۸
شیخ وجیہ الدین اشرف المعروف شیخ فرید جونپوریؒ	۳۰۱
سیّد علاء الدین لاجوریؒ	۳۰۲
مخدوم شیخ حسن طاہر چشتیؒ	۳۰۴
شیخ محمد حسن چشتیؒ	۳۰۷
شیخ عبد العزیز چشتیؒ	۳۰۸
مخدوم بندگی شیخ معروف	۳۱۱
مخدوم شاہ سیّد اسماعیلؒ	۳۱۲

عنوان	صفحہ
سید عثمان شیرازیؒ	۳۱۲
مخدوم سید علی داؤدؒ	۳۱۲
مخدوم بندگی شاہ لطف اللہؒ	۳۱۴
مخدوم سید صدر الدین شاہ زاہدؒ	۳۱۵
شاہ اجمیری چشتیؒ	۳۱۶
مخدوم سید شاہ محمدؒ	۳۱۶
سید علی قوام چشتی جونپوریؒ	۳۱۷
شیخ حمزہ چشتیؒ	۳۱۸
مخدوم شیخ دانیال خضریؒ	۳۱۹
باب ۳ سوم	
چشتیہ مشائخ مانکپور	۳۲۲
شیخ حسام الدین مانکپوریؒ	۳۲۲
مخدوم راجی سید حامد شاہ مانکپوریؒ	۳۲۴
مخدوم راجی سید نورؒ	۳۲۷
مولانا شیخن مانکپوریؒ	۳۲۸
باب ۴ چہارم	
چشتیہ مشائخ ایرج	۳۲۹
قاضی محمد ساوی ایرجیؒ	۳۲۹
خواجہ اختیار الدین عمر ایرجیؒ	۳۳۰
شیخ یوسف بدہ ایرجیؒ	۳۳۰
میر سید ابراہیم ایرجیؒ	۳۳۱

عنوان	صفحہ
باب ۵ پنجم	
چشتیہ مشائخ لکھنؤ	۳۳۴
شیخ قوام الدین چشتی وسہروردیؒ	۳۳۴
شیخ سارنگ چشتی وسہروردیؒ	۳۳۶
شیخ مینا چشتی وسہروردیؒ	۳۳۸
شیخ سعد اللہ کندوری فراز چشتی وسہروردیؒ	۳۴۰
باب ۶ ششم	
چشتیہ مشائخ کنتور	۳۴۲
شیخ محمد متوکل کنتوریؒ	۳۴۲
شیخ سعد اللہ کیسہ دار کنتوریؒ	۳۴۴
شیخ علاء الدین قتال کنتوریؒ	۳۴۵
باب ۷ ہفتم	
چشتیہ مشائخ اودھ	۳۴۸
شیخ فتح اللہ اودھیؒ	۳۴۸
شیخ جمال گوجری اودھیؒ	۳۴۹
باب ۸ ہشتم	
چشتیہ سلسلہ کے دوسرے مشائخ	۳۵۱
شیخ حسام الدین فتح پوریؒ	۳۵۱
شیخ بڈھن انچولویؒ	۳۵۲
شیخ کمال الدین المعروف شیخ کالو کڑویؒ	۳۵۳
شاہ عبد الرزاق جھنجانویؒ	۳۵۳

عنوان	صفحہ
سید سلطان بہرائچیؒ	۳۵۴
مخدوم بندگی جلال الحق، قاضی خان ناصحی ظفرآبادیؒ	۳۵۶
حصہ پنجم	
باب اول	
اشرفیہ سلسلہ	۳۶۰
باب دوم	
میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ	۳۶۲
باب سوم	
میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے خلفاء	۳۷۸
میر سید حاجی عبدالرزاقؒ	۳۷۸
شیخ صفی الدین صیفی حنفیؒ	۳۸۲
شیخ ابوالمکارم اسماعیل ردولویؒ	۳۸۴
شیخ کبیر سرہرپوریؒ	۳۸۶
شیخ شمس الدین صدیقی اودھی المعروف شیخ شمس فریادرسؒ	۳۸۷
شیخ معروف الدیویؒ	۳۸۸
شیخ محمد سرہرپوریؒ	۳۸۸
شیخ خیرالدین انصاری سدھوریؒ	۳۸۹
مخدوم شیخ خاصہ امیٹھویؒ	۳۹۱
حصہ ششم	
باب اول	
صابریہ سلسلہ	۳۹۳
باب دوم	
شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ	۳۹۷
باب سوم	
شیخ احمد عبدالحقؒ کے خلفاء	۴۰۶
شیخ عارف ردولویؒ	۴۰۶
شیخ محمد ردولویؒ	۴۰۷
شیخ بختیارؒ	۴۱۰
شیخ میاں مخلصؒ	۴۱۲
شیخ بہرام چشتی صابریؒ	۴۱۳
شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ	۴۱۵
حصہ ہفتم	
باب اول	
قلندریہ سلسلہ	۴۲۲
باب دوم	
شیخ قطب الدین بینا سے دل قلندرؒ	۴۲۹
باب سوم	
شیخ قطب الدین بینا سے دل قلندرؒ کے خلفاء	۴۳۲
شیخ محمد قطب قلندرؒ	۴۳۳

عنوان	صفحہ
شاہ نصیر قلندرؒ	۴۲۴
شاہ عبدالسلام قلندرؒ	۴۲۵
شاہ داؤد سرمست سربرپوریؒ	۴۲۷
شاہ نور ثانیؒ	۴۲۹
حصہ ہشتم	
باب اوّل	
مداریہ سلسلہ	۴۴۱
باب ۲ دوم	
شاہ بدیع الدین مدارؒ	۴۴۲
باب ۳ سوم	
شاہ بدیع الدین مدارؒ کے خلفاء	۴۴۸
شیخ صدرالدین ثابت مداریؒ	۴۴۸
شیخ فخرالدین مداریؒ	۴۴۹
مُلّا نصیرالدین مداریؒ	۴۵۰
حصہ نہم	
باب اوّل	
شطاریہ سلسلہ	۴۵۱
باب ۲ دوم	
شاہ عبداللہ شطاریؒ	۴۵۲
باب ۳ سوم	
شاہ عبداللہ شطاریؒ کے خلفا اور اس سلسلہ	

عنوان	صفحہ
شطاریہ کے بعد کی تاریخ	۴۶۱
حصہ دہم	
باب اوّل	
مہدوی تحریک	۴۶۹
باب ۲ دوم	
سید محمد جونپوریؒ کی مہدوی تحریک	۴۷۴
باب ۳ سوم	
سید محمد جونپوریؒ کی تعلیمات	۴۹۰
باب ۴ چہارم	
مہدوی دائرے	۴۹۲
ضمیمہ اوّل	
باب اوّل	
شرقی عہد میں ہندی ادب	۴۹۵
باب ۲ دوم	
شرقی عہد کے ہندی ادب کے ہندو و مسلمان شعراء اور صوفیاء	۵۰۲
ودیاپتی ٹھاکر	۵۰۲
شاہ کبیر	۵۰۵
شیخ بہاءالدین نہتو جونپوریؒ	۵۱۲
مخدوم شیخ دانیال خضریؒ	۵۱۳
شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ	۵۱۳

عنوان	صفحہ
شیخ قطب عرف قطبنؒ	۵۱۶
شاہ محمد غوث گوالیاریؒ	۵۱۸
شیخ منجھنؒ	۵۱۹
سید محمد جونپوریؒ	۵۲۰
شیخ برہان الدین کالپویؒ	۵۲۳
ملک محمد جائسیؒ	۵۲۴
ضمیمہ دوم	
شرقی عہد کے حکماء	۵۲۷
حکیم فرید الدین سرمست	۵۲۷
حکیم سید محمد ابراہیم	۵۲۷
حکیم حسام الدین	۵۲۹
ضمیمہ سوم	
شرقی عہد کے اُمراء و وُزراء	۵۳۰
عماد الملک اختیار خاں	۵۳۰
قاضی سماءالدین دبیر الملک قتلغ خاں	۵۳۱
سید صدر جہاں اجمل	۵۳۲
ملک شجاع الملک	۵۳۳
ملک خالص مخلص	۵۳۳
ضمیمہ چہارم	
شرقی عہد کی موسیقی	۵۳۵
ضمیمہ پنجم	
شرقی عہد کا فنِ خوش نویسی	۵۴۲
ضمیمہ ششم	
سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہد کا ایک فرمان	۵۴۷
سلطان حسین شاہ شرقی کے عہد کا ایک فرمان	۵۴۷
مآخذ	
عربی و فارسی	۵۴۹
اُردو	۵۵۵
ہندی	۵۵۸
انگریزی	۵۵۹
اِشاریہ (شخصیات)	۵۷۱
مقامات	۶۰۲

از جناب پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی
سابق صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

پیش لفظ

سلطنتِ دہلی کا آفتابِ اقبال جب گہن میں آیا تو صوبوں میں خودمختار حکومتوں کی داغ بیل پڑنے لگی اور وہ مقامی طاقتیں جو کبھی سلطانِ دہلی سے نبرد آزمائی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھیں، نخوت سے سر اُٹھا کر اعلان کرنے لگیں ــــ

ایا قابضِ شہرِ دہلی بشنو ٭ خیانت چو خواہی ازیں جا برو
منم قابضِ ملک ما راست ملک ٭ خدا داد ما را خدا راست ملک[1]

ان صوبائی حکومتوں میں جون پور کی شرقی سلطنت کو اپنے سیاسی اور تمدنی کارناموں کے باعث خاص شہرت اور اہمیت حاصل ہوئی۔ گو اس کی مدتِ عمر ۸۰ سال سے زیادہ نہ ہوئی، لیکن علم و دانش اور تہذیب و تمدن کے جو مراکز اس زمانہ میں وہاں وجود میں آئے اور فنِ تعمیر میں جو حیرت انگیز ترقی ہوئی، اُس سے سارے ملک کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ علماء اور اہلِ دانش، مشائخ اور صوفیا، شعراء اور ادیب، ماہرینِ فن اور اہلِ ہنر جوق در جوق اُدھر کا رُخ کرنے لگے اور دہلی کے گلشنِ علم نے اُجڑ کر جون پور کے خیابانِ علم کی رونق کا سامان فراہم کر دیا۔ یہاں کے مدرسے اور خانقاہیں، دائرے اور زاویے، طالبانِ راہِ طریقت اور تشنگانِ علم کے ساتھ

۱؎ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے جد امجد شیخ فیروز نے ایک مثنوی میں سلطان بہلول لودی اور سلطان حسین شرقی کی جنگ کا واقعہ نظم کیا تھا۔ یہ اشعار اُس مثنوی کے ہیں۔ حسین شرقی، بہلول لودی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔ (اخبار الاخیار ص ۱۹۰)

وہی عمل کرنے لگے جو مقناطیس لوہے کے ساتھ کرتا ہے۔ جب شرقی سلطنت نے دم توڑا تو سلاطینِ دہلی نے جذبۂ حسد سے مغلوب ہو کر یہاں کی عالی شان عمارتیں تو مسمار کر دیں لیکن جو علمی اور تہذیبی سوتے یہاں سے پھوٹے تھے اُن کو سلاطین کی بے مہری خشک نہ کر سکی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شرقی حکومت کے زوال کے بعد بھی یہاں ایسی مذہبی اور ثقافتی تحریکیں اُبھرتی رہیں، جنھوں نے سیاسی ابتری کو مذہبی زوال کا پیش خیمہ بننے سے بچالیا۔ بہت سے رُوحانی سلاسل کا دورِ تجدید یہاں سے شروع ہُوا اور بھکتی کی تحریک نے اسی سرزمین میں فروغ پایا۔ صدیوں بعد جب شاہ جہاں کی نظر جون پور کی طرف اُٹھی تو بے اختیار "شیرازِ ہند" کا لقب اس کی زبان پر آ گیا۔

ڈاکٹر میاں محمد سعید صاحب برسوں سے جون پور کی سیاسی اور تمدنی تاریخ پر کام کر رہے ہیں۔ اُن کی انگریزی تصنیف -The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History (Karachi 1972) علمی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے اور اپنے موضوع پر مُستند اور مُعتبر سمجھی جاتی ہے۔ مشائخ جون پور کا یہ (پیشِ نظر) تذکرہ بھی بڑی کاوش اور دیدہ ریزی سے مُرتّب کیا گیا ہے۔ اُنھوں نے جون پور کی علمی، مذہبی اور ثقافتی تحریکوں کو تاریخی پس منظر میں پیش کیا ہے۔ سعید صاحب تاریخی ذہن کے ساتھ ساتھ تمدنی اور تہذیبی قدروں کے رمز شناس بھی ہیں۔ اِس لیے اُن کے تذکرہ میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ اُنھوں نے ظفر آباد اور جون پور کا مرقع "دو شہروں کی کہانی" کے عنوان سے بڑی دلکشی سے کھینچا ہے۔ پھر سلطنتِ شرقی کا مقام ہندوستان کی تاریخ میں متعین کرنے کے بعد سلاطین کے علمی، ادبی، مذہبی اور ثقافتی رُجحانات کا جائزہ بڑی دقتِ نظر سے لیا ہے۔ اس پس منظر کے بعد، جو دلچسپ بھی ہے اور بصیرت افروز بھی اُنھوں نے علماء و مشائخ کے حالات بیان کیے ہیں۔ چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں کے علاوہ شطاریہ، قلندریہ اور مداریہ سلسلوں کے اکابر کے حالات بڑی تلاش اور جستجو سے جمع کیے گئے ہیں۔ شطاریہ، مداریہ اور قلندریہ سلسلوں کی اِبتدائی تاریخ تو اس علاقہ کی مذہبی تاریخ کا

65667 ~~۳۱۵۱۱۸~~

ایک جزو ہے۔ مہدوی تحریک کا آغاز بھی اسی سرزمین سے ہوا۔

سیّد محمّد مہدی نے جون پور کا دورِ انحطاط دیکھا تھا۔ اخلاقی ابتری اور مذہبی انتشار نے اُن کے قلب و جگر کو بے چین کر دیا تھا۔ ابنِ بدرون نے دولتِ غرناطہ اور بُلبلِ شیراز نے خلافتِ بغداد کی تباہی پر خُون کے آنسو بہائے تھے۔ سیّد محمّد مہدی کے اضطراب کا سبب تو وہی تھا، لیکن طرزِ فغاں مختلف تھی۔ انھوں نے انسانی قلوب کو ان اعلیٰ اخلاقی اور رُوحانی قدروں کے تابع کرنے کی کوشش کی جن کی بقا پر انسانیت کی بقا کا انحصار ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں مہدوی تحریک کے خد و خال کو واضح کیا ہے جس سے اِس تحریک کے مقصد و منہاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اِس تحریک کے بانی کا جون پور سے تعلق ایک ایسا اتفاق ہے جس کی تفسیر و تعبیر ناممکن نہیں۔

پھر چشتیہ صابریہ سلسلہ کا سب سے مؤثر اور سب سے پہلا مرکز شیخ احمد عبدالحق ردولوئؒی کی قیادت میں اسی علاقہ میں قائم ہُوا۔ بہت سی تحریکیں جنھوں نے اِس علاقہ میں جنم لیا دُوسرے شہروں اور قصبوں میں بھی پھیلیں۔ یہاں کے علماء کی سرگرمیاں حدودِ جون پور تک محدُود نہ رہیں۔ قاضی شہاب الدّین دولت آبادیؒ، مولانا الہ داد جون پوریؒ، شیخ شاہ محمد فاروقیؒ، مُلّا محمود جونپوریؒ وغیرہم کے خرمنِ کمال کے خوشہ چین ملک میں دُور دُور پھیل گئے۔ حد یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخر بلکہ بیسویں صدی کے شروع تک یہ علاقہ علمی اور مذہبی تحریکوں کا مرکز بنا رہا۔ مولوی کرامت علی جون پوری اور علمائے فرنگی محل اسی خاک سے اُٹھے۔

مصنّف نے تمدنی اور ثقافتی پس منظر کو مکمّل کرنے کے لیے ہندی ادب، موسیقی اور خوش نویسی وغیرہ پر بھی دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ اُنھوں نے اپنا تاریخی مواد جن عربی، فارسی، اُردو، ہندی اور انگریزی کتابوں سے تحقیق کی چھلنی میں چھان کر نکالا اور پیش کیا ہے اس کا اندازہ اُس فہرست سے لگایا جاسکتا ہے جو کتاب کے خاتمہ پر درج ہے۔

"شیرازِ ہند" کی اس دل آویز اور مؤثر مرقع کشی پر میاں محمد سعید صاحب لائقِ مبارکباد

ہیں۔ اُن کے لیے یہ سعادت مقدر تھی کہ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں شرقی سلطنت کی تاریخ اور کارنامے بیان کریں۔ مجھے یقین ہے کہ تاریخ کے طالب علم ہی نہیں بلکہ تہذیبی و ثقافتی تحریکوں سے دلچسپی رکھنے والے بھی، اس کتاب کو شوق سے پڑھیں گے اور مستفید ہوں گے۔

سفارت خانہ ہندوستان
دمشق - شام
۱۹۷۶ء

خلیق احمد نظامی
(سفیر ہندوستان متعینہ ملک شام)

تعارف

"تذکرۂ مشائخ شیراز ہند (جونپور)" تاریخ پاک و ہند کے عہدِ شرقی کے علمی و ادبی، مذہبی اور ثقافتی کارناموں کا تذکرہ ہے۔ اس سے پیشتر میں نے شرقی سلطنت پر انگریزی میں ایک کتاب The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History لکھی تھی جس کو کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ تصنیفات نے ۱۹۷۲ء میں Karachi 1972 شائع کیا تھا۔ وہ کتاب سلاطینِ شرقی اور عہدِ شرقی کے سیاسی اور ثقافتی کارناموں پر اپنی نوعیت کی سب سے پہلی کتاب تھی، شائقینِ علم و فن اور مورخین نے اس کو بہت سراہا اور ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بعض دوستوں نے اس کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہونا چاہیے تاکہ اردو داں طبقہ بھی اس سے پوری طرح مستفید ہو سکے۔ خاص طور پر اس کتاب میں جن علمائے عظام و صوفیائے کرام کا تذکرہ آیا ہے۔ ان کی علمی و ادبی اور ثقافتی خدمات سے اردو قارئین کو ضرور استفادہ کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے اُن کے اس قیمتی مشورہ کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کر لیا کہ واقعی اردو اہلِ علم کو نہ

صرف اُن علماء و صوفیا کی علمی و مذہبی خدمات سے رُوشناس کرایا جانا چاہیے کہ جن کا ذِکر انگریزی کتاب میں ہوا ہے، بلکہ شرقی سلاطین اور شرقی سلطنت کے اُن دُوسرے بے شمار مشائخ کے علمی و ادبی، مذہبی اور ثقافتی کارناموں سے بھی متعارف کرانا چاہیے جن کا ذِکر انگریزی کتاب میں نہیں آسکا۔ چنانچہ پیشِ نظر کتاب اسی ارادے کا عملی اظہار ہے۔

اِس کتاب میں شرقی سلاطین کے علمی، مذہبی اور ثقافتی کارناموں کے علاوہ اُن علماء و فضلاء اور صوفیاء کا تذکرہ بھی آیا ہے جو شرقی سلطنت کے دارالحکومت جونپور کے علاوہ دُوسرے شہروں اور قصبوں میں بھی آباد تھے۔ اُن میں سے بعض تو عالمِ اسلام اور دہلی کے سیاسی انتشار سے پریشان ہو کر یہاں پہنچے تھے اور بعض شرقی سلاطین کی فیاضیوں سے متأثر ہو کر یہاں کھنچے چلے آئے۔ اِن علماء اور صوفیا نے مختلف مقامات پر علمی و دینی اور رُوحانی مراکز قائم کر کے عوام النّاس کی علمی و دینی، سیاسی اور معاشرتی اصلاح و تربیت کے لیے پُرخلوص جدّوجہد کی ــــــ اگرچہ ان بزرگوں کے کام کرنے کا انداز اور طریق کار بعض اوقات مختلف ہوتا تھا لیکن ان کی منزلِ مقصود ایک ہی تھی۔ اوّلاً وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے دینی فکر و احساس کو اس طرح بیدار کیا جاتے کہ وہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل و تنظیم صحیح خطوط پر کر سکیں اور ثانیاً یہ کہ غیر مسلموں میں اپنے مذہب و اخلاق کو اس طرح متعارف کیا جاتے کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہوں اور بالآخر اس پر ایمان لے آئیں ــــــ چنانچہ عوام و خواص پر اُن کی اِن پُرخلوص کوششوں کا بڑا اچھا اثر پڑا جس کا ثبوت آج بھی اس علاقہ کی کثیر التعداد مُسلم آبادی سے ملتا ہے، اور جہاں سے علما و فضلا اور صُلحا اپنے نئے اور پرانے علمی و دینی اداروں سے بدستُور احیاءِ اسلام کے لیے بڑا کام کر رہے ہیں ــــــ میں نے اس کتاب میں اِن ہی بزرگوں کے آبا و اجداد کی علمی دینی اور ثقافتی خدمات اور روایات کو قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے جن کا زمانہ چودھویں صدی کے نصف سے لے کر سولھویں صدی کے نصف تک پھیلا ہوا ہے۔

اس تذکرہ کو میں نے دس حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصّہ اوّل چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں سب سے پہلے میں نے شرقی سلطنت کا قیام اور تاریخ پاک و ہند میں اس کا علمی، مذہبی اور ثقافتی مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد شرقی سلاطین کے سیاسی، مذہبی اور ثقافتی کارناموں، اُن کے مذہبی رجحانات اور غیر مسلموں کے ساتھ اُن کے برتاؤ کا ذکر کیا گیا ہے۔ حصّہ دوم پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں شرقی عہد کے اُن علمائے عظام کا ذکر کیا گیا ہے، جنھوں نے اسلامی علوم کی تعلیم و تدریس کے لیے شرقی سلطنت کے مختلف شہروں اور قصبوں میں مراکز قائم کیے اور وہاں علمِ دین کی اشاعت کے لیے پُرخلوص کوششیں کیں۔ حصّہ سوم چار ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں سہروردیہ سلسلہ اور اس سلسلہ کے ظفرآباد، جونپور اور دوسری جگہوں کے مشائخ کا ذکر کیا گیا ہے۔ حصّہ چہارم آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں چشتیہ سلسلہ اور اس سلسلہ کے جونپور، مانکپور، ایرج، لکھنؤ، کنتور اور اودھ وغیرہ کے مشائخ کا ذکر آیا ہے۔ حصّہ پنجم تین ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں اشرفیہ سلسلہ، سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ اور اس سلسلہ کے دوسرے مشائخ کا ذکر کیا گیا ہے۔ حصّہ ششم تین ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں صابریہ سلسلہ، شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ اور اس سلسلہ کے دوسرے مشائخ کا ذکر کیا گیا ہے۔ حصّہ ہفتم تین ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں قلندریہ سلسلہ، شیخ قطب الدین بینا تے دل قلندر اور دوسرے قلندروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ حصّہ ہشتم تین ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں مداریہ سلسلہ، شاہ بدیع الدین مدارؒ اور اُن کے خلفاء کا ذکر کیا گیا ہے۔ حصّہ نہم تین ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں شطّاریہ سلسلہ، شاہ عبداللہ شطّاری، اُن کے خلفاء اور اس سلسلہ کے بعد کی تاریخ بیان کی گئی ہے؛ اور حصّہ دہم میں سیّد محمّد جونپوری کی مہدوی تحریک، اُن کی تعلیمات اور مہدوی دائروں کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے آخر میں چھ ضمیمہ جات بھی دیے گئے ہیں، جن میں سے ضمیمہ اوّل میں شرقی عہد کے ہندی ادب کے ہندو اور مسلم علماء، شعراء اور صوفیاء کا ذکر کیا گیا ہے۔ ضمیمہ دوم

میں شرقی عہد کے حکما، ضمیمہ سوم میں شرقی امراء و وزراء، ضمیمہ چہارم میں شرقی عہد کی موسیقی اور ضمیمہ پنجم میں شرقی عہد کے فنِ خوش نویسی پر قلم اُٹھایا گیا ہے تاکہ اس دَور کے تمام علمی و اَدبی اور ثقافتی پہلوؤں کا پُوری طرح جائزہ لیا جاسکے اور آخر میں ضمیمہ ششم میں سُلطان ابراہیم شاہ شرقی اور سُلطان حسین شاہ شرقی کے ایک فرمان کا عکس بھی بطور نمونہ شامل کیا گیا ہے۔

اِس کتاب کی تصنیف و ترتیب میں عربی، فارسی، ہندی، اُردو اور انگریزی کے ہر ممکن ماخذ سے اِستفادہ کیا گیا ہے۔ مذہبی لٹریچر بالخصوص ملفوظات و مکتوباتِ مشائخ سے تاریخی واقعات کی ترتیب و تہذیب کا کام لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں سکّوں، کتبات اور تذکروں سے بھی مدد لی گئی ہے۔ جن بزرگوں کا اِس کتاب میں ذکر آیا ہے، ان کو اس دور کے سیاسی، تمدّنی اور معاشی حالات کے آئینہ میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اُن کے اصلی خدوخال نمایاں ہوسکیں ــــــ اس طرح مجھے اُمید ہے کہ اِس کتاب سے شرقی سلاطین کے مذہبی رُجحانات، شرقی عہد کے عام مذہبی خیالات اور اس عہد کے علمی و اَدبی اور مذہبی و ثقافتی پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اِس سعی کے باوجُود مجھے احساس ہے کہ کتاب میں بہت سی خامیاں رہ گئی ہوں گی جن کی طرف اگر اہلِ علم مجھے توجّہ دلائیں تو میں ان کا بہت ممنُون ہوں گا۔

میاں محمّد سعید
واشنگٹن۔ ڈی، سی

رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ
المطابق ستمبر ۱۹۷۶ء

اظہارِ تشکّر

اِس عاجز کا یہ تحقیقی کام جو اِس وقت آپ کے پیشِ نظر ہے، سالہاسال کی محنتوں اور جستجوؤں کا حاصل ہے۔ اَن گنت بے چین دن اور بے خواب راتوں کا سوز و گداز میرے اِس تحقیقی کام میں شامل ہے۔ میں نے اپنے ناتواں کاندھوں پر اتنی بڑی ذمہ داری کا بوجھ کیونکر اُٹھالیا؟ اِس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے میں اپنے بچپن، لڑکپن اور جوانی کی طرف مُڑ کر دیکھتا ہوں تو میرے پردۂ ذہن پر جو تصویریں اُبھرتی ہیں، وہ میرے والدین، قرابت دار، اساتذہ اور احباب کے کچھ مبہم اور کچھ نہایت روشن چہرے اور خد و خال ہیں۔ اگر میرے پس منظر میں یہ لوگ نہ ہوتے تو یہ کتاب نہ کبھی لکھی جاتی اور نہ آپ تک پہنچتی۔

عام طور پر جب کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو تعاون کرنے والے ہم عصروں، مصنفوں اور ناشروں کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے، لیکن میں جو اِس وقت اظہارِ تشکّر کی کیفیت میں ہوں خلوصِ دِل سے سوچتا ہوں کہ اِس کتاب کی تالیف میں اُن لوگوں کا بھی ہاتھ ہے، جن کا علم و ادب سے کوئی تعلق نہیں لیکن بلاشبہ انہی کے فیضان سے میرے دِل میں اسلام، مشاہیرِ اسلام اور علماء و مشائخ کے لیے بے انتہا محبت پیدا ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اظہارِ تشکّر کے اوّلین مخاطب وہی لوگ ہیں اور ان میں سرِفہرست ہیں :-

میرے دادا جان مرحوم چوہدری حسن محمّد صاحب، میرے والدِ بزرگوار حکیم حاذق افسر الاطباء پاکستان حکیم چوہدری محمّد عبداللہ صاحب مرحوم، میری والدہ مرحومہ جنّت مکانی خلد آشیانی

کرم بی بی صاحبہ، میری والدہ ثانیہ مرحومہ زینب بی بی صاحبہ، میرے برادرِ محترم مرحوم و مغفور چوہدری عبدالرشید المتخلص بہ رشید، برادرِ محترم چوہدری عبدالمجید صاحب، میری بھابی جان محترمہ نُور فاطمہ صاحبہ، میرے بھتیجے عزیزم مختار احمد صاحب، و مشتاق احمد صاحب، میری بھتیجی عزیزہ نجمہ اختر سلمہا اور عزیزہ زاہدہ پروین سلمہا، برادرِ محترم چوہدری عبدالحمید صاحب مرحوم و مغفور، میری بڑی آپا جان محترمہ الحاجہ مریم بی بی صاحبہ، میرے برادرِ نسبتی حکیم چوہدری فقیر محمد صاحب مرحوم و مغفور اور اُن کے بھائی ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم و مغفور اور حافظ محمد لطیف صاحب میرے خواہر زادگان ظہور الحق صاحب اور افتخار الحق صاحب، میری بھانجی کلثوم اختر سلمہا، ناصرہ بیگم سلمہا، فاخرہ تحسین سلمہا، عذرا شبیرین سلمہا، میری بہن (اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) محترمہ مجیدہ بیگم صاحبہ، میری چھوٹی بہن زبیدہ بیگم سلمہا، میری بھانجی خالدہ بیگم سلمہا، ریحانہ بیگم سلمہا چھوٹی بہن سعیدہ محسن سلمہا اور برادرِ عزیز محمد سرفراز سلمہ، میرے تایا جان چوہدری پیر احمد صاحب مرحوم و مغفور، میری تائی جان محترمہ راجن بی بی صاحبہ مرحومہ، میرے تایا زاد بھائی چوہدری عبدالقیوم صاحب اور اُن کی بیگم محترمہ نواب بی بی صاحبہ اور اُن کے بیٹے چوہدری عبدالسلام صاحب، چوہدری عبدالغفار صاحب اور منظور احمد صاحب، میرے تایا جان چوہدری اللہ دتہ صاحب مرحوم و مغفور، تائی جان محترمہ مہتاب بی بی صاحبہ مرحومہ، اُن کے بیٹے چوہدری محمد اسماعیل صاحب، اُن کی بیگم محترمہ فاطمہ بی بی صاحبہ اور اُن کے بیٹے چوہدری سیف اللہ صاحب، میرے تایا جان چوہدری خدا بخش صاحب مرحوم و مغفور اور اُن کی بیٹی محترمہ سکینہ بی بی صاحبہ، محترمہ شریفاں بی بی صاحبہ مرحومہ، محترمہ حمیدہ بیگم صاحبہ اور میرے تایا زاد بھائی چوہدری محمد شریف صاحب و چوہدری محمد ادریس صاحب، ماموں جان الحاج پیر محمد صاحب مرحوم و مغفور، ممانی صاحبہ الحاجہ بشیر بی بی صاحبہ مرحومہ، ان کے بیٹے چوہدری محمد اسلم صاحب مرحوم، چوہدری محمد اکرم صاحب، چوہدری نصیر احمد صاحب مرحوم اور چوہدری محمد بشیر احمد صاحب، میری خالہ جان محترمہ رحمت بی بی صاحبہ مرحومہ اور خالہ حسین بی بی صاحبہ، ان کے بیٹے چوہدری محمد یعقوب صاحب اور راقم الحروف کی شریکِ حیات بیگم عابدہ غلام حسین، بھتیجی اور میرے خسر جناب غلام جیلانی

ڈھنجی صاحب مرحوم و مغفور اور میری خوش دامن محترمہ نور بانو بانی صاحبہ میرے برادر نسبتی محترم محمود غلام حسین ڈھنجی صاحب میری خواہر نسبتی محترمہ زینب غلام حسین ڈھنجی و عزیزہ رونق غلام حسین ڈھنجی اور اُن کے ماموں جان محترم حسین علی کاپڑیہ صاحب میرے قریبی رشتہ کے بھائی مولوی فقیر محمد صاحب اُن کی اہلیہ سعیدہ بیگم صاحبہ، مولوی محمد شریف صاحب، ان کی بیگم حسن بی بی صاحبہ اور میرے رشتے کی ایک بہن محترمہ معظمہ حاکم بی بی صاحبہ، اُن کی دُختر نیک اختر محترمہ حمیدہ بیگم صاحبہ، ان کے شوہر محترم میاں محمد ابراہیم صاحب اور میرے رشتے کے ایک بھائی محمد نواز صاحب۔

یہ ہیں وہ اسمائے درخشاں کہ جن کی اعلیٰ سیرت کی ضیا پاشیوں سے میرا کاشانۂ ذہن منور ہوا۔ سچ ہے کہ میرے ان بزرگوں، عزیزوں، برخورداروں اور پیاروں کا براہِ راست پیشۂ تحقیق سے کوئی تعلق نہیں لیکن ان سب نے دامے، درمے، قدمے، سخنے جس طرح میری تربیت اور اعانت کی اس کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

پھر میرے حافظے کے پردے پر میرے عظیم المرتبت اساتذۂ کرام کے نورانی چہرے اُبھرتے ہیں اور بے اختیار دل چاہتا ہے کہ اُن سب کے نام دامنِ قرطاس میں محفوظ ہو جائیں کہ اُن سب کے لیے میرے دل میں بے پناہ تشکر کے جذبات موجزن ہیں اور وہ اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:۔

محترم ولی محمد صاحب، نواب دین صاحب، محمد حسن صاحب مرحوم، غلام حیدر صاحب مرحوم، رُتہ علی صاحب، محمد دین صاحب مرحوم، غلام محمد صابری صاحب مرحوم، شیخ محمد حفیظ اللہ صاحب غلام حسین نقشبندی مجددی صاحب مرحوم، مولوی رحمت اللہ صاحب مرحوم، عبدالحق کامل صاحب مرحوم، الحاج محمد یٰسین صاحب مرحوم، قاضی عبدالرشید صاحب، مولوی محمد شریف صاحب مرحوم، مولوی عبدالحق صاحب مرحوم، چوہدری محمد حسین صاحب، محمد امین صاحب، شیخ خادم محی الدین صاحب مرحوم، پروفیسر خواجہ عبدالحیٔ صاحب مرحوم، پروفیسر سید عبدالقادر صاحب مرحوم، پروفیسر عبدالبشیر آزاد صاحب، پروفیسر غلام حسین صاحب مرحوم، پروفیسر سید غلام حیدر شاہ صاحب مرحوم، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب، ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب، ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب، پروفیسر شوانی

غلام مصطفےٰ تبسم صاحب، پروفیسر محمد شجاع الدین صاحب مرحوم، پروفیسر فیاض الدین صاحب ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب مرحوم، ڈاکٹر پیٹر ہارڈی صاحب، ڈاکٹر جے۔ڈبی کیس پیربیس صاحب پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی اور پیرِ طریقت حضرت شیخ فضل احمد نقشبندی مجددی صاحب مرحوم و مغفور۔

میں اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ اپنے چھ عظیم المرتبت اساتذۂ کرام کا خصوصی ذکرِ خیر اظہارِ تشکر کے ساتھ کرتا ہوں۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

★ عالی مرتبت جناب پروفیسر علم الدین سالک صاحب مرحوم و مغفور

★ خُلد آشیانی جناب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب مرحوم و مغفور

★ جنت مکانی جناب پروفیسر سید وقار عظیم صاحب مرحوم و مغفور

★ خلد آشیانی جناب پروفیسر آغا محمد علی صاحب مرحوم و مغفور

★ جناب پروفیسر اے۔ ایل بھٹیم صاحب

اور

★ عالی مرتبت جناب پروفیسر ریاض الاسلام صاحب (اللہ تعالیٰ انھیں طویل عمر عطا فرمائے)

اساتذۂ کرام کے بعد ذہن کے افق پر یادوں کا ایک بہار آفرین قافلہ رواں دواں نظر آتا ہے۔ جو سب کے سب میرے دوست احباب یارانِ بے تکلف ہمدم و ہمسفر، ہم قدم، ہمراز و دمساز ہیں، اور ان سب کے پیارے پیارے نام یہ ہیں کہ ان ناموں کی خوشبوؤں سے میرے کاشانۂ دل میں جنتیں آباد ہیں۔

جناب محمد طفیل شہید، محمد صدیق جاوید، عبد المجید بیگ، نصیر اللہ، محمد امین، محمد یٰسین، محمد حسین، محمد سرور، محمد طفیل، عبد القیوم، عبد المجید، عبد الرشید، محمد صادق گل، رحمت علی گل، مشتاق احمد، مولوی محمد یوسف، منظر الحق، بشیر حسین، محمود احمد، چوہدری غلام نبی باجوہ، سید عارف حسین، مولوی غلام نبی، رحمت علی، محمد اشرف، عبد الحمید، خالد مصطفےٰ مرحوم، عبد الغنی مرحوم، نذیر احمد صابری مرحوم، آفتاب احمد کھٹانہ، مولوی ہدایت اللہ، چوہدری محمد اسلم، شیخ محمد الیاس، چوہدری بشیر احمد چیمہ

چوہدری نوازش علی، چوہدری فقیر محمد، مرزا محمد ظہور، محمد جمیل جنجوعہ، ڈاکٹر مرزا عبدالرؤف بیگ، شیخ نثار عمر، منیر احمد بھٹی، ڈاکٹر منیر احمد، محمد سعید خاں، پروفیسر نیاز عرفان، ابوالحسن نغمی، کرامت حیات، سید عشرت حسین، ذاکر حسین، مصطفےٰ کمال، مولوی محمد یونس، کوثر بخاری، ڈاکٹر عبدالحمید خیال، سید حسن علی شاہ، محمد ابراہیم، محمد جمیل، پروفیسر مرزا محمد اقبال، حفیظ الرحمٰن، محمود اکمل، اقبال حمید دستی، محمد اقبال سنبھل، عبدالعزیز خالد، پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم، حکیم محمد علی، حکیم محمد اجمل خاں، ماسٹر اللہ دتہ، رحمت اللہ، چوہدری محمد نسیم باجوہ، ڈاکٹر عزیز منصور باجوہ، ڈاکٹر محمد نواز خاں، رضا۔ اے۔ خاں۔ پروفیسر محمد جمیل، محمد یونس اُمید، پروفیسر محمد رفیع، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، پروفیسر محمد اسلم کاظمی، پروفیسر افتدا احسن، پروفیسر اعجاز احمد، پروفیسر محمد صابر لودھی، ڈاکٹر خاں بیگ نسیم، سید منظفر حنیا، محمد سعید پرویز، محمد اقبال غوث، صوفی عبدالرشید، امان اللہ خاں، اقبال حسین، غلام مصطفےٰ، محمود احمد، خواجہ محمد امان اللہ، خواجہ محمد حبیب اللہ، پروفیسر نعیم حیات قریشی، پروفیسر سید شکیل اختر ہاشمی، ڈاکٹر صلاح الدین ملک، ڈاکٹر فقیر محمد بھٹی، ممتاز الٰہی، پروفیسر سید علی عباس، سید غضنفر علی شاہ، پروفیسر احسان سالک، پروفیسر محمد مختار، محمد عظیم، پروفیسر حفیظ الرحمٰن احسن، پروفیسر محمد ارشد خاں بھٹی، ڈاکٹر محمد اسلم بھٹی، خورشید احمد ملک، ڈاکٹر اعجاز احمد ملک، چوہدری فیض الحسن، ملک کرم الٰہی خاں، شفیق احمد ملک، ڈاکٹر توقیر احمد، فیض محی الدین قادری، ڈاکٹر غلام نبی ثاقب، نظیر مصطفےٰ، پروفیسر محمد سلیم احمد، ظہیر الدین، اختر الجلیل، انعام الحق، عبدالحمید، ڈاکٹر محمد مشتاق، ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، پروفیسر سردار الدین محمد، پروفیسر افضل رحمٰن، ڈاکٹر اکرام احمد بٹ، ڈاکٹر شکیل احمد فاروقی، ڈاکٹر ریاض الدین، ڈاکٹر مرزا اسخاوت علی بیگ، ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی، ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، پروفیسر لڈ دیگ۔ ڈبلیو۔ ایڈ ملک، پروفیسر ارل۔ ایچ پرچیڈ۔ پروفیسر ارنسٹ کسارا۔ ڈاکٹر نسیم افتخار، اور میرے والد بزرگوار کے شاگردان عزیز حکیم چوہدری محمد دین، حکیم چوہدری محمد حسن، حکیم چوہدری محمد یوسف، حکیم محمد طفیل مرحوم، حکیم چوہدری عبدالحق، حکیم محمد انور اور حکیم چوہدری محمد صدیق، حاجی سردار محمد صاحب، چوہدری عبدالقادر پوٹیہ صاحب مرحوم، چوہدری

محمد اسحاق چیمہ صاحب مرحوم اور میرے پیر بھائی مولوی نذیر احمد دیوانہ نقشبندی مجددی، مولوی ولی محمد نقشبندی مجددی، مولوی نور محمد نقشبندی مجددی، مولوی حسن محمد نقشبندی مجددی، مولوی عبد الحمید نقشبندی مجددی اور مولوی محمد یعقوب نقشبندی مجددی، مولوی محمد الدین صاحب، محترمی غلام رسول شاہ صاحب مرحوم اور محترمہ مائی مریم صاحبہ مرحومہ و مغفورہ۔

میں پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کا "پیش لفظ" لکھا جو میرے لیے باعث فخر و امتیاز ہے۔ میں پروفیسر حفیظ الرحمن احسن صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کی طباعت میں بڑی مدد فرمائی۔ اپنے بھتیجے مختار احمد سلمہ کا ممنون ہوں کہ اس نے بڑی محنت سے اس کتاب کا اشاریہ تیار کیا اور خوش نویس جناب محمد ریاض خاں کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے بڑی محنت سے اس کی عمدہ کتابت کا فریضہ ادا کیا۔

میں آخر میں اپنی بیگم عابدہ غلام حسین ڈھینجی کا دوبارہ تہ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کی تالیف کے دوران میں مجھے ہر طرح کا تعاون اور ذہنی سکون فراہم کیا۔ اور اپنی ننھی بیٹی صفورا محمد سعید اور بیٹوں ابراہیم محمد سعید، اسماعیل محمد سعید سے معذرت خواہ ہوں کہ اپنی کتاب کی تصنیف و تالیف کے دوران میں ان کے لیے وقت نہ نکال سکا، ان کی معصومانہ اداؤں اور بھولی بھالی باتوں سے لطف اندوز نہ ہو سکا کہ تصنیف و تالیف کا ایک مقدس جنوں ہمہ وقت طاری رہا کرتا تھا اور جب یہ کتاب مکمل ہوتی اور میں نے اپنے بچوں کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان کی عہد طفولیت اور شیر خوارگی کا دور گزر بھی چکا تھا۔

رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ
المطابق ستمبر ۱۹۷۶ء

میاں محمد سعید
واشنگٹن۔ ڈی، سی

حصہ اوّل

باب اوّل

سلطنتِ شرقی کے دو شہروں کی کہانی

ظفر آباد

ظفر آباد شہر جونپور سے چار میل کے فاصلہ پر دریائے گومتی کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ اِس شہر کا پرانا نام منیہچ گڑھ اور یہاں کے قلعہ کا نام اساتی یا اسنی تھا۔ اس کو سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۱۸ء میں راجہ چندر پال بھودنے لڑائی کے بعد فتح کیا تھا[1]۔ سلطان شہاب الدین غوری کے عہد میں اِس علاقہ پر گھرودار خاندان کا راجہ جے چند ثانی حکمران تھا۔ جسے سلطان شہاب الدین غوری نے ۱۱۹۳ء میں شکست دی تھی اور قلعہ اسنی پر قبضہ کیا تھا[2]۔ اس کے بعد سلطان فیروز شاہ (المتوفی ۱۳۸۸ء) کے عہد تک یہ علاقہ مستقل طور پر مسلمانوں ہی کے قبضہ میں رہا۔

سلطان غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰ء-۱۳۲۵ء) کے عہد میں یہاں کا گورنر شہزادہ ظفر خاں تھا۔ اُس کے تقرر اور آمد سے پہلے یہاں کے ہندو راجہ اور ہندوؤں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر رکھا تھا۔ ان واقعات کی خبریں جب سارے ملک میں پہنچیں تو حضرت شیخ زکریا الدین ملتانی (المتوفی ۱۳۳۵ء) نے اپنے دو جلیل القدر خلفا۔ حضرت مخدوم سید اسد الدین آفتابِ ہند

Muhammad Habib, Sultan Mahmud of GhazninAligarh. 1927. p 39., لہ

M. Nazim; The Life and Times of Sultan Mahmud of Gl azna Cambridge, 1931. pp. 108-109.

A.B.M., Habibullah; The Foundation of Muslim Rule in India, مله
Lahore 1945. pp 59-65

(المتوفی سنہ ۱۳۹۰ء) اور حضرت مخدوم صدر الدین چراغ ہندؒ (المتوفی ۱۳۹۲ء) کا انتخاب کیا اور ان کو اس علاقہ میں جہاد اور تبلیغ اسلام کے لیے بھیجا۔ یہ دونوں بزرگ یہاں بہت سے مریدین و خلفاء اور مجاہدین کے ساتھ پہنچے[1]۔ جب انھوں نے یہاں کے سیاسی حالات اور مذہبی خلفشار کی اطلاع سلطان غیاث الدین تغلق کو دہلی پہنچائی تو اس نے بھی ان کی مدد کے لیے شہزادہ ظفر خاں کو چھ سو سوار دے کر بھیجا[2]۔ اس کے بعد ان سب نے مل کر راجہ ساکیت سنگھ اور ہنددوں کے خلاف جہاد کیا۔ بالآخر منہیچ گڑھ فتح ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ راجہ اور اس کے بہت سے اعیان و ارکین حکومت بھی مشرف بہ اسلام ہو گئے[3]۔ اس فتح و نصرت کے بعد شہزادہ ظفر خاں کو یہاں کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس نے اپنے عہد میں یہاں بہت سی مساجد اور عمارات تعمیر کرائیں اس طرح اس شہر کو بڑی ترقی حاصل ہوئی۔ پھر یہ شہر ظفر آباد کے نام سے مشہور ہو گیا[4]۔

مخدوم آفتاب ہندؒ اور مخدوم چراغ ہندؒ بھی اس فتح و نصرت کے بعد اپنے خلفا، مریدین اور مجاہدین کے ساتھ یہیں آباد ہو گئے۔ یہ دونوں بزرگ علوم ظاہری و باطنی کے متبحر عالم اور سلسلۂ سہروردیہ کے عظیم المرتبت مشائخ میں سے تھے۔ انھوں نے اپنی باقی ماندہ عمر یہیں درس و تدریس اور تبلیغ و اشاعت اسلام میں گزاری۔ ان کے خرمنِ کمال سے سینکڑوں، ہزاروں افراد نے علمی اور روحانی فیوض حاصل کیے۔ اُن کے وصال کے بعد اُن کے خلفاء، صاحبزادوں اور جانشینوں نے بھی اُن کی روایات کو جاری رکھا اور اشاعتِ دین کے لیے بڑا کام کیا۔ فی الحقیقت ان بزرگوں نے ظفر آباد کو علم و تصوف

---

[1] تجلی نور جلد اوّل ص ۸-۱۴ (۲) خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۵۷

A. Halim: J.A.S.P. Vol. VIII, No. 2, December 1963, pp. 105-108

[2] ایضاً

[3] (۱) تجلیات العارفین (قلمی) ص ۳ (۲) چراغ نور ص ۱۹-۲۳ (۳) مناقب درویشیہ (قلمی)

[4] چراغ نور ص ۲۴

کا بہت بڑا علمی و روحانی مرکز بنا دیا[1]۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک سے طلباء اور مریدین یہاں آکر فیض یاب ہوتے تھے[2]۔

یہ شہر وہاں کے بزرگوں کی عقیدت و توقیر کی بنا پر "شہرِ انور"[3] اور "پیراں شہر"[4] کے نام سے بھی یاد کیا جاتا رہا تھا۔ اور جب کچھ زمانہ بعد یہاں کاغذ بنانے کے چند کارخانے قائم ہو گئے تو یہ "کاغذ کا شہر"[5] کے نام سے بھی مشہور ہوا۔ مگر ظفرآباد کے مقابلہ میں کوئی دوسرا نام زیادہ عرصہ تک نہ چل سکا۔

شہزادہ ظفر خاںؒ کے بعد سلطان محمد بن تغلق (۱۳۲۵ء – ۱۳۵۱ء) کے عہدِ حکومت میں یہاں کا گورنر (۱۳۳۶ء) تاتار خاں تھا[6] جس کو بعد میں بنگال تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے بعد عین الملک ملتانی یہاں کا گورنر مقرر ہوا اور اس نے ۱۳۴۰-۱۳۴۱ء میں سلطان محمد بن تغلق کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا[7]۔ سلطان فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ء – ۱۳۸۸ء) کے عہدِ حکومت میں یہاں کا حاکم شہزادہ نصیر خاں المعروف ملک بہروز سلطانی تھا[8]۔ جب سلطان فیروز نے جونپور کا شہر بسایا تو اِس شہر کی سیاسی حیثیت ختم ہو گئی۔ مگر اس کی علمی و ادبی مذہبی اور ثقافتی حیثیت و اہمیت نصف صدی بعد تک بھی قائم رہی۔ اِس شہر کی خانقاہوں، مساجد، مدارس، مقابر اور مزارات کی بوسیدہ عمارتیں اور کھنڈر آج بھی اس کے عظیم ماضی کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ شہر اب ایک معمولی قصبہ کی حیثیت سے آباد ہے۔

---

[1] اِن بزرگوں کے تفصیلی حالات کے لیے اِس کتاب کے حصۂ سوم کا باب ۲ ملاحظہ ہو [2] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تجلّیٔ نور جلد اوّل و دوم اور تجلیات العارفین (قلمی)

[3] تجلّیٔ نور جلد اوّل ص ۷-۱۸ [4] Imperial D. G. India, Vol. XXVIII, p. 331

[5] ایضاً [6] چراغِ نور ص ۲۴۔ کہا جاتا ہے کہ شہزادہ ظفر خاں نے بعد میں یہاں کے بزرگوں کی صحبت کے اثر سے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔

[7] D.G. Jaunpur

[8] Elliot and Dowson; History of India as told by his own Historians, Vol. II, p. 13

[9] D.G. Jaunpur pp. 245-246

جونپور

جونپور کی قدیم تاریخ اور نام کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک روایت کے مطابق زمانۂ قدیم میں اِس خطّہ کا حاکم "کرار بیر" نامی تھا۔ جو ایک سرکش دیو تھا۔ راجہ رام چندر جی نے اس کو قتل کر کے اِس خطّہ میں امن و امان قائم کیا تھا۔ اِس واقعہ کے بعد اس جگہ کو ایودھیا پورہ کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔[1] مذکور کرار بیر دیو کا استھان جونپور کے موجودہ قلعہ سے متّصل پچھّم کی طرف تھا۔[2] اس کی شکستہ عمارت پر اب موجودہ مندر کی عمارت بنائی گئی ہے۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ راجہ رام چندر جی کے عہد میں یہاں کچھ رشی لوگ رہتے تھے۔ اُن میں سے ایک کا نام جمادگنی تھا اور اسی کے نام کی نسبت سے اِس خطّہ زمین کو جم دگن پورہ، جمادگنی، جمادگنی پورہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا رہا۔ اس رشی کا استھان اب بھی دریائے گومتی کے کنارے ظفر آباد اور جونپور کے درمیان موجود ہے اور جمیتھا کے نام سے مشہور ہے۔[3]

سُلطان فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ - ۱۳۸۸ء) کے عہد سے پیشتر اس جگہ پر بدھوں اور ہندؤوں کا ایک ٹوٹا پھوٹا شہر تھا۔ اس کی قدیم عمارتوں کے کھنڈر یہاں موجود تھے اور اُن پر جھرولی کا قبضہ تھا۔[4] سُلطان فیروز شاہ نے جب ۱۳۵۹ - ۱۳۶۰ء میں لکھنوتی پر سلطان سکندر شاہ (۱۳۵۷ - ۱۳۹۳ء) کے خلاف فوج کشی کی تو اُسے راستے میں مجبوراً برسات کی وجہ سے چھ[6] ماہ کے لیے ظفر آباد رُکنا پڑا۔[5] اِس قیام کے دوران میں وہ ایک روز دریائے گومتی کے کنارے سیر کرتا ہوا چند میل دُور نکل گیا اور اسی خطّہ میں پہنچ گیا۔ یہاں اُس کو بدھوں کے زمانہ کے

---

[1] D.G. Jaunpur, P.145 [2] ایضاً

[3] Fuhrer, A. and Smith; The Sharqi Architecture of Jaunpur Vol. 1, Calcutta 1889. P. 2 ایضاً

[4] ایضاً

[5] Riazl-ul-Islam; J.A.S.P., Vol. III Part 1 Jan. 1955. P. 38.

اُجڑے ہوئے کھنڈروں اور گہرواروں راجپوتوں کے عہد کے مسمار شدہ قلعہ کے ایک ٹیلے کا منظر بہت پسند آیا۔ چنانچہ حسبِ شوق اُس نے یہاں ایک نیا شہر بسانے کا منصوبہ تیار کر لیا[۱]۔ جس کی بُنیادیں شمس سراج عفیف کے بقول اِس واقعہ کے بعد جلد ہی رکھ دی گئی تھیں[۲]۔ روایت ہے کہ سُلطان فیروز شاہ نے انہی دِنوں اپنے مربّی اور چچازاد بھائی محمد بن تغلق جُوناخاں کو خواب میں دیکھا اور اُسی کی نسبت سے اُس نے اِس شہر کا نام جوناپور رکھ دیا جو بعد میں کثرتِ اِستعمال سے جونپور ہو گیا[۳]۔

شہزادہ نصیر خاں المعروف ملک بہروز سلطانی ہی کو اس شہر کا سب سے پہلا حاکم سمجھنا چاہیے کیونکہ وُہی اُن دنوں ظفرآباد کا حاکم تھا اور اسی کی زیرِ نگرانی اس شہر کی بنیادیں رکھی گئی تھیں اور یہاں پر قلعہ، مسجد، بازار، عمارات اور محلّے بسائے گئے تھے[۴]۔ اس کے عہد میں دہلی اور ملک کے دُوسرے حصّوں سے بڑی تعداد میں علماء، فضلاء، صُلحاء، تجّار اور فن کار یہاں پہنچے اور اس کی آبادی میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر سُلطان فیروز شاہ (المتوفّیٰ ۷۸۸ھ) کے عہدِ حکومت میں چار کوس میں پھیلا ہوا تھا۔ شہزادہ نصیر خاں نے جب وفات پائی تو یہیں دفن ہوا اس کے نام پر ایک محلّہ منڈی نصیر خان اب بھی اٹالہ مسجد کے قریب آباد ہے[۵]۔

سُلطان فیروز شاہ کی وفات کے بعد جب طوائف الملوکی کا دَور دورہ ہوا تو سلطنتِ تغلق کے سیاسی انتشار سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کئی صُوبے داروں اور جاگیرداروں نے اپنی خُودمختاری کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ شہزادہ نصیر خاں کے بھانجے شہزادہ علاءالدّین نے جونپور پر قبضہ کر لیا۔ اُس نے اپنی خُودمختاری کا اعلان قلعہ چنار میں کیا اور اپنی رسمِ تاجپوشی بھی وہیں ادا کی۔ اُس نے اپنا صدر مقام بھی اسی جگہ کو بنایا، لیکن قسمت نے اس سے وفا نہ کی اور وُہ کچھ عرصہ بعد ہی اِنتقال کر گیا[۶]۔ اِس واقعہ کے بعد اس علاقہ اور صُوبہ پر ہندو جاگیرداروں کا

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی (عفیف) ص ۱۴۸-۱۴۹ [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] تجلّی نُور حصّہ سوم (قلمی)
[۵] تجلّی نُور۔ جونپور نامہ [۶] D.G. Jaunpur:

دوبارہ قبضہ ہوگیا اور اُنھوں نے حسبِ سابق مسلمانوں پر ظلم و ستم شروع کر دیا۔ جب یہ خبریں دہلی پہنچیں تو سلطان محمود شاہ تغلق (۱۳۹۴ء-۱۴۱۲ء) نے سلطان الشرق ملک سرور کو یہاں کا گورنر بنا کر بھیجا۔ وہ ماہِ مئی ۱۳۹۴ء میں جونپور پہنچا[۱] اور اُس نے تھوڑے ہی عرصہ میں تمام صوبہ میں امن و امان قائم کر دیا[۲]۔

سلطان الشرق ملک سرور جب یہاں پہنچا تو اُس وقت اِس شہر کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے اُن تمام عمارات کو مکمّل کروایا جو سیاسی انتشار کی وجہ سے ادھوری پڑی تھیں۔ اس کے علاوہ اُس نے یہاں قلعہ جونپور، مسجد قلعہ، محل بدیع منزل، کئی نئے بازار اور نئے محلّے بھی آباد کیے۔ اس شہر کو اس کے عہد میں بڑی ترقی ہوئی اور اُس کی شہرت دُور دراز تک پھیل گئی۔ اور جب کچھ عرصہ بعد اُس نے اپنی آزادی و خودمختاری کا اعلان کیا تو اس شہر کو "دارالسرور" کا نام دیا[۳]۔

سلطان الشرق ملک سرور نے جو روایات یہاں قائم کیں اُس کے جانشینوں نے اُن کو بامِ عروج تک پہنچا دیا اور یہ شہر تقریباً ایک صدی تک علم و ادب اور مذہب و ثقافت کا گہوارہ بنا رہا۔ سلاطینِ شرقی کی فیاضیوں سے نہ صرف ہندوستان سے بلکہ عالمِ اسلام کے گوشے گوشے سے ہزاروں علماء، فضلا، صلحاء اور فن کار یہاں کھنچے چلے آتے اور اُنھوں نے اپنے علمی و فنی کمالات سے اِس شہر کو شہرتِ دوام بخشی[۴]۔ سلاطینِ شرقی کے عہد میں یہاں بہت سے عظیم الشان محلّات، مساجد، مدارس، خانقاہیں، روضے، مقبرے اور محلّے آباد ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان حسین شاہ شرقی کے عہد میں یہاں چھیانوے[۹۶] محلّے آباد تھے اور یہ شہر بارہ کوس کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا[۵]۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر تک یہاں سڑسٹھ[۶۷] محلّے

---

۱ جونپور نامہ۔ ص ۱۰ ۲ طبقاتِ اکبری۔ تاریخ فرشتہ ۳ جونپور نامہ ص ۳۶
۴ تفصیلات کے لیے اس کتاب کے مختلف ابواب ملاحظہ ہوں۔
۵ جونپور نامہ ص ۵

آباد تھے اور اس کا رقبہ چار کوس میں پھیلا ہوا تھا۔[1]

سلطان سکندر لودھی (۱۴۹۷ء) نے جب جونپور پر قبضہ کیا تو اُس نے تمام شرقی عمارات، محلات، قلعہ اور شرقی مقابر و مزارات کے کتبات اور گنبدوں کو مسمار کرا دیا بلکہ بعض مساجد کے کتبے بھی مسمار کر دیے گئے۔ دراصل وہ شرقی مساجد کو بھی بارُود سے اُڑا دینا چاہتا تھا لیکن جب مولانا صفی جونپوری اور دُوسرے عُلماء کی ایک جماعت نے اس پر سخت احتجاج کیا تو وہ اس قبیح ارادے سے باز آ گیا۔[2] اس طرح جو شرقی مساجد محفوظ رہ گئیں۔ وہ آج بھی شرقی فنِ تعمیر کا شاہکار مانی جاتی ہیں بلکہ پاک و ہند کے فنِ تعمیر کی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس شہر کی بچی کھچی عمارات کو بعد میں شہنشاہ ہمایوں نے ۱۵۲۵ء میں از سرِ نو تعمیر کروایا تھا۔[3] شاہجہان جب ایک بار جونپور آیا تو اُس نے یہاں کے عُلماء و صُوفیاء کی علمی و دینی خدمات کو سراہتے ہُوئے اس کو "دارالعلم" اور "شیرازِ ہند" کا خطاب دیا۔[4] بعد میں جب ایک دفعہ شہنشاہ اورنگ زیبؒ یہاں پہنچا تو اُس نے بھی اِس شہر کی تمام عمارات کو دوبارہ مرمت و تعمیر کرا کے اُن کو اُن کا اصلی رُوپ بخشا۔[5] لیکن بدقسمتی سے ۱۸۷۱ء میں ۱۲ ستمبر کے سیلاب اور ۲۶ ستمبر کے زلزلہ سے شہر کی عمارات اور آبادی کو خاصا نقصان پہنچا۔[6] پھر اُسی سال ہیضہ اور طاعون کی وبا پھیل گئی جس سے شہر کی خاصی آبادی ختم ہو گئی۔[7] اِن واقعات کے بیس بائیس سال بعد ۱۸۹۴ء میں دوبارہ دریائے گومتی میں سیلاب آیا جس سے شہر کی عمارات کو بڑا نقصان پہنچا۔[8] اِس طرح اُنیسویں صدی کے آخر تک جو کچھ بھی بچا رہ گیا وُہ سلاطینِ شرقی کے حُسنِ ذوق اور کمالِ شوق کی آخری نشانیاں ہیں جن کو دیکھنے کے لیے سیّاح اور فنونِ لطیفہ کے ماہرین دُور دُور سے یہاں پہنچتے ہیں۔ جونپور کی عمارات، مساجد، مدارس، خانقاہیں، مقابر اور مزارات آج

---

[1] جونپور نامہ ص ۱۰۵-۱۰۴ [2] The Sharqi Architecture of Jaunpur Vol. I, P.4.

[3] ایضاً ص ۱۳-۱۴ [4] جونپور نامہ (قلمی نسخہ) غلام حسین ورق ۴ ب

[5] The Sharqi Architecture of Jaunpur, Vol. I, P. 21 [6] جونپور نامہ ص ۱۰۳

[7] ایضاً ص ۱۰۷-۱۰۹ [8]

جس حال میں بھی ہیں اس کے عظیم الشان ماضی کا مُنہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہ شہر اب بھی اپنے فنّی محاسن اور طرح طرح کی مصنوعات کی وجہ سے برصغیر پاک و ہند میں مشہور ہے۔

جونپور کے بارے میں مولانا صفی لکھنوی کی ایک مشہور نظم کے مندرجہ ذیل اشعار اس کے عظیم الشان ماضی کو بہت عمدہ خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں ؎

جونپور ارباب علم و فضل کے "دارالسرور"
کہتے تھے "شیرازِ ہند" اکثر تجھے اہلِ شعور
تجھ میں تھے شاہانِ شرقی کے عمارات و قصور
خود تری تاریخ آبادی ہے "شہر جونپور"
اب کہاں وہ بام و دَر سب ہو گئے زیر و زبر
نام تک ہیں ہے ترے رنگِ تغیّر کا اثر
اے محمّد شاہ جونا کی مکمّل یادگار
کیا ہوتے وہ پھول جن سے اس چمن کی تھی بہار
آہ وہ تیرے مشاہیر انتخابِ روزگار
تیری بستی جن کے غم میں آج تک ہے سوگوار
چل بسے یوں، مدفنوں کا بھی نشاں ملتا نہیں
ایک یوسف! کارواں کا کارواں ملتا نہیں
شہر میں مشہور تھیں جو درسگاہیں کیا ہوئیں
وہ مشائخ کیا ہوتے، وہ خانقاہیں کیا ہوئیں
تھے اسی معمورے میں جو صاحبِ تاج و نگیں
شمع تک اُن کی لحد پر اب کبھی جلتی نہیں

وہ یہیں کے پھول تھے اُن کا یہی تھا خانہ باغ
سمجھے جاتے تھے جو ملکِ ہند میں روشن چراغ
قدرداں بھی پاتے تھے ویسے ہی، حاصل تھا فراغ
اِن چراغوں سے جلا کرتے تھے اور اکثر چراغ
کیا ہوتے وہ صوفیانِ پاک طینت، کیا ہوتے
کیا ہوتے وہ غازیانِ علم و حکمت کیا ہوتے[1]

---

[1] یہ اشعار مولانا صفی لکھنوی کی اس نظم سے لیے گئے ہیں جو انھوں نے جونپور میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۶ء میں پڑھی تھی۔

باب ۲ دوم

شرقی سلطنت کا قیام

تاریخ پاک و ہند میں مرکز اور صوبوں کے درمیان کشمکش

اگر تاریخ پاک و ہند کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان کشمکش کی ایک بڑی دلچسپ لیکن سبق آموز داستان ہے۔ شمالی ہندوستان میں جب کبھی مضبوط حکومت قائم ہوتی اس نے ہمیشہ جنوبی ہندوستان کی فتح کے منصوبے بنائے۔ یہ چیز اگرچہ ایک طرف اُس کی سیاسی قوت اور توسیع پسندانہ جذبے کی مظہر تھی تو دوسری طرف اُس کے اسباب تنزل کی آئینہ دار بھی تھی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس ملک کی جغرافیائی تقسیم، مختلف علاقائی اور تہذیبی قدریں، اقتصادی حالات، صوبائی تعصبات، ذرائع آمد و رفت اور نقل و حمل کی تکالیف مرکزی حکومت کے لیے ہمیشہ پریشانی اور کمزوری کا باعث بنی رہیں۔ اسی کے نتیجے میں مرکز گریز رجحانات اُبھرتے رہے اور وقتاً فوقتاً صوبائی حکومتیں معرض وجود میں آتی رہیں۔

سلاطین دہلی کی صوبائی اور علاقائی پالیسی

جب ترکوں نے ہندوستان پر تسلط قائم کیا تو اس وقت یہ ملک سیاسی اعتبار سے بہت کمزور تھا۔ سارا ملک کئی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹا ہوا تھا اور سیاسی کشمکش کا شکار تھا۔ سلطان شمس الدین التمش (۱۲۱۰ء — ۱۲۳۵ء) نے اس سیاسی کشمکش کا کسی حد تک قلع قمع کیا اور بہت سی علاقائی حکومتوں کو ختم کر کے ایک مضبوط سلطنت کی بنیادیں استوار کیں۔ اس کے بعد اگرچہ سلطان غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ء — ۱۲۸۷ء) منگولوں کے حملوں کی وجہ سے اس سلطنت کی مزید توسیع نہ کر سکا لیکن اُس نے اس کی پوری

طرح حفاظت کی بلکہ اس کو مزید مضبوط بنانے میں خاصی کامیابی حاصل کی۔

جب سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۶-۱۳۱۶ء) نے خلجی سلطنت کی بنیادیں استوار کیں تو اُس نے ملک کے سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے تین طرح کی پالیسی اختیار کی۔ اُس نے دھلی اور اُس کے گرد و نواح کے علاقہ کو شاہی جاگیر قرار دے کر اُسے مرکزی حکومت کے زیرِ نگیں کر دیا[1]۔ راجپوتانہ پر گو اُس نے پوری طرح تسلط جما لیا۔ مگر اس کی مقامی آزادی کو بھی برقرار رہنے دیا[2]۔ اُس نے دکن کو بھی فتح کر کے اپنا باجگزار بنا لیا[3]۔ علاء الدین خلجی کی اس سیاسی حکمت سے اُس کے عہدِ حکومت میں پوری طرح امن و امان قائم رہا اور اُس کی حدودِ سلطنت بھی ملک کے دُور دراز تک پھیل گئیں۔ اِس لائحہ عمل سے ملک کے اِقتصادی حالات بہتر ہو گئے اور تمام رعایا خوش حال ہو گئی۔

سلطان محمد بن تغلق کا طرزِ حکومت

علاء الدین کے بعد تغلق سلطنت کے فرمانروا سلطان محمد بن تغلق (۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) نے سلطان علاء الدین خلجی کی سیاسی بصیرت کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا اور اُس نے سلطنت کے مستقل معاملات کا جو حل بھی تلاش کیا وہ بڑا عارضی اور مہلک ثابت ہوا۔ در اصل اُس نے سلطنت کا تمام علاقہ اپنی ذاتی نگرانی میں رکھنے کی پالیسی اختیار کی۔ لیکن اس کے نتیجے میں صوبائی اور علاقائی عناصر دوبارہ مشتعل ہو گئے اور انھیں شر انگیزی کا موقع مل گیا[4]۔

سلطان محمد بن تغلق کا شمار پاک و ہند کے قابل ترین فرمانرواؤں میں ہوتا ہے۔ اُس کی حکومت کے پہلے چند سال بڑے کامیاب گزرے اور اُس کی سیاسی طاقت کا سکہ نہ صرف

۱؎ K.S. Lal; History of the Khaljis (1290-1320), Calcutta, 1967. pp. 177-190

۲؎ Sir W. Haig; The Cambridge History of India, Vol III, pp. 525-562

تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو:

Mian Mohammad Saeed; The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History, Karachi 1972. pp. 2-3.

۳؎ History of the Khaljis (1290-1320) Calcutta, 1967, pp. 226-237

۴؎ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو:

The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History, pp. 1-39

شمالی ہندوستان میں بلکہ سارے ملک میں بیٹھا ہوا تھا۔ جنوب میں اُس نے (۱۳۲۷-۱۳۲۸ء)

میں ورنگل، معبر (کرناٹک) اور دوارس مدر کو فتح کرکے[1] اپنی سلطنت کی حدود ملک کے

آخری کونے تک بڑھالی تھیں۔ حکومت کے پہلے چند سال اس نے سلطنت کا انتظام بھی بہت عمدہ کیا اور اس کے

دورِ حکومت کے پہلے نصف حصے تک اس کی رعایا بھی بڑی خوشحال رہی۔ اُس کی ساری سلطنت

میں امن وامان تھا اور اُس کی شہرت ایک طرف مصر[2] اور دوسری طرف چین و خراسان تک پھیلی

ہُوئی تھی۔ اِسی طرح اس کی حکومت کا پہلا حصہ سلطنتِ تغلق کا سنہری زمانہ تھا۔ لیکن اس کے بعد یہ

سلطنت کئی وجوہ کی بناء پر ایک لامتناہی کشمکش میں گرفتار ہوگئی۔

غلط حاکموں کا تقرر اور اُنکی بغاوتیں

سب سے پہلی وجہ انتظامِ حکومت کے لیے غلط لوگوں کا چناؤ تھا۔ دراصل ازمنہ وسطیٰ میں کسی مضبوط حکومت کا دارومدار بیشتر اُس کے حکمران طبقہ کی مضبوطی پر ہوتا تھا۔ سلطنتِ دہلی کے پہلے فرمانروا اور حاکم طبقہ ترکی النسل تھے اور اُن میں باہمی ربط تھا لیکن خلجیوں نے اس کے برخلاف مقامی لوگوں کو بھرتی کرنا شروع کردیا۔ اُن کی تقلید سلاطینِ تغلق نے بھی کی۔ اُنھوں نے بھی مختلف قوموں کے لوگوں کو اعلیٰ سول اور فوجی عہدوں

---

[1] The Sharqi Sultanate of Jaunpur; A Political and Cultural History, pp. 3-6.

[2] اسے عباسی خلیفہ مصر نے ۱۳۴۳ء میں حاجی سعید صرصری کی سرکردگی میں ایک فرمان و خلعت بھیجا۔ اس موقع پر سلطان نے ان کا شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا۔ اس دور کے مقتدر شاعر بدر چاچ ایک قصیدہ میں لکھتے ہیں ؎

باستقبالِ فرمانے کہ از پیشِ امام آمد
برہنہ پا و سر کردہ چو ں ایماں شُد ز اسلامش

ایک اور قصیدہ کا مطلع ہے ؎

جبرئیل از طاقِ گردوں البشر گویاں رسید
کز خلیفہ سوئے سلطاں خلعت و فرماں رسید

ابنِ بطوطہ نے عباسی خلیفہ زادہ غیاث الدین کی خراسان سے دہلی میں آمد اور اس سے سلطان کے اظہارِ عقیدت کی دلچسپ داستان قلمبند کی ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۳۷۸، ۳۸۰

پر فائز کرنا شروع کر دیا لیکن اُن کی سیاسی چالوں، جاسوسیوں اور بغاوتوں نے ملک کے سیاسی حالات ناگفتہ بہ بنا دیے۔ جس شخص نے سب سے پہلے سُلطان محمد بن تغلق کے خلاف بغاوت کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا (۳۵-۱۳۳۴ء میں) وہ معبر کا گورنر احسن شاہ تھا جو پہلے کبھی سلطان محمد بن تغلق کا کیسہ بردار ہوا کرتا تھا۔[۱] اس کے بعد بنگال کے گورنر فخر الدین نے (۱۳۳۷ء میں) اپنی خود مختاری کا اعلان کیا جو کبھی بہرام خان کا زرہ بردار تھا۔[۲] ان بغاوتوں کا معبر (کرناٹک) اور بنگال کی علیحدگی کا اثر شمالی ہندوستان پر بہت بُرا پڑا اور وہاں احسن شاہ کے بیٹے ابراہیم شاہ گورنر سرسوتی دہانسی نے (۳۷-۱۳۳۶ء میں) بغاوت کر دی۔[۳] اس کے بعد نظام معین گورنر کٹرہ نے (۳۹-۱۳۳۸ء میں[۴])، عین الملک مُلتانی گورنر اودھ و ظفر آباد نے (۴۱-۱۳۴۰ء میں[۵])، ابیر ہلاجوں نے لاہور میں (۱۳۴۲ء[۶]) اور شاہو افغان نے ملتان میں (۴۲-۱۳۴۱ء[۷]) یکے بعد دیگرے بغاوتیں کر دیں۔ جن سے ساری سلطنت کا امن و امان برباد ہو گیا۔ محمد بن تغلق ان بغاوتوں کو ابھی پوری طرح فرو بھی نہ کر پایا تھا کہ اس سیاسی انتشار کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے دوارسمدر، ورنگل اور وجے نگر (۱۳۳۶ء) یکے بعد دیگرے خود مختار ہو گئے۔[۸]

اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مالوہ، گجرات اور دوسرے جنوبی علاقوں میں بھی اس کے ملکی اور غیر ملکی اُمرا نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ جب سُلطان محمد بن تغلق نے ان بغاوتوں کو دبانے کے لیے زیادہ سختی سے کام لیا تو امیرانِ صدہ کھُلم کھُلا باغی ہو گئے اور اس طوائف الملوکی کا فائدہ

---

۱ ابنِ بطوطہ رحلۃ (اُردو ترجمہ عجائب الاسفار از مولوی محمد حسین دہلی) ۱۸۹۸ء جلد دوم ص ۷۵-۷۶، تاریخ مبارک شاہی ص ۱۰۶

۲ تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص ۴۸۰۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۰۶

۳ عجائب الاسفار (اُردو ترجمہ رحلۃ) جلد دوم ص ۷۸-۷۹ (۴) تاریخ فیروز شاہی ص ۴۸۷ منتخب التواریخ جلد اوّل ص ۲۳۲ (۵) عجائب الاسفار۔ ایضاً ص ۷۹-۸۲

۶ ایضاً ص ۸۱-۸۲ ۷ ایضاً

۸ Agha Mahdi Hussain; The Rise and Fall of Muhammad Bin Tughlaq, Lahore 1938, p. 178.

اُٹھاتے ہوئے حسن گنگو نے دکن میں (۱۳۴۷ء میں) سلطنتِ بہمنی قائم کرلی[۱]۔ آخر سلطان محمد بن تغلق ان شورشوں اور بغاوتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے بڑے حسرت ناک حالات میں ۱۳۵۱ء میں اس دُنیا سے رُخصت ہوگیا[۲]۔

اقتصادی بدحالی سلطان محمد بن تغلق کو ان بغاوتوں کے فرو کرنے اور سیاسی حالات پر قابو پانے کے لیے بے حد رقم خرچ کرنی پڑی، جس سے سلطنت کی اقتصادی حالت بہت خراب ہوگئی۔ علاوہ ازیں اُسے نیا دارالحکومت دولت آباد (دیوگیر) بسانے پر بھی سرمایہ پانی کی طرح بہانا پڑا[۳]۔ جب دہلی سے دولت آباد ہجرت کرنے والوں کو اُن کے مکانوں اور جائیدادوں کی قیمت شاہی خزانہ سے ادا کرنی پڑی تو یہ بھی شاہی خزانہ پر ایک بہت بڑا بوجھ ثابت ہوا[۴]۔ اسی طرح جب محمد بن تغلق نے ایک دفعہ رعایا کی بہبود کی خاطر یہ حکم جاری کیا کہ تانبے کا تنکہ (ٹنکہ) چاندی کے تنکہ (ٹنکہ) کے مساوی سمجھا جائے تو لوگوں نے جعلی سکّے گھڑنے شروع کر دیے جس سے سرکاری خزانہ بالکل تباہ ہوگیا[۵]۔ صرف یہی نہیں بلکہ مون سون کی کمی کی وجہ سے ملک میں خشک سالی کا دور دورہ ہوگیا اور خاص طور پر دوآب میں ایسا قحط شروع ہوا کہ خدا کی پناہ[۶]۔ محمد بن تغلق نے اس قحط سالی کو دُور کرنے کے لیے تمام شرعی ٹیکس اور دوسرے ٹیکس معاف کر دیئے[۷]۔ کسانوں کی حوصلہ افزائی

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص ۵۱۵

[۲] بیان کیا جاتا ہے کہ حالتِ نزع میں سلطان نے مندرجہ ذیل اشعار کہے تھے۔

بسیار دریں جہاں چمیدیم
بسیار نعیم و ناز دیدیم
اسپانِ بلند بر نشستیم
ترکانِ گراں بہا خریدیم
کردیم بسے نشاط و آخر
چوں قامتِ ماہ نو خمیدیم

(تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۱۴۴)

[۳] تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص ۴۶۰-۴۶۱ [۴] ایضاً ص ۴۷۵-۴۷۶

[۵] منتخب التواریخ ص ۲۲۸-۲۲۹ [۶] تاریخ فیروز شاہی برنی ص ۴۷۲-۴۸۵۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۱۲-۱۱۴۔ یہ واقعہ ہے کہ سات سال تک ملک میں بارش کا ایک قطرہ تک نہ برسا۔ (جاری ہے)

کرتے ہوئے انھیں کھیتی باڑی کے لیے قرضے دیے اور کنوئیں کھدوانے کے لیے پیشگی رقمیں دیں۔ جو لوگ قحط زدہ علاقوں سے ہجرت کر گئے اُن پر دو کروڑ روپے خرچ کیے۔ یہ تمام بوجھ بھی سرکاری خزانہ پر ہی پڑا۔[1] اِن تمام کوششوں کے باوجود محمد بن تغلق ان نامساعد حالات پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ چیز بھی اِس بات کا ایک اہم سبب بنی کہ مُلکی حالات کی اَبتری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جن صُوبوں میں گورنروں اور اُمراء نے بغاوتیں کیں ان کو فرو نہ کیا جا سکا۔

جب اُس نے اِن تمام حالات کا حل سوچتے ہوئے دہلی کے بجائے دولت آباد (دیوگیر) کو دارالحکومت بنایا اور دہلی کی ساری آبادی کو وہاں منتقل ہو جانے پر مجبور کیا تو اس کی تمام رعایا اس کے خلاف ہو گئی اور بادشاہ کا ساتھ دینے کے بجائے اس کے راستے میں مزاحم بن کر کھڑی ہو گئی۔ پھر جب محمد بن تغلق نے مسلمان علماء و صُوفیاء کو مُلک کے دُوسرے حصّوں میں جا کر تبلیغ و اشاعتِ اسلام پر مجبور کیا تو لوگوں میں اس کے خلاف اور بھی نفرت پھیل گئی۔[2] ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں ان تمام حالات کی تفصیلات درج ہیں۔ اِن حالات کے نتیجے میں دہلی کی مرکزی طاقت بالکل کھوکھلی ہو گئی اور مُلک کے دُور دراز حصّوں پر اس کا قبضہ و تسلط کمزور پڑ گیا۔ چنانچہ صُوبائی گورنر اور اُمراء اپنی خود مُختاری کے خواب دیکھنے لگے جو رفتہ رفتہ حقیقت میں تبدیل ہوتے گئے۔

تغلق نظامِ حکومت کے نقائص

تغلقوں کا نظامِ حکومت بھی کئی لحاظ سے بڑا ناقص تھا۔ مرکزی اور صُوبائی حکومتوں کا باہمی تعلق بڑا غیر اُستوار اور غیر مربوط تھا۔ وزرائے سلطنت اور صُوبائی گورنر، بہت زیادہ طاقت کے مالک تھے اور بہت حد تک خود مختار تھے۔[3] وزارتِ اعلیٰ،

---

[1] R.P.Tripathi; Some Aspects of Muslim Administration, Allahabad, 1936. pp. 277-278.

[1] ایضاً ص ۲۷۷-۲۷۸ [2] ایضاً۔ دیوانِ امیر کوہی کے افسروں اور شقداروں نے بھی بے بہا رقمیں غبن کر لی تھیں۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص ۴۹۸-۴۹۹۔

[3] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی۔ (برنی)

[2] The Rise and Fall of Muhammad Bin Tughluq. pp. 121-123

[3] I.H. Qureshi; The Administration of the Sultanate of Dehli, Lahore 1944. pp. 50, 84-85.

صوبائی گورنری اور اعلیٰ عہدوں پر جن منظورِ نظر لوگوں کا تقرر کیا گیا تھا وہ خود غرض اور نالائق تھے۔ سلطان محمد بن تغلق کا وزیرِ اعظم خواجہ جہاں احمد ایاز کافی عمر رسیدہ شخص تھا۔ پہلے وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے عہدِ حکومت میں محض محکمہ تعمیراتِ عامہ کا صدر تھا[1] اور حکومت کے معاملات چلانے کا کوئی تجربہ اور اہلیت نہیں رکھتا تھا[2]۔ غیاث الدین کی وفات کے بعد اس کا نو مسلم نائب اِس عہدہ پر فائز ہوا۔ سلطان فیروز شاہ کو اس پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ تمام اہم امور سلطنت اُس کے سپرد کر کے کئی کئی مہینے دارالحکومت سے غائب رہتا تھا[3]۔ اس کے بعد جب سلطان فیروز شاہ نے خان جہان ملک مقبول کو وزیرِ اعظم بنایا تو اس کو بھی اس قدر اختیارات سونپ دیے کہ وہ مشرف الممالک جیسے افسران کا تقرر یا معزولی بھی کر سکتا تھا[4]۔

وزیرِ اعظم کو اِس قدر اختیارات سونپنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے افسر اور اُمراء وغیرہ اس کے ساتھ حسد و بغض رکھنے اور سیاسی جوڑ توڑ اور سازشوں میں مصروف رہنے لگے۔ سلطان فیروز شاہ کے بعد جب سلطان محمد شاہ (۱۳۹۰-۱۳۹۱ء) تخت نشین ہوا تو اُس نے اسلام خاں کو وزیرِ اعظم مقرر کیا اور اس کو تمام اختیارات سونپ دیے[5]۔ ایک دفعہ سلطان محمد شاہ اودھ میں قلعہ محمد آباد کی تعمیر دیکھنے کے لیے گیا تو اُس نے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے پنجاب میں بغاوت کی [illegible] مگر نائب وزیر خواجہ سرور نے سلطان کو تمام حالات سے مطلع کر دیا۔ چنانچہ سلطان نے اُس کو برطرف کر کے وزارتِ اعلیٰ کے عہدے پر خواجہ سرور کو فائز کر دیا[6]۔ یہی کیفیت

---

[1] تاریخ مبارک شاہی ص ۹۸
احمد ایاز نو مسلم تھا۔ اس کا پہلا نام ہردیو تھا۔ وہ دیوگڑھ کے حکمران خاندان سے تھا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی توجہ سے مسلمان ہوا۔ اس نے فارسی میں "چہل روزہ" نام کی ایک کتاب بھی لکھی جس میں اس نے اپنے مرشد کے حالات اور اپنے زمانے کے کچھ واقعات بیان کیے ہیں۔

[2] The Administration of the Sultanate of Dehli pp. 84 85. [3] ایضاً

[4] تاریخ فیروز شاہی (عفیف) ص ۴۲۶

[5] The Cambridge History of India, Vol. III, pp. 192-193.

[6] K.S.Lal; Twilight of the Sultanate, Bombay 1963, p. 7.

دوسرے صوبائی گورنروں کی بھی تھی۔ جو ذاتی خوبیوں کی بنا پر نہیں بلکہ خوشامدی اور منظورِ نظر ہونے کی بنا پر ان اعلیٰ عہدوں پر پہنچے تھے۔ معبر، سرسوتی دہانسی، بنگال اور کڑہ وغیرہ کے گورنر ایسے ہی لوگوں میں سے تھے، جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور جن کی بغاوتوں نے ملک کو ابتری اور افراتفری میں مبتلا کر رکھا تھا۔[1]

یہی صورتِ حال آخری تغلق فرمانرواؤں کے عہد میں بھی رہی۔ ملک راجہ فاروقی جو خاندیش کا گورنر تھا، کبھی سلطان فیروز شاہ کا ایک ذاتی محافظ رہا تھا۔[2] دلاور خان مالوہ کا گورنر، سلطان فیروز شاہ کا ایک پرانا منظورِ نظر تھا۔[3] ظفر خاں گجرات کا گورنر سلطان فیروز شاہ کی بیوی کا بھائی تھا۔[4] اسی طرح ملک سرور ظفر آباد اور اودھ کا گورنر کبھی سلطان فیروز شاہ کا خواجہ سرا ہوتا تھا۔ سلطان محمد شاہ تغلق جب مرکز کے معاملات میں الجھا ہوا تھا تو ان گورنروں نے اس کو کمک یا مالی مدد بھیجنے کے بجائے اپنے ذاتی مفادات کو مدِ نظر رکھا اور دہلی کی سیاسی ابتری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سب نے یکے بعد دیگرے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

ہندوؤں کا طرزِ عمل اور بغاوتیں

ہندو راجے، ہندو جاگیردار اور ہندو رعایا بھی ہمیشہ سلاطینِ دہلی کے لیے پریشانی کا باعث بنی رہی۔ چونکہ ملکی آبادی کی بہت بڑی اکثریت انہیں پر مشتمل تھی اس لیے ان کا تعاون حکومت کی کامیابی کے لیے بے حد ضروری تھا۔ بعض ہندو سلطنت کے ممتاز عہدوں پر بھی فائز تھے۔ ضیاء الدین برنی اور ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کے عہدِ حکومت میں ایک ہندو رتن سندھ کا حاکم تھا۔[5] اسی طرح ایک اور

---

[1] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب
The Sharqi Sultanate of Jaunpur; A Political and Cultural History, pp. 4-10.

[2] تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۴۱-۵۴۲ [3] ایضاً ص ۴۶۱-۴۶۲

[4] ایضاً ص ۵۴۱-۵۴۲

[5] طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۷۲ — مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب:
The Sharqi Sultanate of Jaunpur; A Political and Cultural History, pp. 20-25.

[6] عجائب الاسفار (اردو ترجمہ رحلہ) جلد سوم ص ۱۰۵-۱۰۶

ہندو دھارا دھرنامی بھی کچھ عرصے تک دیوگڑھی کا نائب وزیر رہا اور وہ دیوانِ اسلوب کا صدر تھا۔ فرشتہ کے بقول بھرن راتے اس کے قابلِ اعتماد حکام میں سے تھا۔ بقول ابنِ بطوطہ سلطان جوگیوں کی بہت عزت کرتا تھا۔ بعض ہندو اُمرا کو خدمات کے صلے میں جاگیریں بھی عطا کی جاتی تھیں۔[1]

چنانچہ قاعدے کے مطابق ان جاگیرداروں کے ذمّہ ہوتا تھا کہ وہ علاقے کے زمینداروں سے لگان وصول کریں اور مقامی مصارف کے بعد بچی ہوئی رقم مرکزی خزانہ میں جمع کروائیں۔ مگر یہ ہندو جاگیردار لگان وصول کرنے والے افسروں اور زمینداروں کے درمیان رکاوٹیں پیدا کرتے۔ دراصل ایسے جاگیردار ہندو زمینداروں اور مسلم گورنروں کے درمیان بہت اہم کڑی تھے۔[2] لیکن وہ اکثر حسد و بغض اور کینہ پروری سے سیاسی اور سرکاری معاملات میں اُلجھاؤ اور مشکلات پیدا کرتے۔ انھیں جب بھی موقعہ ملتا وہ سرکاری رقوم غبن کر جاتے جس سے شاہی خزانے پر بڑا بُرا اثر پڑتا۔[3] ان جاگیرداروں اور اُمرا کے پاس خاصی تعداد میں فوج بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ انھیں جب بھی موقع ملتا بغاوت کر دیتے۔ ایسے ہی حالات سے فائدہ اُٹھا کر وجے نگر کے راؤں نے ۱۳۳۶ء میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔[4] اس طرح ۱۳۴۳ء میں سمانہ، کھیتل اور سنام کے ہندوؤں نے بھی بغاوت کی اور اپنے علاقہ میں لوٹ مار مچا دی تھی۔[5] سلطان فیروز شاہ کے انتقال (۱۳۸۸ء) کے بعد جب مرکزی حکومت کمزور ہو گئی تو بعض ہندو جاگیرداروں نے مقامی سیاسیات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور وہ سلطنتِ تغلق کے استحکام اور بقا کے لیے بڑے مہلک ثابت ہوئے۔[6] اس کے بعد سلطان محمد تغلق کے زمانہ (۱۳۹۱ء-۱۳۹۳ء) میں اٹاوہ کے ہندوؤں کی بغاوت اور سلطان محمود شاہ تغلق کے عہد میں (۱۳۹۴ء) میں صوبہ اودھ کے ہندوؤں

۱؎ عجائب الاسفار (اُردو ترجمہ رحلتہ ابن بطوطہ) جلد سوم ص ۱۰۵-۱۰۶

The Rise and Fall of Muhammad Bin Tughluq, pp. 12-13.

۲؎ The Administrtion of the Sultanate of Dehli, p. 197.

۳؎ ایضاً ص ۱۹۸-۱۹۹

۴؎ The Rise and Fall of Muhammad Bin Tughluq, p.162.

۵؎ تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص ۴۷۹-۴۸۰ ۶؎ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۵۳

۷؎ The Cambridge History of India, Vol III, pp. 192-193.

کی بغاوتوں نے اِس علاقہ کے سیاسی حالات بڑے ناگفتہ بہ کر دیے تھے۔ خاص طور پر انھوں نے مسلمانوں کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اور انہی بغاوتوں کو فرو کرنے اور اس علاقے میں امن و امان قائم کرنے کے لیے سلطان الشرق ملک سرور کو جونپور کا گورنر بنا کر بھیجا گیا تھا۔[1]

سلطان فیروز شاہ کا محکمۂ غلاماں

سلطنتِ تغلق کے لیے محکمۂ غلاماں بھی کئی لحاظ سے زوال و انحطاط کا باعث ہوا۔ اس زمانے میں غلاموں کو تعلیم و تربیت دے کر ان کی اہلیت و قابلیت کے مطابق مناسب عہدوں پہ فائز کیا جاتا تھا۔ کچھ لوگوں کو فوج میں بھی بھرتی کیا جاتا۔ بعض کو شاہی محل میں ملازم رکھا جاتا اور بعض کو دوسرے سرکاری محکموں میں جگہ دی جاتی تھی۔ یہ غلام سلطنتِ دہلی کے دورِ اوّل میں سلطنت کے لیے بڑی تقویت کا باعث رہے اور ان میں سے بعض تو سلطنتِ دہلی کے وارث بھی ہوئے۔ ایبک، التتمش اور بلبن جیسے کامیاب حکمراں اس نظام کی بہترین پیداوار تھے۔ بعد ازاں سلاطینِ خلجی و تغلق کے عہد میں یہ روایات برقرار نہ رہ سکیں اور بہت سے شاہی غلام بے وفا اور باغی ثابت ہوئے۔ سلطان علاء الدین خلجی کا غلام ملک کافور اور سلطان محمد بن تغلق کا غلام ملک طغی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے جن کی نمکحرامی اور سیاسی چالبازیوں سے اس دور کی تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔[2]

سلطان فیروز شاہ تغلق جب تختِ نشین ہوا تو اُس نے غلاموں کی تعداد میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ اِس دور کے مؤرخ شمس سراج عفیف لکھتے ہیں کہ اس کے عہد میں غلاموں کی تعداد ایک لاکھ اسّی

---

[1] تاریخ مبارک شاہی ص ۱۵۶

[2] The Rise and Fall of Muhammad Bin Tughluq, pp. 185-188.

مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب

The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History, pp. 6-14.

ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ان میں سے چالیس ہزار تو محل کے ملازمین تھے اور بارہ سو بطور دستکار اور کاریگر کے دھلی میں کام کرتے تھے۔[1] ان غلاموں کا اپنا ایک علیحدہ محکمہ تھا اور سرکاری خزانے پر ان کے اخراجات کا بڑا بوجھ تھا۔[2] سلطان فیروز شاہ کے عہدِ سلطنت کے آخری دور میں ان غلاموں کی ریشہ دوانیوں اور سیاسی چالوں نے ملکی معاملات میں بڑی بدانتظامی پیدا کر دی تھی۔ سلطان محمود شاہ اور نصرت شاہ جب تختِ شاہی کے لیے برسرپیکار ہوئے تو اِن غلاموں اور دوسرے امراء و وزراء کی سیاست بازی اور معاندانہ حرکات نے جلتی پر تیل کا کام کیا[3] اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تمام صوبائی گورنر یکے بعد دیگرے خودمختار ہو گئے۔

سلطان فیروز شاہ کا جاگیرداری نظام

سلطان فیروز شاہ کا جاگیرداری نظام بھی مرکزی حکومت کے استحکام کے لیے سخت مضر ثابت ہوا۔ یہ جاگیردار اپنی جاگیروں کے اندرونی معاملات میں بالکل آزاد ہوتے تھے، اپنی سرحدوں کی حفاظت خود کرتے تھے[4] اور اپنے زمینداروں سے لگان بھی خود ہی وصول کرتے۔ ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ لگان کی آمدنی سے اپنے اخراجات پورے کرنے کے بعد باقی رقم مرکزی خزانہ میں جمع کرائیں اور جنگ کے موقعہ پر مرکز کو فوج اور گھوڑے وغیرہ فراہم کریں لیکن وہ اکثر جعل سازی اور فریب کاری سے کام لیتے۔ یہ لوگ بڑی سیاسی حیثیت و اہمیت کے بھی مالک تھے۔ سلطان فیروز شاہ کے عہدِ حکومت میں اس طرح کے ایک بڑے جاگیردار مردان دولت نامی تھے جن کا خطاب سلطان الشرق تھا اور وہ کڑہ، دالمؤ (ضلع رائے بریلی) اور کول (علی گڑھ) کے جاگیردار تھے۔ اسی طرح گجرات کی جاگیر سکندر کے ماتحت تھی۔ ظفر آباد اور اودھ کی جاگیر ایک دوسرے امیر کے ماتحت تھی اور بہار کی جاگیر بیر افغان کے زیرِ فرمان تھی۔ ایسے تمام جاگیردار اور

۱ تاریخ فیروز شاہی ص ۱۶۰-۱۶۱

۲ The Administration of the Sultanate of Delhi, p. 65.

۳ The Cambridge History of India, Vol. III, pp. 193-205.

۴ Lane-Poole, Stanley; Medieval India under Muhammadan Rule, London 1926, pp. 146-147.

اُمرا سلطنت کے سیاسی و اقتصادی معاملات کے لیے بڑی پریشانی اور خرابی کا باعث تھے۔ وُہ ہمیشہ ذاتی مفاد کو مدِ نظر رکھتے اور اکثر باھمی کشمکش میں مُبتلا رہتے۔ ان کی دغا بازیوں، سازشوں اور سیاسی چالوں سے مرکزی حکومت ہمیشہ پریشاں رہتی۔ اس طرح وہ سلطنت کے تنزل و زوال کا بہت بڑا سبب ثابت ہوئے۔

تغلق فوجی نظام کے نقائص

سلاطینِ تغلق کی وسیع سلطنت و حکومت کے لیے بڑی اور طاقت ور فوج موجود تھی۔ لیکن اُن کا فوجی نظام کئی لحاظ سے ناقص تھا۔ اُن میں سے سلطان محمد بن تغلق اپنی فوج کی دیکھ بھال خُود کرتا رہا[1]۔ اُس کے دورِ حکومت کے پہلے نصف حصّہ میں فوج بڑی قابل اور کامیاب رہی۔ لیکن ۱۳۴۲ء کے بعد اُس میں تنزّل کے آثار شروع ہو گئے۔ اور یہ تنزّل و انحطاط کئی لحاظ سے اُس کے نظامِ حکومت کی خرابیوں کا بھی نتیجہ تھا۔ اس کی ایک وجہ ملک میں قحط سالی اور اُس کی نئی نئی سکیموں کی ناکامی بھی تھی۔ مزید برآں تغلق فوج میں ہر قوم کے لوگ شامل تھے۔ جن کے ذاتی جھگڑوں سے بھی فوج میں بد انتظامی رہتی۔ خاص طور پر لڑائی کے موقعوں پر اُن کی نا اتفاقی اور جھگڑے بڑے مہلک ثابت ہوتے[2]۔ بعض اوقات ایک صُوبہ کی فوجی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے دُوسرے صُوبہ کی فوج بلوائی جاتی۔ اِس طرح کا فوجی نظام اتنی وسیع سلطنت کو قابو میں رکھنے کے لیے یقیناً غیر موزوں تھا۔ علاوہ ازیں محمّد بن تغلق کے بعد اُس کے جانشین، جن میں سلطان فیروز شاہ بھی شامل تھے، اچھے فوجی جرنیل ثابت نہ ہُوئے۔ جب ان جانشینوں میں جنگِ تخت نشینی چھڑ گئی جس نے کئی سال تک طُول کھینچا تو فوجی طاقت مزید کمزور ہوتی گئی۔ اِس دوران میں کئی نئے نئے سیاسی و فوجی سردار پیدا ہو گئے، جن میں سے بہادر ناہر میواتی، ملّو اقبال اور مقرب خاں

---

[1] Medieval India under Muhammadan Rule, p. 147.

[2] عجائب الاسفار (اُردو ترجمہ رحلۃ۔ ابنِ بطوطہ) ص ۸۱-۸۲ تغلق فوج میں ہندوستانیوں کے علاوہ تُرک اور خراسانی سپاہی بھی تھے۔

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اِن فوجی سرداروں کی ریشہ دوانیوں سے ملکی حالات مزید ابتری کا شکار ہو گئے[1] اور سلطنت کی سرحدیں غیر محفوظ ہوتی گئیں۔ یہی وہ حالات تھے جن سے امیر تیمور کو دہلی پر حملہ کرنے کی جرأت پیدا ہوئی۔

کمزور جانشین اور اُن کی خانہ جنگیاں

سلطنتِ تغلق کے آخری فرمانروا نالائق اور کمزور تھے۔ وہ سلطنت کی صحیح معنوں میں حفاظت نہ کر سکے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں ایک طاقتور سلطان کی ہی حکومت مضبوط ہو سکتی تھی۔ سلطان التمش، سلطان بلبن اور سلطان علاءالدین خلجی جیسے طاقتور سلاطین ایک مضبوط سلطنت کے مالک تھے۔ لیکن اُن کے کمزور جانشین اُن کی سلطنت کو سنبھالنے میں نااہل ثابت ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کا عہد سلطنت تغلقوں کا سنہری زمانہ تھا۔ لیکن اُس کے بعد یہ سلطنت زوال پذیر ہو گئی۔ سلطان فیروز شاہ نے اس کو کچھ عرصہ سنبھالا دیا لیکن اُس کی وفات کے بعد ملک میں ایسی طوائف الملوکی کا دَور دَورہ شروع ہوا کہ بڑے تھوڑے ہی عرصہ میں یہ خاندان ختم ہو گیا۔ سلطان فیروز شاہ کے جانشینوں نے اپنی خانہ جنگی سے سلطنت کے لیے ایسے بُرے حالات پیدا کر دیے کہ مسلمان صوبائی گورنر بھی مرکزی حکومت کی اطاعت سے منحرف ہو گئے۔ اودھ اور راجپوتانہ میں ہندو اُمراء اور جاگیرداروں کی بغاوتوں نے اور پنجاب میں کھوکھروں کی بغاوتوں اور لُوٹ مار نے اِس سلطنت کی رہی سہی ساکھ کو بھی ختم کر دیا[2]۔ جب سلطان غیاث الدین تغلق ثانی، ابوبکر، محمد شاہ، سکندر، محمود اور نصرت شاہ جیسے کمزور سلاطین یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوتے تو وہ اِس طوائف الملوکی کو دبا نہ سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنتِ تغلق کا شیرازہ بکھر گیا۔

حملۂ تیمور اور صوبائی حکومتوں کی خودمختاری

اِن حالات میں جب امیر تیمور نے دہلی پر حملہ کیا تو کئی صوبائی حکومتیں معرضِ وجود میں آ گئیں۔ اس سے پہلے معبر میں ۱۳۳۴ء میں اور

---

[1] The Cambridge History of India, Vol. III, pp. 193-205.

[2] ایضاً ص ۱۹۲-۱۹۴

وجے نگر میں ۱۳۳۶ء میں خود مختار حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ جام فرمانرواؤں کے تحت سندھ کا صوبہ بھی ۱۳۳۶ء ہی سے کسی حد تک آزاد تھا[۱]۔ بنگال ۱۳۳۸ء میں ہاتھ سے نکل چکا تھا[۲]۔ دکن میں بہمنی سلطنت ۱۳۴۷ء میں معرضِ وجود میں آچکی تھی۔ خاندیش کی راجدھانی کی بنیادیں ۱۳۸۲ء میں پڑ چکی تھیں۔ اب سلطنتِ مالوہ ۱۴۰۱ء میں اور سلطنتِ گجرات ۱۴۰۱ء میں وجود میں آگئیں اور ایسے ہی حالات میں شرقی سلطنت جونپور نے ۱۳۹۸ء میں اپنی مکمل آزادی کا اعلان کر دیا[۳]۔

۱۔ The Cambridge History of India. Vol. III, pp. 192-194.

۲۔

۳۔ ان سلطنتوں کے مختصر حالات اس کتاب کے بابِ سوم میں ملاحظہ فرمائیں۔

باب ۳ سوم

تاریخِ پاک و ہند میں شرقی سلطنت کا مقام

شرقی سلطنت سے پیشتر صوبہ اودھ اور بہار کے علمی، دینی اور ثقافتی مراکز

صوبہ اودھ اور بہار کے مسلمانوں کی علمی، دینی اور ثقافتی زندگی کا آغاز شرقی سلطنت کی داغ بیل پڑنے سے بھی کئی صدیاں پہلے ہو چکا تھا۔ اور اس کی کڑیاں عہدِ غزنوی سے جا کر ملتی ہیں۔ سلطان محمود غزنوی (۹۹۸ - ۱۰۳۰ء) اور سلطان شہاب الدین محمد غوری (۱۱۷۵ - ۱۲۰۶ء) کے درمیان جو ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گزرا اُس میں مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد دہلی کو عبور کر کے شمالی ہندوستان کے مختلف شہروں اور قصبوں میں آباد ہو چکی تھی۔ اس طرح شرقی سلطنت کے قیام سے صدیوں پہلے بہرائچ، بدایوں، بلگرام، قنوج، کٹرہ، بہار شریف، اور ظفر آباد وغیرہ میں مسلمانوں کے علمی و دینی مراکز قائم ہو چکے تھے[1]۔ بہرائچ میں سید سالار مسعود غازیؒ[2] اور میر سید امیر ماہ بہرائچیؒ[3] کے مزارات، بدایوں میں میر ملہم شہیدؒ[4] اور حضرت برہان الدین شہیدؒ اور دوسرے شہداء کے مزارات اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ وہاں پہلے ہی سے مسلمان موجود تھے[5]۔ علاوہ ازیں بدایوں کے مولانا رضی الدین

---

۱ حیاتِ شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ ص ۱۱-۱۲۔ تاریخِ مشائخ چشت ص ۱۴۳-۱۴۴

۲ سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۳۷۶۔ موصوف سلطان محمود غزنوی کے غزاۃ میں سے تھے۔

۳ ایضاً ص ۱۴۱۔ وہ سلطان فیروز شاہ (المتوفیٰ ۱۳۸۸ء) کے زمانہ کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ وہ سید علاء الدین المعروف بہ علی جاوریؒ سے بیعت تھے۔ انھوں نے وحدۃ الوجود کے مختلف مسائل پر رسالہ مطلوب فی عشق المحبوب لکھا تھا۔

۴ ایضاً ص ۳۷۵۔ وہ سید سالار مسعود غازیؒ کے رفیقوں میں سے تھے۔

۵ ایضاً ص ۱۰۴-۱۰۵۔ یہ شہداء بغداد، بخارا، یمن، نخشب، ہیمرہ، غزنین اور غور سے یہاں پہنچے تھے۔

حسن صغانی[1] بلگرام کے خواجہ عماد الدینؒ اور سید محمد صغریؒ[2]، کڑہ کے میراں سید تاج الدینؒ مخدوم ضیاء الدین زاہد کڑویؒ اور سید اسماعیل کڑویؒ[3]، بہار کے حضرت احمد بہاریؒ[4] اور حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ[5] جیسے بزرگ بھی سلطنتِ شرقی سے تقریباً ڈیڑھ صدی پیشتر اس علاقہ میں اشاعتِ اسلام کے لیے بڑا کام کر چکے تھے۔ ان کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰-۱۳۲۵ء) کے عہدِ حکومت میں حضرت مخدوم اسد الدین آفتابِ ہندؒ (المتوفیٰ ۱۳۹۰ء) اور حضرت مخدوم صدر الدین چراغِ ہندؒ (المتوفیٰ ۱۳۹۲ء) اپنے بے شمار رفقاء، خلفاء، مریدین اور مجاہدین کے ساتھ یہاں پہنچے[6] اور انھوں نے بھی کلمۂ دین کی اشاعت و احیاء کے لیے یہاں بڑا کام کیا۔ یہ بزرگ پورے یقین و انہماک کے ساتھ علمی و دینی اور تمدنی اداروں کی تعمیر و تشکیل میں لگے رہے اور ہندو راجہ اور ان کی ہندو رعایا ان کے حوصلوں کو کبھی پست نہ کر سکی۔ انھوں نے اس علاقہ میں مساجد، مدارس اور خانقاہیں آباد کر کے لاکھوں بندگانِ خدا کو علمی و روحانی فیوض سے مالامال کیا۔[7]

---

[1] حیاتِ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص ۱۲۔ موصوف ۱۱۸۱ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی مشہور تصنیف مشارق الانوار ہے۔ انھوں نے (۱۲۱۸ء میں) بغداد پہنچ کر بڑے بڑے عالموں کی گردنیں جھکا دی تھیں۔

[2] سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۱۲۳-۱۲۴۔ یہ دونوں حضرات خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خلفا تھے اور سلطان التمش کو بھی ان سے والہانہ عقیدت تھی۔ بقول آزاد بلگرامی صاحب مآثر الکرام، کلمۂ دین کی اشاعت و احیاء اور بدعت کے مٹانے میں راسخ العقیدہ تھے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ مآثر الکرام ص ۱۰-۱۳۔

[3] تجلیٔ نور، جلد اول ص ۸-۱۵۔

[4] سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۴۲۵-۴۲۶۔ آپ بھی اسرار و رموزِ توحید پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے اور حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے ساتھ ان کو بڑی گہری عقیدت تھی۔ وہ بعض اوقات عالمِ مجذوبیت میں ایسی باتیں کہہ دیتے جو عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتیں۔ سلطان فیروز شاہ کے عہد میں علماء نے دہلی کے فتویٰ سے قتل کر دیے گئے تھے۔

[5] ایضاً ص ۳۷۲ — انھوں نے اسرارِ حقیقت اور آدابِ شریعت کو اپنے مکتوبات میں جس انداز سے سمویا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ ان سے سلطان محمد بن تغلق کو بڑی عقیدت تھی۔ شیخ منیریؒ فردوسیہ سلسلہ کے سب سے معروف بزرگ تھے۔

[6] تجلیاتِ العارفین (قلمی) ص ۲-۳ چراغِ نور ص ۲۱-۲۴۔ تجلیٔ نور جلد اول ص ۸-۱۵

[7] ایضاً

جب سلطان محمد بن تغلق نے دہلی کی ساری آبادی کو دولت آباد منتقل ہونے کا حکم دیا اور بہت سے علماء و مشائخ کو ملک کے دُور دراز صوبوں میں بھی جا کر اشاعتِ اسلام کے لیے مجبور کیا تو شمالی ہند کی علمی و مذہبی محفلیں بتدریج سرد پڑتی گئیں اور خاص طور پر دہلی، جو کبھی رشکِ بغداد اور غیرتِ مصر تھا اور جہاں قدم قدم پر مدرسے اور خانقاہیں تھیں، ایسا تباہ و برباد ہوا کہ دُور دُور تک خاک اُڑنے لگی۔ سلطان فیروز نے اس بکھری ہوئی مجلس کو سمیٹنے کی کوشش تو کی لیکن اس کے انتقال کے بعد دہلی کی مرکزی حیثیت ہر لحاظ سے ختم ہو گئی۔ اس کے بعد وہاں کے علماء و صوفیا بھی ملک کے دُوسرے صوبوں میں منتقل ہو گئے اور اُن میں سے بہت سے صوبہ اودھ اور بہار میں بھی آ گئے[۱]۔ یہ بزرگ جہاں جہاں بھی پہنچے اُنھوں نے وہاں کے بسنے والے مختلف الخیال اور مختلف المذاہب لوگوں میں اتحادِ عمل اور اتحادِ فکر پیدا کیا اور وہاں کے منتشر طبقوں کو ایک سماجی رنگ میں رنگ کر ایک مضبوط معاشرہ کی شکل دی۔ اُن کی خانقاہوں میں ہندو مُسلم سب جمع ہوتے اور وُہ اُن کے اختلافات کے پردوں کو ہٹا کر اُن میں ہم دلی اور ہم زبانی پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ وُہ ساری قوم کا اخلاقی مزاج درست رکھنے اور صحت مند عناصر کو ابھارنے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ــــ ان مشائخ کی ایسی کوششوں پر ہی فی الحقیقت قرونِ وُسطیٰ میں مُسلم سوسائٹی کی شیرازہ بندی کا انحصار تھا اور اس مُسلم سوسائٹی کے ضبط و نظم پر ہی مُسلمانوں کے سیاسی نظام کا دار و مدار تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے بیشتر مؤرخین نے مُسلمانوں کے سماج اور اُن کے نظریات کو صرف سلاطینِ دہلی اور حکمران طبقہ کے افکار و اعمال کے آئینہ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس دور میں دہلی کی نہ صرف سیاسی بلکہ تمدّنی حیثیت بالکل معمولی تھی اور اس سے کہیں زیادہ کام مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے دُوسرے علاقوں میں ہو رہا تھا۔

حملۂ تیمور کے بعد صوبائی علمی، دینی اور ثقافتی مراکز

جس طرح امیر تیمور کے دہلی پر حملہ کے بعد ہماری سیاسی توجّہ کا مرکز دکن، گجرات، خاندیش، بنگال، مالوہ اور جونپور کی صوبائی حکومتیں

---

[۱] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخِ مشائخِ چشت ص ۱۹۲-۲۱۴

بن گئیں۔ اسی طرح ہماری علمی و ادبی، مذہبی اور ثقافتی تاریخ کی دلچسپیاں لکھنوتی، پنڈوہ، دولت آباد، گلبرگہ، برہان پور، زین آباد، مانڈو، احمد آباد، اور جونپور کی طرف منتقل ہوگئیں۔ ہر چند اُن جگہوں کے سیاسی و ثقافتی کارناموں سے تاریخ کا ہر طالب علم آگاہ ہے لیکن ان کے مختصر سے حالات نمونہ مشتے از خروارے کے طور پر بیان کیے جاتے ہیں تاکہ اُن سے شرقی سلطنت کی علمی و ادبی اور ثقافتی اہمیت سمجھنے میں مدد ملے۔

سلطنتِ بہمنی کی علمی و ادبی اور ثقافتی اہمیت

یہ سلطنت دکن میں ۱۳۴۷ء میں حسن المعروف علاء الدین بہمن شاہ نے قائم کی[1]۔ اس کے بیٹے اور جانشین سلطان محمد شاہ اوّل (۱۳۵۸-۱۳۷۳ء) کو اُس کے ہمعصر خلیفۂ مصر نے بھی تسلیم کیا اور خلعتِ شاہانہ سے نوازا[2]۔ بہمنی سلطنت کا ایک بادشاہ سلطان محمد شاہ ثانی (۱۳۷۸-۱۳۹۷ء) تھا جو بڑا امن پسند حکمران تھا۔ وہ علوم و فنون کا بڑا شائق تھا اور اسی نے خواجہ حافظ شیرازیؒ کو اپنے ہاں مدعو کرنا چاہا تھا[3]۔ اُس کے جانشین سلطان فیروز شاہ (۱۳۹۷-۱۴۲۲ء) کا عہدِ حکومت سلطنتِ بہمنی کا سنہری زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ فیروز شاہ بڑی خوبیوں کا مالک اور فنِ تعمیر کا بے حد شائق تھا۔ گلبرگہ میں اُس نے بڑی عالیشان عمارات تعمیر کروائیں اور اُس کے نام اور کام کی شہرت سُن کر امیر تیمور نے بھی اُسے تحفے تحائف بھیجے تھے[4]۔ اسی کے عہد میں حضرت سید محمد گیسو دراز بندہ نوازؒ گلبرگہ پہنچے اور انھوں نے وہاں اپنا مدرسہ و خانقاہ آباد کی[5]۔ اُس کے بھائی سلطان احمد شاہ (۱۴۲۲-۱۴۳۵ء) نے بیدر کا شہر آباد کیا اور وہاں عظیم الشان عمارات بنوائیں۔ اس کو بھی علم و ادب سے بڑی گہری

---

[1] ظفر الوالہ جلد سوم ص ۱۷۸

[2] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ظفر الوالہ۔ طبقاتِ اکبری، تاریخ فرشتہ

[3] ایضاً خواجہ حافظؒ بحری سفر کی صعوبتوں کے سبب دکن نہ پہنچ سکے۔ انھوں نے سلطان کے دربار میں معذرت نامہ اور ایک غزل بھیجی جس کا مطلع یہ ہے ؎

دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمے ارزد — بمی فروش دلق ما کزیں بہتر نمے ارزد

[4] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ظفر الوالہ۔ طبقاتِ اکبری۔ تاریخ فرشتہ [5] ایضاً

دلچسپی تھی۔ اُس نے ایران کے مشہور شاعر آذری کو اپنے ہاں بُلا کر اُس سے شاہ نامہ فردوسی کی طرز پر بہمنی نامہ لکھوایا تھا۔[1]

اُس نے ایران کے مشہور بزرگ حضرت نعمت اللہؒ کو بھی دعوت بھیجی تھی لیکن انھوں نے ہندوستان آنا پسند نہ کیا لیکن اپنی جگہ اپنے صاحبزادے خلیل اللہ کو بھیج دیا۔ جن کی یہاں بڑی قدر و منزلت ہوئی۔[2] بعد ازاں اس سلطنت کو وزیر محمود گاواں (۱۴۵۷-۱۴۸۱ء) جیسی قابل ہستی نے کچھ عرصہ سنبھالا تو دیا لیکن اُس کے ناحق قتل کے چند سال کے اندر اندر یہ عادل شاہی سلطنتِ بیجاپور (۱۴۸۹-۱۶۸۶ء) نظام شاہی سلطنت احمد نگر (۱۴۹۸-۱۶۳۶ء) قطب شاہی سلطنتِ گولکنڈہ (۱۵۱۸-۱۶۸۷ء) عماد شاہی سلطنتِ برار (۱۴۸۴-۱۵۷۴ء) اور برید شاہی سلطنت بیدر (۱۴۹۲ء - ۱۶۱۹ء) کی پانچ مختلف ریاستوں میں بٹ گئی اور جن کو پھر بعد میں مُغلوں نے یکے بعد دیگرے فتح کر لیا۔

اِن تمام ریاستوں کے حکمران بڑے شائستہ مزاج تھے۔ اُنھوں نے علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی میں بڑا نام پیدا کیا۔ اور بیدر اور گولکنڈہ کے بعض شہروں کو علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کے ایسے مراکز بنا دیا جو صدیوں تک قائم رہے۔ ان کے عہد کے مضبوط فوجی قلعے فنِ تعمیر کی عمدہ مثال مانے جاتے ہیں۔ ان کی مساجد، محلات، مقبروں، روضوں اور مدرسوں کی عالیشان عمارات اب بھی جس حال میں ہیں اپنے عظیم الشان ماضی کی یاد دلاتی ہیں[3] اور ان کو دیکھنے کے لیے سیاح دُور دراز کا سفر طے کر کے وہاں پہنچتے ہیں۔ دکنی فرمانرواؤں کے عہدِ حکومت میں دکنی یعنی قدیم اُردو کو بھی پھلنے پھولنے کا موقعہ ملا وہاں حضرت شاہ بُرہان الدین غریب (المتوفی ۱۳۳۷ء) حضرت سیّد محمّد گیسو دراز بندہ نواز (المتوفی ۱۴۲۲ء) شاہ بُرہان الدین جانم (المتوفی ۱۵۸۲ء) اور موخر الذکر کے بیٹے شاہ امین الدین اعلیٰ (المتوفی ۱۶۷۵ء) اور سیّد میراں حسینی شاہ (المتوفی ۱۶۶۳ء) جیسے صوفیوں نے اس زبان کی بے حد خدمات انجام دیں اور اُس میں بڑا گرانقدر ادبی سرمایہ چھوڑا۔[4]

۱؎ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ ظفر الوالہ۔ طبقات اکبری۔ تاریخ فرشتہ۔ ۲؎ ایضاً

۳؎ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ آبِ کوثر۔

۴؎ اُردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۱۹-۵۱ و ۵۷-۶۰

سلطنتِ خاندیش کی ثقافتی اہمیّت

اس سلطنت کی بُنیاد ملک راجہ فارُوقی نے ۱۳۸۸ء میں رکھی[1]۔ گو یہ سلطنت سیاسی طور پر زیادہ اہمیت کی حامل نہ تھی لیکن علمی، فنّی اور ثقافتی کارناموں کی بدولت بڑے عروج کو پہنچی وہاں کے ایک بادشاہ عادل شاہ فارُوقی (۱۴۵۷ء - ۱۵۰۱ء) نے شاہی سرپرستی میں سونے چاندی کی تاروں کا بنا ہُوا بے نظیر کپڑا اور عُمدہ سُوتی کپڑا بنوانا شروع کیا تھا جو بعد میں بھی صدیوں تک، مشہُورِ عالم رہا[2]۔ اس سلطنت کے تاجداروں نے بھی اپنے دارالحکومت برہان پور اور تھلنیر میں بڑی عظیم الشّان عمارات تعمیر کروائیں اور اُن میں سے بُرہان پور کی جامع مسجد اور بی بی کی مسجد اب تک مشہُور اور قابلِ دید ہیں۔ یہ سلطنت بھی مُغلوں نے ۱۶۰۱ء میں فتح کر لی تھی۔

سلطنتِ مالوہ کی علمی و اَدبی اور ثقافتی اہمیّت

اِس صُوبائی سلطنت کی بُنیاد دلاور خان نے (۱۴۰۱ء) میں رکھی تھی[3]۔ اس کے جانشین سُلطان ہوشنگ نے سلاطینِ گُجرات، بہمنی، دہلی، اور جونپور کے خلاف متعدد جنگیں لڑ کر اپنی حدودِ سلطنت میں توسیع کر لی تھی[4]۔ وُہ فنِ تعمیر کا بڑا دِلدادہ تھا۔ اُس نے اپنے دارالحکومت مانڈو میں بڑی عالیشان عمارات بنوائیں جن میں سے دہلی دروازہ، مسجد کلاں اور اس کا اپنا مقبرہ فنِ تعمیر کے شاہکار مانے جاتے ہیں[5]۔ اس سلطنت کے مشہُور و معروف سُلطان محمُود خلجی (۱۴۳۶-۶۹ء) نے چتوڑ کے راجہ کمبھ پر بڑی شاندار فتح حاصل کی تھی اور اس کی یاد میں اُس نے ایک سات منزلہ

---

[1] "تاریخ فرشتہ" جلد دوم ص ۵۴۱
[2] آب کوثر
[3] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو P. Brown; Indian Architecture; The Islamic Period, Bombay 1956.
[4] تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۴۶۰-۴۶۱۔ وہ یہاں کا ۱۳۹۲ء میں گورنر مقرر ہوا تھا۔
[5] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو G. Yazdani; Mandu, The City of Joy, Oxford 1929 and Raghbir Sing Malwa in Transition, Bombay 1936.
[6] Indian Architecture; The Islamic Period.

عظیم الشان مینار بھی تعمیر کروایا تھا[۱]۔ کئی اور راجپوت ریاستوں کو بھی اُس نے فتح کر لیا تھا۔ اُس کی فتوحات کی شہرت ملک سے باہر بھی جا پہنچی۔ چنانچہ ماوراءالنہر کے سلطان ابُوسعید اور خلیفۂ مصر نے اس کے دربار میں سفیر بھیجے[۲]۔ وُہ فنِ تعمیر اور فنونِ لطیفہ کا بھی بڑا دِلدادہ تھا۔ اُس نے مانڈو میں بڑی عالیشان عمارات تعمیر کروائیں۔ جن میں سے اُس کا ذاتی مقبرہ جو سنگِ مرمر کا بنا ہُوا تھا۔ مالوی فنِ تعمیر کا شاہکار مانا جاتا ہے[۳]۔ اُس نے سلطنت کے کئی مقامات پر متعدد مدرسے اور ہسپتال بھی بنوائے جن میں سے خاص طور پر مانڈو کا ہسپتال اور کالج بڑے مشہور تھے۔ اِسی ہسپتال کے افسرِ اعلیٰ اس دور کے مشہور حکیم فضل اللہ تھے[۴]۔ سلطان محمود خلجی کی آباد کی ہُوئی درسگاہوں سے ایسے باکمال اور عظیم المرتبت علماء و فضلاء اور صُلحاء پیدا ہوتے جو شیرازی عُلماء و صُلحاء کی یاد دلاتے تھے۔ سلطان محمود خلجی کا جانشین سلطان غیاث الدین (۱۴۶۹-۱۵۰۰ء) بڑی عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ خاص طور پر اس کو اپنے محل میں ہر ذوق کی عورتیں ملازم رکھنے کا بڑا شوق تھا[۵]۔ اس کی سخاوت اور انصاف کے قصّے بھی بڑے دلچسپ ہیں اور اُس کی فیاضیوں سے پرندے اور جانور تک فیض یاب ہوتے رہتے[۶]۔ فنِ تعمیر میں اُس کا جہاز محل حُسن و دلکشی کا بہترین نمُونہ تھا[۷]۔ اُس کے جانشین سلطان ناصر الدین (۱۵۰۰-۱۵۱۰ء) کو بھی خوبصورت عمارات بنوانے کا بڑا شوق تھا۔ اور اُس نے بھی اکبر پور اور ریوا کھنڈ میں بڑے عالیشان محلّات بنوائے تھے[۸]۔ اِس سلطنت کا آخری فرمانروا سُلطان محمُود ثانی (۱۵۱۰-۱۵۳۱ء) تھا جو راجپوتوں کی سازش

۱۔ Mandu, The City of Joy. P. 16

۲۔ ایضاً ۳۔ ایضاً

۴۔ du. The City of Joy and Malwa in Transition, pp. 17-19.

۵۔ تاریخ فرشتہ جلد دوم۔ ایک وقت میں اس کے ہاں پندرہ ہزار عورتیں ملازم تھیں۔ جن میں سے بعض اُستانیاں، بعض جھاڑ پھونک کرنے والی بعض ناچنے گانے والی اور بعض کشیدہ کاری کرنے والی تھیں، پانچ ہزار تُرک عورتیں ننتے کپڑوں میں ملبوس تیر و کمان اُٹھائے ہُوئے اس کی دائیں طرف اور پانچ ہزار وردیاں پہنے ہوئے اس کی بائیں طرف کھڑی رہتی تھیں۔

۶۔ Mandu, The City of Joy and Malwa in Transition

۷۔ ایضاً ۸۔ ایضاً Malwa in Transition

کا شکار ہو گیا۔ اس کے بعد اس سلطنت پر سلطان بہادر شاہ گجراتی قابض ہو گیا[1]۔ بالآخر اس سلطنت کو بھی سُوری خاندان کے گورنر باز بہادر سے شہنشاہ اکبر کے جرنیل ادہم خاں اور پیر محمد نے ۱۵۶۲ء میں فتح کر لیا تھا[2]۔

مانڈو کی عظیم الشان عمارات میں سے سلطان ہوشنگ کا مقبرہ، جامع مسجد، ہنڈولہ محل، جہاز محل اور رُوپ متی اور باز بہادر کے محلات اپنی مضبوطی اور حسن و خوبی کے لیے مشہور تھے۔ جن کی شکستہ عمارات اب دریائے نربدا کے کنارے ایک پہاڑی پر بڑا عمدہ رومانی منظر پیش کرتی ہیں[3]۔ مالوہ قرونِ وُسطیٰ میں اعلیٰ قسم کے سُوتی کپڑوں کے لیے بھی بڑا مشہور تھا۔ یہاں کی چھینٹ اور سر دنج نام کا کپڑا ایران و ترکی میں بڑا مقبول تھا اور وہاں خوب فروخت ہوتا تھا[4]۔ مالوہ پوست، افیم، گنّا، پان، کافور، انگور اور میٹھے خربوزوں کے لیے بھی مشہور تھا اور وہاں کے پھل مغلیہ عہد کے اُمراء، وُزراء اور شہنشاہوں کے شاہی دسترخوان پر بڑے شوق سے چُنے جاتے تھے[5]۔ ایک عرصہ تک مانڈو اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ شطاریوں اور مہدویوں کی تبلیغ و تحریک کا بھی مرکز رہا[6]۔

سلطنتِ گجرات کے علمی و ادبی اور ثقافتی کارنامے

اس سلطنت کی بُنیاد ظفر خاں نے (۱۴۰۱ء میں) رکھی[7]۔ اس کے بعد اس کے پوتے اور

---

[1] Mandu, The City of Joy and Malwa in Transition.

[2] [3] Indian Architecture, The Islamic Period.

[4] Malwa in Transition, pp. 5-8.

سر دنج بڑا باریک کپڑا ہوتا تھا اور عہد مغلیہ میں بڑا مقبول تھا۔ اس کو مغلیہ شاہی خاندان کے لوگ اور اُمراء موسم گرما میں بڑے شوق سے پہنتے تھے۔ یہ کپڑا بیرونی ممالک میں بھی فروخت کے لیے بھیجا جاتا تھا۔

[5] Malwa in Transition, pp. 5-8

[6] تفصیلات کے لیے اس کتاب کے ابواب نہم و دہم ملاحظہ ہوں۔

[7] تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۲۵۲

وہ یہاں ۱۳۹۱ء میں گورنر مقرر ہو کر آیا تھا۔

جانشین سلطان احمد شاہ اوّل (۱۴۱۱-۱۴۴۱ء) نے اس کی سیاسی اہمیت کو برقرار رکھا۔ اُس کے عہد کا سب سے کامیاب کارنامہ اُس کے وہ ضوابط و قوانین ہیں جو اُس نے اپنے وُزراء کے مشورے سے تشکیل دیے تھے[1]۔ احمد آباد کا شہر بھی اُسی نے بسایا اور خوبصورت عمارات سے سجایا تھا[2]۔ یہ شہر صدیوں تک ہندوستان کا ایک بے نظیر شہر مانا جاتا رہا۔ احمد شاہ کا بیٹا سلطان محمد شاہ سخاوت و فیاضی میں بے مثل تھا اور زر بخش اور لکھ بخش کے لقب سے مشہور تھا[3]۔ اسی کے پوتے سلطان محمود شاہ اوّل (۱۴۵۹-۱۵۱۱ء) المعروف محمود بیگڑہ نے جُوناگڑھ اور جاپانیر کی شاندار فتوحات حاصل کی تھیں۔ اس کے عہد میں گجرات کا علاقہ سرسبزی و شادابی کی بدولت باغ و بہار بنا ہوا تھا۔ اس کا دارالحکومت احمد آباد صنعت و حرفت کا بہت بڑا مرکز تھا[4]۔ اور اس کے عہد میں سُورت، بھروچ، مہاتم، کھمبات، دیو اور دمن بڑے آباد اور پُر رونق شہر تھے اور بڑے اہم تجارتی مرکز تھے۔ محمد آباد، مصطفےٰ آباد اور محمود آباد کے شہر بھی اُسی نے آباد کیے تھے[6]۔ وہ علماء صوفیاء کا بڑا قدردان تھا۔ ان کے لیے اُس نے مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کروائی تھیں[7]۔ ایک بار سُلطان سکندر لودھی نے بھی اُسے تحفے تحائف بھیج کر اُس کے ساتھ دوستی کا اظہار کیا اور اس موقعے پر کہا: "مدارِ بادشاہِ دہلی بر گندم و جوارست و بنیادِ بادشاہِ گجرات بر مرجان و مروارید کہ ہشتاد و چہار بندر در تختِ بادشاہ گجرات است"[8]۔

اس کا فرزند رشید سُلطان مظفر شاہ حلیم (۱۵۱۱-۱۵۲۵ء) بھی ایک عظیم المرتبت بادشاہ تھا۔ وہ حافظِ قرآن تھا اور حدیث کا بھی عالم تھا[9]۔ اس فضل و کمال کے ساتھ وہ تقویٰ اور عزیمت کی دولت سے بھی بہرہ ور تھا۔ تمام عمر نصوصِ احادیث پر عمل کرتا رہا۔ ہمیشہ باوضو رہتا اور نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتا۔

۱۔ یادِ ایام (مولانا سید عبدالحیٔ) ص ۱۴

۲۔ ایضاً ص ۱۴ ۳۔ ایضاً ص ۱۴-۱۵ ۴۔ ایضاً ص ۱۵-۱۶ ۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً ۷۔ ایضاً ۸۔ مرآۃ سکندری از مرزا اسکندر بن محمد اکبر گجراتی۔

۹۔ یادِ ایام ص ۱۶-۱۷

اُس نے روزے بھی تمام عُمر رکھے۔ بڑا خلیق و حلیم تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ حکمرانی کے اعلیٰ اوصاف سے بھی آراستہ تھا۔[1] اس کے عظیم فرزند بہادر شاہ (۱۵۲۶-۱۵۳۷ء) نے دکنی شاہوں کے جھنڈے سرنگوں کیے اور اس کے نام کا خطبہ نظام شاہ نے احمد نگر میں عماد شاہ نے برار میں اور محمد شاہ نے برہان پور میں پڑھوایا تھا۔[2] اُس نے سلطنتِ مالوہ کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کیا تھا۔ اُسی نے چتوڑ اور رنتھنبور کے فلک فرسا قلعے بھی فتح کیے اور بیانہ کا قلعہ بھی زیر کیا تھا۔ ان فتوحات کے بعد دہلی اور آگرہ کا نمبر آیا تو شہنشاہ ہمایوں کے مقابلہ میں اس کو اپنے محترم جرنیل رُومی خاں کی سازش کی وجہ سے شکست ہوئی اور بعد ازاں ۱۵۳۷ء میں پرتگیزوں کی غدّاری سے قتل ہو گیا۔[3]

اس کا بھتیجا سُلطان محمود شاہ ثانی (۱۵۳۷-۱۵۵۴ء) عُلماء و صُوفیا کا قدر دان تھا۔ اُس کا یہ معمول تھا کہ دعوتوں میں عُلماء و صُوفیا کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں آفتابہ لے کر دُھلواتا۔[4] اس نے مکّہ معظّمہ میں باب العُمرہ کے مُتصل ایک عظیم الشّان مدرسہ بنوایا تھا، جہاں علامہ شہاب الدّین ابن حجر مکّی اور عزّالدّین عبدالعزیز زمزمی جیسے علماء درس و تدریس کا فریضہ ادا کرتے تھے۔[5] علاوہ ازیں اُس نے مکّہ معظّمہ میں کئی رباط اور مکتب بھی تعمیر کروائے تھے۔[6] اس نے کھمبات کی ایک بندرگاہ کی تمام آمدنی محض حرمین شریفین کے رہنے والوں کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اسی بندرگاہ سے ایک لاکھ اشرفیوں کی قیمت کا مال جدّہ بھیجا جاتا تھا۔ اُس کے بھیجنے پر جو خرچ ہوتا وُہ شاہی خزانہ سے ادا کیا جاتا۔ اِس مال کی قیمتِ فروخت اور تمام آمدنی اہلِ حرمین کے لیے وقف تھی۔[7] لیکن یہ عظیم الشّان بادشاہ بعض نمک حراموں کی غدّاری سے قتل کر دیا گیا۔ اس کی شہادت کے بعد یہ سلطنت بازیچۂ اطفال بن گئی اور پھر اس پر

---

۱ یادِ ایام ص ۱۷ ۲ ایضاً ۳ ایضاً
۴ ایضاً ص ۱۸ ۵ ، ۶ ایضاً ۷ ظفر الوالہ۔ یادِ ایام ص ۱۸

شہنشاہ اکبر (۱۵۷۲ - ۱۵۷۳ء) نے قبضہ کر لیا۔

سلاطینِ گجرات نے علوم و فنون کی سرپرستی بے حد ذوق و شوق کے ساتھ کی۔ انھوں نے گجرات کو ہر طرح کی صنعت و حرفت کا مرکز بنا دیا۔ وہاں صدہا کارخانے موجود تھے۔ احمد آباد میں سینکڑوں طرح کی بیش قیمت اور نادر اشیا بنتی تھیں۔ سنگ تراشی، زردوزی، کارِ چوب اور چینی، صندل اور ہاتھی دانت کے کام اور کپڑوں کی صنعت میں زربفت، کمخواب، مخمل، سقرلاط، الاچہ، چکن اور چیرہ وہاں کی ایسی نایاب مصنوعات تھیں جو سارے ہندوستان میں مشہور تھیں اور بڑی اونچی قیمتوں سے فروخت ہوتی تھیں[۱]۔ احمد آباد میں کاغذ بھی بڑا عمدہ تیار ہوتا تھا جو نفاست و صفائی میں دولت آباد اور کشمیر کے کاغذ سے بہت بہتر ہوتا تھا[۲]۔ احمد آباد کے نوادر عہدِ مغلیہ تک مشہور تھے۔ شاہ جہان اپنے ایامِ شہزادگی میں جب گجرات کا گورنر مقرر ہوا تو یہاں کی مصنوعات سے متاثر ہو کر اس نے احمد آباد میں ایک شاہی کارخانہ قائم کیا تھا[۳]۔ گجرات کو اورنگ زیب جیسے دقیقہ رس اور نکتہ سنج فرمانروا نے بھی "زیب و زینتِ ہندوستان" قرار دیا تھا[۴]۔ مرزا امین بن رازی نے ہفت اقلیم میں احمد آباد کے متعلق لکھا ہے کہ "بحیثیت لطافت و کیفیت آبادانی و شہریت بر تمام ولایتِ ہند رجحان دارد[۵]۔"

۱؎ مرآۃ احمدی از مرزا علی محمد بن محمد علی گجراتی۔ یادِ ایام ص ۲۵۔ ۲؎ یادِ ایام ایضاً

۳؎ مآثر الامرا۔ از صمصام الدولہ نواب عبدالرزاق خان خوافی۔ وزیر دولت آصفیہ دکن۔ مرآۃ احمدی۔ یادِ ایام ص ۲۵ - ۲۸۔ اس کارخانہ سے اس نے اپنے والدِ بزرگوار کو نذرانہ پیش کرنے کے لیے ایک تختِ مرصع دس لاکھ روپیہ کی تیاری کا اور ایک شمشیر کا پرتلہ دو لاکھ کی تیاری کا بنوایا تھا۔ دہلی میں قلعہ معلّیٰ اور تختِ طاؤس کے تیار ہونے پر جو دربار (۱۰۴۸ھ میں) منعقد ہوا تھا، اس کے لیے زربفت کا شامیانہ ایک لاکھ روپیہ کی تیاری کا اسی کارخانہ میں تیار ہوا تھا اور اس کے مخملی سائبان اور طلائی اور نقرئی ستونوں کے نقش و نگار بھی احمد آباد ہی کے کاریگروں کی ہنرمندی کا کمال تھے۔ سنگ پٹھانی کا چونہ جو چھتوں اور دیوار پر لگایا جاتا تھا اس کو گجرات کے کاریگر اس طرح رگڑتے تھے کہ آئینہ کی طرح چمکنے لگتا تھا اور اس میں صورت نظر آنے لگتی تھی۔ شاہجہان نے لال قلعہ میں اسی چونہ کی استرکاری کرائی تھی جو سینکڑوں سال گزر جانے کے بعد اب بھی دیکھنے والوں کے واسطے آئینۂ حیرت ہے۔ ۴؎ یادِ ایام ص ۲۹ ۵؎ ہفت اقلیم (قلمی)

شاہانِ گجرات بڑے عمدہ اور نفیس ذوق کے مالک تھے۔ انھوں نے سلطنت کے تمام شہروں میں عظیم الشان مساجد اور عمارات بنوائیں۔ کہا جاتا ہے کہ صرف احمد آباد میں ایک ہزار کے قریب مساجد تھیں۔ جن میں سے مسجد احمد شاہ، مسجدِ ہیبت خان، مسجد سید عالم اور جامع مسجد ہندوپاکستان کے فنِ تعمیر کے شاہکار مانے جاتے ہیں۔ احمد آباد کی تین دروازہ کی عمارت بلندی اور پختگی میں آج بھی بے نظیر ہے۔ وہاں احمد شاہ کا مقبرہ اور رانی کا حجرہ نام کی عمارت بھی قابلِ دید ہے۔ بعض گجراتی عمارات پر مسلم ممالک کی فنی روایات اور خاص طور پر ایرانی اثرات بلغایت درجہ نظر آتے ہیں۔ یہ اثرات احمد آباد میں دریا خاں کے مقبرے اور دھولکا میں الف خاں کی مسجد میں بدرجۂ اتم ملتے ہیں۔ اسی طرح محمود آباد اور مصطفیٰ آباد کی عالیشان مساجد و عمارات کا طرزِ تعمیر جودھپور، جلور اور ناگور کی مساجد و عمارات پر بھی کسی طرح اثر انداز ہوا ہے[1]۔

شاہانِ گجرات نے اپنے ڈیڑھ سو سالہ دورِ حکومت میں جس قدر علوم و فنون کی سرپرستی کی اس کی نظیر دہلی کی چھ سو سالہ تاریخ بھی پیش نہیں کر سکتی۔ جونپور کی طرح وہاں دہلی اور شمالی ہند کے علاوہ بلادِ اسلامیہ سے بے شمار علماء، فضلاء اور صلحاء پہنچے تھے اور خود گجرات میں بھی ایسے ذی مرتبت علماء پیدا ہوئے جن کے فیوضِ علمی سے اب تک ہندوپاکستان کی درسگاہیں سیراب ہو رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گجرات اگر جونپور کی طرح علوم و فنونِ عقلیہ کے اعتبار سے "شیرازِ ہند" تھا تو حدیث شریف کی خدمات کے لحاظ سے یمن میمون سے مماثلت رکھتا تھا[2]۔

---

[1] Indian Architecture; The Islamic period, p. 51-54.

[2] یادِ ایام ۳۳-۳۴۔ گجرات کے علماء و مشائخ کی خدمات کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ملاحظہ کیجیے۔ شیخ عبدالقادر حضرمی کی النور السافر، ابوبکر شلی کی المشرع الروی، محمد بن عمر آصفی کی ظفر الوالہ اور مولانا عبدالحئی کی العوارف، جنۃ المشرق اور نزہۃ الخواطر۔

شرقی سلطنت جونپور کی سیاسی، علمی و ادبی اور مذہبی و ثقافتی اہمیت

اس سلطنت کی بنیاد سلطان الشرق ملک سرور نے ۱۳۹۴ء میں رکھی مگر اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان دہلی پر حملۂ تیمور کے بعد کیا[1]۔ یہ سلطنت شمالی ہندوستان کے زرخیز ترین علاقہ میں پھیلی پھولی۔ اس کی سرحدیں ایک طرف کول (علی گڈھ) سے لے کر بنگال تک اور دوسری طرف دامن کوہ ہمالیہ سے لے کر مالوہ تک پھیلی ہوتی تھیں۔ شمالی و جنوبی بہار کے علاوہ بندھیل کھنڈ اور روہیل کھنڈ کے علاقے بھی اس میں شامل تھے۔ اڑیسہ، لکھنوتی، کالپی[2] (محمود آباد) ترہت[3]، اور قنوج کے حکمران اس کے باجگذار تھے[4]۔ اس طرح اس سلطنت کے مختلف علاقوں کے لوگ مختلف سیاسی اور ثقافتی روایات کے حامل تھے۔ اس بنا پر یہاں کے حکمرانوں کو گوناں گوں مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور یہ مدت العمر مختلف حکمرانوں اور ہمسایہ سلطنتوں کا نشانہ بنی رہی۔ شرقی فرمانرواؤں نے اپنی سلطنت کی حفاظت اور رعایا کے امن و امان کے لیے تمام پرانے قلعوں کی از سر نو مرمت و تعمیر کروایا اور بعض مقامات پر نئے قلعے بھی بنوائے۔ صرف سلطان ابراہیم شاہ شرقی (۱۴۰۱۔ ۱۴۴۰ء) کے عہد حکومت میں ضلع رائے بریلی میں تعمیر ہونے والے پانچ قلعے یعنی قلعہ رائے بریلی، قلعہ ڈلمؤ[5]، نگھلنڈی کا قلعہ، موضع ہردوئی کا قلعہ اور نصیر آباد کا قلعہ اس حقیقت کا ثبوت پیش کرتے ہیں[6] کہ شرقیوں کی وسیع سلطنت کے دوسرے حصوں میں بھی اسی طرح بے شمار قلعے ہوں گے۔ ان قلعوں میں باقاعدہ اعلیٰ تربیت یافتہ فوج ہر وقت تیار رہتی تھی اور ان میں

---

۱ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۵۶۔۱۵۷

۲ شہر کالپی (محمود آباد) ضلع و شہر جبالون (یو پی) سے ۲۲ میل کے فاصلہ پر دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے۔ پرانے زمانے میں ریاست کالپی میں یو پی کے موجودہ ضلع کانپور کے کئی پرگنا جات شامل ہوتے تھے

(جاری ہے)

ترہٹ انتنی مکانات، حمام، باؤلیاں، مساجد اور کنوئیں بھی بنائے گئے تھے تاکہ فوج اور فوجی عملہ کو ہر طرح کی سہولتیں میسر ہوں۔ اِس سلطنت کو چونکہ مالوہ، اڑیسہ اور دہلی کے حکمران چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے، اِسی لیے شرقی سلطنت نے اپنے تحفظ کے لیے ایک لاکھ ستر ہزار گھڑ سوار، چودہ سو ہاتھی اور اسی قدر پیادہ فوج تیار کر رکھی تھی[۲] اور واقعہ یہ ہے کہ اس قدر فوج ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ میں کسی اور حکمران کے پاس موجود نہ تھی۔ یہ فوج ایک صدی تک شرقی سلطنت کی حفاظت کے لیے برسرِ پیکار رہی تھی۔

سلطنتِ شرقی کے چھ حکمران ہوئے ہیں۔ سلطان الشرق ملک سرور (۱۳۹۴-۱۳۹۹ء) اُس کا متبنّٰی اور جانشین سلطان مبارک شاہ شرقی (۱۳۹۹-۱۴۰۱ء)، متوخرالذکر کا چھوٹا بھائی سلطان ابراہیم شاہ شرقی (۱۴۰۱-۱۴۴۰ء)، اس کا بیٹا سلطان محمود شاہ شرقی (۱۴۴۰-۱۴۵۷ء) اور متوخرالذکر کے دو بیٹے سلطان محمّد شاہ شرقی (۱۴۵۷-۱۴۵۸ء) اور سلطان حسین شاہ شرقی (۱۴۵۸-۱۵۰۵ء)۔ ان میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی، سلطان محمود شاہ شرقی اور سلطان حسین شاہ شرقی نے تقریباً چورانوے[۹۴] سال حکومت کی اور اسی دوران میں یہ سلطنت اپنے سیاسی علمی و ادبی اور مذہبی و ثقافتی کارناموں کے لحاظ سے انتہائی عروج کو پہنچی۔

جونپور شہر کی بنیادیں گو سلطان فیروز شاہ تغلق نے رکھیں[۳] لیکن اس کو صحیح معنوں میں

---

[۱] ترہٹ۔ پرانے زمانے میں ترہٹ میں بہار کے موجودہ ضلع دربھنگہ ضلع مظفر پور اور ضلع چمپارن کے علاقے اور ریاست نیپال کا جنوبی علاقہ بھی شامل تھا۔

[۲] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب

The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History, p. 112-130.

[۳] دالمو (دالائمو) ضلع رائے بریلی کی ایک تحصیل کا صدر مقام ہے اور دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے

A. Fuhrer; The Monumental Antiquities and Inscriptions in the N. W. Provinces and Oudh, Vol. II, Allahabad 1891. pp. 39-24.

[۴] ایضاً

[۵] طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۰۱-۳۰۲-۳۰۳۔ تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۳۲۱-۳۲۲، جلد دوم ۵۹۸-۵۹۹۔

[۶] تاریخ فیروز شاہی (عفیف) ص ۱۴۸-۱۴۹۔ جونپور نامہ ص ۷-۸

سلطان الشرق نے ہی آباد کیا تھا۔ یہاں اُس نے قلعہ، مسجد، محل، بازار اور دُوسری بہت سی عمارتیں تعمیر کروائیں، شہر کو ہر طرح سے رونق بخشی[1] اور اسے دارالسرور کا نام دیا۔ اس نے بہت سے عُلماء و فُضلاء اور صُوفیاء کو بھی یہاں مدعو کیا اور انھیں ہر طرح کی سہولتیں مہیا کر کے سلطنت کے مختلف حصّوں میں آباد کیا۔ اس نے اپنی رعایا کی فلاح و بہبُود کے لیے بھی بڑے کام کیے[2]۔ اس کے عہدِ حکومت میں تمام سلطنت میں امن و امان تھا اور رعایا خوشحال تھی[3]۔ اس کے بعد اس کا متبنّیٰ[4] سُلطان مبارک شاہ شرقی تخت نشین ہُوا مگر اس کا سارا وقت اِس نوزائیدہ سلطنت کی حفاظت ہی میں گُزر گیا۔

سُلطان ابراھیم شرقی (۱۴۰۱۔۱۴۴۰ع) کا چالیس سالہ عہدِ حکومت سلطنت شرقی کا سُنہری زمانہ تھا۔ اُس نے نہ صرف تحفّظِ سلطنت بلکہ تحفّظِ اسلام کے لیے بھی دھلی، مالوہ اور بنگال کے حکمرانوں کے خلاف متعدّد جنگیں لڑیں[5]۔ کالپی اور ترہت کے حکمرانوں کو مطیع و باجگذار بنایا اور اپنے عہدِ حکومت میں تمام سلطنت میں امن و امان قائم رکھا[6]۔ وُہ اپنے ہندو باجگذاروں کی حفاظت کے لیے مُسلمانوں کے خلاف بھی لڑا۔ فی الحقیقت اس نے ہر مذہب و ملّت والوں کے دِلوں پر حکومت کی۔ اُس کے رفاہِ عامہ کے کاموں اور فوجی نظام کی مثال اِس برّصغیر کے دورِ متوسط کی تاریخ میں بھی نہیں ملتی[7]۔

اُس نے شہر جونپور کی مزید توسیع کی اور اس کو نئے بازاروں، عالیشان محلّات، روضوں اور مقبروں سے سجایا[8]۔ پُرانے شہروں کی از سرِ نو مرمّت کرائی اور ان میں بھی عظیم الشّان عمارات تعمیر کرائیں اور ابراھیم آباد جیسے نئے نئے شہر بھی آباد کیے[8]۔ اِس کے علمی و اَدبی اور ثقافتی

---

[1] تاریخ فیروز شاھی (عفیف) ص ۳۶

[2] تفصیلات آئندہ صفحات پر ملاحظہ ہوں

[3] تاریخ محمدی (قلمی) ورق ۲۷۰ ا

[4] مزید تفصیلات کے لیے اِسی کتاب کا باب چہارم ملاحظہ ہو [5] ایضاً [6] ایضاً

[7] جونپور نامہ
The Sharqi Architecture of Jaunpur, Vol. I.

[8] مرآۃ الاسرار (قلمی)، جونپور نامہ، تجلّی نُور، جلد اوّل و دوم

کارناموں کی شہرت اِسی ملک میں نہیں بلکہ عالمِ اسلام کے بھی گوشے گوشے میں پہنچی اور یہاں ہزاروں علماء، فضلاء اور صوفیاء کھنچے چلے آتے اور دارالحکومت جونپور اور سلطنت کے مختلف شہروں و قصبوں میں آکر آباد ہوتے۔ سلطان نے ان علماء وصوفیاء کو درس و تدریس اور وعظ و تلقین کے لیے مدارس اور خانقاہیں بنوا کر دیں اور ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں[1]۔ جو نامور علماء اس کے عہد میں جونپور پہنچے ان میں سے ایک ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ تھے۔ جن کی علمی فضیلت و شہرت نہ صرف اس ملک میں تھی بلکہ سارے عالمِ اسلام میں پھیلی ہوئی تھی۔ سلطان ابراہیم اُن کی بے حد قدر و منزلت کرتا اور اپنے پاس چاندی کی کرسی پر بٹھاتا[2]۔ قاضی صاحب موصوف کی لکھی ہوئی کتابیں صدیوں تک اس ملک کے نصاب میں شامل رہیں اور اُن کے افکار و نظریات سے مسلمانوں کے بہترین دماغ متاثر ہوتے۔ سلطان ابراہیم کے عہد میں جو بزرگانِ دین یہاں پہنچے اُن میں سے بعض نے نئے نئے رُوحانی سلاسل کا اجرا کیا۔ اور جونپور اور اُس کے گرد و نواح میں نئی نئی مذہبی تحریکیں منصۂ شہود پر آئیں۔ حضرت شیخ احمد عبدالحقؒ نے ردولی میں صابریہ سلسلہ کو رواج دیا[3]۔ حضرت شیخ بدیع الدین شاہ مدارؒ شام و عرب سے یہاں پہنچے اور اُنھوں نے مکن پور میں مداریہ سلسلہ کا اجراء کیا[4]۔ حضرت قطب الدین بینائے دل قلندرؒ نے جونپور میں قلندریہ سلسلہ کی داغ بیل ڈالی[5] اور حضرت شاہ عبداللہ شطاریؒ ایران سے یہاں پہنچے اور اُنھوں نے شطاریہ سلسلہ کو جونپور میں رواج دیا[6]۔ علاوہ ازیں سہروردیہ اور چشتیہ سلسلے کے سیکڑوں صوفیاء بھی جونپور اور سلطنت کے دُوسرے شہروں اور قصبوں میں آکر آباد ہوتے اور اُنھوں نے اپنے اپنے سلسلہ کی اِشاعت کے لیے بڑا کام کیا[7]۔

---

[1] اخبار الاخیار، مرآۃ الاسرار (قلمی) تجلی نور، جلد اوّل و دوم۔ مزید تفصیلات کے لیے اسی کتاب کا حصّہ دوم و سوم ملاحظہ ہو۔ [2] تجلی نور، جلد دوم ص ۳۲-۳۶۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۸۸-۸۹ [3] اخبار الاخیار ص ۱۸۲
[4] ایضاً ص ۱۶۰ [5] تجلی نور، جلد اوّل ص ۶۳-۶۴
[6] اخبار الاخیار ص ۱۷۱
[7] مزید تفصیلات کے لیے اس کتاب کا حصّہ سوم و چہارم ملاحظہ ہو۔

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے بیٹے اور جانشین سلطان محمود شاہ شرقی (۱۴۴۰-۱۴۵۷ء) نے بھی اپنے عظیم المرتبت والد کی روایات کو بڑی اچھی طرح جاری رکھا اور اُس کے عہدِ سلطنت میں بھی یہاں سینکڑوں علماء وصوفیاء آتے۔ وہ بھی بڑا مذہب پرست بادشاہ تھا اور اُس نے بھی اشاعتِ اسلام کے لیے علماء وصوفیاء کو مساجد، مدرسے اور خانقاہیں بنوا کر دیں اور اُن کو ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں[1]۔ خاص طور پر بہار میں اُس نے اشاعتِ اسلام کے لیے مساجد اور اسلامی ادارے قائم کیے[2] وہ مسلمانوں کی حفاظت و اصلاحِ دین کے لیے بھی مالوہ، اڑیسہ، بنگال اور کالپی کے حکمرانوں سے برسرِ پیکار رہا[3]۔ اس کو تعلیمِ بالغاں کی اہمیت کا بے حد احساس تھا۔ اس غرض سے اس نے جونپور میں ایک عالیشان کالج بنوایا۔ جس میں بڑے قابل اساتذہ کا تقرر کیا۔ اس کالج میں ملک کے دوسرے حصوں سے بھی طلباء تعلیم و تدریس کے لیے پہنچتے اور اُن کو وہ ہر طرح کی سہولتیں اور وظائف مہیا کرتا[4]۔

سلطان محمود شاہ شرقی کی ملکہ بی بی راجی بھی اس کی طرح مذہب و ثقافت کی بڑی پرستار تھی۔ اُس نے بھی شہر جونپور میں عالیشان محلات، عظیم الشان مساجد، مدارس اور خانقاہیں تعمیر کروائیں۔ سلطنت کے مختلف مقامات پر بھی مساجد، پل، مہمان خانے اور نماز گاہیں اُس نے بنوائیں اور بعض علماء وصوفیاء کے مقبرے اور روضے بھی تعمیر کروائے[5]۔ ملکہ کو تعلیمِ نسواں کی ضرورت کا بڑا احساس اور پاس رہا اور جونپور شہر میں اس نے تعلیمِ نسواں کے لیے ایک کالج بھی بنوایا[6]۔ خواتین کے لیے اُس نے لال دروازہ مسجد کی دوسری منزل پر زنانہ

---

[1] تفصیلات کے لیے اس کتاب کے حصہ اوّل کا باب چہارم ملاحظہ ہو۔

[2] R.R. Diwakar; Bihar Through The Ages, Calcutta 1959, p.94.

[3] طبقاتِ اکبری جلد س ص ۲۷۹-۲۸۲۔ مطلع السعدین جلد دوم ص ۷۸۲-۷۸۳

[4] جونپور نامہ ص ۵۲-۵۳ [5] سلاطینِ جونپور (قلمی) جونپور نامہ ص ۵۲-۷۶

[6] مسلم خواتین کی تعلیم ص ۳۶

گیلریاں تعمیر کروائیں تاکہ وہاں وہ باپردہ بیٹھ کر درس و وعظ سن سکیں اور عبادت و ریاضت کر سکیں[1]۔ فی الحقیقت تعلیمِ بالغاں اور تعلیمِ نسواں کے لیے جس قدر کام سلطان محمود شاہ شرقی اور ان کی قابلِ احترام ملکہ بی بی راجی نے عہدِ شرقی میں کیے ان کی دوسری مثال ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ میں بھی کم ہی ملتی ہے۔

سلطان محمود شاہ شرقی کی وفات کے بعد (۱۴۵۷ء) اس کا بیٹا سلطان محمد شاہ شرقی تخت نشین ہوا۔ اس نے صرف پانچ ماہ حکومت کی اور اس کا یہ تمام وقت اپنے بھائیوں کے ساتھ خانہ جنگی میں گزرا[2]۔ اس کی وفات کے بعد سلطان حسین شاہ شرقی ۱۴۵۸ء میں اس سلطنت کا وارث ہوا[3]۔ اگرچہ وہ تمام عمر سلطنت کی حفاظت و توسیع کے لیے لودھیوں کے خلاف جنگ و جدل کرتا رہا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے بزرگوں کی روایات کو بھی بڑی کامیابی سے برقرار رکھا اور خاص طور پر فنونِ لطیفہ کی دنیا میں اس نے بڑا نام پیدا کیا۔ سلطنت کے بعض پرانے شہروں کو اس نے از سرِ نو مرمت و تعمیر کروایا اور اپنے نام کے نئے شہر (مثلاً حسین آباد) بھی بسائے[4]۔ اس نے بھی شہر جونپور میں عالیشان مساجد، محلات، عید گاہ اور دوسری عمارات بنوائیں اور اسی طرح سلطنت کے دوسرے شہروں اور قصبوں میں بھی مساجد اور عمارات تعمیر کروائیں[5]۔ جونپور شہر کی جامع مسجد (جامع الشرق)، شرقی فنِ تعمیر کا ایک شاہکار، اس کی حسین یادگار ہے جس میں اس نے عورتوں کی عبادت و ریاضت کے لیے زنانہ گیلریاں بھی بنوائیں[6]۔ اس مسجد سے ملحق اس نے طلباء اور شائقینِ علم و فن کی خاطر حجرے، ایک کالج اور اس کے ساتھ رہائشی کمرے بھی

---

[1] جونپور نامہ ص ۵۲-۵۳ The Sharqi Architecture of jaunpur Vol. I, pp. 44-46.

[2] طبقاتِ اکبری، جلد اوّل، ص ۳۰۵-۳۰۶۔

[3] Shamsud Din Ahmad; Catalogue of the Indian Coins in The Indian Museum, Delhi 1939, p. 207.

[4] D.G. Azam Garh, p. 159 یہ شہر حسین آباد صرف ایک گاؤں کی صورت میں پرگنہ خرید، تحصیل بانسڈیہ، ضلع بالیہ میں واقع ہے۔

[5] جونپور نامہ ص ۴۵-۴۹ و ۵۵-۵۶

[6] ایضاً ص ۴۵-۴۹

The Sharqi Architecture of jaunpur Vol. I, pp. 49-50.

بنوائے تاکہ اُن کو ہر طرح کی سہولتیں میسّر ہوں[1]۔ وُہ اپنے باپ دادا کی طرح علماء و صُوفیاء کا بھی بڑا گرویدہ تھا۔ خاص طور پر سیّد محمد جونپوری کے درس میں بڑے شوق سے شامل ہوتا۔ عُلماء کو علمی و دینی کاموں کے لیے تمام سہولتیں مہیّا کرتا اور اُن کو اعلیٰ تصنیفات پر انعام و اکرام بھی دِیا کرتا تھا[2]۔

سلطان حسین شرقی نے فی الواقع اپنی ہندو رعایا کے دِلوں پر بھی حکومت کی اور وُہ اس کی سلطنت کی حفاظت کے لیے لودھیوں کے خلاف آخری دم تک لڑتے رہے۔ ہندوؤں کو اُس نے اپنے عہد میں پُوری مذہبی آزادی دی اور بھگت کبیر اور اس کی بھگتی تحریک اُسی کے عہد میں جونپور کے گِرد و نواح میں پروان چڑھی[3]۔ بھگت کبیر اور اُس کے رفقاء نے اِس علاقہ میں ایسی وسیع الخیالی کی فضا پیدا کر دی کہ اُس سے متاثر ہو کر اِس نے بھی ستیا پیر تحریک چلانے کا ارادہ کیا تاکہ مُسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحادِ فکر و عمل پیدا ہو سکے[4]۔ اس کے عہد میں ہندی ادب کو بھی بڑی ترقی ہُوئی۔ بھگت کبیر اور اُس کے چیلوں کے علاوہ مسلمان عُلماء، اُدباء، شعراء اور صُوفیاء نے بھی اس کی ترویج و ترقی کے لیے بڑا کام کیا۔ ان میں سے شیخ منجھن اور اس کے درباری شاعر شیخ قطبن کے نام خاص طور پر قابِل ذکر ہیں[5]۔

سلطان حسین کے عہد میں فنِ مصوّری اور خاص طور پر فنِ موسیقی کو بڑا فروغ حاصل ہُوا۔ ہُوا۔ وُہ خود اعلیٰ درجہ کا مُصوّر تھا اور اس فن میں اُس کی ایک حسین یادگار ایک جین کلپ سوترا ہے[6]۔ لیکن موسیقی کی دُنیا میں جو کمال و شہرت اس کو حاصل ہوئی وُہ ابدی ہے۔ اس نے اس فن کو اِس قدر ترقی دی کہ ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ میں اس کی دُوسری مثال کہیں نہیں ملتی۔

---

[1] جونپور نامہ ص ۴۵-۴۹ [2] تجلّیِ نور، جلد اوّل ص ۵۸؛ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۸

[3] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو حصّہ اوّل کا باب ششم [4] اوراقِ مصوّر ص ۴۷

[5] مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ اوّل کا باب اوّل و دوم [6] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو

Moti Chandra; Jain Miniature Paintings from Western India, Allahabad 1949, pp. 37-38.

وُہ بہت بڑا نائک تھا اور گندھرو کے لقب سے سرفراز تھا۔[۱] اُس نے کئی شیام، ٹوڑیاں اور راگ بھی ایجاد کیے اور خاص طور پر راگ خیال اس کی ایک ایسی عمدہ یادگار ہے جو اب تک سارے ہند و پاک میں مقبول ہے۔[۲] سلطان حسین کے فنِ موسیقی کی ایجادات و کمالات کا اثر اس کے ہندو معاصرین پر بھی پڑا۔ جن میں راجہ مان سنگھ گوالیاری صاحب تصنیف مان کوتوحل، عید سنگھ راجہ گوڑ، اور رام شاہ راجہ کھرک پور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔[۳] سلطان حسین کے اپنے گویوں میں سے راما پنڈت، رسُول خاں اور بہول بڑے اعلیٰ پایہ کے موسیقار تھے۔[۴] اس عہد کے جونپور کے دُوسرے نامور مُغنّی منجھو قوّال اور عبدالرحمٰن مغل تھے۔[۵] سلطان سکندر لودھی بھی اس کے بعض راگوں کا بڑا دِلدادہ تھا اور رات کو سونے سے پیشتر ان کو بڑے شوق سے سُنا کرتا تھا۔[۶] فی الحقیقت سُلطان حسین شاہ شرقی حضرت امیر خسرو دہلویؒ کے بعد ہند و پاک کا بہت بڑا موسیقار تھا اور موسیقی کی جن روایات کو اُس نے وجود بخشا وُہ اس کے بعد بھی صدیوں تک قائم رہیں — اِن روایات کو عہدِ مغلیہ میں اور خاص طور پر عہدِ اکبری میں بڑا فروغ حاصل ہُوا اور بعد میں نوّابانِ اودھ نے ان کو جاری رکھا —— آج یہ بات پُورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ سلطنتِ شرقی کے تاجداروں نے اِس عہد میں ہندوستان کی دونوں ہندو مُسلم تہذیبوں کی پُوری طرح نگہبانی کی اور اس اعتبار سے جو ہمہ گیری اور تنوّع شرقی سلطنت کو حاصل ہُوا وُہ ہندوستان کی دُوسری صُوبائی سلطنتوں کو نصیب نہ ہُوا۔

---

۱ A Halim; J.A.S.P. Vol. I. No. I, May 1957, pp. 59-60.

مرآۃ آفتاب نما (قلمی) ورق ۲۷۰

۲ ایضاً راگ درپن (قلمی) ورق ۱۲-۱۱ - سرمایۂ عشرت (قلمی)

A. Halim; I.C XIX No. 4. January 1945, p. 355. خلاصۃ العیش (قلمی)

A. Halim, J.A.S.P. Vol. I, No. 1, 1956, pp. 60-61.

۳ سرمایۂ عشرت (قلمی) و خلاصۃ العیش (قلمی) ۴ ایضاً ۵ تاریخ بدایونی۔ سرمایۂ عشرت (قلمی) دربارِ اکبری ص ۱۲۵ ۶

شرقی مساجد اور عمارات بھی نہ صرف اپنے دور کی دہلی اور دوسری صوبائی عمارات کے مقابلہ میں زیادہ حسین و دلکش تھیں بلکہ اپنی رنگارنگی اور پختگی کے اعتبار سے فنِ تعمیر کا شاہکار مانی جاتی تھیں۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ شرقی سلاطین کا فنونِ لطیفہ کا ذوق بہت عمدہ تھا اور دوسرے انھوں نے دہلی کے معماروں اور فنکاروں کے علاوہ مقامی جین اور ہندو معماروں اور فن کاروں کی مقامی روایات اور کمالِ فن کا پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ شرقی عمارات میں مسجد اٹالہ دیوی، مسجد جھنجری، مسجد خالص مخلص، مسجد لال دروازہ اور مسجد جامع الشرق خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ فنِ تعمیر کے شائقین اور سیاح آج بھی دور دور سے ان کو دیکھنے کے لیے جونپور پہنچتے ہیں۔ ان مساجد کے بلند دروازے مصری معابد کے بلند دروازوں کی یاد دلاتے ہیں، شرقی فنِ تعمیر سے مغلیہ عمارات بھی متاثر ہوئیں اور یہ اثر خاص طور پر فتح پور سیکری کے بلند دروازہ میں بدرجہ اتم نظر آتا ہے۔ اکبری دور کی دوسری عمارات کے علاوہ متھرا کا گوبند دیو مندر، بنارس کی اڑھائی کنگورا مسجد، اٹاوہ کی جامع مسجد، اور قنوج کی جامع مسجد پر بھی شرقی فنِ تعمیر کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔[ا]

شرقی عہد کے علماء و مشائخ نے خاص طور پر ظفر آباد، جونپور، کچھوچھہ، سرائے میر، راجگیر، پلاون، مکن پور، جھنجانہ، ردولی، کنتور، فتح پور، انچولی، ایرچ، لکھنؤ، کالپی، مانکپور اور بہرائچ وغیرہ جیسے شہروں اور قصبوں میں خاص طور پر تعلیم و تدریس اور وعظ و تلقین کے لیے مدرسے اور خانقاہیں قائم کی تھیں۔ پوری قلمرو میں مدرسوں اور خانقاہوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا لیکن سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہد میں صرف جونپور میں ان مدرسوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد تھی۔[۲] ان شرقی مدرسوں میں علمِ تفسیر، فقہ، حدیث، اصول، کلام اور دوسرے

ا John Terry; The Charm of Islamic Architecture London, 1955, p. 13.

John Terry; Indian Architecture, The Islamic Period, p. 47.

۲ سلاطین جونپور قلمی

تمام مشرقی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی اور ان علوم کی تدریس کے لیے اعلیٰ قابلیت کے اُستاد مُقرر کیے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سُلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہد میں ایک وقت میں نو سو چوراسی ۹۸۴ علماء کی پالکیاں نماز جُمعہ و عیدین کے لیے نکلتی تھیں بلکہ بعض مؤرخین نے تو ان پالکیوں کی تعداد چودہ سو لکھی ہے[1]۔ ان مدرسوں میں ہندوستان کے علاوہ ایران و عرب تک کے طلباء بھی اکتساب علم کے واسطے جمع ہوتے تھے۔ ان طلبہ کو وظائف کے علاوہ پوشش خوراک اور کتابوں وغیرہ کی تمام سہولتیں بہم پہنچائی جاتی تھیں۔ ان شرقی مدرسوں اور خانقاہوں سے صدیوں تک علم و اَدب اور تصوف کے چشمے اُبلتے رہے اور جن سے ملک کا چپّہ چپّہ سیراب ہوتا رہا۔ ہزاروں تشنگانِ علم نے ان سے اپنی پیاس بجھائی اور ہزاروں دِلدادگانِ راہِ طریقت نے روشنی حاصل کی۔ فی الواقعہ شرقی سلطنت کے شہروں کی خاموش علمی فضا اور رُوح پرور ماحول میں ہندوستان اور عالم اسلام کے انسانوں نے اطمینان و سکون کا سانس لیا جونپور میں اہلِ ہنر کے بھی قافلے پہنچتے رہے اور اُنھوں نے بھی اپنے ذوق و شوق کے مطابق کارہائے نمایاں انجام دیے۔ فی الحقیقت عہد وسطیٰ کا جونپور محض ایک شہر نہ تھا، بلکہ علم و اَدب کا مرکز، تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور ایک ایسی کارگاہِ فکر و نظر تھا کہ جہاں صدیوں تک علم و فن، تعلیم و تربیت، اَخلاق و مذہب، معاشرت و سیاسیات کے سانچے ڈھلتے رہے۔ جونپور کو بقول فرشتہ "دہلیِ ثانی" کہتے تھے[2]۔ وہاں کے عُلماء، فضلاء اور صُوفیاء کو دُنیا سے رُخصت ہوتے ہر چند کہ صدیاں گُزر چکی ہیں لیکن جب بھی اُن بزرگ ہستیوں کا خیال آتا ہے تو تصور میں تلقین و ارشاد، تزکیۂ نفس، تجلیۂ باطنی اور شعر و اَدب کی ہزاروں محفلیں جگمگا اُٹھتی ہیں۔ جونپور کو جو علمی و اَدبی، مذہبی اور ثقافتی اہمیت و شہرت عہدِ شرقی میں حاصل ہُوئی وہ اِس سلطنت کا چراغ بجھ جانے کے بعد بھی صدیوں تک قائم رہی یہاں تک کہ

---

[1] تاریخ شیراز ہند (جونپور) ص ۱۰۹

[2] تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۹۲

سترھویں صدی میں شاہجہاں نے اُسے مدرسوں اور علم و فن کے لحاظ سے "دارالعلم" اور "شیرازِ ہند" کا لقب دیا تھا[1] اور محمد شاہ (۱۷۱۹ء-۱۷۴۸ء) کے زمانے میں بھی یہاں بہت ہی مشہور و معروف مدرسے موجود تھے[2]

---

[1] جونپور نامہ (قلمی نسخہ) غلام حسین، ورق ۴۳ ب
[2] ہندوستان کی قدیم درسگاہیں

باب چہارم

سلاطین جونپور کے علمی و ادبی، سیاسی اور ثقافتی کارنامے

سلطان الشرق ملک سرور
(۱۳۹۴ء - ۱۳۹۹ء)

شرقی سلطنت کا بانی ملک سرور ایک خواجہ سرا تھا[1]۔ اس کو سید رجب علی نے سلطان فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) کی خدمت میں پیش کیا تھا[2]۔ سلطان اُس کی فرمانبرداری اور دیانتداری سے بڑا خوش ہوا اور اُس نے اسے تھوڑے ہی عرصہ بعد شاہی ہیرے جواہرات اور زیورات

---

[1] طبقات اکبری جلد سوم ص ۲۷۳۔ زبدۃ التواریخ (قلمی) ورق ۲۷۲ ب

[2] Sayyid Hassan Askari; "Discursive Notes on the Sharqi Monarchy of Jaunpur" Indian History Congress Proceedings, The Twenty Third Session Aligarh, 1960, Part I. pp. 154-160.

H.R. Nevill, D. G. Jaunpur لکھتے ہیں کہ اس کو سلطان غیاث الدین اول کے بھائی سپہ سالار رجب نے سلطان محمد بن تغلق کی خدمت میں پیش کیا تھا مگر Kings of The East, pp. 35-36. میں ہے کہ وہ سلطان غیاث الدین اول کے بھائی سپہ سالار رجب کا غلام تھا اور جس نے اس کو سلطان محمد شاہ تغلق کی خدمت میں پیش کیا تھا لیکن شجرۂ خاندانی راجہ سید ارادت جہاں (قلمی)، احوال جونپور (قلمی)، بیان الانساب سادات زیدیہ (مطبوعہ) سلاطین جونپور (قلمی)، مرآۃ الاسرار (قلمی) اور تاریخ مبارک شاہی وغیرہ کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سید رجب علی جو سید خضر خاں والی ملتان کی بہن کے خاوند تھے۔ انھوں نے اس کو سلطان فیروز شاہ تغلق کی خدمت میں پیش کیا تھا اور سلطان مبارک شاہ شرقی اور اُن کے بھائی سلطان ابراہیم شاہ شرقی سید رجب علی کے بیٹے تھے بلکہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی اپنے ماموں سید خضر خاں کے داماد بھی تھے۔

مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب

The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History. pp. 20-36.

وغیرہ کا محافظ بنا دیا۔[۱] اس عہدہ کو اُس نے بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔ سلطان فیروز اس کی قابلیت اور اِنتظام سے اِس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اس کو مزید ترقی دے کر شہر دہلی کا گورنر مقرر کر دیا۔[۲] ملک سرور نے اس عہدہ کے فرائض بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیئے اور اس عہدہ پر وہ سلطان فیروز کی وفات (۱۳۸۸ء) کے بعد سلطان ابوبکر شاہ کے عہد میں بھی متمکن رہا۔[۳] سلطان ابوبکر شاہ پانچ ماہ کے بعد قتل ہو گیا اور اُس کی جگہ بڑی تگ ودو کے بعد سلطان محمد شاہ (۱۳۹۰-۱۳۹۴ء) تخت نشین ہوا۔ اس خانہ جنگی میں چونکہ ملک سرور نے سلطان محمد شاہ کی کھلم کھلا مدد کی تھی۔ اِس لیے اس نے اِس کو خواجہ جہاں کا خطاب دے کر پہلے نائب وزیر اور کچھ عرصہ بعد اسلام خاں کی جگہ اپنا وزیرِ سلطنت منتخب کر لیا۔[۴] عہدہ وزارت پر بھی اس نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے اور اپنے مربی کی وفات کے بعد سلطان علاء الدین سکندر شاہ (۱۳۹۴ء) اور پھر سلطان محمود شاہ تغلق (۱۳۹۴-۱۴۱۲ء) کے عہدِ حکومت میں بھی پہلے دو ماہ تک وہ اس عہدے پر فائز رہا۔[۵]

بعد میں جب صوبہ اودھ کے سیاسی حالات دوبارہ خراب ہو گئے اور وہاں کے ہندو جاگیرداروں اور ہندوؤں نے مسلمانوں پر پہلے کی طرح ظلم وستم کرنا شروع کر دیا تو سلطان محمود شاہ تغلق نے اس کو سلطان الشرق کا خطاب دے کر جونپور کا گورنر مقرر کیا اور مختصر سی فوج بھی ساتھ کر دی تاکہ وہ وہاں پہنچ کر اِنتظام کو درست کر کے امن وامان قائم کر سکے۔[۶] سلطان الشرق ملک سرور نے اس مختصر سی فوج کے ساتھ مئی ۱۳۹۴ء میں دہلی سے جونپور کا

۱۔ تاریخ فیروز شاہی (عفیف) ص ۱۴۸-۱۴۹ ۔ ۲۔ تاریخ محمدی (قلمی) ورق ۴۱۶ ب
۳۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۴۶ ۴۔ ایضاً۔ طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۲۴۴۔ تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۲۷۵۔ روضۃ الطاہرین (قلمی) ورق ۶۰۳
۵۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۵۵
۶۔ ایضاً ص ۱۵۶-۱۵۷

رُخ کیا مگر راستے میں پہلے اسے کول (علی گڈھ)، کھنور[1] (شمس آباد)، اٹاوہ اور کمپل[2] وغیرہ کے باغیوں کی سرکوبی کرنی پڑی[3]۔ اس کے بعد ابھی وُہ اپنے دارالحکومت جونپور میں اچھی طرح جم کر بیٹھے بھی نہ سکا تھا کہ اس کو دالمئو[4]، کڑہ[5]، بہرائچ، قنوج، سندیلہ اور اودھ کے باغیوں کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی[6]۔ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد اس نے بہار و ترہت کے راجوں کی گوشمالی کی اور وہاں کے فتنہ و فساد کا قلع قمع کیا[7]۔ کچھ عرصہ بعد اس نے اڑیسہ اور لکھنوتی کے حکمرانوں کی بھی گوشمالی کی اور ان کو دوبارہ حکومتِ دہلی کا مطیع و باجگزار بنایا[8]۔ اس طرح اس نے چند ہی سالوں میں تمام صوبہ میں امن و امان قائم کر دیا اور اپنی جگہ اپنی قابلیت و انتظام کا سکہ بٹھا دیا۔ اس دوران میں دہلی کے سیاسی حالات دوبارہ خراب ہوگئے اور وہاں سلطان محمود شاہ کے مقابلہ میں نُصرت شاہ تخت کا دعویدار بن کر کھڑا ہوگیا۔ ابھی یہ شاہی جنگ جاری ہی تھی کہ امیر تیمور کے دہلی پر حملہ آور ہونے کی خبریں پہنچیں۔ بالآخر اِن حالات سے دِل برداشتہ ہو کر سلطان محمود مالوہ بھاگ گیا اور دہلی پر امیر تیمور کا قبضہ ہوگیا۔ سلطنتِ تغلق اور دہلی کے ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جب صوباتی گورنروں نے یکے بعد دیگرے اپنی خُود مختاری کا اعلان کر دیا تو سلطان الشرق نے بھی یہ موقعہ مناسب جان کر اپنی خُود مختاری کا اعلان کر دیا۔

---

[1] یہ شہر تیرھویں صدی کے شروع میں ایک راٹھور سردار نے بسایا تھا۔ اب یہ ایک ٹیلے کی صورت میں ہے اور اور کوٹ یا قلعہ کھور راجہ کہلاتا ہے۔ موجودہ شہر شمس آباد سلطان التمش نے اسی کے کھنڈروں پر بنوایا تھا اور ضلع فرخ آباد (یوپی) میں شہر فرخ آباد سے ۱۸ میل کے فاصلے پر شمال مغرب میں واقع ہے۔

[2] یہ جگہ کمپل (کمپیلہ) اب ضلع رائے بریلی میں ایک گاؤں کی صورت میں ہے۔

[3] منتخب التواریخ جلد اوّل ص ۲۶۴۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۵۶۔۱۵۷

[4] دالمئو (دالامئو) یہ شہر دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔ اور ضلع رائے بریلی (یوپی) کی ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔

[5] کڑہ ضلع و شہر الہ آباد (یوپی) سے ۴۱ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

[6] تاریخ مبارک شاہی ص ۱۷۵۔ تاریخ حقی / ذکر الملوک (قلمی) ورق ۵۳

[7] Bihar Through The Ages, p.. 363.

[8] تاریخ مبارک شاہی ایضاً۔ طبقات اکبری جلد اوّل ص ۲۵۱

اور اتابک اعظم لقب اختیار کر کے اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کر دیا۔[1]

آغاز میں سلطان الشرق کی سلطنت میں شمالی اور جنوبی بہار، ترہت، قنوج کے گرد و نواح بھوج پور کا شہر اور اد جین کی سرحد تک، بھیر دوھیل کھنڈ اور بندھیل کھنڈ کے علاقے شامل تھے۔ کچھ عرصہ بعد اس نے کول، سنبھل[2] اور راپری[3] کو بھی فتح کر لیا۔[4] گویا زمانۂ عروج میں اس کی سلطنت کی حدیں شمال میں علی گڈھ سے لے کر بنگال تک اور کوہ ہمالیہ کے دامن سے لے کر مالوہ تک پھیلی ہوئی تھیں مگر شومئ تقدیر سے وہ اس وسیع سلطنت پر زیادہ عرصہ حکومت نہ کر سکا اور نومبر ۱۳۹۹ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔[5]

سلطان الشرق ملک سرور نے ساڑھے پانچ سال حکومت کی لیکن اس کا یہ مختصر سا عہدِ حکومت تاریخ پاک و ہند میں جلی حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ اس عرصہ میں اس نے شرقی سلطنت کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا اور اپنے وزیر عماد الملک بختیار خاں کی زیرِ نگرانی اس کا نظم و نسق نہایت عمدگی سے اور خوش اسلوبی سے چلایا۔[6]

سلطان الشرق علماء و صوفیاء کا بڑا مربی تھا۔ اس کی علم دوستی، مذہب پرستی اور فیاضیوں کی شہرت سن کر سینکڑوں علماء و صوفیاء اور فن کار جونپور پہنچے اور انھوں نے سلطنت کے مختلف حصوں میں آباد ہو کر درس و تدریس اور اشاعتِ اسلام کا بڑا کام کیا۔ نیز ایسی روایات قائم کر دیں جو بعد میں صدیوں تک قائم رہیں۔[7] شرقی مدرسوں میں علوم ظاہری و باطنی کی درس و تدریس کے علاوہ ایک شعبہ فوجی تعلیم کا بھی ہوتا تھا۔[8] سلطان الشرق خود مخدوم اخی

---

[1] تاریخ محمدی (قلمی) ورق ۴۲۶-۴۲۷۔ روضۃ الطاہرین ورق ۹۸۹ ا، جونپور نامہ ص ۱۰

[2] ضلع مراد آباد (یوپی) کی ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔

[3] راپری ضلع مین پوری (یوپی) کے پرگنہ "شکوہ آباد" میں واقع ہے۔

[4] تاریخ مبارک شاہی ص ۱۵۶-۱۵۷۔ زبدۃ التواریخ (قلمی) ص ۲۷۲ ب

[5] تاریخ مبارک شاہی ص ۱۵۹ [6] مشاہیر جونپور (قلمی) ص ۶۹-۷۰ وزیر عماد الملک کے مزید حالات ضمیمہ سوم میں ملاحظہ ہوں۔ [7] اخبار الاخیار۔ مرآۃ الاسرار (قلمی)، تجلیات العارفین (قلمی)، مزید تفصیلات کے لیے اس کتاب کا حصہ دوم سوم ملاحظہ فرمائیں۔ [8] سلاطین جونپور (قلمی)

سراج راجگیرؒ کا مرید تھا اور ان سے بڑی گہری عقیدت رکھتا تھا۔ سلطنت کے نیک کاموں میں بھی ان سے اکثر مشورے لیا کرتا تھا۔[1]

رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے بھی اس نے بڑے کام کیے۔ ان کے آرام کے لیے کنوئیں کھدوائے، باغ بنوائے اور زمینداروں کی سہولت کے لیے نہریں کھدوائیں۔ اس کی کھدوائی ہوئی نہروں میں سے ایک نہر کا کتبہ ۷۹۸ھ/۱۳۹۵-۱۳۹۶ء ضلع بدایوں میں بھی برآمد ہوا ہے[2] اس نے سلطنت اور رعایا کے تحفظ کے لیے تمام ویران قلعوں کو بھی مرمت کروایا اور وہاں قابل سپہ سالاروں کے ماتحت حفاظتی فوجی دستے بٹھائے۔[3] اس کے ہم عصر مؤرخ محمد بہامد خانی لکھتے ہیں کہ اس کا عہدِ حکومت گو مختصر تھا مگر پر امن تھا۔ رعایا خوشحال تھی اور تمام جاگیردار اور زمیندار باقاعدہ مالیہ ادا کرتے تھے۔[4]

اُس نے دارالحکومت جونپور کو بھی بڑی رونق بخشی۔ سب سے پہلے قلعہ کرار کوٹ کو مکمل کروا کے اس کو اپنا سرکاری ہیڈ کوارٹر بنایا۔[5] اور پھر ان باقی ماندہ عمارات کی بھی تعمیر مکمل کروائی جو سیاسی بحران کی وجہ سے نامکمل پڑی تھیں۔[6] اس نے راجہ جے چند کے مسمار شدہ محل کو بھی از سرِ نو تعمیر کروایا اور اس کو کاشی کاری کے کام سے مزین کر کے اس کا نام بدیع منزل رکھا۔[7] یہ محل حوضِ خاص کے بالمقابل تھا۔ بعد میں اس کے جانشین سلطان مبارک شاہ نے بھی اس کو اپنی قیام گاہ کے طور پر استعمال کیا۔[8] مزید برآں اس نے شہر جونپور میں نئے بازار، محلے اور بہت سی عظیم الشان عمارات بنوائیں اور شہریوں کے لیے ہر طرح کے آرام و آسائش کا سامان کیا۔ جونپور کو اس نے "دارالسرور" کا نام دیا تھا۔[9]

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۱۵۴ و خزینۃ الاصفیاء، جلد دوم ص ۶۴

[2] The Monumental Antiquities and Inscriptions in the N.W. Provinces and Oudh, Vol. II, p. 203.

[3] تاریخ مبارک شاہی ص ۱۰۵

[4] تاریخ محمدی (قلمی) ورق ۴۲۷ ل

[5] جونپور نامہ ص ۲۶

[6] ایضاً

[7] ایضاً

[8] ایضاً

[9] ایضاً

سلطان مبارک شاہ شرقی

(۱۳۹۹-۱۴۰۱ء)

سلطان الشرق ملک سرور کی وفات کے بعد اس کا منہ بولا بیٹا مبارک شاہ تخت نشین ہوا[1]۔ اس کی تخت نشینی کے موقع پر جونپور شہر میں جشنِ چراغاں منایا گیا۔ شعراء نے قصائد اور قطعات پیش کیے اور تمام ارکانِ دولت کو انعام و اکرام سے نوازا گیا[2]۔ اس موقعہ پر فراہی نے یہ قطعہ لکھا تھا

گشت چوں بادشہ مبارک شاہ
شادی آمادہ گشت بر با جشن
سالِ تاریخ ایں خجستہ جلوس
شد نگہبان "عالم آرا جشن"
۸۰۲ھ

سلطان مبارک شاہ کے والد کا نام سید رجب علی تھا جو سید خضر خاں والی ملتان کی بہن کا داماد تھا۔ وہ ملک قرنفل کے نام سے بھی مشہور تھا اور یہی وہ سید رجب علی ہے[3] جس نے ملک سرور کو سلطان فیروز شاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا سلطان مبارک شاہ تخت نشین ہونے سے پہلے سلطان الشرق ملک سرور کے عہدِ حکومت میں مرکزی حکومت کا سربراہ رہ چکا تھا۔ اور ملک الشرق کے خطاب سے سرفراز تھا[4]۔ وہ ایک قوی ہیکل جوان اور قابل جرنیل تھا[5] اور

---

[1] طبقات اکبری جلد سوم ص ۲۷۴ - تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۹۱ [2] سلاطین جونپور (قلمی) ص ۴۳-۵

Khan Bohadur Molvi Fasih ud din; Kings of The East Banaras, pp. 35-36.

[3] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۸۱-۱۸۲

شجرہ خاندانی راجہ سید اردت جہاں (قلمی) احوالِ جونپور (قلمی) "سلاطین جونپور (قلمی)
بیاالانساب سادات زیدیہ (مطبوعہ) اور مرآۃ الاسرار (قلمی) مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب

The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History, pp. 80-86.

سلطان الشرق کے عہد میں شمالی و جنوبی بہار کے راجاؤں کو کئی بار شکست دے کر اپنی قابلیت کے جوہر دکھا چکا تھا۔[۱]

جب وہ تخت نشین ہوا تو اس وقت سلطان محمود شاہ تغلق مالوہ میں پناہ گزیں تھا اور اس کی غیر حاضری میں ملّو اقبال سلطان نصرت شاہ کی جگہ دہلی پر قابض ہو گیا تھا۔[۲] ملّو اقبال نے جب مبارک شاہ کی تخت نشینی کی خبر سنی تو ملکی ہوس میں کثیر التعداد فوج لے کر (جنوری / فروری ۱۴۰۰ء) جونپور کی طرف نکلا۔ اور قنوج کا علاقہ تباہ و برباد کرتا ہوا گنگا کے کنارے کنارے آگے بڑھا۔ سلطان مبارک شاہ کو جب اس کی آمد کی خبر ملی تو وہ بھی فوج لے کر مقابلہ کے لیے آگے بڑھا اور گنگا کے دوسرے کنارے اس کے بالمقابل جا پہنچا۔ لیکن ملّو اقبال نے جب اس کی افواج قاہرہ کا رعب و دبدبہ دیکھا تو وہیں رک گیا۔ اس کے بعد تقریباً دو ماہ تک دونوں کی فوجیں آمنے سامنے آمادۂ پیکار رہیں لیکن کسی کو بھی دریا کو عبور کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بالآخر دونوں میں صلح ہو گئی اور وہ اپنے اپنے دارالخلافے کو واپس چلے گئے۔[۳] لیکن سلطان مبارک ابھی جونپور پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ اسے دوبارہ ملّو اقبال اور سلطان محمود شاہ تغلق کے جونپور پر حملہ آور ہونے کی اطلاع پہنچی۔ چنانچہ وہ بھی فوجیں لے کر مقابلہ کے لیے پلٹا مگر ابھی راستے ہی میں تھا کہ اچانک فوت ہو گیا۔[۴]

ملا عبدالقادر بدایونی اس کا سال وفات ۸۰۳ھ / ۱۴۰۱ء لکھتے ہیں[۵] اور غالباً وہ اس سال کے آخر میں فوت ہوا۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ و سکہ بھی جاری کیا لیکن سلطان الشرق ملک سرور کی طرح اس کے نام کا بھی کوئی سکہ ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا۔[۶]

(گزشتہ سے پیوستہ)

[۹] سلاطین جونپور (قلمی) ص ۴-۵

[۱] جونپور نامہ ص ۱۵-۱۶

[۲] تاریخ مبارک شاہی ص ۱۶۹

[۳] جونپور نامہ ص ۱۵-۱۶

[۴] طبقات اکبری جلد سوم ص ۲۷۴

[۵] طبقات اکبری جلد سوم ص ۲۷۴

[۵] منتخب التواریخ جلد اول ص ۲۷۲-۲۷۳

[۶] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History, pp. 293-300.

سلطان مبارک شاہ شرقی کا دورِ حکومت ایک سال اور چند ماہ تھا۔ اس مختصر عرصۂ حکومت میں اس نے اپنی نوزائیدہ سلطنت کو بدخواہوں سے محفوظ رکھا اور دارالخلافہ جونپور کی مزید توسیع اور رونق میں نمایاں حصہ لیا۔ محمد بہامد خانی لکھتے ہیں کہ اس نے اپنی رعایا پر بڑے انصاف، محبت و شفقت سے حکومت کی تھی۔[1]

[1] تاریخِ محمدی (قلمی) ورق ۴۲۷ ا

سلطان ابراہیم شاہ شرقی

(۱۴۰۱-۱۴۴۰ء)

سلطان مبارک شاہ شرقی کی وفات کے بعد ۱۴۰۱ء میں اس کا چھوٹا بھائی ملک اکرم شمس الدین المعروف سلطان ابراہیم شاہ شرقی تخت نشین ہوا۔ اس کی رسم تاجپوشی پر بنگال، بہار، ترہت، اودھ، اور قنوج کے راجگان اور شرقی اُمراء نے بیش بہا تحائف اور نذرانے پیش کیے۔ جونپور میں جشنِ چراغاں کیا گیا۔ مدرسوں اور خانقاہوں میں لنگر جاری کیے گئے، علماء و فقراء کو خلعت عطا ہوتے اور تمام سلطنت میں ہر امیر و غریب نے خوشیاں منائیں[1]۔ اس کی تخت نشینی کے موقعہ پر درباری شاعر فراہی نے یہ قطعہ پیش کیا تھا ؎

زہے شاہِ بحرِ سخا عدل گستر
باد تاج و تخت و نگیں شد مسلّم
بروں آر سالِ جلوسِ ہمایوں
ز سلطانِ اہلِ صفا شاہ عالم[2]
۸۰۴ھ

سلطان ابراہیم شرقی نے جس وقت اس نوزائیدہ سلطنت کی باگ ڈور ہاتھ میں لی اس وقت اس کی بنیادیں ابھی کمزور تھیں۔ چاروں طرف سے حریف سلاطین اس پر قبضہ جمانے کی فکر میں تھے اور باجگذار راجے بھی اطاعت گذاری سے منحرف ہورہے تھے۔ چنانچہ اس نے ان تمام ملکی و سیاسی حالات کا پوری طرح جائزہ لیا اور تمام دشمن طاقتوں کا یکے بعد دیگرے

---

[1] سلاطین جونپور (قلمی)
[2] ایضاً ص ۷

ایسا قلع قمع کیا کہ سلطنت کی بنیادیں ایک صدی تک کے لیے مستحکم کر دیں۔

سب سے پہلے اس نے ۱۴۰۱ء میں ملّو اقبال اور سلطان محمود شاہ تغلق کی افواج کو شکست دے کر قنوج پر سکہ جمایا[1]۔ ۱۴۰۲ء میں اس نے ترہت کے باغی ملک ارسلان کی سرکوبی کی اور اپنے باجگزار راجہ کیرتی سنگھ کو دوبارہ شاہی گدی پر بحال کیا[2]۔ ۱۴۰۷ء میں وہ لشکرِ جرار لے کر دہلی کی فتح کے لیے بڑھا۔ اور سنبھل اور برن (بلند شہر) پر قبضہ جماتے ہوئے دہلی کے بالمقابل دریائے جمنا کے کنارے جا پہنچا۔ مگر سلطان مظفر گجراتی (۱۳۹۶-۱۴۱۱ء) کی فتحِ مالوہ اور اس کے بعد جونپور پر حملہ کی خبروں سے اسے مجبوراً لوٹنا پڑا[3]۔ اس کے بعد وہ چند سال تک سلطنت کے نظم و نسق اور رعایا کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مصروف رہا لیکن ۱۴۱۲ء میں جب اس کو سلطان محمود شاہ تغلق کی وفات پر دولت خاں لودھی کے دہلی پر قابض ہو جانے کی خبر ملی تو دوبارہ افواجِ قاہرہ لے کر فتحِ دہلی کے لیے نکلا لیکن راستے میں اس کا بہت سا وقت قادر شاہ (۱۴۱۱-۱۴۳۲ء) والیٔ کالپی کی گوشمالی میں ضائع ہو گیا۔ اس طرح دہلی کی فتح کا معاملہ پھر التوا میں پڑ گیا[4]۔

۱۴۱۴ء میں جب شیخ نور قطب عالم نے اس کو سلطان سیف الدین حمزہ شاہ (۱۴۱۰-۱۴۱۲ء) اور اس کے متبنّیٰ سلطان شہاب الدین بایزید (۱۴۱۲-۱۴۱۴ء) کے عہد میں راجہ کنس (جو بھتوریہ ضلع راج شاہی کا جاگیردار تھا) کے مسلمانوں پر ظلم و ستم اور تختِ بنگال پر قابض ہو جانے کی اطلاع دی تو وہ ایک لشکرِ جرار لے کر گیا مگر راستے میں پہلے اس نے اپنے باجگزار راجہ دیو سنگھ والیٔ

---

[1] تاریخ محمدی ورق ۴۴۳ ب   تاریخ مبارک شاہی ص ۱۷۱-۱۷۵   طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۲۵۸-۲۶۱

[2] کیرتی لتا ص ۱۴-۱۸

[3] تاریخ مبارک شاہی ص ۱۷۶۔ طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۲۷۷۔ منتخب التواریخ جلد اوّل ص ۲۷۵-۲۷۶ احسن التواریخ ورق ۱۴۷ د

[4] تاریخ محمدی ورق ۴۴۹-۴۵۱، طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۲۶۴۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۷۵۔ منتخب التواریخ جلد اوّل ورق ۲۸۳   تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۲۹۲-۲۹۳-

زبست کی بحالی کی اور پھر بنگال پہنچ کر راجہ کنس اور اس کے ساتھیوں کو زیر کیا۔ پھر اس کی جگہ اس کے بیٹے جادو کو مسلمان بنا کر سلطان جلال الدین محمد (۱۴۱۴-۱۴۳۱ء) کے نام سے تختِ بنگال پر بٹھایا اور وہاں پوری طرح امن و امان بحال کیا[۱]۔ ۱۴۱۶ء میں اس نے ادجین کے باغی راجہ گج راج اور اس کے چھوٹے بھائی جگ دیو کی مسلسل بغاوتوں کا انسداد کیا اور اس کے بعد پھر ادجین کو بھی مستقل طور پر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا[۲]۔

رفتہ رفتہ سلطان ابراہیم شرقی کی طاقت کا سکہ اس کی ساری سلطنت اور ہمسایہ حریف حکومتوں پر پوری طرح بیٹھ گیا اور اس کی قابلیت، مذہب پرستی، علم پروری اور فیاضی کی شہرت تمام اسلامی ممالک میں پہنچ گئی۔ اس کی مملکت میں نہ صرف اس ملک کے بلکہ عالمِ اسلام کے گوشے گوشے سے علماء، فضلاء اور صوفیاء کھنچے چلے آئے[۳]۔ بعد کے بارہ سال وہ جنگوں کے بجائے علماء و صوفیاء کی صحبت سے فیضیاب ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ رفاہِ عام کے کاموں میں مصروف رہا اور اس کی سلطنت میں ہر طرح امن و امان رہا۔

لیکن ۱۴۲۷ء میں جب اس کو قادر شاہ والئ کالپی کے ظلم و ستم کی خبریں ملیں تو وہ دوبارہ اس کی گوشمالی کے لیے پہنچا۔ قادر شاہ کو جب اُس کی آمد کی خبر ملی تو اُس نے سلطان سید مبارک شاہ (۱۴۲۱-۱۴۳۴ء) والئ دہلی کو اپنا محافظ بنا کر مدد مانگی۔ موخر الذکر اس وقت بیانہ پر حملہ آور تھا اور سلطان ابراہیم شاہ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے پہلے ہی خائف تھا۔ اس نے بیانہ کا معاملہ تو التواء میں ڈالا اور فوجیں لے کر مقابلہ پر اُتر آیا۔ چنانچہ دونوں طرف کی فوجوں میں نالہ کیتھر کے قریب دریائے جمنا کے کنارے بڑے گھمسان کا معرکہ ہوا جس میں فریقین کا بہت زیادہ جانی و مالی

۱۔ ریاض السلاطین جلد سوم ص ۱۱۲-۱۱۴۔ مکتوبات اشرفی خط نمبر ۵، ۱۰ و ۴۴ ورق ۹۲ و ۹۴۔ اخبار الاخیار ص ۱۴۹-۱۵۱

Sayyid Hasan Askari, Indian History Congress Proceedings, The [illegible] Third Session Aligarh, 1960, part I, pp. 154-162.

[illegible] Hasan Askari B.P.P. (67) 1948, p. 37.

۲۔ Bihar Through the Ages, p. 393.

۳۔ طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۷۵، تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۹۲۔ ہفت گلشن محمد شاہی ورق ۹۴-۹۵

نقصان ہوا۔ بعد میں دونوں میں صلح ہوگئی اور وہ اپنے اپنے دارالحکومت کو لوٹ گئے۔[1] پھر اگلے سال قادر شاہ کی وفات کے بعد جب اس کے بیٹوں میں (۱۴۳۲ء) تخت نشینی کی جنگ چھڑ گئی تو اس موقعہ پر سلطان ابراہیم شرقی نے شہزادہ زغیر خاں کا ساتھ دیا۔ ادھر شہزادہ جلال خاں کا ساتھ سلطان ہوشنگ والی مالوہ نے دیا۔ اس جنگ میں بھی سلطان ابراہیم کو کامیابی ہوئی اور وہ شہزادہ زغیر خاں کو کالپی کی گدی پر بٹھانے میں کامیاب ہوگیا۔[2]

۱۴۲۵ء میں اس نے والی بنگال سلطان شمس الدین احمد شاہ (۱۴۳۱-۱۴۴۲ء) پر حملہ کرکے اس کے ظلم و ستم کا انسداد کیا اور وہاں بھی امن و امان قائم کیا۔[3] کچھ عرصہ بعد جب سلطان سید مبارک شاہ کی وفات کے بعد سلطان محمد شاہ (۱۴۳۴-۱۴۴۳ء) تخت دہلی کا وارث ہوا تو بعض صوبائی گورنر اور امراء اس کو کمزور جان کر دہلی پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھنے لگے۔ ان حالات سے سلطان ابراہیم بھی غیر متعلق نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ وہ ۱۴۳۷ء میں اپنی فوجیں لے کر دہلی جا پہنچا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مگر سلطان محمد شاہ نے اپنی کمزوری کو سمجھتے ہوئے اس سے صلح و دوستی کر لی۔ بعد میں اسی مقصد کے لیے اس نے اپنی شہزادی بی بی راجی کی منگنی بھی شہزادہ محمود خان سے ٹھہرا دی۔ یہ شادی بعد میں دہلی میں بڑی شان و شوکت سے انجام پائی۔[4] سلطان ابراہیم اس واقعہ کے بعد تین سال مزید زندہ رہا اور ۱۴۴۰ء میں فوت ہوگیا۔[5]

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا شمار ہند و پاکستان کے قابل ترین اور عظیم الشان فرمانرواؤں میں کیا جاتا ہے۔ اس کا چالیس سالہ عہد حکومت سلطنت شرقی کا سنہری زمانہ تھا۔ اس دوران میں اس نے شرقی سلطنت کی بنیادیں پوری طرح مستحکم کر دیں اور اس کی سیاسی حیثیت و اہمیت

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۰۷-۲۱۲۔ طبقات اکبری جلد اوّل ۲۷۶-۲۷۸۔ تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۳۰۱ اور جلد دوم ص ۵۹۴-۵۹۵۔ منتخب التواریخ جلد اوّل ص ۲۹۲-۲۹۳۔

[2] تاریخ محمدی (قلمی) ورق ۴۵۶-۴۵۹

[3] ایضاً ورق ۴۲۷

[4] روضۃ الطاہرین (قلمی) ورق ۶۰۶-۶۰۷۔ جونپور نامہ ص ۱۲، ۱۹ Kings of the East, p. 41

[5] تاریخ حقی (قلمی) ورق ۵۹ ب، احسن التواریخ (قلمی) ورق ۴۱۷، جونپور نامہ ص ۱۳

سراج راجگیری کا مرید تھا اور ان سے بڑی گہری عقیدت رکھتا تھا سلطنت کے نیک کاموں میں بھی ان سے اکثر مشورے لیا کرتا تھا[1]۔

رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے بھی اس نے بڑے کام کیے۔ ان کے آرام کے لیے کنوئیں کھدوائے، باغ بنوائے اور زمینداروں کی سہولت کے لیے نہریں کھدوائیں۔ اس کی کھدوائی ہوئی نہروں میں سے ایک نہر کا کتبہ ۷۹۸ھ/۱۳۹۵-۱۳۹۶ء ضلع بدایوں میں بھی برآمد ہوا ہے[2]۔ اس نے سلطنت اور رعایا کے تحفظ کے لیے تمام ویران قلعوں کو بھی مرمت کروایا اور وہاں قابل سپہ سالاروں کے ماتحت حفاظتی فوجی دستے بٹھائے[3]۔ اس کے ہم عصر مؤرخ محمد بہامد خانی لکھتے ہیں کہ اس کا عہدِ حکومت گو مختصر تھا مگر پر امن تھا۔ رعایا خوشحال تھی اور تمام جاگیردار اور زمیندار باقاعدہ مالیہ ادا کرتے تھے[4]۔

اُس نے دارالحکومت جونپور کو بھی بڑی رونق بخشی۔ سب سے پہلے قلعہ کرار کوٹ کو مکمل کروا کے اس کو اپنا سرکاری ہیڈکوارٹر بنایا[5]۔ اور پھر ان باقی ماندہ عمارات کی بھی تعمیر مکمل کروائی جو سیاسی بحران کی وجہ سے نامکمل پڑی تھیں[6]۔ اس نے راجہ جے چند کے مسمار شدہ محل کو بھی از سرِ نو تعمیر کروایا اور اس کو کاشی کاری کے کام سے مزین کر کے اس کا نام بدیع منزل رکھا[7]۔ یہ محل حوضِ خاص کے بالمقابل تھا۔ بعد میں اس کے جانشین سلطان مبارک شاہ نے بھی اس کو اپنی قیام گاہ کے طور پر استعمال کیا[8]۔ مزید برآں اس نے شہر جونپور میں نئے بازار، محلے اور بہت سی عظیم الشان عمارات بنوائیں اور شہریوں کے لیے ہر طرح کے آرام و آسائش کا سامان کیا۔ جونپور کو اس نے "دارالسرور" کا نام دیا تھا[9]۔

---

[1] مراۃ الاسرار (قلمی) ورق ۱۵۴ و خزینۃ الاصفیا جلد دوم ص ۶۴

[2] The Monumental Antiquities and Inscriptions in the N.W. Provinces and Oudh, Vol. II, p. 203.

[3] تاریخ مبارک شاہی ص ۱۷۵

[4] تاریخ محمدی (قلمی) ورق ۴۲۷ ل

[5] جونپور نامہ ص ۳۶

[6] ایضاً

[7] ایضاً

[8] ایضاً

[9] ایضاً

سلطان مبارک شاہ شرقی

(۱۳۹۹-۱۴۰۱ء)

سلطان الشرق ملک سرور کی وفات کے بعد اس کا منہ بولا بیٹا مبارک شاہ تخت نشین ہوا۔[۱] اس کی تخت نشینی کے موقع پر جونپور شہر میں جشنِ چراغاں منایا گیا۔ شعراء نے قصائد اور قطعات پیش کیے اور تمام ارکانِ دولت کو انعام واکرام سے نوازا گیا۔[۲] اس موقعہ پر فراہی نے یہ قطعہ لکھا تھا

گشت چوں بادشہ مبارک شاہ
شادی آمادہ گشت بر با جشن
سالِ تاریخ این خجستہ جلوس
شد نگہبان "عالم آرا جشن"
۸۰۲ھ

سلطان مبارک شاہ کے والد کا نام سید رجب علی تھا جو سید خضر خاں والی ملتان کی بہن کا خاوند تھا۔ وہ ملک قرنفل کے نام سے بھی مشہور تھا اور یہی وہ سید رجب علی ہے[۳] جس نے ملک سرور کو سلطان فیروز شاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ سلطان مبارک شاہ تخت نشین ہونے سے پہلے سلطان الشرق ملک سرور کے عہدِ حکومت میں مرکزی حکومت کا سربراہ رہ چکا تھا۔ اور ملک الشرق کے خطاب سے سرفراز تھا۔[۴] وہ ایک قوی ہیکل جوان اور قابل جرنیل تھا اور

---

۱ طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۷۴ - تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۹۱ ۲ سلاطینِ جونپور (قلمی) ص ۴-۵
Khan Bohadur Molvi Fasih ud din; Kings of The East Banaras, pp. 35-36.

۳ تاریخ فیروز شاہی ص ۱۸۱-۱۸۲
شجرہ خاندانی راجہ سید ارادت جہاں (قلمی) احوالِ جونپور (قلمی) "سلاطین جونپور (قلمی)
بیاض الانساب سادات زیدیہ (مطبوعہ) اور مرآۃ الاسرار (قلمی) مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب
The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History, pp. 80-86.

سلطان الشرق کے عہد میں شمالی و جنوبی بہار کے راجاؤں کو کئی بار شکست دے کر اپنی قابلیت کے جوہر دکھا چکا تھا[۸]۔

جب وہ تخت نشین ہوا تو اس وقت سلطان محمود شاہ تغلق مالوہ میں پناہ گزیں تھا اور اس کی غیر حاضری میں ملّو اقبال سلطان نصرت شاہ کی جگہ دہلی پر قابض ہو گیا تھا[۹]۔ ملّو اقبال نے جب مبارک شاہ کی تخت نشینی کی خبر سنی تو ملکی ہوس میں کثیر التعداد فوج لے کر (جنوری/فروری ۱۴۰۰ء) جونپور کی طرف نکلا۔ اور قنوج کا علاقہ تباہ و برباد کرتا ہوا گنگا کے کنارے کنارے آگے بڑھا۔ سلطان مبارک شاہ کو جب اس کی آمد کی خبر ملی تو وہ بھی فوج لے کر مقابلہ کے لیے آگے بڑھا اور گنگا کے دوسرے کنارے اُس کے بالمقابل جا پہنچا۔ لیکن ملّو اقبال نے جب اس کی افواج قاہرہ کا رعب و دبدبہ دیکھا تو وہیں رُک گیا۔ اس کے بعد تقریباً دو ماہ تک دونوں کی فوجیں آمنے سامنے آمادۂ پیکار رہیں لیکن کسی کو بھی دریا کو عبور کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بالآخر دونوں میں صلح ہو گئی اور وہ اپنے اپنے دارالخلافے کو واپس چلے گئے[۱۰]۔ لیکن سلطان مبارک ابھی جونپور پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسے دوبارہ ملّو اقبال اور سلطان محمود شاہ تغلق کے جونپور پر حملہ آور ہونے کی اطلاع پہنچی۔ چنانچہ وہ بھی فوجیں لے کر مقابلہ کے لیے پلٹا مگر ابھی راستے ہی میں تھا کہ اچانک فوت ہو گیا[۱۱]۔

ملّا عبدالقادر بدایونی اس کا سالِ وفات ۸۰۳ھ/۱۴۰۱ء لکھتے ہیں[۱۲] اور غالباً وہ اس سال کے آخر میں فوت ہوا۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ و سکّہ بھی جاری کیا لیکن سلطان الشرق ملک سرور کی طرح اس کے نام کا بھی کوئی سکّہ ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا[۱۳]۔

(گزشتہ سے پیوستہ)

۸؎ سلاطین جونپور (قلمی) ص ۴-۵

۹؎ جونپور نامہ ص ۱۵-۱۶

۱۰؎ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۶۹

۱۱؎ منتخب التواریخ جلد اول ص ۲۷۲-۲۷۳

۱۲؎ جونپور نامہ ص ۱۵-۱۶

۱۳؎ طبقات اکبری جلد سوم ص ۲۷۴

۱۴؎ طبقات اکبری جلد سوم ص ۲۷۴

۱۵؎ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History, pp. 293-300.

سلطان مبارک شاہ شرقی کا دورِ حکومت ایک سال اور چند ماہ تھا۔ اس مختصر عرصۂ حکومت میں اس نے اپنی نوزائیدہ سلطنت کو بدخواہوں سے محفوظ رکھا اور دارالخلافہ جونپور کی مزید توسیع اور رونق میں نمایاں حصّہ لیا۔ محمّد بہامد خانی لکھتے ہیں کہ اس نے اپنی رعایا پر بڑے انصاف، محبّت و شفقت سے حکومت کی تھی۔[1]

---

[1] تاریخِ محمدی (قلمی) ورق ۴۲۷ ر

سلطان ابراہیم شاہ شرقی

(۱۴۰۱-۱۴۴۰ء)

سلطان مبارک شاہ شرقی کی وفات کے بعد ۱۴۰۱ء میں اس کا چھوٹا بھائی ملک اکرم شمس الدین المعروف سلطان ابراہیم شاہ شرقی تخت نشین ہوا۔ اس کی رسم تاجپوشی پر بنگال، بہار، ترہت، اودھ، اور قنوج کے راجگان اور شرقی امراء نے بیش بہا تحائف اور نذرانے پیش کیے۔ جونپور میں جشنِ چراغاں کیا گیا۔ مدرسوں اور خانقاہوں میں لنگر جاری کیے گئے۔ علماء و فقراء کو خلعت عطا ہوتے اور تمام سلطنت میں ہر امیر و غریب نے خوشیاں منائیں۔[1] اس کی تخت نشینی کے موقعہ پر درباری شاعر فراہی نے یہ قطعہ پیش کیا تھا ؎

زہے شاہِ بحرِ سخا عدل گستر
بادتاج و تخت و نگیں شد مسلّم
بروں آر سالِ جلوسِ ہمایوں
زسلطان اہلِ صفا شاہ عالم[2]

۸۰۴ھ

سلطان ابراہیم شرقی نے جس وقت اس نوزائیدہ سلطنت کی باگ ڈور ہاتھ میں لی اس وقت اس کی بنیادیں ابھی کمزور تھیں۔ چاروں طرف سے حریف سلاطین اس پر قبضہ جمانے کی فکر میں تھے اور باجگذار راجے بھی اطاعت گذاری سے منحرف ہو رہے تھے۔ چنانچہ اس نے ان تمام ملکی و سیاسی حالات کا پوری طرح جائزہ لیا اور تمام دشمن طاقتوں کا یکے بعد دیگرے

---

[1] سلاطینِ جونپور (قلمی)
[2] ایضاً ص،

ایسا قلع قمع کیا کہ سلطنت کی بنیادیں ایک صدی تک کے لیے مستحکم کر دیں۔

سب سے پہلے اس نے ۱۴۰۱ء میں ملّو اقبال اور سلطان محمود شاہ تغلق کی افواج کو شکست دے کر قنوج پر سکّہ جمایا۔[1] ۱۴۰۲ء میں اس نے ترہت کے باغی ملک ارسلان کی سرکوبی کی اور اپنے باجگزار راجہ کیرتی سنگھ کو دوبارہ شاہی گدی پر بحال کیا۔[2] ۱۴۰۷ء میں وہ لشکرِ جرار لے کر دہلی کی فتح کے لیے بڑھا۔ اور سنبھل اور برن (بلند شہر) پر قبضہ جماتے ہوئے دہلی کے بالمقابل دریائے جمنا کے کنارے جا پہنچا۔ مگر سلطان مظفر گجراتی (۱۳۹۶-۱۴۱۱ء) کی فتحِ مالوہ اور اس کے بعد جونپور پر حملہ کی خبروں سے اسے مجبوراً لوٹنا پڑا۔[3] اس کے بعد وہ چند سال تک سلطنت کے نظم و نسق اور رعایا کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مصروف رہا لیکن ۱۴۱۲ء میں جب اس کو سلطان محمود شاہ تغلق کی وفات پر دولت خاں لودھی کے دہلی پر قابض ہو جانے کی خبر ملی تو دوبارہ افواجِ قاہرہ لے کر فتحِ دہلی کے لیے نکلا لیکن راستے میں اس کا بہت سا وقت قادر شاہ (۱۴۱۱-۱۴۳۲ء) والیٔ کالپی کی گوشمالی میں ضائع ہو گیا۔ اس طرح دہلی کی فتح کا معاملہ پھر التوا میں پڑ گیا۔[4]

۱۴۱۴ء میں جب شیخ نور قطب عالم نے اس کو سلطان سیف الدین حمزہ شاہ (۱۴۱۰-۱۴۱۲ء)[5] اور اس کے متبنّیٰ سلطان شہاب الدین بایزید (۱۴۱۲-۱۴۱۴ء) کے عہد میں راجہ کنس (جو بھتوریہ ضلع راج شاہی کا جاگیردار تھا) کے مسلمانوں پر ظلم و ستم اور تختِ بنگال پر قابض ہو جانے کی اطلاع دی تو وہ ایک لشکرِ جرار لے کر گیا مگر راستے میں پہلے اس نے اپنے باجگزار راجہ دیو سنگھ والی

۱۔ تاریخ محمدی ورق ۴۴۴ ب — تاریخ مبارک شاہی ص ۱۷۱-۱۷۵ — طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۲۵۸-

۲۶۱

۲۔ کیرتی لتا ص ۱۴-۱۸

۳۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۷۶۔ طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۲۷۷۔ منتخب التواریخ جلد اوّل ص ۲۷۵-۲۷۶
احسن التواریخ ورق ۱۴۷ و

۴۔ تاریخ محمدی ورق ۴۴۹-۴۵۱، طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۲۶۴۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۷۵۔
منتخب التواریخ جلد اوّل ورق ۲۸۳ — تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۲۹۲-۲۹۳۔

ترہٹ کی بحالی کی اور پھر بنگال پہنچ کر راجہ کنس اور اس کے ساتھیوں کو زیر کیا۔ پھر اس کی جگہ اس کے بیٹے جادو کو مسلمان بنا کر سلطان جلال الدین محمد (۱۴۱۴-۱۴۳۱ء) کے نام سے تختِ بنگال پر بٹھایا اور وہاں پوری طرح امن و امان بحال کیا۔[1] ۱۴۱۶ء میں اس نے اودھین کے باغی راجہ گج راج اور اس کے چھوٹے بھائی جگ دیو کی مسلسل بغاوتوں کا انسداد کیا اور اس کے بعد پھر اودھین کو بھی مستقل طور پر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔[2]

رفتہ رفتہ سلطان ابراہیم شرقی کی طاقت کا سکہ اس کی ساری سلطنت اور ہمسایہ حریف حکومتوں پر پوری طرح بیٹھ گیا اور اس کی قابلیت، مذہب پرستی، علم پروری اور فیاضیوں کی شہرت تمام اسلامی ممالک میں پہنچ گئی۔ اس کی مملکت میں نہ صرف اس ملک کے بلکہ عالمِ اسلام کے گوشے گوشے سے علماء، فضلاء اور صوفیاء کھنچے چلے آتے۔[3] بعد کے بارہ سال وہ جنگوں کے بجائے علماء و صوفیاء کی صحبت سے فیضیاب ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ رفاہِ عام کے کاموں میں مصروف رہا اور اس کی سلطنت میں ہر طرح امن و امان رہا۔

لیکن ۱۴۲۷ء میں جب اس کو قادر شاہ والی کالپی کے ظلم و ستم کی خبریں ملیں تو وہ دوبارہ اس کی گوشمالی کے لیے پہنچا۔ قادر شاہ کو جب اس کی آمد کی خبر ملی تو اس نے سلطان سید مبارک شاہ (۱۴۲۱-۱۴۳۴ء) والی دہلی کو اپنا محافظ بنا کر مدد مانگی۔ متوخر الذکر اس وقت بیانہ پر حملہ آور تھا اور سلطان ابراہیم شاہ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے پہلے ہی خائف تھا۔ اس نے بیانہ کا معاملہ تو التواء میں ڈالا اور فوجیں لے کر مقابلہ پر اتر آیا۔ چنانچہ دونوں طرف کی فوجوں نے بن نالہ کیتھر کے قریب دریائے جمنا کے کنارے بڑے گھمسان کا معرکہ ہوا جس میں فریقین کا بہت زیادہ جانی و مالی

---

[1] ریاض السلاطین جلد سوم ص ۱۱۲-۱۱۴۔ مکتوباتِ اشرفی خط نمبر ۴۵ و ۴۶ ورق ۹۲-۹۴ اخبار الاخیار ص ۱۴۵-۱۵۱

Sayyid Hasan Askari, Indian History Congress Proceedings, The Twenty Third Session Aligarh, 1960, part I, pp. 154-162.

Sayyid Hasan Askari B.P.P. (67) 1948, p. 37.

[2] Bihar Through the Ages, p. 393.

[3] طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۷۵، تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۹۲۔ ہفت گلشن محمد شاہی ورق ۹۴-۹۵

نقصان ہوا۔ بعد میں دونوں میں صلح ہوگئی اور وہ اپنے اپنے دارالحکومت کو لوٹ گئے۔[1] پھر اگلے سال قادر شاہ کی وفات کے بعد جب اس کے بیٹوں میں (۱۴۳۲ء) تخت نشینی کی جنگ چھڑ گئی تو اس موقعہ پر سلطان ابراہیم شرقی نے شہزادہ زغیر خاں کا ساتھ دیا۔ ادھر شہزادہ جلال خاں کا ساتھ سلطان ہوشنگ والی مالوہ نے دیا۔ اس جنگ میں بھی سلطان ابراہیم کو کامیابی ہوئی اور وہ شہزادہ زغیر خاں کو کالپی کی گدی پر بٹھانے میں کامیاب ہوگیا۔[2]

۱۴۲۵ء میں اس نے والی بنگال سلطان شمس الدین احمد شاہ (۱۴۳۱-۱۴۴۲ء) پر حملہ کرکے اس کے ظلم و ستم کا انسداد کیا اور وہاں بھی امن و امان قائم کیا۔[3] کچھ عرصہ بعد جب سلطان سید مبارک شاہ کی وفات کے بعد سلطان محمد شاہ (۱۴۳۴-۱۴۴۳ء) تخت دہلی کا وارث ہوا تو بعض صوبائی گورنر اور امراء اس کو کمزور جان کر دہلی پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھنے لگے۔ ان حالات سے سلطان ابراہیم بھی غیر متعلق نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ وہ ۱۴۳۷ء میں اپنی فوجیں لے کر دہلی جا پہنچا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مگر سلطان محمد شاہ نے اپنی کمزوری کو سمجھتے ہوئے اس سے صلح و دوستی کر لی۔ بعد میں اسی مقصد کے لیے اس نے اپنی شہزادی بی بی راجی کی منگنی بھی شہزادہ محمود خان سے ٹھہرا دی۔ یہ شادی بعد میں دہلی میں بڑی شان و شوکت سے انجام پائی۔[4] سلطان ابراہیم اس واقعہ کے بعد تین سال مزید زندہ رہا اور ۱۴۴۰ء میں فوت ہو گیا۔[5]

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا شمار ہند و پاکستان کے قابل ترین اور عظیم الشان فرمانرواؤں میں کیا جاتا ہے۔ اس کا چالیس سالہ عہد حکومت سلطنت شرقی کا سنہری زمانہ تھا۔ اس دوران میں اس نے شرقی سلطنت کی بنیادیں پوری طرح مستحکم کر دیں اور اس کی سیاسی حیثیت و اہمیت

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۰۷-۲۱۲۔ طبقات اکبری جلد اوّل ۲۷۶-۲۷۸۔ تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۳۰۱ اور جلد دوم ص ۵۹۴-۵۹۵۔ منتخب التواریخ جلد اوّل ص ۲۹۲-۲۹۳۔

[2] تاریخ محمدی (قلمی) ورق ۴۵۶-۴۵۹

[3] ایضاً ورق ۴۲۷

[4] روضۃ الطاہرین (قلمی) ورق ۶۰۶-۶۰۷۔ جونپور نامہ ص ۱۲، ۱۹ Kings of the East, p. 41.

[5] تاریخ حقی (قلمی) ورق ۵۹ ب، احسن التواریخ (قلمی) ورق ۴۱۷، جونپور نامہ ص ۱۳

کا سکہ اپنے ہم عصر حکمرانوں پر پوری طرح بٹھادیا۔ سلطنت کے اقتصادی حالات بھی بہترین طریقے سے درست کیے اور اس کی ثقافتی سرگرمیاں بھی بامِ عروج تک پہنچا دیں یہاں تک کہ بقول فرشتہ جونپور ثانی دہلی ہوگیا۔[1]

سلطان ابراہیم شرقی بہت حسین و جمیل اور رعب و جلال کا حامل تھا۔ وہ دراز قد، دراز ریش، فراخ سینہ شخص تھا اور مضبوط اور فربہ جسم کا مالک تھا۔ نیک مزاج، نیک خصلت اور پاکیزہ سیرت تھا۔ امورِ سلطنت کا ماہر اور صاحبِ تدبیر حکمران تھا اور جیسا سخی تھا ویسا ہی شجاع تھا۔ علاوہ ازیں بے حد علم دوست اور منصف مزاج تھا۔ غرضیکہ وہ سبھی صفات جو ایک کامیاب بادشاہ میں ہونی چاہئیں وہ اس میں پائی جاتی تھیں۔[2]

سلطان ابراہیم شرقی نے اپنی رعایا کے دلوں پر حکومت کی۔ ہر مذہب اور ہر قوم کے لوگوں کے ساتھ اس کی رواداری اور عدل و انصاف یکساں تھا۔ وہ راتوں کو سادہ لباس میں شہر کا گشت کرتا، لوگوں کے حالات معلوم کرتا اور جرائم کا سراغ لگا کر ان کا پوری طرح سدِ باب کرتا۔ وہ اخلاق و مروت کا پیکر تھا۔ شاہی شان و شوکت اور رعب و جلال کے باوجود رعایا سے بڑی خوش خلقی سے ملتا۔ ہر امیر و غریب کی درخواست ہمدردی اور توجہ سے سنتا۔ اپنے فوجی سرداروں، پرگنہ کے عاملوں، شقہ داروں، فوطہ داروں، رقعہ نویسوں، محاسبوں، محصلوں اور تمام ملازموں سے خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے بات کرتا اور ان کو کبھی محسوس نہ ہونے دیتا کہ وہ کسی بادشاہ سے بات کر رہے ہیں۔ اپنی خوشامد سے اسے بے حد نفرت تھی اور وہ کسی خوشامدی کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔[3]

سلطان جود و سخا کا سرچشمہ تھا۔ ملازمین، علماء و مشائخ، فقراء و مساکین، مسافر اور

---

[1] تاریخ فرشتہ، جلد دوم ص ۵۹۲، مراۃ جہاں نما (قلمی) ورق ۳۱۲
[2] تجلی نور (قلمی) حصہ سوم۔ طبقات ناصری۔ لطائف اشرفی
[3] سلاطین جونپور (قلمی) سیر المتاخرین (قلمی)

تمام رعایا اس سے یکساں طور پر فیض یاب ہوتی تھی۔ اس نے "امورِ خیر" اور "امدادِ مساکین" کے لیے ایک رقم مخصوص کر رکھی تھی جس سے محتاج لوگ اور طلباء وظیفے پاتے تھے اور بہت سے یتیموں اور ناداروں کی پرورش ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں وہ بہت سے بے وسائل لوگوں کو ہر سال حج کے لیے مکّہ معظمہ بھیجتا اور ان کا سفر خرچ شاہی خزانے سے ادا کرتا۔ اس کا معمول تھا کہ وہ علی الصبح نمازِ فجر کے بعد مسجد سے حرم سرا جاتے ہوتے راستے میں فقیروں اور غریبوں کو دونوں ہاتھوں سے سونے اور چاندی کے سکّے خیرات کرتا۔ محل سرا میں اس نے غرباء کو خیرات دینے کے لیے ایک علیحدہ رقم مقرّر کر رکھی تھی تاکہ اس کے دروازے سے کوئی سائل خالی نہ جائے۔ اس نے اپنے بیشتر قرابتداروں کے وظائف مقرّر کر رکھے تھے اور بعض کو جاگیریں بھی دے رکھی تھیں[1]۔

سلطان ابراہیم شرقی کے عہد میں ایران، عراق، عرب و حجاز، ماوراء النہر، بخارا، ترکستان، کشمیر، دھلی، لاہور اور ملک کے دُوسرے حصّوں سے ساداتِ عظام، اولیائے کرام، علمائے ذوی الاحترام اور باوقار اُمراء و شرفاء جونپور آئے۔ اُن میں سے بعض عالمِ اسلام پر تیموری حملوں اور دھلی کی تباہی کی وجہ سے یہاں پہنچے اور بعض اس کے علم و فضل کا چرچا اور قدردانی کا شہرہ سن کر آئے اور بعض کو اس نے خود بھی دعوت نامے بھیج کر بلوایا۔ ان تمام مہمانوں کی ضیافت و خدمت اور عزّت و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ان کو حسبِ مراتب جاگیروں، عہدوں اور وظائف سے نوازا[2]۔ کسی کے سپرد خانقاہ کا انتظام کیا۔ کسی کو مسجد میں پیش امام، موذّن یا خادم مُقرّر کیا۔ کسی کو مدرسہ کے نگران یا مدرّس کا عہدہ دیا۔ کسی کو قاضی کا درجہ دیا اور کسی کو مشیرِ سلطنت بنایا۔ تمام مدرّسین یا معلّمین اور ملازمین کو تنخواہیں خزانۂ شاہی سے دی جاتی تھیں۔ بعض علماء ایسے بھی تھے جو شاہی سرپرستی سے بے نیاز رہ کر

---

[1] سلاطینِ جونپور (قلمی)

[2] ایضاً۔ جونپور نامہ

درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے اور تشنگانِ علم و معرفت کی پیاس بجھاتے رہتے۔ سلطان ابراہیم شاہ کے زمانہ میں صرف دارالحکومت جونپور میں مدرسوں کی تعداد ڈیڑھ سو تک تھی۔ ان مدرسوں میں علومِ مشرقی کی تعلیم کے لیے قابل اساتذہ مقرر کیے جاتے اور وہاں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے علاوہ ایران و عرب کے طلبا بھی اکتسابِ علم کے لیے پہنچتے۔ کہا جاتا ہے کہ جونپور میں ایک وقت میں ۹۸۴ علماء کی پالکیاں نمازِ جمعہ و عیدین کے موقعہ پر نکلتی تھیں[1] بلکہ بعض مؤرخین نے ان پالکیوں کی تعداد ۱۴۰۰ بھی لکھی ہے۔[2]

فی الحقیقت عہدِ شرقی کے مسلمانوں کی علمی، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی اصلاح و تربیت کا سہرا اسی سلطان کے سر ہے۔ اس کے عہد میں علومِ اسلامی کے احیاء کا ایک شاندار دور شروع ہوا اور ہزاروں علماء و صوفیاء اس ملک اور عالمِ اسلام کے گوشے گوشے سے یہاں پہنچے، ان میں سے بعض نے سلاسلِ سہروردیہ و چشتیہ کے علاوہ دوسرے نئے روحانی سلاسل کی ترقی و ترویج کے لیے بڑا کام کیا۔ جن میں سے سلسلۂ صابریہ، مداریہ، قلندریہ اور شطاریہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔[3] سلطان ابراہیم شاہ نے ان سلسلوں کے بزرگوں کی بڑی خاطرداری کی۔ ان کے لیے مساجد و خانقاہیں بنوائیں اور معاشی امداد بھی کی اور جب وہ فوت ہوتے تو ان سے اظہارِ عقیدت کے لیے روضے اور مقبرے تعمیر کروائے اور ان کے جانشینوں کو وظائف اور جاگیریں دیں۔[4] بعض بزرگوں کی عقیدت میں جو مساجد بنوائیں ان میں سے جونپور کی اٹالہ دیوی مسجد اور جھنجری مسجد شرقی فنِ تعمیر کے شاہکار مانے جاتے ہیں اور آج جونپور میں سیاحوں اور شائقینِ فن کے لیے کشش کا باعث ہیں۔ سید

---

[1] سلاطینِ جونپور (قلمی)

[2] تفصیلات کے لیے اس کتاب کے حصہ دوم تا حصہ دہم کے مختلف الواب ملاحظہ ہوں۔

[3] سلاطینِ جونپور (قلمی) جونپور نامہ

[4] جونپور نامہ ص ۵۱-۵۲

اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی خانقاہ کچھوچھہ[۱]، شاہ مدارؒ کی خانقاہ و روضہ مکن پور[۲]۔ اور سید صدر جہاں اجملؒ، خواجہ ابوالفتح سونرسیؒ، مخدوم سعید جعفریؒ۔ قاضی شہاب الدینؒ اور ان کی بیگم کا روضہ و مقبرہ جونپور میں اسی نے بنوایا[۳]۔ جو اس کے ان بزرگوں سے اظہارِ عقیدت کا عمدہ ثبوت ہیں۔ اس نے سلطنت کے دوسرے حصوں میں بھی مساجد تعمیر کروائیں جن میں سے جامع مسجد رائے بریلی[۴]۔ مساجد موضع تھلنڈی (ضلع رائے بریلی)[۵] جامع مسجد جائس اور جامع مسجد قنوج[۶] اس کی مذہب پرستی کا مزید ثبوت پیش کرتی ہیں۔ اس کی پیروی کرتے ہوئے اس کے دور کے بعض علماء و امراء نے بھی جونپور میں کئی مساجد تعمیر کروائیں۔ جن میں سے مسجد چہار انگلی (مسجد خالص مخلص) اور مسجد قدم رسول خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[۷]۔

سلطان ابراہیم شاہ نے سید صدر جہاں اجمل اور مولانا شہاب الدین دولت آبادیؒ سے علومِ فقہ، و حدیث و منطق وغیرہ میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ علومِ اسلامی سے اس کی اس قدر گہری دلچسپی کی بدولت علمائے کاملین اکثر اس کے دربار میں جمع رہتے۔ ان علماء میں جب فقہی مسائل پر کوئی بحث چھڑ جاتی تو وہ بڑی دلچسپی سے سنتا[۸] اور حتی الامکان دورانِ بحث میں کسی قسم کی تلخی اور شکر رنجی پیدا نہ ہونے دیتا اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا کہ دربار میں علماء کے درمیان اختلافات پیدا نہ ہونے پائیں[۹]۔ وہ دینی معاملات میں علمائے وقت کی طرف سے جاری شدہ فتووں کو خود بھی اشاعت سے پہلے غور سے دیکھ لیتا اور اگر کوئی بات اس کے نزدیک ان میں درست نہ ہوتی تو

۱؎ The Monumental Antiquities and Inscripjtions in the N.W. Provinces and Oudh, Vol. II, p. 320-321.

۲؎ ۳؎ جونپور نامہ ص ۸۹-۹۰

۴؎ The Monumental Antiquities and Inscriptions in the N.W Provinces And Oudh, Vol. II, p. 325.

۵؎ ۶؎ عزابت نگار ص ۱۴۶

۷؎ سلاطین شرقی (قلمی)

۸؎ جونپور نامہ ص ۸۰، ۸۶-۸۷

۹؎ سلاطین جونپور (قلمی)

ترمیم و تنسیخ کرتا۔[1]

سلطان ابراہیم شاہ علماء وصوفیا کے علاوہ شعراء و اُدباء اور فن کاروں کی بھی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ مورخین، منجموں، شعراء اور فنِ سپاہ گری کے ماہرین کی اچھی خاصی تعداد اس کے دربار سے وابستہ تھی۔ اُن میں سے ایک مورخ قاضی سخا تھے جو علم نجوم کے بھی ماہر تھے۔[2] جوتشیوں میں سے ایک پنڈت نارائن داس علم جوتش کے زبردست ماہر تھے اور اُن کا خاندان سلطنت کے آخری دور تک دربار سے منسلک رہا۔[3] شاہی حکماء میں سے حکیم سید محمد ابراہیم کا مقام بہت بلند تھا جو فنِ خوش نویسی کے بھی بڑے ماہر تھے اور ہفت قلم قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ کے مایۂ ناز شاگردوں میں سے تھے۔[4] درباری شعراء میں سے بدرالدین بدر، رفیع، کمال، جلالی اور عرشی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں مگر اس کے دربار میں سب سے زیادہ قدر و منزلت فراھی کو حاصل تھی جو اس کا درباری شاعر تھا جو اکثر جنگی معرکوں میں بھی اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے کلام سے خوش ہو کر وہ اکثر اس کو خلعت و انعام سے نوازتا رہتا۔[5]

سلطان ابراھیم شاہ شرقی کا فوجی نظام بھی بہت عمدہ اور کامیاب تھا۔ اُس سے پہلے شرقی فوج میں صرف چالیس ہزار سوار، تیس ہزار پیادے اور گھوڑے سے توپچی اور باربردار تھے۔ ہاتھیوں کی کل تعداد ستر تھی۔ ان میں سے بیس ہاتھی اعلیٰ جنگی تربیت حاصل کیے ہوتے تھے اور محاذِ جنگ کا بڑا تجربہ رکھتے تھے۔ سلطان نے اپنے عہد میں پیدل فوج، گھڑ سواروں، ہاتھیوں اور گھوڑوں کی تعداد میں کافی اضافہ کیا۔ تذکرۃ سلاطینِ جونپور میں ہے کہ اس کے عہد میں ایک لاکھ سوار، پچاس ہزار پیدل، دو ہزار توپچی اور باربردار تھے، ان

---

[1] سلاطینِ جونپور (قلمی)
[2] ایضاً
[3] ایضاً
[4] ایضاً
[5] ایضاً

ہیں سات سو گھوڑے خالص عربی النسل، اور تین سو ہاتھی اعلیٰ تربیت یافتہ تھے جو ہر وقت جنگ کے لیے تیار کھڑے رہتے تھے۔ فوجیوں اور گھوڑوں کے طبی معائنہ کے لیے ماہرین مقرر تھے جو طویلوں میں داروغۂ اصطبل کی مدد سے گھوڑوں کی غذا، مالش اور صفائی کی جانچ پڑتال کرتے اور حسب ضرورت داروغہ کی بازپرس بھی کرتے۔ اصطبل کے معائنہ کے لیے سلطان ابراہیم خود بھی باقاعدہ گشت لگایا کرتے۔ ممالکِ محروسہ کے بھی تمام رسالدار ہر ہفتہ اپنے اپنے حالات کی تفصیلات دارالحکومت بھیجتے۔ اس کے رسالدار ہندو مسلم دونوں تھے۔ اس کے مشہور رسالدار سہیل خاں، ملک رسول خاں، تاتار خاں، مبارک خاں گنگ، ملک علی گجراتی، مہربان خاں، ملک کالو، سید عبداللہ، مجھو جا سنگھ، سانونت سنگھ، محمد خاں اور دریا خاں تھے۔ اس کے جن رسالداروں کا قیام پرگنوں اور دیہاتوں میں رہتا تھا اُن کو بھی حکم تھا کہ وہ دارالحکومت جونپور سے باقاعدہ اور براہِ راست خط و کتابت رکھیں۔ امراء اور جاگیردار بھی اس زمرہ میں شامل تھے۔ پوری فوج کے اخراجات شاہی خزانہ سے دیے جاتے تھے۔ رسالدار اور جاگیردار اپنے ملازمین کی تنخواہ اور جانوروں کی خوراک ہر ماہ صدر دفتر سے وصول کیا کرتے تھے[۱]

سلطان ابراہیم شاہ کا ایک مخصوص فوجی دستہ عراقی دستہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے سپہ سالار سید مخلص تھے۔ اس میں کوئی ہندوستانی سپاہی بھرتی نہیں کیا جاتا تھا اور تمام سپاہی عرب اور بلوچ ہوتے تھے۔ اس دستہ کے ذمہ قلعۂ شاہی محلات اور شہر کی حفاظت تھی[۲]۔ سلطان ابراہیم نے دارالحکومت جونپور کی حفاظت کے لیے قلعہ کرار کوٹ کو از سرِ نو مرمت کروایا تھا جہاں اس نے امراء اور سرکاری ملازمین کے لیے بہت سے نئے کمرے، ایک حمام اور مسجد کا اضافہ کیا تھا[۳]۔ سلطنت کے دوسرے حصوں میں بھی اس نے پرانے قلعوں کو از سرِ نو مرمت کروایا اور خاص طور پر رائے بریلی کے پرانے قلعہ کو از سرِ نو آباد کیا تھا[۴]۔

---

[۱] سلاطین جونپور (قلمی) (۲) ایضاً [۳] جونپور نامہ ص ۳۶-۳۷

[۴] The Sharqi Architecture of Jaunpur, Vol. I, P. 23.

سلطنت کے بعض اہم مقامات پر کئی نئے قلعے بھی بنوائے۔ ان قلعوں میں سے والمتو، نصیرآباد، ہردوئی اور بھلنڈی کے چار قلعے قواب تک شکستہ حالت میں موجود ہیں[1]۔

سلطان الشرق ملک سرور کی طرح اُس نے بھی ہر شاہی ملازم کے لیے یہ ضروری قرار دے رکھا تھا کہ وہ اپنی چہرہ نویسی کرواتے۔ گویا ہر ملازم کا پورا حلیہ، جسم کے داغ دھبے اور آنکھ کا رنگ وغیرہ رجسٹر کر لیا جاتا تھا۔ اور ان چیزوں کے ملاحظہ کے بعد ملازمین کو تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ اس طرح شاہی گھوڑوں پر بھی شاہی نشان داغ دیا جاتا تھا تاکہ اُن کی خوراک کے انتظام کے علاوہ تعداد کا صحیح اندازہ بھی ہو سکے اور سرقہ کا سدِ باب کیا جا سکے[2]۔

سلطان ابراہیم نے اپنی حدودِ سلطنت میں خبر رسانی کا بہت عمدہ اور محکم انتظام کیا ہوا تھا۔ اس نے اڑیسہ سے قنوج تک اور اسی طرح ہر مقام سے دُوسرے مقام تک جانے والی تمام سڑکوں پر جگہ جگہ خبر رسانی کی چوکیاں تعمیر کرائی تھیں[3]۔ ان چوکیوں میں شاہی ملازمین رہتے تھے جو سربمہر خطوط کو اپنی اگلی چوکی پر پہنچاتے۔ اس طرح خطوط باقاعدگی سے دارالحکومت جونپور سے تمام علاقہ جات محروسہ کو اور وہاں سے دارالحکومت میں باقاعدہ پہنچتے رہتے تھے۔ بعض اہم خطوط برق رفتار گھڑسواروں کے ذریعے آن کی آن میں منزلِ مقصود پر پہنچا دیے جاتے تھے۔

سلطان ابراہیم شاہ جنگ کے دنوں میں اس محکمہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا کرتا۔ ایک حصہ تو دارالحکومت سے بدستور خبریں لانے اور لے جانے میں مصروف رہتا اور دُوسرا محاذِ جنگ پر خاص خدمات بجا لاتا۔ جنگ کے موقعہ پر بعض تجربہ کار اور ہوشیار اشخاص کو بھی خفیہ خبر رسانی کے لیے ملازم رکھا جاتا تھا۔ ملک حسین اور علاءالحق خاص طور پر اس کام کے بہترین ماہر مانے جاتے تھے[4]۔

---

[1] The Monumental Antiquities and Inscriptions in the N.W. Provinces and Oudh Vol. II, pp. 319-325.

[2] سلاطین جونپور (قلمی) [3] ایضاً

[4] سلاطین جونپور (قلمی) تجلیات العارفین ص ۵۴

سلطان ابراہیم شاہ کو فنِ تعمیر کا اور خاص طور پر اپنے دار السلطنت کو خوبصورت عمارات سے آراستہ کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اس نے اپنے عہدِ حکومت میں جونپور اور سلطنت کے دوسرے حصوں میں بھی بہت سے باغات، محلات، دیوان خانے، دربارِ خاص، حوض، باولیاں، کنوئیں، پل، مہمان سرائیں، بازار، مسجدیں، خانقاہیں، مقبرے، روضے، قلعے اور سڑکیں وغیرہ تعمیر کروائیں۔ جونپور میں جہاں آج کل حوضِ خاص واقع ہے وہاں سکندر لودھی کے حملہ سے پہلے شاہی محلات اور سرکاری عمارتیں تھیں وہاں ہر محل ایک دوسرے سے تقریباً ۲۰۰ گز کے فاصلہ پر تھا۔ حوضِ خاص انہی محلات میں مقیم لوگوں کی سہولت کے لیے خاص طور پر بنایا گیا تھا اور رقبہ میں ۸۔۱۰ ایکڑ کے لگ بھگ تھا۔ اس میں شاہی بیگمات کے نہانے کے لیے خاص انتظام کیا گیا تھا[1] اور وہاں پردے کا بہت زیادہ اہتمام کیا گیا تھا[2]۔ شاہی محلات میں سے ایک محل لال دروازہ بہت مشہور تھا۔ اس کی عمارت میں ایسے نایاب اور بیش قیمت سرخ پتھر لگائے گئے تھے جو رات کو معمولی روشنی کے عکس سے بھی جگمگا اٹھتے تھے۔ اس کا صدر دروازہ بہت بلند اور کشادہ تھا جس کے پھاٹک کو کھولنا اور بند کرنا اکیلے آدمی کے بس میں نہ تھا[2]۔ اس نے ایک خاص محل چہل ستون بھی تعمیر کرایا۔ جو تین منزلہ تھا اور اس کی عمارت بڑی عالیشان تھی۔ وہ تمام زندگی اپنے جملہ سماجی و تہذیبی امور اس محل میں سرانجام دیتا رہا۔ صبح صادق کے مصنف محمد صادق لکھتے ہیں کہ جب یہ محل مکمل ہو رہا تھا تو اس نے ایک رات مزدوروں کو آپس میں یہ باتیں کرتے ہوئے سنا کہ اب تو بادشاہ کا محل مکمل ہونے کو آیا ہے۔ اس کے بعد اب اس کو ہماری ضرورت نہیں رہے گی۔ نہ جانے اب ہماری روزی کا کیا ہوگا۔ یہ سن کر اس نے اگلے ہی روز حکم دے دیا کہ اس محل کی تمام عمارت کو گرا دیا جائے اور اسے از سرِ نو تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ ایسے

---

[1] سلاطینِ جونپور (قلمی) تجلیات العارفین ص ۴۵
[2] ایضاً

ہی ہوا اور یہ محل دوبارہ بڑے طویل عرصہ کے بعد مکمل ہوا۔ حوضِ خاص کے جنوب مشرق میں اس کا ایک اور شاہی محل روشن محل نام کا تھا۔ شاہی عمارتوں میں سب سے زیادہ اسے سجایا گیا تھا[۱] اور فی الحقیقت یہ تھا بھی سب سے زیادہ خوبصورت و خوشنما۔ اس نے صدر دروازہ پر ایک ایسا قمقمہ لگایا گیا تھا جو رات ہوتے ہی کسی مسالہ سے خود بخود روشن ہو جاتا اور اس کی روشنی میلوں تک جاتی تھی[۲]۔ اسی طرح سلطان ابراہیم کا ایک اور عظیم الشان محل جنت محل تھا[۳]۔ سلطان نے ان تمام محلات کی تعمیر محمد خاں کی زیرِ نگرانی کروائی تھی جو دہلی سے سلطان الشرق ملک سرور کے ہمراہ یہاں آئے تھے[۴]۔ دہلی سے آئے ہوئے دوسرے معماروں میں اکرام اللہ، شمس الدین، چراغن، قاسم علی، واحد خاں اور نبی بخش وغیرہ مشہور تھے۔ ہندو معماروں میں پورنماشی، رام کبیر اور بسنت فنِ تعمیر کے مشہور ماہرین تھے۔ شرقی عمارات اگرچہ ان سب نے مل کر بنائی تھیں لیکن ان میں محمد خاں فنِ تعمیر کے سب سے قابل و کامل استاد تھے۔ پہلے وہ سلطان فیروز شاہ کے عہد میں دہلی میں شعبۂ تعمیرات کے افسرِ اعلیٰ بھی رہے۔ جونپور کی بہت سی عمارات مثلاً محل بدیع منزل، محل لال دروازہ، محل سرا، دربارِ خاص، مدرسۂ نسواں، بارہ دری، متعدد مساجد اور دوسرے محلات انہی کی زیرِ نگرانی تعمیر ہوئے تھے[۵]۔ ان کی تعمیر کردہ بعض مساجد کی عمارات تو آج بھی مؤرخین اور سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں اور فنِ تعمیر کا بہت عمدہ نمونہ ہیں۔ سلطان ابراہیم نے بہت سے باغ بھی لگوائے تھے۔ ان باغوں میں سے ایک خوبصورت باغ دریائے گنگا کے کنارے مکن پور کے قریب دالمؤ میں تھا جہاں اس نے ایک کنواں بھی بنوایا تھا[۶]۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان محمد شاہ شرقی کا مقبرہ بھی اسی باغ

۱۔ صبح صادق۔

Vide Sayyid Hasan Askari, Indian History Congress Proceedings, The Twenty Third Session Aligarh, 1960, part I, pp. 35.

۲۔ سلاطینِ جونپور (قلمی) تجلیات العارفین ص ۴۵ ۔ ۳۔ سلاطینِ جونپور (قلمی)

۴۔ ایضاً تجلیات العارفین ایضاً ۔ ۵۔ ایضاً۔ سلاطینِ جونپور (قلمی)

۶۔ The Monumental Antiquities and Inscriptions in the N.W. Provinces and Oudh, Vol. II, p. 320.

ہیں ہے[۱]۔ سلطان ابراہیم نے کئی قصبے اور گاؤں بھی بسائے۔ ان میں سے ایک ابراہیم آباد کا ذکر مرآۃ الاسرار میں بھی ملتا ہے[۲]۔

سلطان ابراہیم شاہ بڑا سچا دیندار و پابندِ شریعت بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں تمام عدالتیں شرعی طریقِ کار کی پابند تھیں۔ تمام سلطنت میں جگہ جگہ قاضی مقرر تھے۔ جن میں سے بعض صدرالصدور کے عہدہ پر فائز تھے۔ ہر علاقہ اور شہر کا قاضی دارالحکومت جونپور کے قاضی القضاۃ کے ماتحت ہوتا تھا۔ ان قاضیوں کے نائب بھی ہوتے تھے جو مقدمات کی کارروائی کو ترتیب دے کر قاضی کے سامنے پیش کرتے تھے[۳]۔ قاضی کو یہ ہدایت تھی کہ وہ مذہب و ملت کا لحاظ نہ کرے اور اپنے فیصلہ کو عدل و انصاف پر مبنی رکھے۔ کسی قاضی کے فیصلے سے اگر سلطان ابراہیم کو اطمینان نہ ہوتا تو وہ خود دخل دے کر رعایا کی دلجوئی کرتا۔ ہر قاضی کے لیے یہ بھی لازم تھا کہ وہ فنِ حرب و ضرب سے بھی واقف ہو تاکہ بوقتِ ضرورت وہ جنگی خدمات بھی انجام دے سکے۔ قاضیوں کو معقول تنخواہیں اور جاگیریں دی جاتی تھیں اور ان کو سلطنت کا بڑا اہم جزو سمجھا جاتا تھا۔

سلطان ابراہیم شاہ کے ممتاز قاضیوں میں سے قاضی نصیر الدین گنبدیؒ، قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ، قاضی نظام الدین کیکلانیؒ، قاضی رکن الدینؒ، قاضی صلاح الدینؒ اور قاضی خیر اللہؒ تھے۔ سلطان ان قاضیوں کی بے حد عزت کرتا تھا۔ قاضی کے بعد کوتوال کا درجہ تھا۔ وہ شہر کے انتظامی امور کا ذمہ دار ہوتا تھا اور خاص طور پر بادشاہ کی عدم موجودگی میں اس کو شہر کے نظم و نسق کا کلی اختیار ہوتا تھا۔ سلطان ابراہیم شاہ کے عہد کا ایک کوتوال نظام شاہ عدل و انصاف میں بڑا مشہور تھا۔ اس کے عہد میں کوتوالی محلہ چھتری گھاٹ میں ہوتی تھی، جو شہر سے مغرب کی طرف دریا کے کنارے پر اب بھی موجود ہے[۴]۔

---

۱ The Monumental Antiquities and Inscriptions in the N.W. Provinces and Oudh., Vol. II, p. 320.

۲ مرآۃ الاسرار (قلمی)

۳ سلاطین جونپور (قلمی)

۴ ایضاً تجلیات العارفین

سلطان ابراہیم شرقی بڑا رحیم دل بادشاہ تھا۔ اس نے تمام سلطنت میں امن و امان قائم کر رکھا تھا۔ وہ اپنی رعایا پر سختی کرنے کو پسند نہیں کرتا تھا۔ بعض سخت سزائیں اس نے موقوف کر دی تھیں۔ مثلاً آنکھوں میں گرم آہنی سلاخیں ڈال کر اندھا کرنا، ہاتھ پاؤں کاٹنا، ہاتھ پاؤں کے ناخنوں میں میخ ٹھونکنا، پوست کھنچوانا، آگ میں ڈال دینا اور سنگسار کرنا۔ ایسی سزاؤں کو اس نے یک قلم منسوخ کر دیا تھا[1]۔ اس سے پہلے محاذِ جنگ پر جو دشمن گرفتار ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا جاتا تھا۔ کسی کو تختۂ دار پر کھنچوا دیا جاتا اور کسی کا سر کٹوا دیا جاتا تھا۔ مگر وہ ایسی سخت سزاؤں سے بالعموم اِجتناب کرتا اور رعایا کے جُرم و خطا پر نہایت نرم سزائیں دلواتا[2]۔ قاضیوں کو یہ خاص ہدایت تھی کہ مسافروں کے مقدمات میں اِحتیاط برتیں اور اُن کو ہر ممکن سہولت اور آرام پہنچائیں۔ اُن سے مہمان سراؤں اور خانقاہوں میں کوئی رقم وصُول نہ کی جائے۔ اگر اُن سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو دربار میں اس کی شکایت درج کرائی جائے اور کسی کا سامان وغیرہ ضبط نہ کیا جائے[3]۔ اسی کی طرف سے عمّال اور محصّلین کے لیے مستقل حکم تھا کہ وہ مالگزاروں سے ایک بھی حبّہ زیادہ وصُول کر کے خزانۂ شاہی میں داخل نہ کریں۔ فی الواقعہ اس کے قوانین ہر مذہب و ملّت کے لوگوں کے لیے بہت نرم تھے اور اس کی رعایا اس قدر خُوش حال تھی کہ وہ بھی ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کرنا بھول گئی تھی[4]۔

سلطان ابراہیم شاہ چونکہ خود بڑا نیک طینت اور رحمدل بادشاہ تھا۔ اس لیے اس نے اپنی سلطنت میں سفاکی و بیدادگری، فسق و فجور، رشوت ستانی، رہزنی اور چوری جیسے جرائم کے انسداد کے لیے بہت سخت لیکن عادلانہ احکام نافذ کر رکھے تھے۔ اس کے عہد میں ہر امیر و غریب شب و روز آزادی کے ساتھ نقدی اور قیمتی اشیاء لے کر نقل و حرکت کر سکتا

---

[1] سلاطینِ جونپور (قلمی) تجلیات العارفین
[2] ایضاً۔ سلاطینِ جونپور (قلمی)
[3] سلاطینِ جونپور (قلمی)
[4] ایضاً۔ تجلیات العارفین

تھا اور کسی کو مجال نہ تھی کہ اس کی طرف بُری نظر اُٹھا کر دیکھے۔ اس کے عہد میں ہر مسجد میں ایک پہرہ دار بھی ہوتا تھا جو مسجد کی چیزوں کی دیکھ بھال کرتا۔ بڑی مساجد کے ساتھ مدرسے بھی ملحق ہوتے تھے۔ ان کا خرچ اور پیش امام، مؤذن اور خادموں کے تمام اخراجات شاہی خزانہ سے دیے جاتے تھے۔[1]

سلطان ابراہیم شرقی کو سلطنت کی تمام سڑکوں کی درستی اور اُن کے دونوں طرف سایہ دار درختوں کے نصب کرنے کا ہمیشہ خیال رہتا۔ اُس نے تخت نشین ہوتے ہی یہ کام شروع کر دیا تھا۔ سڑکوں کی درستی کے علاوہ ان پر موزوں مقامات پر کنوئیں کھدوائے۔ سرائیں بنوائیں، چوکیاں تعمیر کروائیں۔ مہمان خانوں کے ساتھ ایک مسجد، کنواں، باغ اور باورچی خانہ ہوتا تھا اور اُن میں کوئی بھی مسلمان یا ہندو ٹھہر سکتا تھا۔ مسلمانوں کے لیے مسلمان ملازم اور ہندوؤں کے لیے ہندو ملازم رکھے جاتے تھے۔ مسافروں کو اختیار ہوتا تھا کہ وہ خواہ پکا ہوا کھانا کھائیں یا سامان لے کر خود پکا کر کھائیں۔ ان کو کھانے اور سامان کی کوئی قیمت نہیں ادا کرنی پڑتی تھی۔ آٹا، دال چاول، گھی، تیل، ترکاری اور لکڑی جیسا ہر سامان ہر وقت مہیا رہتا تھا۔ وہاں مسافروں کے علاوہ جانوروں کے لیے بھی گھاس اور چارے کا انتظام ہوتا تھا اور اس کا بھی کوئی معاوضہ مہمانوں اور مسافروں سے نہیں لیا جاتا تھا۔ گرمیوں میں مہمان سراؤں کے علاوہ مختلف مقامات پر ٹھنڈے اور شیریں پانی کی سبیلیں جاری رہتیں۔ جن کے منتظمین ہندو اور مسلمان علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے۔[2]

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کو عمدہ کھانوں کا بے حد شوق تھا۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں دسترخوان کی زینت کا خاص طور پر خیال رکھا۔ اس کے دسترخوان پر ہر وقت ڈھائی تین سو اشخاص شریکِ طعام ہوتے۔ اُن میں اس کے مہمان، قدر انداز، اور اُمرا سبھی شامل ہوتے۔ سفر میں

---

[1] سلاطین جونپور (قلمی)
[2] ایضاً

بھی اس کا دستر خوان کافی وسیع ہوتا۔ مطبخ کا انتظام اُس نے اپنے ایک قریبی عزیز ابوسعید خاں کے سپرد کر رکھا تھا جو اس کام میں کافی مہارت رکھتا تھا[1]۔

اس کے عہد میں غلّہ، گھی، دودھ اور ترکاریوں کا نرخ اتنا ارزاں تھا کہ ایک شخص ایک مہینہ دو روپے میں بڑے آرام سے گزار سکتا تھا۔ اس کے زمانہ میں گیہوں ایک روپے کا ۲½ من، جو ۵½ من، چنا ۴ من، گھی تازہ ۲۰ سیر، شکر دیسی ۱۸ سیر، گوشت بکری فربہ ۸ سیر، گوشت گاؤ ۲۰ سیر، چاول پلاؤ اعلیٰ قسم ۳ من، روغن تلخ ۳۵ سیر اور لکڑی سوختنی ۵۰ من دستیاب تھی[2]۔

سلطان ابراہیم شاہ کے ملازمینِ خاص میں سقّا ۱۶، جاروب کش ۱۴، بادکش ۱۸، باورچی ۱۰، توشہ بردار ۲۲، خدمت گار ۴۰، کفش بردار ۷، پارچہ بردار ۸، دھوبی ۸، حجام ۱۰، مہتر ۲۰، حکیم ۳، اتالیق ۱۲، کنیزیں ۴۰، ماما ئیں ۲۵ اور خواجہ سرا ۱۲ تھے[3]۔

---

[1] سلاطینِ جونپور (قلمی)، تجلیات العارفین

[2] ایضاً۔ سلاطینِ جونپور (قلمی) تنگہ کو روپیہ میں تبدیل کر کے یہ بھاؤ لکھے گئے ہیں۔

[3] ایضاً

سُلطان محمُود شاہ شرقی

(۱۴۴۰ء - ۱۴۵۷ء)

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے انتقال کے بعد ۸۴۰ھ میں اس کا سب سے بڑا بیٹا محمود خاں تخت نشین ہوا اور اُس نے اپنا لقب سُلطان محمود شاہ رکھا۔ اس کا جشن تاجپوشی نہایت تزک و احتشام سے منایا گیا۔ اس موقع پر اسے ہر طرف سے پیغاماتِ تہنیت آئے۔ کسی شاعر نے اس موقعہ پر یہ قطعہ کہا تھا ؎

سریر آرا چو شد ملکِ اتابک[1]
بسالِ فرخ و ایامِ مسعُود
نوشتم مصرعۂ تاریخ از فکر
مبارک باد جشنِ محمُودؒ

۸۴۴ھ

سلطان محمود بھی اپنے والد کی طرح بڑا مذہب پرست اور رعایا کا بہت خیر خواہ تھا۔ اس نے بھی اسلام اور رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے ہمسایہ حکومتوں کے خلاف جہاد کیا۔ سب سے پہلے اس نے والئ بنگال سلطان شمس الدین احمد شاہ (۱۴۳۱-۱۴۴۲ء) کے خلاف قدم اُٹھایا۔ کیونکہ اس نے اپنے آخری دورِ حکومت میں رعایا پر انتہائی ظلم و ستم شروع کر رکھا تھا جس کے

---

[1] سلاطینِ جونپور (قلمی) تجلی نور (قلمی) حصہ سوم

نتیجے میں ملک میں طوائف الملوکی برپا تھی مگر جب اس نے سلطان محمود شرقی کے حملہ (۱۴۴۲ء) کی خبر سنی تو وہ فوراً اپنے اعمالِ بد سے باز آ گیا اور آئندہ بھی اس نے اپنے ملک کے حالات کو درست رکھنے کا وعدہ کیا۔[1]

اسی طرح اگلے سال (۱۴۴۳ء) جب اس کو خبر ملی کہ نصیر خاں والیٔ کالپی/محمود آباد نے قصبہ شاہ پور کو تباہ و برباد کر کے وہاں کے مسلمانوں کو شہر بدر کر دیا ہے اور کچھ مسلمان عورتوں کو زبردستی ناچ اور گانا سکھانے کے لیے ہندو نائکوں کے حوالے کر دیا ہے۔ تو وہ فوجیں لے کر اس کی گوشمالی کے لیے کالپی پہنچا۔ جب نصیر خاں کو اس کی آمد کی خبر ملی تو وہ چندیری بھاگ گیا اور وہاں اس نے سلطان محمود خلجی والیٔ مالوہ کو اپنا محافظ تسلیم کر کے اس سے مدد کی درخواست کی چنانچہ سلطان محمود بھی فوجیں لے کر کالپی پہنچ گیا اور وہاں دونوں فوجوں میں گھمسان کا معرکہ ہوا لیکن شیخ جاپلدہ نے فریقین کے حالات کے پیشِ نظر دونوں میں صلح کرا دی اور نصیر خاں کو پابندیٔ اسلام اور قیامِ عدل کے وعدہ پر دوبارہ بحال کر دیا گیا۔[2]

سلطان محمود بڑا پکا مسلمان تھا اور جذبۂ جہاد سے سرشار تھا۔ چنانچہ اس نے اڑیسہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ تاریخی حوالوں سے اس کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ اس نے یہ حملہ کن حالات سے متاثر ہو کر کیا لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ وہ وہاں کے مسلمانوں پر ہندوؤں کے ظلم و ستم کی خبریں سن کر آمادۂ جہاد ہوا۔ بہر حال اڑیسہ پر اس کا حملہ بڑے زور کا تھا۔ وہاں سے اسے بہت سا مالِ غنیمت بھی حاصل ہوا۔ جنگ میں کامیابی کے بعد اس نے تبلیغِ اسلام کی غرض سے پہاڑ پور میں دو مساجد بھی بنوائیں اور اس علاقے میں قابل مفتیوں کا تقرر کیا۔[3]

---

[1] مطلع السعدین ص ۷۸۲-۷۸۳ R. H. Major; India in the Fifteenth Century, London 1857, p. 15

Jadunath Sarkar; History of Bengal, Vol. II, Dacca 1948, p. 120.

[2] طبقات اکبری جلد سوم ص ۲۷۹-۲۸۲ و ص ۳۲۶-۳۲۹ تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۹۶-۵۹۸۔ معاثرِ رحیمی جلد اوّل ۱۰۱-۱۰۴ [3] طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۸۳۔ تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۹۵ معاثرِ رحیمی جلد اوّل ص ۱۰۴۔ احسن التواریخ (قلمی) ورق ۱۸ام ب، زبدۃ التواریخ (قلمی) ورق ۳۷۵ و

Bihar Through the Ages, p. 94.

اِس واقعہ کے بعد وُہ ایک عرصہ تک دارالحکومت میں مقیم رہ کر ملکی اِنتظامات میں مصروف رہا۔ اِس عرصہ میں اس نے سلطنت کے بہت سے قلعوں کی دوبارہ مرمّت کروائی، وہاں مضبوط چوکیاں بنوائیں اور ان میں قابل فوجی افسروں کا تقرر کیا۔ شہر جونپور کو بھی اس نے خوبصورت عمارات و مساجد اور محلّات سے سجایا۔

انہی دنوں میں جب سلطان علاء الدین عالم شاہ (۱۴۴۵ - ۱۴۷۸ء) سلطنتِ دہلی کا اِنتظام اپنی ملکہ کے دو بھائیوں اور وزیر حمید خاں کے سپرد کر کے بدایوں چلا گیا تو بہلول لودھی نے مقامی سیاست سے فائدہ اٹھا کر دہلی پر قبضہ کر لیا[۱]۔ اس کی بیٹی ملکہ بی بی راجی کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو وہ بہت سٹپٹائی۔ چنانچہ اس نے سلطنتِ دہلی کو اپنا خاندانی حق سمجھتے ہوئے سلطان محمود کو دہلی پر حملہ اور قبضہ کرنے کے لیے آمادہ کیا[۲]۔ سلطان محمود ایک لاکھ ستر ہزار گھڑسوار اور پیادہ فوج اور چودہ سو ہاتھی لے کر منزلیں مارتا ہوا دہلی جا پہنچا (۱۴۵۲ء) اور شہر کا محاصرہ کر لیا[۳]۔ بہلول لودھی چونکہ اس وقت پنجاب میں تھا، اِس لیے اس نے شرقیوں سے ہراساں ہو کر صُلح کے لیے ہاتھ بڑھایا اور شرقی جرنیل دریا خاں لودھی[۴] کی معرفت قلعہ و شہر کی چابیاں بھی پیش کیں۔ مگر دریا خاں نے جان بوجھ کر معاملہ التواء میں ڈال دیا۔ اسی اثناء میں بہلول لودھی شرقیوں کی ایک فوج کو نریلہ کے مقام پر شکست دیتا ہوا دہلی آ پہنچا۔ سلطان محمود ان حالات سے دِل برداشتہ ہو کر جونپور لوٹ آیا اور دہلی کی فتح کا ایسا سنہری موقعہ پھر اس کو کبھی نصیب نہ ہوا[۴]۔ اس کے دو سال بعد ۱۴۵۴ء میں اس نے اپنے باجگزار باغی راجہ ایشور سنگھ والی اوجین کی گوشمالی کی اور اس کے دارالحکومت رہتاس پر قبضہ کر کے وہاں امن و امان قائم کیا[۵]۔

---

[۱] طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۲۹۲ [۲] تاریخ داؤدی ص ۱۳

[۳] ایضاً۔ طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۰۱-۳۰۲ [۴] ایضاً۔ تاریخ داؤدی ص ۱۳-۱۵

واقعات مشتاقی (قلمی) ورق ۷-۸۔ تاریخ خان جہاں و مخزنِ افغانی (قلمی) ورق ۶۵، تحفۂ اکبری شاہی (قلمی) ورق ۲

[۵] Bihar Through The Ages, p. 393.

بہلول لودھی شرقیوں کے محاصرۂ دہلی کو نہ بھولا تھا چنانچہ اس نے پہلے اپنی فوجوں کی از سرِ نو تنظیم کی اور پھر چند سال میں یکے بعد دیگرے میوات، سنبھل، بھونگاؤں[1] اور راپری پر قبضہ جما لیا۔ مگر جب اُس نے اٹاوہ سے شرقی گورنر کو مار بھگایا تو سلطان محمود شاہ بھی فوجیں لے کر موقعہ پر جا پہنچا لیکن پھر ایک ہی دن کی لڑائی کے بعد قطب خاں لودھی نے دونوں میں صُلح کرا دی اور یہ طے ہوا کہ جنگِ نریلہ میں جو شرقی ہاتھی پکڑے گئے تھے وہ واپس کر دیے جائیں نیز سیّد مبارک شاہ اور سلطان ابراہیم شاہ کے عہد کی حدودِ سلطنت کو آئندہ کے لیے حدودِ سلطنت تسلیم کیا جاتے اور موسمِ برسات کے بعد شمس آباد شرقی گورنر جونا خاں سے لے کر لودھیوں کے حوالے کر دیا جاتے[2] مگر موسمِ برسات کے بعد جونا خاں نے صُلح نامہ کے مطابق شمس آباد کو لودھیوں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر بہلول لودھی نے شمس آباد (۱۴۵۶ء۔ ۱۴۵۷ء) پر زبردستی قبضہ کر لیا اور رائے کرن کو وہاں اپنا گورنر مقرّر کر دیا۔ سلطان محمود شاہ کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ فوجیں لے کر شمس آباد جا پہنچا اور دونوں میں دوبارہ جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں قطب خاں لودھی اچانک گھوڑے سے گر پڑا اور گرفتار کر کے جونپور بطور قیدی بھیج دیا گیا[3]۔
اس پر بہلول بڑا پریشان ہوا۔ چنانچہ اس نے رائے کرن کی مدد کے لیے تو شہزادہ جلال اور شہزادہ سکندر کو بھیج دیا اور خود بڑے جوش و خروش سے شرقی فوجی کیمپ پر حملہ آور ہوا لیکن سلطان محمود دورانِ جنگ میں اچانک بیمار ہو کر وہیں فوت ہو گیا (۱۴۵۷ء)۔ چنانچہ ان حالات میں ملکہ بی بی راجی نے بہلول سے صُلح کر لی اور اپنے بڑے بیٹے شہزادہ بھیکن کی تختِ نشینی کا اعلان کر دیا[4]۔

---

[1] بھونگاؤں (پرگنہ) ضلع دشہر مین پوری سے مشرق کی طرف ۹ میل پر واقع ہے۔
[2] طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۰۲۔۳۰۳، تاریخ خان جہانی و مخزنِ افغانی (قلمی) ورق ۶۵ الف۔ تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۳۲۱۔۳۲۲ و جلد دوم ص ۵۹۸۔ مآثرِ رحیمی جلد اوّل ص ۴۴۱۔۴۴۲
[3] طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۸۴
[4] تاریخ خان جہانی و مخزنِ افغانی (قلمی) ورق ۶۵، طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۰۲، تاریخ داؤدی ص ۱۶ مآثرِ رحیمی جلد اوّل ص ۴۴۱۔۴۴۲۔ تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۹۸

سلطان محمود شاہ شرقی اپنے والد کی طرح بڑا مذہب پرست اور علم دوست بادشاہ تھا۔ اس نے علماء، فضلاء، صوفیاء اور رعایا کے لیے مساجد، خانقاہیں اور مدرسے تعمیر کروائے اور اُن کو ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔[۱] تبلیغ اسلام کے لیے اس نے بہار کے کئی مقامات پر مساجد بنوائیں اور وہاں جیّد علماء اور مفتیوں کا تقرر کیا۔[۲] اس نے بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح اپنے وُزراء، اُمراء اور جاگیرداروں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور اُن کے لیے ہر طرح کی امداد و وظائف کو جاری رکھا۔[۳] اسے فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ اس نے جونپور میں عالی شان مساجد کے علاوہ کئی خوبصورت عمارات اور محلات تعمیر کروائے جونپور کی لال دروازہ مسجد اور محل نماز گاہ اسی نے بنوایا تھا۔[۴] اس کے وزراء و امراء بھی فنِ تعمیر کے بڑے دلدادہ تھے جن میں اس کے ایک غلام انبیا حاکم بنارس نے بنارس میں ایک بازار اور اپنے نام کی منڈی بنوائی تھی۔[۵] سلطان محمود کے عہد میں ایک جدید طرز کا ریشمی کپڑا بنایا جاتا تھا جسے "محمودی" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ کپڑا اب بھی کہیں کہیں تیار کیا جاتا ہے۔[۶]

تمام مؤرخین نے سلطان محمود کے عہدِ حکومت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور اس کو بڑا ذی شان اور شریف النفس بادشاہ قرار دیا ہے۔ اس نے اپنے دور کے تمام سیاسی، مذہبی اور ثقافتی معاملات میں پوری طرح دلچسپی لی اور ان میں نمایاں کامیابی بھی حاصل کی۔ نظام الدین احمد اور نور الحق لکھتے ہیں کہ اس کے عہد میں لوگ بہت خوشحال تھے۔ اور اس کی محبت و شفقت سے فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔ اس کے عہد میں جونپور شہر لوگوں کی امیدوں کا مرکز تھا اور اس کی شان و شوکت کا سکہ تمام دشمنوں پر بیٹھا ہوا تھا۔[۷] فرشتہ لکھتے ہیں کہ اس نے انتظامِ سلطنت بڑے عمدہ پیرائے میں چلایا اور سلطنتِ شرقی کو اس کے عہد میں بڑی ترقی ہوئی۔[۸]

Bihar Through The Ages, p. 94.

۱ تفصیلات کے لیے اس کتاب کے صفحات ۱۴۸ - ۱۵۰ و ۱۶۶ - ۱۶۸ ۔ ۲

۳ سلاطین جونپور (قلمی) تجلیات العارفین ۴ تاریخ آثارِ بنارس ۵ ایضاً

۶ تاریخ آثارِ بنارس ۷ زبدۃ التواریخ (قلمی) ورق ۲۷۴ ب، طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۷۸-۲۷۹

۸ تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۹۵

ملکہ بی بی راجی

سلطان محمود شرقی کی ملکہ بی بی راجی کا شمار تاریخ ہند و پاکستان کی بڑی ذی مرتبت ہستیوں میں ہوتا ہے۔ اور اس کے نام اور کام سے گلبدن بیگم، نور جہاں، جہاں آرا، اور زیب النساء کی یادیں تازہ ہوتی ہیں۔ اس کی دانش مندی، امورِ سلطنت میں اپنے شوہر کی مدد، مذہب پرستی، فنونِ لطیفہ سے شغف اور فنِ تعمیر کا شوق تاریخ ہند و پاکستان میں سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔

اس نے علماء و صوفیاء کی خدمات، رعایا کی فلاح و بہبود اور خاص طور پر تعلیم نسواں کے لیے جو قابلِ قدر کام کیے وہ عہدِ وسطیٰ میں عدیم المثال مانے جاتے ہیں۔ اُس نے بہت سی مساجد، خانقاہیں، مدرسے، پُل، روضے اور مقبرے بنوائے، کئی گاؤں بھی بساتے جو آج بھی زبانِ حال سے اس کے ذوق و شوق اور عظمت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس کے عہد کی ایک حسین یادگار محل نماز گاہ تھا، جس کی تعمیر میں اس وقت کے بہترین کاریگروں نے حصّہ لیا تھا۔ اس سے ملحقہ ایک مدرسہ، مہمان خانہ، حوض اور باغ بھی تھا۔ ملکہ اسی محل میں اپنی کنیزوں اور سہیلیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ محل مسجد لال دروازہ کے پاس تھا اور مسجد کی طرح یہ بھی لال پتھر سے بنایا گیا تھا[۱]۔ اس کا ایک اور محل، محل بی بی راجی نام کا بھی تھا جو جامع مسجد جونپور کے قریب تھا اور چوڑائی میں ۴۰ فٹ اور لمبائی میں ۱۹۰ فٹ تھا۔ سلطان سکندر لودھی نے اپنے زمانے میں اس کو مسمار کر دیا تھا لیکن بعد میں اس کو سلطان حسین شاہ شرقی کے پوتے عمر خاں نے مرمت کروا کے اپنی رہائش گاہ بنا لیا تھا۔ بعد میں شرفیوں کے جانشین صدیوں تک اس میں رہتے رہے[۲]۔

---

[۱] سلاطین شرقی (قلمی) تجلیات العارفین

[۲] جونپور نامہ ص ۵۲

D. G. Azam Garh, pp. 243-246.

ملکہ نے اپنی چہیتی بیٹی لاڈلی بیگم کے لیے بھی جونپور سے کچھ فاصلہ پہ ایک نالے کے کنارے ایک محل کی بنیادیں استوار کی تھیں۔ یہ نالہ شہر جونپور اور کرنجہ کے درمیان آج بھی بہتا ہے۔ یہاں اس نے کچھ رہائشی کمرے ایک پل اور ایک مسجد بھی تعمیر کروائی تھی[1]۔ لیکن یہ محل لودھی اور شرقی جنگوں کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکا اور سکندر لودھی نے اس محل کی بنیادوں اور بنے ہوئے رہائشی کمروں اور پل کو بھی تباہ و برباد کر دیا تھا[2]۔ اب صرف وہاں ایک مسجد باقی ہے جو مسجد بی بی راجی کے نام سے مشہور ہے[3]۔

ملکہ بی بی راجی کی تعمیر کی ہوئی جونپور کی لال دروازہ مسجد شرقی فنِ تعمیر کا ایک شاہکار مانی جاتی ہے۔ یہ شہر جونپور کے موجودہ محلّہ بیگم گنج (لال دروازہ) میں ہے۔ یہ مسجد اس نے مخدوم سیّد علی داؤد جونپوریؒ کی سہولت و آرام کے لیے بنوائی تھیں۔ علاوہ ازیں اُس نے اُن کے لیے ایک خانقاہ بھی بنوائی تھی۔ اس مسجد سے ملحقہ ایک کالج بھی تھا جس میں درس و تدریس کے لیے قابل علماء کا تقرر کیا گیا تھا۔ وہاں طلبا ملک کے گوشے گوشے سے تحصیلِ علم کے لیے پہنچتے تھے۔ لال دروازہ مسجد میں عورتوں کے لیے عبادت و ریاضت کے لیے پردے کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ اس مسجد کے مرکزی ہال کے دونوں طرف دوسری منزل پہ زنانہ گیلریاں بنائی گئی تھیں اور ان میں اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں مسجد کے اندر سے جاتی تھیں۔ ان زنانہ گیلریوں میں عورتیں درس و وعظ کے موقعہ پر اور نماز و عبادت کے لیے بھی اکثر جمع ہوتیں[4]۔

ملکہ بی بی راجی نے (۱۴۴۱ء میں) تعلیمِ نسواں کے لیے ایک کالج میں قائم کیا تھا[5]۔ اس کو عورتوں کی مذہبی تعلیم و ضروریات کا ہمیشہ احساس اور پاس رہا۔ فی الواقعہ ملکہ نے اس دور میں

---

[1] The Sharqi Architecture of Jaunpur, Vol. I, pp. 9-10 & 13.

[1] جونپور نامہ ص ۷۶

[2] ایضاً [3] ایضاً [4] اس مسجد کے کتبہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسجد ۱۴۴۷ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ جونپور نامہ ص ۵۲-۵۳

[2] Indian Architecture, The Islamic Period, p. 45.

[3] The Sharqi Architecture of Jaunpur Vol. I, pp. 43-44 & 51.

[4] . . . Jaunpur p. 243.

[5] Medievel India under Muhammadan Rule, p.171.

[5] مسلم خواتین کی تعلیم ص ۳۶

تعلیمِ نسواں کے لیے جس قدر کام کیا ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ اس نے مخدوم سید علی داؤد سے اظہارِ عقیدت کے طور پر ایک گاؤں بھی بسایا تھا جو اب تک سید علی پور کے نام سے موجود ہے[1]۔ اس نے اس طرح کے کئی اور بھی قصبے بسائے تھے۔ گو اب ان کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا۔ اس کی بنوائی ہوئی ایک مسجد شہر بنارس میں بھی ہے۔ جو شہر کے چوک میں کافی بلندی پر واقع ہے[2]۔ اس نیک ملکہ کو علماء و فقراء کی خدمت کا بے حد شوق تھا۔ اس نے ان کے لیے صرف مساجد اور خانقاہیں ہی نہیں بلکہ اُن کے لیے درگاہیں اور روضے بھی بنوائے۔ جونپور کے مشہور صوفی سید سلیمان شاہ (المتوفی ۱۴۶۲ء) کا روضہ بھی اسی نے تعمیر کروایا تھا جو آج جونپور شہر میں درگا سلیمان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ۶۵ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور اس کا گنبد بہت بڑا اور عالیشان ہے[3]۔

ملکہ بی بی راجی کی ایک بڑی پیاری سہیلی فیروز خانم تھیں۔ وہ بڑی زیرک اور دانش مند خاتون تھیں۔ اس کو اس نے گلبدن کا خطاب دے رکھا تھا۔ بنارس کا مشہور ریشمی پارچہ "گلبدن" اسی کے نام سے موسوم ہے[4]۔ اس مہذب ملکہ کو چونکہ عورتوں کی فلاح و بہبود کا خیال ہمیشہ ملحوظِ خاطر رہتا۔ اس لیے اُس نے ان کی سہولت کے لیے اسلامی مہینوں کے نئے نام بھی رائج کیے تھے۔ مثلاً محرم کو "واھا" صفر کو "تیرہ تیزی"، ربیع الاوّل کو "بارہ وفات"، ربیع الآخر کو "بڑے پیر" جمادی الاوّل کو "مدا" جمادی الآخر کو "خواجہ مدین" رجب کو "مہ رجب" شعبان کو "شبرات" رمضان کو "روزہ" شوال کو "عید" ذلیقعد کو "خالی" اور ذی الحجہ کو "بقر ید" نام سے رائج کیا تھا[5]۔ جن میں سے بعض "بارہ وفات" جیسے نام آج بھی رائج ہیں۔

---

[1] تجلّیِ نور جلد اوّل ص ۶۴

[2] تاریخ آثار بنارس

[3] The Sharqi Architecture of Jaunpur, Vol. I, p. 62.

[4] تاریخ آثار بنارس

[5] ایضاً

سلطان محمد شاہ شرقی

(۱۴۵۷ - ۱۴۵۸ء)

سلطان محمود شاہ شرقی کی میدانِ جنگ میں اچانک وفات کے بعد شہزادہ بھیکن سلطان محمد شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا[1]۔ اس کا جشنِ تاجپوشی بھی خاندانی روایات کے مطابق بڑے تزک و احتشام سے منایا گیا[2]۔ کسی شاعر نے اس موقعہ پر حسبِ ذیل قطعہ پیش کیا؎

محمد شاہ را شاہی مبارک ‏ ‏ ‏ شود مامون از بیداد و از ظلم
یکے از عقل چوں تاریخ پرسید ‏ ‏ ‏ برآمد سن مبارک گفت الحکم[3]

۸۶۲ھ

سلطان محمد شاہ شرقی قوی ہیکل نوجوان اور شیر صفت بہادر تھا۔ فن سپاہ گری، تیر اندازی، شمشیر زنی اور گھڑ سواری میں بے مثال تھا اور لڑائی میں غنیم پر شیر کی طرح جھپٹتا تھا۔ اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں وہ قوت و دبدبہ میں کہیں زیادہ تھا مگر ظالم طبع اور سخت مزاج تھا۔ حکومت کے طور طریقوں سے بالکل ناواقف تھا[4]۔ اسی لیے امراء و وزراء اُسے ہرگز پسند نہ کرتے تھے۔ بنابریں اسے ان کی طرف سے یہ خطرہ لاحق تھا کہ وہ اسے تخت سے محروم کر کے اُس کے بھائی شہزادہ حسن خان کو تخت پر بٹھادیں گے۔

اس لیے باپ کی وفات کے بعد جب وہ بہلول لودھی سے صلح کر کے جونپور پہنچا تو اس نے اپنے دونوں بھائیوں شہزادہ حسن خاں اور شہزادہ قطب خاں کو قید کر دیا[5]۔ اس کے اس فعل کی وجہ سے اُس کے کئی وفادار امراء بھی اس سے باغی ہو گئے اور ان میں سے کئی ایک کو اس نے قتل بھی کرادیا[6]۔ ان وجوہات کی بناء پر ہر خاص و عام پر اس کے ظلم و ستم کا خوف طاری رہنے لگا۔

---

[1] طبقاتِ اکبری جلد اول ص ۳۰۳ تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۹۹
[2] سلاطینِ جونپور (قلمی) [3] ایضاً [4] ایضاً [5] تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۹۹ [6] ایضاً

ادھر بہلول لودھی اُس صلح نامہ کے بعد جب دہلی کے قریب پہنچا تو اس کی بیوی شمس خاتون کا اُسے پیغام مِلا کہ "میرا بھائی قطب خان لودھی جب تک شرقیوں کی قید میں ہے تم پر کھانا پینا اور سونا حرام ہے۔"[1] بہلول لودھی نے یہ الفاظ سنتے ہی بدلہ لینے کی ٹھان لی اور فوجیں لے کر جونپور کی طرف بڑھا اور منزلیں مارتا ہوا سرسوتی پہنچ گیا۔ سلطان محمد شاہ شرقی بھی اس خبر کو سنتے ہی اپنی فوجیں لے کر مقابلہ کے لیے نکل آیا لیکن جب فوجوں میں مڈبھیڑ ہوئی تو شرقی فوجیں ہمت ہار بیٹھیں[2]۔ اس صورتِ حال سے سلطان محمد شاہ کی بڑی دِل شکنی ہوئی اور اس نے اِس ناکامی کا ذمہ دار اپنے بھائیوں کی بے مروّتی اور اُمراء کی ناچاقی کو ٹھیرایا چنانچہ وہ خود تو بہلول کے مقابلہ پر ڈٹا رہا لیکن کوتوال جونپور کو حکم بھجوایا کہ تخت کے دونوں دعویٰ داروں یعنی شہزادہ حسن خان اور شہزادہ قطب خاں کا سر قلم کر دیا جائے۔ یہ خبر اس کی والدہ کو بھی پہنچ گئی اور وہ اس حکم کی تعمیل میں حائل ہو گئیں۔ سلطان محمد کو جب یہ پتہ چلا تو اس نے والدہ کو پیغام بھیجا کہ وہ خود اسے آکر ملیں تاکہ اُن کی رضامندی سے سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس پیغام کے ملتے ہی ملکہ بی بی راجی جونپور سے چل پڑیں لیکن وہ ابھی قنوج ہی پہنچی تھیں کہ کوتوالِ جونپور نے موقعہ غنیمت سمجھ کر شہزادہ حسن خاں کو قتل کروا دیا[3]۔ اس حادثے کے نتیجے میں ملکہ بی بی راجی، سلطان محمد شاہ کے دوسرے بھائی اور تمام امرا بھی اس کے خلاف ہو گئے اور انھوں نے اتفاق کر کے شہزادہ حسین خاں کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا[4]۔ سلطان محمد شاہ ان حالات سے بوکھلا گیا اور اپنی حفاظت میں تنہا لڑتا ہوا راجگیر کے قریب مارا گیا[5] (۸۵۴ھ)۔ اس کا عہدِ حکومت صرف ۵ ماہ رہا جس میں ایسے واقعات رونما ہوتے رہے کہ جن کی وجہ سے سلطنتِ شرقی کی بنیادیں کھوکھلی ہو گئیں۔

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۹۹ [2] ایضاً طبقاتِ اکبری جلد اول ص ۳۰۴
[3] ایضاً ص ۳۰۴ تاریخ شاہی ص ۱۴-۱۸ [4] طبقاتِ اکبری جلد اول ص ۳۰۵-۳۰۶
[5] ایضاً فرشتہ جلد دوم ص ۳۰۶۔ محمد شاہ دالنو سے ایک میل دُور مکن پور کے ایک باغ میں دفن ہوا جہاں اس کا مقبرہ اس کے بھائی سلطان حسین شاہ شرقی نے تعمیر کروایا تھا۔

سلطان حسین شاہ شرقی

(۱۴۵۸-۱۵۰۵ء)

سلطان محمد شاہ شرقی کے بعد حسین خان (۱۴۵۸ء) شرقی سلطنت کا وارث ہوا۔ اس نے اپنا لقب سلطان حسین شاہ رکھ کر اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا[1]۔ اس کی رسم تاجپوشی کے موقعہ پر کسی درباری شاعر نے حسب ذیل قطعہ پیش کیا تھا ؎

صد شکر حسین شاہ شرقی

بر تختِ جہاں نشست از جنگ

تاریخ بگو ز روئے اقبال

سلطان حسین شاہ اورنگ[2]

۸۶۲ھ

اس کی تخت نشینی کے موقعہ پر سلطان محمد شاہ کے ظلم و ستم اور احمقانہ کاموں کی وجہ سے دارالحکومت جونپور کے سیاسی حالات بڑے خراب تھے۔ اس لیے وہ بہلول لودھی سے صلح کر کے فوراً جونپور پہنچا[3]۔ سب سے پہلے اس نے شہر میں امن و امان قائم کیا اور پھر جن اُمراء اور سرکاری افسروں نے شہزادہ حسن خان کے قتل میں حصہ لیا تھا ان کو سزائیں دیں[4]۔

سلطان حسین شاہ نے اپنے بزرگوں سے بڑی وسیع سلطنت حاصل کی تھی۔ جس کی

---

[1] H.K. Wright; Catalogue of Indian Coins in the Indian Museum, Vol. II, (Muhammadan Series) Oxford 1907, p. 207.

[2] سلاطینِ جونپور (قلمی)، [3] طبقاتِ اکبری: جلد سوم ص ۲۰۷ [4] تاریخ فرشتہ: جلد دوم ص ۳۰۱

سرحدیں ایک طرف کوہ ہمالیہ کے دامن سے لے کر ریاست مالوہ تک اور دوسری طرف بنگال سے لے کر شہر دہلی کے گرد و نواح تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بندھیل کھنڈ اور روھیل کھنڈ بھی اس کی سلطنت کا حصہ تھے لیکن اس قدر وسیع سلطنت بھی اس کے شوق ملک گیری کے لیے اطمینان کا باعث نہ ہوئی اور اس نے اُس کو مزید وسعت دینے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ اس جذبہ و شوق کے تحت اس نے سب سے پہلے اپنی فوج میں اضافہ کیا اور اس کے لیے ہر طرح کا جنگی سامان مہیا کیا[1]۔ جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو سب سے پہلے اس نے اڑیسہ پر حملہ کیا[2] کیونکہ وہاں کے راجہ نے جونپور کے سیاسی انتشار سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے باج ادا کرنا بند کر دیا تھا۔ مگر وہاں پہنچنے سے پہلے اس نے راستے میں ترہٹ کے راجہ کی گوشمالی کر کے اس سے خراج وصول کیا اور پھر اڑیسہ پہنچا[3]۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے ساری ریاست میں لُوٹ مار مچا دی اور راجہ کپلی ایندر (۱۴۳۵ - ۱۴۶۷ء) کو دوبارہ مطیع و باجگزار بنایا۔ راجہ نے اس موقعہ پر اس کی خدمت میں بیش بہا تحفوں اور ساز و سامان کے علاوہ تیس[30] ہاتھی اور سو[100] گھوڑے بھی پیش کیے[4]۔

اڑیسہ کی اس شاندار فتح کے بعد اس کا حوصلہ اور بڑھا اور اب اس نے مغرب کی طرف اپنی حدودِ سلطنت کی توسیع کا ارادہ کیا۔ مگر اس سے پیشتر اُس نے دارالحکومت جونپور کی حفاظت اور انتظام کا پورا پورا بندوبست کیا۔ سلطنت کے تمام قلعوں کی بھی مرمت کرا کے وہاں قابل فوجی افسروں کا تقرر کیا[5]۔ اس کے بعد اس نے راجہ مان سنگھ والیٔ گوالیار کے خلاف فوج کشی کر کے (۱۴۶۶ء) اس کے قلعہ و شہر کا محاصرہ کر لیا۔ بالآخر اس نے اطاعت قبول کر لی اور اس کی خدمت میں بہت سے تحائف کے علاوہ تاوانِ جنگ بھی ادا کیا[6]۔

---

[1] طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۸۴ زبدۃ التواریخ (قلمی) ورق ۳۷۵ [2] ایضاً

[3] R.C. Majumdar; The Delhi Sultanate, Bombay 1960, p. 191.

[4] طبقاتِ اکبری۔ ایضاً۔ تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۶۰۱

[5] طبقاتِ اکبری ایضاً روضۃ الطاہرین (قلمی) ورق ۶۹۱۔ بنارس کا قلعہ اس نے ۱۴۶۵ء میں اس سلسلہ میں از سر نو تعمیر و مرمت کروایا تھا [6] طبقاتِ اکبری ایضاً

ان فوجی معرکوں سے اس کی شہرت دور دراز تک پہنچ گئی اور مملکت کے اقتصادی حالات بھی بہتر ہو گئے۔ چنانچہ وہ بہلول لودھی کی طرف متوجہ ہوا کیونکہ اس نے شمس آباد کو شرقی حاکم جونا خاں سے لے کر رائے کرن کے قبضہ میں دے دیا تھا اور اس کے علاوہ اپنی فوجی طاقت کو بھی بڑھا لیا تھا۔ سلطان حسین بہلول کے ان حالات سے آتش زیر پا تھا اور اس کے خلاف فوج کشی کا موقعہ تلاش کر رہا تھا۔ چنانچہ جب اس کو خبر ملی کہ بہلول کسی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے ملتان گیا ہوا ہے تو وہ ایک لشکرِ جرار لے کر دہلی کی طرف بڑھا۔ راستے میں اس کی فوجی طاقت سے متاثر ہو کر احمد خاں میواتی اور رستم خاں والیٔ کول بھی اس کے ساتھ مل گئے۔ ادھر جب بہلول لودھی کو حملہ کی اطلاع ملی تو وہ فوراً دہلی پہنچا اور اپنی فوج کو مجتمع کر کے چندوار (چندوارہ) مقابلہ کے لیے اُتر آیا۔ بالآخر دونوں میں چندوار کے قریب گھمسان کا معرکہ ہوا (۱۴۶۹ء) مگر ایک ہفتہ کی لڑائی کے بعد جب دونوں جانب کی فوجیں تھک کر چور ہو گئیں تو دونوں حکمرانوں میں تین سال کا معاہدہ ہو گیا اور دونوں اپنے اپنے دارالحکومت واپس چلے گئے۔[1]

سلطان حسین شاہ شرقی نے جونپور پہنچ کر اپنی فوج اور توپ خانے کو از سرِ نو ترتیب دیا[2] اور اپنے باجگزار راجاؤں سے بھی فوجی مدد حاصل کی[3]۔ جب اس نے یہ تمام انتظامات مکمل کر لیے تو دہلی پر دوبارہ حملہ کے لیے اپنے مشیر ملک شمس سے مشورہ کیا لیکن اس نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ اس کے باوجود وہ اپنی چہیتی ملکہ بی بی خونزہ کی خوشنودی کے لیے ایک لاکھ چالیس ہزار گھڑ سوار اور چودہ سو ہاتھی لے کر کول (علی گڑھ) اور برن (بلند شہر) کو فتح کرتے

---

[1] طبقاتِ اکبری، جلد اوّل ص ۳۰۶-۳۰۷، تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۳۲۳-۳۲۴
روضۃ الطاہرین (قلمی) ورق ۲۱۲ ا۔ تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی (قلمی) ورق ۵۰
واقعاتِ مشتاقی (قلمی) ورق ۱۱۔ مآثرِ رحیمی جلد اوّل ص ۴۴۵

[2] روضۃ الطاہرین (قلمی) ورق ۲۱۲ ا

[3] واقعاتِ مشتاقی ایضاً

ہوتے دھلی جا پہنچا اور شہر کا محاصرہ کر لیا[1]۔ بہلول لودھی نے اپنی حفاظت کے لیے سلطان محمود خلجی والی مالوہ سے بھی مدد مانگی لیکن وہ اسی اثناء میں فوت ہو گیا۔ اس صورتِ حال سے گھبرا کر بہلول لودھی حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے روضہ پر تمام رات ننگے سر کھڑا دعا مانگتا رہا۔ بالآخر سلطان حسین کو اس نے پیغام بھیجا کہ مجھے دھلی اور اس کے گرد و نواح کا صرف چھتیس ۳۶ میل کا علاقہ درکار ہے جو باجگزار کی حیثیت سے میرے پاس رہنے دیا جائے۔ لیکن سلطان حسین کے غرور و تمکنت نے اس پیغام کی کوئی قدر و قیمت نہ سمجھی[2]۔ ادھر بہلول پہلے ہی یہ پیغام بھیج کر پچھتا رہا تھا اور سمجھ گیا کہ اسے اب اپنی قسمت کا فیصلہ میدانِ جنگ میں ہی کرنا ہوگا۔ اس کے پاس اس وقت صرف اٹھارہ سو گھڑ سوار تھے۔ جن کو اس نے دریائے جمنا کے دوسرے کنارے، شرقیوں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ سلطان حسین خاں کا معمول تھا کہ وہ اپنی فوج کو لوٹ مار کے لیے ارد گرد کے علاقہ میں بھیجا کرتا[3]۔ چنانچہ جب ایک روز اس سلسلہ میں اس کا لشکر غائب تھا تو بہلول نے موقعہ کو غنیمت جان کر جمنا کو عبور کر کے اس کے خیموں پر حملہ بول دیا۔ سلطان حسین گو خود تو بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ نکلا لیکن اس افراتفری میں وہ اپنی ملکہ بی بی خونزہ کو ساتھ نہ لے سکا۔ بہلول نے ملکہ کو تو گرفتار کر لیا۔ مگر مشیرِ مملکت ملک شمس کو گرفتار کرتے ہی اس کا سر قلم کر دیا اور بعد میں اسی کے سر کے ساتھ ملکہ کو سلطان حسین شاہ کے پاس بھجوا دیا[4]۔ یہ واقعہ ۸۷۰ھ میں پیش آیا۔ اس تباہی و بربادی کے باوجود ملکہ کی شاہانہ ضد اور غرور نے پھر سلطان حسین کو بھڑکایا اور وہ لشکرِ جرار لے کر دوبارہ دھلی کی طرف بڑھا۔ شرقی اور لودھی

---

[1] طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۴۸-۲۴۹
واقعاتِ مشتاقی (قلمی) ورق ۱۱۔ افسانۂ شاہاں (قلمی) ورق ۱۵-۱۸

[2] طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۸۵۔ تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۶۰۲

[3] ایضاً

[4] طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۸۵۔ واقعاتِ مشتاقی (قلمی) ص ۱۲۔
احسن التواریخ (قلمی) ورق ۴۲۰

فوجوں میں پھر بھتو اڑہ کے مقام پر گھمسان کا معرکہ ہوا۔ (۱۴۷۱ء) لیکن اس جنگ میں دونوں کا پلہ برابر رہا اور پھر دونوں میں صلح ہو گئی۔ بہلول اس کے بعد دھلی چلا گیا اور حسین اٹاوہ لوٹ گیا۔[1]

اس واقعہ کے دو سال بعد ۱۴۷۳ء میں پھر دونوں میں سکھیرا کے مقام پر کئی روز تک لڑائی ہوتی رہی لیکن موسم برسات کی وجہ سے سلطان حسین کی قسمت نے پھر یاوری نہ کی اور وہ دوبارہ اٹاوہ لوٹ گیا۔[2] اس دوران میں سلطان حسین کی والدہ ملکہ بی بی راجی فوت ہو گئیں۔[3] وہ اس غم واندوہ سے دوچار تھا کہ بدایوں میں اس کی ملکہ کے والد سلطان علاالدین عالم شاہ بھی فوت ہو گئے (۱۴۷۸ء)۔ چنانچہ وہ بدایوں تعزیت کے لیے پہنچا لیکن رسم تعزیت سے فارغ ہو کر کچھ روز بعد ہی اپنی ملکہ کے بھائیوں کی جگہ خود بدایوں پر قابض ہو گیا۔[4] اب پھر وہ ایک لشکر جرار لے کر دھلی کے قریب جا پہنچا اور دریائے جمنا کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ (۱۴۷۸ء) بہلول لودھی کو اس کے حملہ کی خبر سرہند میں ملی۔ وہ بھی وھاں سے منزلیں مارتا ہوا مقابلہ کے لیے جا پہنچا۔ اس جنگ میں گو سلطان حسین شرقی کو بڑی شاندار فتح ہوئی۔[5] لیکن قطب خاں لودھی نے سلطان حسین شاہ کو اس کی والدہ مرحومہ کا واسطہ دے کر آپس میں صلح کرا دی اور یہ طے پایا کہ آئندہ گنگا سے مشرق کا علاقہ لودھیوں کا اور گنگا سے مغرب کا علاقہ شرقیوں کا تسلیم کیا جائے۔ سلطان حسین شاہ شرقی نے اس صلح کے بعد ایک شاھانہ دعوت کا بندوبست کیا اور اس میں رقص و سرود کا بھی اہتمام کیا۔ اس دعوت کا بندوبست قطب خاں لودھی کے مشورہ پر دریا کے کنارے کیا گیا اور جب رقص و سرود اپنے پورے جوبن پر تھا تو بہلول

---

[1] طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۸۵ [2] ایضاً جلد اوّل ص ۳۰۸
[3] ایضاً۔ تاریخ خان جہانی و مخزنِ افغانی (قلمی) ورق ۵۱
[4] طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۰۹-۳۱۰
[5] ایضاً۔ تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۳۲۵ و ۳۸۵۔ تاریخ داؤدی ص ۱۹ افسانۂ شاہاں (قلمی) ورق ۲۰

نے حسین پر اچانک ایسا چھاپا مارا کہ اس کا فوجی سامان، سامانِ رسد، لاتعداد گھوڑے اور ہاتھی، شاہی خزانہ قبضہ میں کر لیے اور چالیس امراء، وزیرِ اعظم قاضی سماء الدین قتلغ خاں اور ملکہ بی بی خونزہ کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد بہلول نے حسین کا بھی تعاقب کیا لیکن وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ نکلا[1]۔ بہلول کی قسمت کا رُخ اس شاندار فتح کے بعد بالکل بدل گیا اور اس نے پھر بہت جلد کئی شرقی پرگنوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ سلطان حسین نے اپنی بچی کھچی فوج کے ساتھ دوبارہ راپری پرگنہ کے گاؤں رام بجور کے پاس مقابلہ کیا اور پھر ایک بار ہمت و مردانگی کا ثبوت دیا لیکن ہار کھائی۔ بالآخر دونوں میں صلح ہو گئی اور طے پایا کہ آئندہ دونوں اپنی اپنی حدودِ سلطنت سے مطمئن رہیں اور ایک دوسرے کے فتح کیے ہوئے پرگنہ جات واپس کر دیں۔ یہاں سے پھر بہلول دھوپا مؤ چلا گیا اور حسین راپری چلا آیا[2]۔

اس واقعہ کے بعد سلطان حسین زیادہ عرصہ خاموش نہ رہ سکا اور فوج جمع کر کے دوبارہ قسمت آزمانے کے لیے میدانِ جنگ میں کود پڑا (۱۴۸۰-۱۴۸۱ء) لیکن پھر اسے سونہار[3] (سہار) کے مقام پر شکست ہوئی[4]۔ اس نے دوبارہ اپنی فوج کو جمع کیا اور مقابلہ کے لیے آیا لیکن پھر شکست کھائی (۱۴۸۲ء) اور اس دفعہ بھی وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا۔ جب وہ دریائے جمنا کو عبور کر رہا تھا تو اس کے چند بیٹے اور کئی دوسرے افرادِ خانہ ڈوب گئے۔ اس پریشاں حالی میں جب وہ اپنے باجگذار راجہ کیرت سنگھ والئی گوالیار کے پاس جا رہا تھا تو راستے میں ڈاکوؤں نے رہا سہا سامان بھی لوٹ لیا۔ اِس حالت میں جب وہ گوالیار پہنچا تو راجہ کیرت

---

[1] طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۰۹-۳۱۰۔ تاریخ فرشتہ ص ۳۲۵ تا ۳۸۵
تاریخ داؤدی ص ۱۹۔ افسانۂ شاھاں (قلمی) ورق ۲۰

[2] طبقاتِ اکبری ایضاً۔ تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۳۲۵-۳۲۶ منتخب التواریخ (قلمی) ورق ۶۳-۶۴
تاریخ خان جہانی و مخزنِ افغانی (قلمی) ورق ۵۲۔

[3] موجودہ سہاور کا گاؤں ضلع ایٹہ (یوپی) میں واقع ہے اور سکیت سے شمال مشرق کی جانب ۸ میل کے فاصلہ پر ہے

[4] طبقاتِ اکبری جلد اول ص ۳۱۰۔ تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۳۲۵-۳۲۶

سنگھ نے اسے کئی لاکھ تنگہ خراج پیش کیا اور مدد کے لیے گھوڑے، ہاتھی اور کثیر تعداد فوج بھی ہمراہ کر دی، بلکہ وہ اسے راتے گاؤں[1] تک الوداع کرنے بھی گیا[2]۔ بہلول نے اس دوران میں اٹاوہ پر قبضہ کر لیا اور بدستور اُس کا تعاقب کرتا رہا۔ بالآخر دونوں میں اکّا دُکا لڑائیوں کے بعد پھر ایک زبردست جنگ ہوئی لیکن اس جنگ میں بھی سلطان حسین شاہ کو راجہ تلوک چند حاکم بکسر[3] کی نمک حرامی سے شکست ہوئی اور وہ بھٹہ (ریوا) کی طرف بھاگ گیا جہاں اس کے باجگزار راجہ بھید نے اُسے کئی لاکھ تنگہ خراج اور سو گھوڑے پیش کیے اور اسے جونپور تک چھوڑنے بھی گیا[4]۔

جونپور پہنچ کر سلطان حسین شاہ نے پھر فوج کو جمع کیا اور حضرت میاں بدھؒ سے فتح و نصرت کی دعا کی درخواست کی لیکن میاں بدھؒ نے اس کو بُرا شگون دیا[5]۔ ادھر بہلول لودھی بدستور اس کا پیچھا کرتا رہا اور اسے اس وقت خبر ہوئی جب بہلول جونپور کے قریب آ پہنچا۔ صورتِ حالات کو نازک دیکھ کر سلطان حسین جونپور سے بہرائچ کے راستے قنوج کی طرف چل دیا۔ بہلول مسلسل اس کا تعاقب کرتا رہا۔ بالآخر سلطان حسین نے تنگ آ کر کالی ندی کے کنارے دوبارہ مقابلہ کیا۔ جہاں گھمسان کا معرکہ ہوا مگر اسے پھر شکست ہوئی اور اس دفعہ اس کا شاہی چتر اور خزانہ بھی بہلول کے ہاتھ آ گیا۔ بلکہ اس کی ملکہ بی بی خونزہ بھی دوبارہ گرفتار کر لی گئیں۔ مگر پھر وہ کسی حیلے بہانے رہا ہو کر سلطان حسین کے پاس پہنچ گئیں[6]۔ بہلول اس فتح کے بعد (۸۸۳ھ/۱۴۸۴-۱۴۸۳ء) جونپور پہنچا اور کسی دقّت کے بغیر اس پر قابض ہو گیا[7]۔ اس نے وہاں مبارک خاں نوحانی کو حاکم مقرر

---

[1] راتے گاؤں ضلع کانپور (یوپی) کی بلہور تحصیل میں ایک معمولی سا گاؤں ہے۔

[2] طبقات اکبری، جلد اوّل ص ۳۱۰-۳۱۱

[3] بکسر، اناؤ شہر سے جنوب مشرق کی طرف ۳۴ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

[4] طبقاتِ اکبری جلد اوّل، ایضاً تاریخ داؤدی ص ۲۰

[5] افسانۂ شاہاں (قلمی) ورق ۱۷-۱۸

[6] طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۱۲۔ جونپور نامہ ص ۲۷

[7] طبقاتِ اکبری ایضاً تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی (قلمی) ورق ۵۳ ا

کیا اور خود بدایوں کی طرف چلا گیا تاہم سلطان حسین نے اس کی غیر حاضری میں مبارک خاں نوھانی کو جونپور سے مار بھگایا۔[1] بہلول کو جب یہ خبر ملی تو اس نے اپنے بیٹے باربک شاہ اور دُوسرے کئی لودھی امراء کو مبارک خاں نوھانی کی مدد کے لیے بھیجا۔[2] اور خود قطب خاں لودھی کی فاتحہ خوانی کے لیے دہلی چلا گیا۔[3] دہلی سے وہ دوبارہ جونپور کی طرف بڑھا مگر سلطان حسین شاہ شرقی مقابلہ کی تاب نہ لا کر بہار کی طرف چل دیا۔[4] بہلول بھی اس کا باقاعدہ تعاقب کرتا رہا۔ بالآخر اس نے سلطان حسین کے پاس چنار کا علاقہ بطور خاندانی جاگیر کے چھوڑ دیا۔[5] اور شہزادہ باربک شاہ کو جونپور کا حاکم مقرر کر کے اس کو اپنا خطبہ و سکہ بھی جاری کرنے کا اختیار دے دیا۔[6] اس کے بعد وہ خود کالپی، دھولپور اور باری[7] کو فتح کرتے ہوئے دہلی لوٹ گیا۔[8] تاہم اس کی غیر حاضری میں سلطان حسین نے باربک شاہ کو پھر جونپور سے مار بھگایا۔ بہلول کو جب یہ اطلاع ہوئی تو وہ منزلیں مارتا ہوا پھر جونپور کی طرف بڑھا سلطان حسین نے اپنے بھتیجے جلال خاں کو تیس ہزار فوج دے کر اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی ہوئی اور وہ پھر شکست کھا کر بہار کی طرف بھاگ نکلا۔[9] اس کے بعد بہلول دوبارہ باربک شاہ کو بحال کر کے دہلی لوٹ گیا۔ ۱۴۸۸ء میں بہلول گوالیار پہنچا اور راجہ مان سنگھ تنوار کی سرکوبی کی۔ اس کے بعد جب وہ دہلی کے سفر میں تھا تو راستے میں گرمی کی شدت سے بیمار ہو گیا اور پرگنہ سکیت کے گاؤں میلاولی (ملاولی) کے قریب فوت ہو گیا۔ (۱۲ جولائی ۱۴۸۹ء)[10]

اس کے بعد جب سلطان سکندر لودھی سلطنت دہلی پر تخت نشین ہوا تو باربک شاہ نے

---

[1] طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۱۲

[2] طبقاتِ اکبری ایضاً [3] طبقاتِ اکبری ایضاً [4] طبقاتِ اکبری ایضاً [5] طبقاتِ اکبری ایضاً تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۶۰۳۔ اس جاگیر کی سالانہ آمدنی تقریباً ۵ لاکھ ٹنکے تھی۔ [6] طبقاتِ اکبری ایضاً

[7] باری دھولپور (ریاست) کے ریلوے سٹیشن سے مغرب کی طرف ۱۹ میل پر اور آگرہ سے جنوب مغرب کی طرف ۴۵ میل پر واقع ہے۔

[8] طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۱۲ [9] طبقاتِ اکبری ایضاً۔ تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۳۲۷ تاریخ شاہی (قلمی) ورق ۱۸

[10] طبقاتِ اکبری ایضاً۔ تاریخ خان جہانی و مخزنِ افغانی (قلمی) ورق ۵۳-۵۴۔

جونپور میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا[1]۔ مگر سلطان حسین شاہ نے اس کو تختِ دھلی کے لیے ورغلایا۔ چنانچہ وہ اس نیت سے دھلی کی طرف بڑھا لیکن سلطان سکندر نے اس کو راستے ہی میں قنوج کے قریب گرفتار کر لیا اور دوبارہ جونپور بحال کر دیا[2]۔ اس کے بعد سلطان سکندر نے لودھیوں کی طاقت کو مزید استوار کرنے کے لیے جونپور کے گرد و نواح کا علاقہ لودھی جاگیرداروں کو بانٹ دیا[3]۔ لیکن سلطان حسین شاہ کے وفادار زمینداروں اور راجپوت جاگیرداروں نے باچگوٹی راجپوت سردار جوگا (جگا) کی سرکردگی میں پھر لودھیوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس وقت جوگا (جگا) کے پاس دو لاکھ پیادہ فوج اور پندرہ ہزار گھڑسوار تھے۔ اس نے لودھی جاگیرداروں کو شکست دے کر جونپور پر ہلہ بول دیا اور وہاں سے باربک شاہ کو مار بھگا دیا[4]۔ سلطان سکندر کو جب یہ اطلاع ہوئی تو اس کی سرکوبی کے لیے پہنچا مگر جوگا (جگا) منزلیں مارتا ہوا سلطان حسین شاہ شرقی کے پاس قلعہ چھند پہنچ گیا[5]۔ سلطان سکندر نے وہاں پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا لیکن اس بار پھر سلطان حسین کو شکست ہوئی۔ (۸۹۲ھ) اور وہ بہار بھاگ گیا[6]۔ اس کے بعد سلطان سکندر جونپور پہنچا اور باربک شاہ کو وہاں دوبارہ بحال کر کے دہلی لوٹ گیا[7]۔ لیکن ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ جونپور کے مقامی زمینداروں اور راجپوت جاگیرداروں نے دوبارہ بغاوت کر دی اور وہاں سے باربک شاہ کو مار بھگا دیا[8]۔ سلطان سکندر کو جب ان حالات کی خبر ملی، تو اُس نے لودھی اُمراء کو بھیج کر باربک شاہ کو گرفتار کروا کے اسے ہیبت خاں شیروانی اور عمر خاں کی نگرانی میں دے دیا[9]۔

---

۱ طبقاتِ اکبری جلد اول ص ۳۱۴ تاریخ داؤدی ص ۴۵۔ مراۃ العالم (قلمی) ورق ۲۴۶

۲ طبقاتِ اکبری جلد اول ص ۳۱۶ ۳ طبقاتِ اکبری ، ایضاً۔ تاریخ داؤدی ایضاً

۴ طبقاتِ اکبری جلد اول ص ۳۱۷۔ تاریخ خان جہانی و مخزنِ افغانی (قلمی) ورق ۵۶ جگا (جگا) باچگوٹی راجپوت تھا۔ اس راجپوت قبیلہ کے لوگ ضلع جونپور اور گورکھپور کی سرحد پر اب بھی آباد ہیں۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو

Elliot H. M; Memories of the Races of the North West Provinces, Vol. I, p. 47.

۵ طبقاتِ اکبری ایضاً۔ تاریخ داؤدی ص ۴۶-۴۷۔ واقعاتِ مشتاقی (قلمی) ورق ۲۰-۲۱ ۶ تاریخ داؤدی ص ۴۷

۷ ایضاً ص ۴۷-۴۸

۸ طبقاتِ اکبری ایضاً ص ۳۱۷-۳۱۸۔ مراۃ العالم (قلمی) ورق ۲۴۶

۹ Bihar Through The Ages, p. 391.

سلطان حسین شاہ کی اپنی قلمرو میں اس وقت دریائے گنگا کا جنوبی علاقہ اور چنار[1]، چھراند اور بہار کا علاقہ شامل تھا اور ان علاقوں کے تمام زمیندار اور جاگیردار ابھی تک اس کی وفاداری کا دم بھرتے تھے[2]۔ سلطان سکندر آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب تک سلطان حسین اس علاقہ کا حکمران ہے جونپور پر لودھیوں کی طاقت کا مستحکم ہونا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ اس نے چنار کی فتح کے لیے اپنے جرنیل مبارک خاں کو بھیجا۔ سلطان حسین شاہ کو جب یہ اطلاع ملی تو اس نے بھی حاکم چنار کی مدد کے لیے ایک راجپوت سردار کو بھیجا۔ اس جنگ میں (۱۴۹۲ء) لودھیوں کو شکست فاش ہوئی[3]۔ اور جرنیل مبارک خاں کو گرفتار کر کے راجہ بھید والی بھٹہ کے حوالے کر دیا گیا[4]۔ سلطان سکندر کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ راجہ بھید کے خلاف فوج لے کر پہنچا مگر وہ مبارک خاں کو رہا کر کے سلطان حسین کے پاس بھاگ گیا۔ اس کے بعد سلطان سکندر پریاگ، اراپل[5]، کڑہ، دالمؤ اور کول کے علاقوں کو تباہ و برباد کرتا ہوا دہلی لوٹ گیا[6]۔

سلطان سکندر ۱۴۹۴ء میں راجہ بھید کی گوشمالی کے لیے دوبارہ بہار پہنچا۔ راجہ بھید کا بیٹا نرسنگھ[7] مقابلہ کے لیے آیا مگر شکست کھا کر بھاگ نکلا۔ اس کے بعد سلطان سکندر نے اس علاقہ کو بھی خوب تہ و بالا کیا[8]۔ اس دوران میں جب وہ پاپھوند (پھاپھا ماؤ) پہنچا تو وہاں چیزوں کی مہنگائی، سامانِ رسد کی کمی اور بیماری و وبا کی وجہ سے اس کے نوّے فی صدی گھوڑے مر گئے[9]۔ سلطان حسین کو اس کے ان حالات کی خبر ملی تو اس نے اپنے وفادار راجپوتوں کی ایک فوج جمع کر کے اس پر حملہ کر دیا۔ دونوں کی فوجوں میں بنارس سے چھتیس[36] میل کے فاصلہ پر گھمسان کا معرکہ

---

[1] چنار دریائے گنگا کے دائیں کنارے پر واقع ہے اور ضلع مرزا پور (یوپی) کی ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔

[2] افسانۂ شاہاں (قلمی) ورق ۲۵-۲۶ [3] ایضاً ورق ۲۵-۲۶ [4] افسانۂ شاہاں (قلمی) ورق ۲۵

[5] اراپل ایک پرانا گاؤں ہے جو قلعہ الٰہ آباد کے بالمقابل دریائے گنگا اور جمنا کے سنگم پہ دریائے جمنا کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ [6] طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۱۸

[7] طبقاتِ اکبری اور تاریخ فرشتہ کے مصنفین اسے نرسنگھ لکھتے ہیں لیکن مآثرِ رحیمی تاریخ خان جہانی و مخزنِ افغانی اُسے سیر سنگھ لکھتے ہیں جو غالباً درست ہے۔

[8] ایضاً تاریخ خاں جہانی و مخزنِ افغانی (قلمی) ورق ۵۷ [9] ایضاً۔ طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۱۸-۳۱۹

ہوا۔ مگر راجہ بھید کے بیٹے سالباہن کی سازش اور بے وفائی سے سلطان حسین شاہ کو شکست ہوئی۔ (۸۹۴ھ) اور وہ بھٹہ ہوتا ہوا بہار بھاگ گیا[1]۔ سلطان سکندر نے اس کا تعاقب جاری رکھا اور جب وہ بہار پہنچا تو سلطان حسین قلعہ و شہر بہار پر ملک کندو کی حیثیت کو مستحکم کر کے کلگنگ (کہل گاؤں) میں جا پناہ گزین ہوا[2]! یہ جگہ لکھنوتی کا ایک پرگنہ تھی۔ یہاں سلطان علاءالدین حسین شاہ (۱۴۹۳-۱۵۱۸ء) والی لکھنوتی نے اس کا شاہانہ استقبال کیا اور یہ جگہ اور اس سے متعلقہ علاقہ اس کو بطور جاگیر دے دیا۔ نیز اس کو اپنے نام کا سکہ جاری رکھنے کی اجازت بھی دے دی اور مستقبل میں ہر طرح کی مدد اور حفاظت کا وعدہ بھی کیا[3]۔

ادھر سلطان سکندر اس کا تعاقب کرتا ہوا دیوبار[4] جا پہنچا[5] اور کچھ عرصہ وہاں مقیم رہا۔ یہاں سے اس نے ایک فوج قلعہ بہار کو سر کرنے کے لیے بھیجی لیکن ملک کندو اس فوج کا مقابلہ نہ کر سکا تو وہاں سے فرار ہو گیا۔ اس طرح صوبہ بہار بھی سلطنت لودھی میں شامل کر لیا گیا (۸۹۵ھ) اور مبارک خاں نوہانی کو وہاں کا حاکم مقرر کیا گیا[6]۔ بہار کی فتح کے بعد سلطان سکندر والی بنگال کے خلاف فوجیں لے کر بڑھا کیونکہ اس نے سلطان حسین کو پناہ دے رکھی تھی۔ سلطان سکندر بڑھتے بڑھتے تغلق پور تک پہنچ گیا۔ سلطان علاءالدین حسین شاہ نے اپنے بیٹے دانیال کو اس کے مقابلہ کے لیے بھیجا اور بڑھ[7] کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا لیکن دونوں میں لڑے بغیر صلح ہو گئی[8] (۸۹۶ھ)۔

سلطان سکندر اس کے بعد جونپور چلا آیا اور وہاں چھ ماہ مقیم رہا۔ اس دوران میں اس نے

---

[1] طبقات اکبری جلد اول ص ۳۱۹۔ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۱۹

[2] کلگنگ (کہل گاؤں) شہر بھاگلپور (بہار) سے مشرق کی طرف ۲۳ میل کے فاصلے پر دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔ یہ کلکتہ سے ۲۴۵ میل کے فاصلے پر ہے اور ایسٹ انڈیا ریلوے کا سٹیشن بھی ہے۔

[3] منتخب التواریخ (قلمی) ورق ۶۵۔ تاریخ داؤدی (قلمی) ورق ۵۳۔ افسانۂ شاہاں (قلمی) ورق ۲۹، ہفت گلشن محمد شاہی (قلمی) ورق ۲۹ب

[4] افسانۂ شاہاں (قلمی) ورق ۲۹ب، جونپور نامہ ص ۱۹-۲۰

[5] اس کو غالباً دیوار بھی کہتے ہیں۔ یہ صوبہ بہار کے ضلع چمپارن کے شمال مشرقی علاقہ میں ایک گاؤں ہے۔

[6] طبقات اکبری جلد اول ص ۳۲۰۔ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۳۳-۳۳۴ مآثر رحیمی جلد اول ص ۴۹۵

[7] شہر بڑھ ضلع پٹنہ (بہار) میں واقع ہے اور ایسٹ انڈیا ریلوے کا سٹیشن ہے۔ یہ کلکتہ سے ۲۹۹ میل کے فاصلے پر واقع ہے

[8] طبقات اکبری جلد اول ص ۳۲۰۔

شرقی عمارات، محلات اور شرقیوں کی ہر چیز کو تباہ و برباد کر دیا۔ صرف شرقی مساجد علماء کے احتجاج کی بدولت محفوظ رہیں تاہم ان میں سے بعض کے کتبوں کو مسمار کر دیا گیا۔[1]

سلطان حسین شاہ شرقی ابھی تک اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ان دنوں جونپور کا لودھی حاکم جمال خان سارنگ خانی تھا جو شیر شاہ سوری کا پہلا مربی تھا اور بہار کا حاکم دریا خاں نوہانی تھا۔ سلطان حسین شاہ اس علاقے میں لودھیوں کی طاقت مستحکم ہونے سے پہلے قسمت آزمانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے سلطان علاء الدین حسین شاہ سے مشورہ اور مدد مانگی لیکن اس نے اس کو چند سال تک خاموش رہنے کا مشورہ دیا[2] مگر سلطان حسین کی بے تابی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اس لیے وہ اپنی باقی ماندہ فوج کو ترتیب دے کر بہار پہنچ گیا جب دریا خاں نوہانی اس کا مقابلہ نہ کر سکا تو وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا لیکن سلطان حسین شاہ نے اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا[3] سلطان سکندر کو جب یہ اطلاع پہنچی تو اس نے اس علاقہ کے تمام لودھی جاگیرداروں کو دریا خاں نوہانی کی مدد کا پیغام بھیجا لیکن سلطان حسین کی فوج نے رات بھر میں قلعہ کی خندق کو خشک کر دیا۔ اس طرح قلعہ فتح ہونے ہی والا تھا کہ دریا خاں نوہانی کی مدد کے لیے لودھیوں کی نو ہزار فوج پہنچ گئی[4] سلطان حسین کی فوج اس کے مقابلہ میں بالکل معمولی تھی اس لیے وہ قلعہ کا محاصرہ چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اور فتح کی آخری امید سے بھی مایوس ہو کر کلگنگ (کہل گاؤں) واپس چلا گیا۔[5] (۱۵۰۰ء)

اپنی سلطنت کو حاصل کرنے کے لیے سلطان حسین شاہ شرقی کی یہ آخری کوشش تھی۔ اس کے بعد وہ چند سال اور زندہ رہا مگر یہ زندگی اس نے خاموشی سے گزار دی۔ اس کا انتقال

---

[1] طبقاتِ اکبری جلد اول ص ۳۲۰ ۔ تاریخ خان جہانی و مخزنِ افغانی (قلمی) ص ۵۹ ا۔ جونپور نامہ ص ۱۹-۲۰

[2] افسانۂ شاہاں (قلمی) ورق ۳۲ ب

[3] واقعاتِ مشتاقی (قلمی) ورق ۸۰، افسانۂ شاہاں (قلمی) ورق ۳۲-۳۳

[4] ایضاً واقعاتِ مشتاقی ایضاً

[5] ایضاً ورق ۸۶ جونپور نامہ ص ۲۰-۲۱

۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء میں ہوا[۱] اور وہ اپنی وصیت کے مطابق جونپور ہی میں دفن ہوا[۲]۔

سلطان حسین شاہ شرقی بڑی خوبیوں کا مالک تھا اگرچہ اس کی حکومت کا زیادہ عرصہ لودھیوں کے خلاف جنگ و جدل میں گزرا اور اسے آرام و سکون کا بہت کم وقت میسّر آیا لیکن اس کے باوجود اس نے فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر کی دنیا میں بڑی عمدہ یادگاریں چھوڑیں اور بڑا نام پیدا کیا۔ دارالحکومت جونپور کے علاوہ اس نے سلطنت کے دوسرے حصّوں میں بھی عالیشان عمارات، مدرسے، روضے اور مقبرے تعمیر کروائے اور نئے نئے شہر بسائے۔ اس کی عمدہ ترین یادگار جونپور شہر کی جامع الشرق ہے جس کو اس نے (۱۴۷۸ء) میں مکمّل کروایا تھا۔ یہ مسجد شرقی فنِ تعمیر کا اعلیٰ ترین شاہکار مانی جاتی ہے[۳] اور آج تک آباد ہے۔ جونپور میں حسین شاہ کی ایک دوسری یادگار مسجد عیدگاہ ہے جو آج تک استعمال میں ہے[۴]۔ جونپور شہر سے باہر اس کی ایک یادگار جامع مسجد مچھلی شہر ہے[۵]۔ جو اب بھی اچھی حالت میں ہے۔ اس شہر میں سولہ دوسری مساجد کے کھنڈر بھی ملتے ہیں[۶]۔ وہاں ایک کربلا بھی ہے جس کو تیرھویں صدی میں شیخ کریم نے بنوایا تھا اور ایک عیدگاہ بھی جو سولھویں صدی میں محمد منزلی نے بنوائی تھی[۷]۔

سلطان حسین شاہ خود عالم تھا اور علماء و صوفیاء کا بھی بے حد قدردان تھا۔ مولانا صفی جونپوریؒ، شیخ جہانگیر سہروردیؒ، مخدوم بہاءالدین چشتی اور سیّد محمد جونپوری جیسی ہستیوں سے اس کو والہانہ عقیدت تھی اور وہ ان کی بے حد قدر و منزلت کرتا تھا۔ سیّد محمد جونپوری کا وہ شاگرد تھا اور اکثر ان کے درس و تدریس میں شامل ہوتا تھا[۸]۔ اس کو حضرت شاہ مدارؒ سے بھی بڑی عقیدت تھی

---

[۱] اس نے اپنے سکّے ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء تک باقاعدہ جاری رکھے تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو:
H.M. Whitell; Numismatic Supplement (36), J.A.S.B. 1922 N. 35
The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History: pp. 293-301.

[۲] جونپور نامہ ص ۲۰-۲۱   [۳] جونپور نامہ ص ۴۶-۴۹

The Sharqi Architecture of Jaunpur Vol. I; p. 52

[۴] جونپور نامہ ص ۴۷-۴۹

[۵] The Monu... tal Antiquities and Inscriptions in the N.W. Provinces and ... , Vol. II, p. 185.

[۶] تفصیلات کے لیے اس کتاب کے حصّہ دوم کا باب اوّل ... ہوں۔

ان کی درگاہ کا ایک دروازہ (المعروف چور دروازہ) بھی اسی نے بنوایا تھا۔[۱]

سلطنت کے بعض پرانے قلعوں کو بھی اس نے نئے سرے سے مرمت و تعمیر کروایا۔ اور خاص طور پر بنارس کا قلعہ (۱۴۶۵ء میں) از سر نو تعمیر کروایا تھا۔[۲] بعض شہروں کو بھی اس نے از سر نو آباد کیا اور کئی نئے شہر بسائے۔ راتے بریلی کو اس نے از سر نو آباد کروا کر اس کا نام حسین آباد رکھا تھا۔[۳] مگر یہ نام زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔ ایک نئے شہر حسین آباد کی بنیا دیں بھی رکھیں لیکن اس کو بہلول لودھی سے جنگ و جدل کی وجہ سے مکمل نہ کر سکا۔ یہ جگہ اب ایک گاؤں کی صورت میں آباد ہے اور حسین آباد کہلاتی ہے۔ یہ پرگنہ فرید تحصیل بانس دہ میں شہر و ضلع بالیہ سے بارہ میل شمال مشرق کی طرف واقع ہے۔[۴] حسین آباد میں اس وقت کا ایک تالاب بھی اب تک موجود ہے۔[۵] حسین شاہ نے سلطنت کے بعض حصوں میں کئی باغ بھی لگوائے تھے اور لکھن پور کے باغ میں سلطان محمد شاہ شرقی کا مقبرہ بھی اسی نے بنوایا تھا۔[۶]

سلطان حسین فن مصوری کا بھی ماہر تھا۔ ایک منقش جین "کلپ سوترا" اس کے عہد کی حسین یادگار ہے جو اس کے ذوق مصوری کا عمدہ ثبوت ہے۔[۷] سلطان حسین شاہ دنیائے موسیقی کا ایک درخشاں ستارہ تھا اور امیر خسرو دہلوی کے بعد وہ ہند و پاک کا دوسرا بڑا موسیقار مانا جاتا ہے۔ اپنے عہد میں اس کی شہرت سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی اور موسیقی

۱۔ The Monumental Antiquities and Inscriptions in the N.W. Provinces and Oudh, Vol. II, pp. 169-170.

۲۔ طبقات اکبری جلد سوم ص ۲۸۴

۳۔ D. G. Azam Garh, p. 159.

۴۔ Ibid P 159

۵۔ Ibid P 193

۶۔ The Monumental Antiquities and Inscriptions in the N W. Provinces and Oudh, Vol. II, p. 320.

۷۔ Jain Miniature Paintings from Western India, p. 35.

A Halim. J.A.S.P. Vol. I, No. I, 1957, p. 59.

A Halim I. C XIX No. I, Jan 1945, p. 355.

ہیں اپنے کمالات کی وجہ سے انسے گندھروا کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔[1] اس نے بارہ شیام چار ٹوڑیاں اور کئی راگ اور راگنیاں بھی ایجاد کیں۔ راگ خیال بھی اسی کی ایجاد ہے جس کو پہلے شاہجہان، پھر محمد شاہ اور ان کے بعد نوابانِ اودھ کے زمانہ میں بڑی ترقی ہوئی اور جسے اب بھی ہند و پاکستان کے لوگ بڑے شوق سے سنتے ہیں۔[2]

---

[1] مرآۃ آفتاب نما (قلمی) Halim, J.A.S.P. Vol. I, No. 1, 1957, p. 59.
راگ درپن (قلمی) Halim, I. C XIX No. 4, January 1945, p. 335
[2] ایضاً

باب پنجم

شرقی سلاطینِ جونپور کے مذہبی رجحانات

سلطان الشرق ملک سرور

سلطان الشرق کا علما و صوفیا سے نیک سلوک ملک سرور کا عہدِ حکومت گو بڑا مختصر تھا لیکن اس عرصہ میں اس نے اپنے سلیقہ اور صلاحیت جہانبانی سے سلطنتِ دہلی کے منتشر اور ضعیف البنیاد مقبوضات کو ایک مستقل اور مستحکم سلطنت کے قالب میں ڈھال دیا تھا۔ اس نے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے بہت کام کیے۔ رعایا خوشحال تھی اور اس کی سلطنت میں ہر جگہ امن و امان تھا۔[1] وہ علماء و صلحاء کا مربی تھا اور اس کی علم دوستی، مذہب پرستی اور فیاضیوں کی شہرت سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے عہد میں سینکڑوں علماء و صوفیاء جونپور اور سلطنت کے مختلف مقامات میں آکر آباد ہوئے۔ اس نے ان کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ بعض کو جاگیریں بھی دیں۔ ان کو ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اُن کے لیے مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرائیں جن میں درس و تدریس اور تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا باقاعدہ کام ہوتا رہا۔ اس طرح جونپور میں ایسی روایات قائم ہوگئیں جو بعد میں بھی صدیوں تک قائم رہیں۔

---

[1] طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۷۲

مولانا شرف الدین لاہوری اور سلطان الشرق

سلطان الشرق جب کسی عالم و فاضل اور بزرگ دین کی شہرت سُنتا تو اس کو اپنے ہاں مدعو کرتا۔ ان بزرگوں میں سے ایک مولانا شرف الدین لاہوری بھی تھے جو اسی کی دعوت پر جونپور پہنچے تھے۔ ان کے لیے اس نے جونپور میں ایک مدرسہ، خانقاہ اور مسجد تعمیر کروائی[1]۔ جہاں سے سالہا سال تک علم و تصوف کے چشمے پھوٹتے رہے۔ انھیں علوم شریعت پر مکمل عبور تھا اور وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ شرح کافیہ نحو، شرح ازودی اور تفسیر بیضاوی پر حاشیہ ان کی بڑی مستند تصنیفات ہیں[2]۔ وہ ہمیشہ اپنے طلباء کو کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش اختیار کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے کہ دُنیا میں ایک لمحہ صحیح بسر کرنا موت کے بعد کی زندگی کے ہزار ہا سال سے بہتر ہے[3]۔

قاضی نصیرالدین گنبدیؒ اور سلطان الشرق

قاضی نصیرالدین گنبدی جب تیمور کے حملہ سے ہراساں ہو کر جونپور پہنچے تو سلطان الشرق نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور ان کی علمی قابلیت کو سراہتے ہوئے قاضی جونپور کے عہدہ پر فائز کیا[4]۔ مگر یہ کام ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس لیے کچھ عرصہ بعد وہ مستعفی ہو گئے اور باقی ماندہ زندگی درس و تدریس میں مصروف رہے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ اُن کے ہم عصر تھے اور وہ بھی ان کی قابلیت کے بڑے مدّاح تھے[5]۔ زندگی کے آخری حصّہ میں وہ ایک گنبد نما

---

[1] A. Halim, J.A.S.P. Vol VIII, No. 2, Dec. 1963, p. 79.

[2] ایضاً

[3] ایضاً

[4] تجلّی نور، جلد دوم ص ۳۲، تذکرہ علماء ہند ص ۲۳۸۔ آپ قاضی عبدالمقتدر دہلوی کے مقبول ترین شاگردوں میں تھے

[5] اخبار الاخیار ص ۱۷۶، تذکرہ علمائے ہند۔ ایضاً۔

حجرہ میں دن رات یادِ اللہ میں مستغرق رہا کرتے تھے[1]۔ ان کے وعظ و تلقین سے ہزارہا لوگ مستفیض ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ عبادت و ریاضت سے ان کے مریدوں کی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ وہ ان کی خانقاہ میں بمشکل زنجیروں کے سہارے اُٹھ بیٹھ سکتے تھے[2]۔ ان کا اِنتقال ۱۴۱۴ء میں ہوا[3]۔

مخدوم جہانیاںؒ اور سلطان الشرق

بعض کتابوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سیّد جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ جب جونپور تشریف لائے تو سلطان نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور بے شمار لوگ ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہو گئے۔ پھر جب وہ دوبارہ یہاں آئے تو سلطان ابراہیم شاہ نے ان کے قیام کے لیے محلہ بلوچ ٹولہ (جونپور) میں ایک مکان اور ایک مسجد تعمیر کروائی کچھ عرصہ وہاں ٹھہرنے کے بعد قنوج اور پھر مانکپور چلے گئے۔ بعض تاریخی حوالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں قیام کے دوران میں سیّد مبارک شاہ اور سلطان ابراہیم شاہ نے بھی ان سے مشرف بہ بیعت ہوئے[4]۔

مخدوم اخی راجگیریؒ اور سلطان الشرق

ان تمام بزرگوں میں سے مخدوم اخی جمشید راجگیری (المتوفی ۱۳۹۸ء) سے سلطان الشرق کو والہانہ عقیدت تھی[5]۔ وہ غالباً ان ہی کا مرید بھی تھا، ان کی زیارت کے لیے وہ اکثر راجگیر جایا کرتا تھا[6]۔ بعض مذہبی مسائل پر ان کے ساتھ سلطان کی خط و کتابت بھی رہتی[7]۔ سلطان سلطنت

---

[1] تجلی نور جلد دوم ص ۳۲، انھوں نے اپنے گنبد نما حجرۂ عبادت ہی میں انتقال فرمایا اور اسی میں دفن ہوئے اسی وجہ سے وہ گنبدی کہلاتے ہیں۔ [2] تجلی نور ایضاً ص ۳۲۔ اخبار الاخیار ایضاً، تذکرہ علماء ہند ص ۲۳۸
[3] تجلی نور ص ۳۲-۳۳
[4] تذکرۃ الکرام۔ اگر حضرت مخدوم جہانیاں کا سالِ وصال ۱۳۸۴ء یا ۱۳۸۶ء صحیح ہے تو ان کا جونپور آنا غلط ثابت ہوتا ہے کیونکہ سلطان الشرق جونپور ۱۳۹۴ء میں آئے تھے۔ مگر یہ ممکن ہے کہ ان کی ملاقات دہلی یا کسی اور جگہ ضرور ہوتی ہو۔ [5] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۱-۴۵۲ [6] ایضاً [7] ایضاً

کے بعض امور میں ان سے مشورہ بھی لیتا تھا۔ ان کی دعاؤں کو وُہ ہمیشہ باعثِ برکت سمجھتا رہا[1]۔ اس کا یہاں تک خیال تھا کہ شاید سلطنتِ شرقی کا حصول بھی انہی کی نیک دعاؤں کا ثمر ہے۔

حضرت مخدوم اخی جمشید راجگیریؒ کو رقص و سرود سے بھی لگاؤ تھا۔ ایک دفعہ راجگیر میں ہولی کا تہوار منایا جا رہا تھا۔ اِس موقعہ پر بعض ہندو لڑکے زیور پہنے، گاتے اور رقص کرتے ہوئے اُن کے مکان کے پاس سے گزرے۔ اُن کو گاتے اور ناچتے دیکھ کر ان میں بھی ایک ترنگ آئی اور اُن کے ساتھ شامل ہو گئے اور تین دن تک شہر کی گلیوں میں ناچتے اور گاتے رہے۔ جب قنوج اور اس کے گرد و نواح کے لوگوں کو اس کا علم ہوا تو وہ بھی وہاں پہنچ کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اِس طرح سارے شہر میں ناچ اور گانے کا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا[2]۔ اِس صُورتِ حال کو جب قنوج کے قاضی اور مفتی صاحبان اور دوسرے راسخ العقیدہ لوگ برداشت نہ کر سکے تو انھوں نے اِس واقعہ کی تمام تفصیلات سے سلطان الشرق ملک سرور کو آگاہ کیا۔ انھوں نے اِس رائے کا اظہار کیا کہ شیخ اخیؒ دائرۂ اسلام سے باہر جا چکے ہیں اس لیے وہ شرعی سزا کے مستحق ہیں۔ مگر سلطان الشرق نے عُلماء کے فتاویٰ کو بالکل نظر انداز کر دیا[3]۔ اس کے بعد قنوج کے لوگوں نے علمائے جونپور کو لکھا تو انھوں نے بھی ان کے ساتھ اِتفاق کیا[4]۔ یہ تمام حالات جب شیخ اخیؒ کو معلوم ہوتے تو انھوں نے بھی سلطان الشرق کے نام ایک طویل خط لکھا[5] اور اس میں تمام واقعہ اور حالات کی مکمل تشریح کر دی۔ انھوں نے اس خط میں یہ بھی لکھا کہ "در زمین رقص کردہ شدہ است۔ رقص ہوا را از اقبال شاہ آرزو دارم[6]" (میں نے زمین پر تو رقص کر لیا ہے لیکن اب میری آرزو ہے کہ اقبالِ شاہ سے ہوا میں بھی رقص کروں)۔ اس خط کے آخر میں انھوں نے یہ بھی لکھا کہ عشقِ حقیقی میں مرنا میری زندگی کا مدّعا ہے[7]۔

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۲-۴۵۱ [2] ایضاً
[3] ایضاً " ورق ۴۵۲-۴۵۱ [4] ایضاً [5] ایضاً
[6] ایضاً [7] ایضاً

سلطان الشرق ملک سرور نے یہ خط پڑھنے کے بعد علمائے جونپور کے فتویٰ کو بھی یک قلم مسترد کر دیا۔ عبدالرحمن چشتیؒ نے مرآۃ الاسرار میں یہ خط پورا نقل کیا ہے[۱]۔

سلطان الشرق کی وفات کے بعد اس کا منہ بولا بیٹا سلطان مبارک شاہ شرقی (۱۳۹۹ - ۱۴۰۱ء) تخت نشین ہوا۔ اس کا تمام تر عہدِ حکومت اس نوزائیدہ سلطنت کی حفاظت میں گزرا۔ اس کے مذہبی رجحانات کے متعلق کسی کتاب میں کوئی حوالہ نہیں ملتا، سوائے اس کے وہ مخدوم جہانیاں کے حلقۂ ارادت میں شامل تھا[۲]۔

---

[۱] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۱-۴۵۲م - یہ خط مرآۃ الاسرار کے اوراق ۴۵۲ ب سے ۴۵۴ و پر ہے -

[۲] تحفۃ الکرام

سلطان ابراہیم شاہ شرقی

سلطان ابراہیم شاہ کا اپنی رعایا سے نیک سلوک

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا عہدِ حکومت (۱۴۰۱ء-۱۴۴۰ء) متحدہ ہندوستان کے وسطی دور کی تاریخ کا کئی لحاظ سے ایک زریں دور تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں جونپور کی ثقافتی سرگرمیاں عروج کو پہنچ گئیں۔ یہاں تک کہ جونپور ثانی دہلی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس کی علم پروری، مذہب پرستی اور دیانتیوں سے ہزاروں علماء، فضلاء اور صوفیاء جونپور اور شرقی سلطنت کے مختلف شہروں اور قصبوں میں آ کر آباد ہوتے اور ان کے مذہبی اور ثقافتی کاموں کی بدولت اس کے عہد میں احیاءِ اسلام کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

بنگال، ترہت اور کالپی کے مسلمانوں کی حفاظت

سلطان ابراہیم نے نہ صرف اپنی ہندو مسلم رعایا کی بلکہ ہمسایہ حکومتوں کی ہندو مسلم رعایا کی بھی فلاح و بہبود اور تحفظِ مذہب کے لیے یکساں طور پر کام کیے۔ ۱۴۱۴ء میں جب شیخ نور قطب عالمؒ نے میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کو راجہ کنس (جو بھتورہ یہ ضلع راجشاہی کا جاگیردار تھا) کے بنگال پر قبضہ اور مسلمانوں کے قتلِ عام کی اطلاع کی اور سلطان ابراہیم کو بھی ان حالات کا علم ہوا تو وہ ایک لشکرِ جرار لے کر بنگال کی طرف بڑھا۔ مگر راستے میں پہلے اس نے اپنے باجگزار راجہ شیو سنگھ والیٔ ترہت کی گوشمالی کی کیونکہ اس نے بھی راجہ کنس کے بھڑکانے پر وہاں کے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا تھا۔ بالآخر اس نے اس کی جگہ راجہ دیو سنگھ کو بحال کیا ۔ وہاں ایک مسجد بنوائی اور مخدوم شاہ سلطان حسین خلیفہ مخدوم علاء الحقؒ کے لیے ایک رہائش گاہ بھی تعمیر کروائی تاکہ وہاں اشاعتِ اسلام کا کام باقاعدگی سے جاری رہے۔ ان

سب انتظامات کے بعد جب وہ بنگال پہنچا تو راجہ کنس شرقی افواج کے رُعب و دبدبے سے گھبرا اٹھا اور اس نے فوراً شیخ نور قطب عالمؒ کی طرف رجوع کیا اور اپنے اعمالِ بد کی معافی چاہی[1]۔ پھر وہ اپنے بیٹے جادو کو مشرف بہ اسلام کر کے سلطان جلال الدین محمد شاہ (۱۴۱۴-۱۴۳۱ء) کے نام سے تخت نشین کرنے پر راضی ہو گیا۔ علاوہ ازیں اس نے آئندہ کے لیے بھی ظلم و ستم سے باز رہنے کا وعدہ کیا۔ اس طرح جب بنگال میں پوری طرح امن و امان ہو گیا۔ تو سلطان ابراہیم جونپور لوٹ گیا۔[2]

اِس طرح جب سلطان ابراہیم کو (۱۴۲۷ء میں) اپنے باجگزار قادر شاہ (۱۴۱۱-۱۴۳۲ء) والیٔ کالپی کے رعایا پر ظلم و ستم کی خبر ملی تو فوراً فوجیں لے کر اس کی گوشمالی کے لیے پہنچا اور جب اس نے اپنے اعمالِ بد سے باز رہنے کا وعدہ کیا تو لوٹ آیا[3]۔ اس نے ۱۴۳۵ء میں سلطان شمس الدین احمد شاہ (۱۴۳۱-۱۴۴۲ء) والیٔ بنگال کے رعایا پر مظالم کے خلاف بھی فوج کشی کی۔ جب اس نے اپنی سلطنت میں امن و امان قائم رکھنے کا وعدہ کیا تو اس کو بحال رہنے دیا اور واپس آگیا۔[4]

قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ اور سلطان ابراہیم شاہ

سلطان ابراہیم شاہ کو اپنے عہد کے علماء و فضلاء اور صلحاء کے ساتھ بڑی گہری عقیدت تھی اور ان کے ساتھ اس نے ہمیشہ نہایت عمدہ سلوک کیا۔ ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ اس کے عہد کے علمائے عظام میں تھے۔ اس نے ان کی علمی شہرت سن کر انھیں جونپور مدعو کیا تھا اور وہاں ان کے لیے ایک عمدہ گھر اور ایک عالی شان مدرسہ تعمیر کروا کے دیا تھا۔ علاوہ ازیں انھیں ہر طرح کی دوسری سہولتیں بھی بہم پہنچائیں۔[5]

---

[1] ریاض السلاطین جلد سوم ص ۱۱۲-۱۱۴۔ مکتوباتِ اشرفی (قلمی) خط نمبر ۴۵ ورق ۹۲-۹۴

[2] ریاض السلاطین ایضاً۔ مکتوب اشرفی (قلمی) ایضاً۔

[3] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۰۷-۲۱۲

[4] تاریخ محمدی (قلمی) ص ۱۰۱

[5] اخبار الاخیار ص ۱۴۲

وہ ان کی حد درجہ تعظیم و تکریم کرتا اور ان کو اپنے دربار میں اپنے پاس چاندی کی کرسی پر بٹھاتا۔ اس نے انھیں قاضی القضاۃ کے عہدہ پر بھی فائز کیا۔ وہ ان کے فتاویٰ اور فیصلوں کو حد درجہ سراہتا[1]۔ بعض اوقات ان کو جنگی سفروں میں بھی اپنے ساتھ رکھتا۔ قاضی صاحب کو بھی اس کی علم دوستی اور مذہب پرستی کا بڑا پاس تھا اور وہ بھی ان کے ساتھ والہانہ عقیدت رکھتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب اصولِ ابراہیم شاہی اسی کے نام معنون کی۔ یہ کتاب عربی میں علمِ اصول پر بحث ہے۔ مولانا کی ایک اور کتاب فتاویٰ ابراہیم شاہی کا نام بھی سلطان ابراہیم شاہ کے ساتھ ان کی محبت و تعلقِ خاطر کا ثبوت ہے[2]۔ تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی لکھتے ہیں کہ ایک بار مولانا سخت بیمار پڑ گئے تو سلطان ابراہیم ان کی مزاج پرسی کے لیے پہنچا۔ اس نے جب مولانا کی حالت نازک پائی تو پانی کا ایک پیالہ منگوایا اور اس کو مولانا کے سر کے گرد پھرا کر یہ کہتے ہوئے پی لیا کہ اے خدایا! جو بیماری انھیں ہے وہ مجھے لگ جائے۔ مشہور ہے کہ اس واقعہ کے بعد قاضی صاحب تو صحت مند ہو گئے لیکن سلطان ابراہیم بیمار ہو کر فوت ہو گیا[3]۔ "تاریخ فرشتہ" کے مصنف لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے دو سال بعد قاضی صاحب بھی سلطان کے غم میں گھل گھل کر چل بسے[4]۔ ایک سلطان اور عالم کی محبت و عقیدت کی اس قدر اعلیٰ مثال شاید ہی کوئی اور ملے۔

مولانا صفی جونپوریؒ اور سلطان

مولانا صفی جونپوریؒ قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ کے محبوب اور قابل ترین شاگردوں میں سے تھے اور ان کا شمار اس دور کے جید علماء میں ہوتا ہے۔ سلطان ابراہیم شاہ ان کی قابلیت اور اخلاق کا بڑا گرویدہ تھا۔ چنانچہ اس نے انھیں اپنے بیٹوں کا اتالیق مقرر کیا اور ان کی ہر طرح

---

[1] تجلی نور جلد دوم ص ۳۴
[2] ایضاً۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۸۸ [3] ایضاً ص ۸۹۔ تجلی نور جلد دوم ص ۳۶
[4] تجلی نور۔ ایضاً۔

خاطر مدارات کی۔ مولانا نے بھی شرقی شہزادوں کی تعلیم و تربیت بہت عمدہ پیرائے میں کی اور ان کی سہولت کے لیے قافیہ پر ایک شرح بھی لکھی جو اس عہد میں بڑی مقبول ہوئی۔[1]

قاضی نظام الدین کیکلانیؒ اور سلطان

سلطان ابراہیم شرقی نے جب شہاب الدین احمد بن محمد المعروف قاضی نظام الدین کیکلانی (المتوفی ۱۴۷۰) کے علم و بصیرت کی شہرت سنی تو انھیں گجرات سے جونپور مدعو کیا۔[2] قاضی نظام الدین نے اس دعوت کو بڑی خوشی سے قبول کیا۔ جب وہ جونپور پہنچے تو ان کا شاہانہ استقبال کیا گیا اور انھیں قاضی جونپور کے عہدہ پر فائز کیا گیا۔[3] وہ امانت و دیانت اور انصاف میں بے مثل تھے۔ اس بنا پر انھیں تقرب شاہی حاصل رہا اور ان کی شہرت چار سُو پھیل گئی۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی ان کے ہم عصر تھے اور وہ بھی ان کے علم و فضل کے بڑے مدّاح تھے اور خاص طور پر ان کے علمِ دین کے بڑے معترف تھے۔ قاضی شہاب الدین ان دنوں جونپور کے قاضی القضاۃ تھے اور کسی سرکاری تحریر، فیصلہ یا فتویٰ پر اس وقت تک اپنی مہر ثبت نہ کرتے جب تک کہ اس پر قاضی کیکلانی کے دستخط نہ دیکھ لیتے۔[4] جونپور میں ان کے درس و تدریس کے بڑے چرچے رہے اور ہزاروں لوگ ان سے مستفید ہوئے۔ وہ بڑے بلند پایہ مصنف بھی تھے اور ان کی کتاب ابراہیم شاہیہ مجموعہ فتاویٰ حنفیہ بڑے پایہ کی تصنیف مانی گئی ہے۔ یہ کتاب انھوں نے سلطان ابراہیم شاہ شرقی ہی کے مشورہ سے مرتب کی تھی۔[5]

قاضی عبد المقتدرؒ اور سلطان

سلطان ابراہیم شرقی نے اس دور کے یکتائے روزگار عالم و فاضل قاضی عبد المقتدر دھلوی کو بھی جونپور

A. Halim J.A.S.P. Dacca, Vol. VIII, No. 2, Dec. 1963, p. 87.

[1]

[2] تجلی نور جلد دوم ص ۴۰-۴۱

[3] ایضاً

[4] ایضاً

[5] ایضاً

مدعو کیا۔ جن کا قیام جونپور میں تقریباً ایک سال رہا اور اس دوران میں ان کے مواعظ اور مناظروں سے ہزاروں غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے۔ سلطان ابراہیم شرقی نے انھیں ان کے قیام کے دوران میں جملہ سہولتیں بہم پہنچائیں اور ہر طرح سے ان کی خاطر مدارات کی۔ اس نے انھیں مستقل طور پر جونپور میں رہنے کی درخواست کی لیکن انھوں نے دہلی کو چھوڑنا پسند نہ کیا۔[1] وہ اپنی خواہش کے مطابق واپس دہلی چلے گئے۔[2] لیکن اپنے بیٹے شیخ عبدالواحد کو جونپور میں چھوڑ گئے۔ جہاں اس نے اپنے والد بزرگوار کی روایت کو بڑے عمدہ طریقہ سے جاری رکھا۔ جونپور کے مشہور عالم شیخ عبدالصمدؒ انہی کے فرزند ارجمند تھے۔ موخر الذکر اس دور کے جید علماء وصلحاء میں شمار ہوتے تھے۔ سلطان سکندر لودھی ان کے مریدوں میں سے تھے۔[3]

خواجہ سیّد صدر جہاں اجملؒ اور سلطان

خواجہ سیّد صدر جہاں اجملؒ سلسلہ سہروردیہ میں حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔[4] اور اپنے دور کے عظیم المرتبت مشائخ میں شمار ہوتے تھے۔ وہ علم شریعت و طریقت کے جیّد عالم تھے۔[5] سلطان ابراہیم ان کا بہت گرویدہ تھا۔ خاص طور پر وہ ان کی سیاسی بصیرت کا بہت مداح تھا۔ اور اسی بنا پر اس نے ان کو اپنا وزیر منتخب کیا۔ تاہم سیّد اجملؒ اس عہدہ سے بہت جلد مستعفی ہو گئے۔[6] اور اپنا تمام تر وقت عبادت و ریاضت میں گزارنے لگے۔ سلطان ابراہیم نے ازراہِ عقیدت ان کے لیے دریائے گومتی کے کنارے ایک مسجد بھی تعمیر کروائی جو جھنجری مسجد کے نام سے مشہور ہے۔[7] اور شرقی فنِ تعمیر کا ایک اہم شاہکار مانی جاتی ہے۔ سلطان ابراہیم شاہ کا ایک بیٹا بھی ان کا مرید تھا۔ جب وہ فوت ہوا تو حسبِ خواہش ان کی خانقاہ کے پاس ہی مدفون ہوا۔[8]

---

[1] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۴۴۔ تاریخ بدایونی جلد اوّل ص ۳۳۲ A Halim J.A.S.P., Vol. VIII No. 2 1963 pp. 89.

[2] اخبار الاخیار ص ۱۴۸ A. Halim Ibid.

[3] A. Halim Ibid.

[4] ریاض الاولیاء (قلمی) ورق ۱۳۶ الف

[5] ریاض الاولیاء (قلمی) ایضاً [6] ایضاً [7] تجلی نور جلد اوّل ص ۵۰ [8] ایضاً جونپور نامہ ص ۹۰

مخدوم رکن الدّین سہروردیؒ اور ابراہیم شاہ

سلطان ابراہیم شاہ شرقی جب کسی بزرگ کے روحانی کمالات کا حال سنتا تو فوراً اس کی طرف رجوع کرتا۔ اس کے عہد کے مخدوم رکن الدّین سہروردی جونپور کے ذی مرتبت اولیائے کرام میں سے تھے۔ وہ ہمیشہ حالتِ جذب میں رہتے۔ مگر جب اُن کے مرید ان کی زیارت کے لیے جاتے تو وہ ان کے آگے سربسجود ہو جاتے۔ قاضی شہاب الدّین اُن دنوں جونپور کے قاضی القضاۃ تھے۔ جب ان کو اس بات کا علم ہوا تو بہت برہم ہوتے۔ چنانچہ انھوں نے مخدوم کے اس مشرکانہ فعل پر باز پرس کے لیے اپنے ایک شاگرد شیخ عادل کو اُن کے پاس بھیجا لیکن وہ ان سے ملتے ہی فوراً ان کا مرید ہو گیا۔ قاضی صاحب کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ اور بھی برہم ہوتے اور کوتوالِ شہر کو حکم بھیجا کہ مخدوم کو فوراً شہر بدر کر دیا جاتے۔ مگر جب کوتوال یہ حکم لے کر ان کے پاس پہنچا تو ایسا متأثر ہوا کہ وہ بھی ان کا مرید ہو گیا۔ بلکہ اس نے سلطان ابراہیم شاہ کے پاس جا کر عرض کیا کہ میرے خیال میں شہر و سلطنت کی فلاح اسی میں ہے کہ ہم سب مخدوم کی طرف سے خاطر جمع رکھیں اور اُن سے تعرض نہ کریں۔ سلطان ابراہیم کو جب مخدوم کی رُوحانیت کا علم ہوا تو وہ بھی اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا[1] اور پھر ان کی بڑی خاطر مدارات کی۔

مخدوم شیخ محمدؒ اور سلطان

مخدوم شیخ محمد دہلی کے عالی مرتبت بزرگوں میں سے تھے اور اپنے دور کے اولیائے کرام میں شمار ہوتے تھے۔ امیر تیمور کے دہلی پر حملہ کی وجہ سے وہ بھی ہجرت کر کے جونپور پہنچے اور وہاں ایک ویرانے میں ایک درخت کے نیچے ٹھکانہ بنا کر بیٹھ گئے[2]۔ ان کو اسی حال میں کئی ماہ گزر گئے یہاں تک کہ موسمِ گرما شروع ہو گیا لیکن اس سارے عرصے میں کوئی بارش نہ ہوتی اور ایسی قحط سالی پڑی کہ

---

[1] تجلی نور جلد اوّل ص ۳۲۔۳۳
[2] ایضاً ص ۳۶

سلطان اور سبھی پریشان و بدحال ہو گئے۔ چنانچہ سلطان ابراہیم نے اس صورتِ حال کا ذکر شیخ المشائخ قاضی نصیر الدین گنبدی سے کیا۔ قاضی صاحب بڑے صاحب روحانیت بزرگ تھے۔ انھوں نے عرض کیا کہ ہمارے خیال میں کوئی ولی اللہ بے گھر ہے، اور کسی درخت کے نیچے بسر اوقات کر رہا ہے۔[۱] اور اس کے پاس موسمی اثرات سے بچاؤ کا کوئی ساز و سامان نہیں ہے۔ سلطان ابراہیم شاہ نے اس بزرگ کی تلاش کے لیے لوگ بھیجے جنھوں نے شیخ محمد کو ایک درخت کے نیچے پڑا پایا اور سلطان کو آ کر بتایا کہ فلاں جگہ ایک درخت کے نیچے ایک درویش صفت بزرگ اپنے اہل و عیال سمیت ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں جن کا چہرہ جمالِ روحانی سے منور ہے۔ سلطان ابراہیم شاہ اس خبر کو سنتے ہی فوراً ان کے پاس پہنچے۔ پہلے ان سے اظہارِ عقیدت و معذرت کیا اور پھر فوری طور پر انھیں گھاس پھونس کا ایک مکان تیار کروا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ محمد نے جونہی اس مکان میں قدم رکھا بارش شروع ہو گئی اور اس قدر برسی کہ ہر چیز سیراب ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد سلطان ابراہیم شاہ اور دوسرے بے شمار لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔[۲]

امراء و صوفیاء کو تحفظِ اسلام کے لیے جاگیریں

شرقی تاریخ سلطان ابراہیم شاہ کی رعایا سے محبت اور مذہب پرستی کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اپنی سلطنت میں جہاں کہیں اس نے ہندوؤں کی آبادی گنجان پائی وہاں امراء و صوفیاء کو جاگیریں اور مددِ معاش کے لیے قطعات عطا کیے[۳] تاکہ اس علاقہ میں مسلمانوں کی حفاظت ہو اور ان کی مذہبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں خلل نہ پڑے۔

---

[۱] تجلی نور جلد اول ص ۴۶-۴۷

[۲] ایضاً

[۳] مراۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۱-۵۰۲

میر سید علم الدین کو پلادن کی جاگیر

جن لوگوں کو اس نے قطعات اور جاگیریں بخشیں ان میں سے ایک میر سید علم الدین پلادن سہروردیؒ (المتوفی ۸۰۸ھ ہجری) بھی تھے جو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے خلفاء اجل میں سے تھے۔[۱] اور اس دور کے عالی مرتبت بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے حضرت مخدوم اخی جمشید راجگیریؒ اور حضرت میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے ساتھ بھی بڑے گہرے مراسم تھے۔[۲] ان سب کی آپس میں خط و کتابت بھی تھی جن میں مذہبی معاملات پر بحث و گفتگو ہوتی تھی۔ حضرت سید اشرف کے نام ان کا ایک ایسا ہی خط مرآۃ الاسرار میں موجود ہے۔[۳] ان کا تعارف مخدوم اخی جمشید راجگیریؒ نے سلطان ابراہیم سے کروایا اور اس نے ان کو پرگنہ سدھور میں پلادن[۴] کی جاگیر عطا کی۔[۵] تاکہ وہ وہاں آباد ہو کر اشاعتِ اسلام کا کام کریں۔ میر سید علم الدین جب جاگیر کے فرمان کے سلسلہ میں جونپور پہنچے تو سلطان ابراہیم شاہ نے ان کا شاہانہ استقبال کیا اور پلادن میں بھی ان کو ہر طرح کی سہولتیں مہیا کیں۔[۶] پلادن میں ہندوؤں کی آبادی کثرت سے تھی اور ان کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ بہت برا تھا اور ان کے جان و مال کو ہر وقت خطرہ لاحق رہتا تھا۔ اسی بناء پر انھوں نے حضرت مخدوم اخی راجگیریؒ کے مشورے سے وہاں ایک حفاظتی قلعہ بھی تعمیر کروایا۔[۷] تاکہ وہ مسلمانوں کے جان و مال اور مذہب و ثقافت کا صحیح معنوں میں تحفظ و نگہبانی کر سکیں۔

خواجہ ابوالفتح سوبرنیسؒ اور سلطان

خواجہ ابوالفتح سوبرنیس چشتیؒ (المتوفی ۸۴۵ھ) قاضی عبدالمقتدرؒ دہلوی کے پوتے تھے اور اپنے زمانہ کے متبحر علماء اور بلند مرتبت صوفیاء میں شمار ہوتے تھے۔[۸] ان کی تعلیم و تربیت

۱؎ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۱ الف ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً ورق ۵۰۱-۵۰۲

۴؎ بعض نے اس کو پلاتیں لکھا ہے۔ بعض نے پلاؤں اور بعض نے پلادن۔

۵؎ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۱-۵۰۲ ۶؎ ایضاً ۷؎ ایضاً

۸؎ اخبار الاخیار ص ۱۷۰

قاضی عبدالمقتدرؒ کے زیر سایہ ہوتی تھی اور انہی کے وہ مرید و خلیفہ تھے[1]۔ امیر تیمور کے دہلی پر حملہ کی وجہ سے وہ بھی جونپور چلے آئے اور وہاں سلطان ابراہیم شرقی نے ان کو ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ وہ ہمیشہ ان کے ساتھ بڑی عزت و تکریم سے پیش آتا اور اُن کے کمالات کی بڑی قدر افزائی کرتا[2]۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ بھی ان کے زہد و ورع سے بڑے متاثر تھے اور ان کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ دونوں میں اکثر علم اصول، کلام اور فقہ پر بحث مباحثے بھی ہوتے[3]۔ خواجہ صاحب نے بعد میں ان مباحث کے موضوعات پر کئی رسالے بھی تصنیف کیے[4]۔ ان کے درس و تدریس اور خرمنِ کمال سے ہزاروں نے روحانی فیوض حاصل کیے[5]۔ اور ان کے بعد ان کی روایات کو اُن کے شاگردوں اور خُلفا نے بھی جونپور اور اس کے گرد و نواح میں صدیوں تک جاری رکھا۔

شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ اور ابراہیم شاہ

شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ علومِ ظاہری میں قاضی شہاب الدین کے شاگرد تھے اور قاضی صاحب نے انہی کی خاطر شرحِ اصولِ بزدوی لکھی تھی[6]۔ دعیائے تصوف میں وہ پہلے حضرت شیخ ابوالفتح سوبزیںؒ سے بیعت ہوئے[7]۔ لیکن بعد میں شیخ فتح اللہ اودھیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے تھے[8]۔ اور اپنے دور کے عظیم المرتبت علماء و صوفیاء میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے چالیس سال تک عزلت نشینی اختیار کیے رکھی اور تمام عمر توکل علی اللہ پر گزار دی[9]۔ اگر کوئی بادشاہ یا امیر ان کی خدمت میں کوئی ہدیہ بھیجتا تو اسے ہرگز قبول نہ کرتے[10]۔ سلطان ابراہیم شرقی کو بھی ان سے والہانہ عقیدت تھی اور وہ بھی ان کے حلقۂ ارادت میں شامل

---

۱. اخبار الاخیار ص ۱۷۰

۲. مراۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۹ و

۳. اخبار الاخیار ص ۱۷۰

۴. ایضاً

۵. ایضاً مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۹ و

۶. اخبار الاخیار ص ۱۷۵

۷. تجلّی نور جلد اوّل ص ۲۲

۸. اخبار الاخیار ایضاً

۹. ایضاً

۱۰. ایضاً

تھا۔ ایک بار اس نے کچھ رقم اور چند جوڑے کپڑوں کے اُن کی خدمت میں بھیجے لیکن انھوں نے یہ سب کچھ واپس کر دیا اور جواب میں یہ رباعی لکھ بھیجی[1]

من دولت خود باطلسِ شاہاں ندہم
من فقرِ خود بملکِ سلیمان ندہم
از رنج فقر در دل کنجی کے یافتم
ایں رنج را براحتِ شاہاں ندہم

شیخ عیسیٰ سے ہزاروں کو علمی و روحانی فیوض پہنچے۔ ان کے بعض شاگرد بھی نامورِ زمانہ ہوئے۔ وہ جونپور کے مایۂ ناز مشائخ میں شمار ہوتے تھے۔

میر سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے مذہبی دورے اور مناظرے

حضرت میر سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ (المتوفی ۸۴۱ھ) کا شمار پاک و ہند کے ان چند جلیل القدر علما و مشائخ میں ہوتا ہے۔ جو تمام عمر اس ملک میں اور عالمِ اسلام میں اپنے مذہبی دوروں، تقریروں، تحریروں اور مناظروں کے ذریعے اشاعتِ اسلام کے لیے سرگرم عمل رہے۔ ان کے درس و تدریس اور مناظروں سے ہزاروں غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے اور جو مسلمان تھے وہ راہِ مستقیم پر گامزن ہوتے[2]

میر سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ اور قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ کی باہمی عقیدت

ایک بار جب وہ مذہبی دورہ پر جونپور پہنچے تو وہاں ان کے فیوض و برکات سے علماء و صلحاء سلطان ابراہیم اور دوسرے بے شمار لوگ مستفید ہوئے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ جیسے نامور عالم نے ان کی صحبت میں بڑے روحانی مدارج طے کیے اور ان سے خرقۂ خلافت بھی حاصل

---

[1] تجلی نور جلد اوّل ص ۲۲

[2] مرآۃ الاسرار (قلمی) خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل۔ ص ۳۷۱۔۳۷۲۔ لطائف اشرفی

کیا تھا[۱]۔ وہ ان کی قابلیت کے بے حد معترف تھے۔ ایک موقعہ پر انھوں نے ان کے متعلق فرمایا کہ ہندوستان میں اتنی صاحب فضیلت شخصیت میں نے کم دیکھی ہے۔ ایک اور موقع پر ان کی کتاب ارشاد کے متعلق فرمایا " اینکہ می گویند کہ سحر از ہندوستان راست آمد غالباً این دو رست است" آپ ہی نے قاضی صاحب کو ملک العلماء کا خطاب دیا تھا[۲]۔ جن دنوں ان کا قیام جونپور میں تھا سلطان ابراھیم بھی قاضی شہاب الدین کی وساطت سے اپنے خوانین و امراء کے ہمراہ کئی بار ان کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا[۳]۔

میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ سے سلطان ابراھیم شاہ کی عقیدت

میر سید اشرفؒ سلطان کی مذہب پرستی، قابلیت اور رعایا پروری کے بڑے معترف تھے۔ آپ کو ایک بار اس نے اپنی مسندِ خاص پر بھی بٹھا دیا۔ جس سے آپ بڑے خوش ہوتے اور جب گھر پہنچے تو فرمایا " چہ سید نسبُ عالی جناب بہ مقاصد مآب الحمدللہ کہ در ہندوستان چنیں مردم در آمدہ اند[۴]"

انھی دنوں سلطان ابراھیم کو قلعہ جنادہ کی فتح میں مشکل پیش آئی تو اس نے آپ سے دعا کے لیے درخواست کی چنانچہ اللہ تعالےٰ کی رحمت سے وہ قلعہ فتح ہو گیا[۵]۔ سلطان ابراھیم شرقی ان کی دعاؤں سے ہمیشہ فیض یاب ہوتے رہے اور ان کے ساتھ اس کی عقیدت روز بروز بڑھتی گئی۔ ایک بار سلطان بعض شہزادوں اور دوسرے آدمیوں کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے پاس اس وقت روٹی کا ایک ٹکڑا اور شربت بھی تھا۔ حاضر ہو کر عرض کیا کہ بندہ تو حضور کے ہاتھ پر بیعت ہو چکا ہے۔ اب یہ لوگ بھی آپ کے حلقۂ ارادت

---

[۱] لطائفِ اشرفی جلد اوّل ص ۴۱۰ ، مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۳۵ ب
[۲] ایضاً لطائف اشرفی ، جلد دوم ص ۱۰۵-۱۰۶ ، بزمِ صوفیہ ص ۵۲۶-۵۲۷
[۳] بزمِ صوفیہ ایضاً
[۴] بزمِ صوفیہ ص ۵۲۷-۵۲۸
[۵] ایضاً لطائف اشرفی جلد دوم ص ۱۰۵-۱۰۶

میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس روز وہ بھی لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت ہوتے[۱]۔ سلطان ابراہیم شاہ کو ان سے والہانہ عقیدت تھی۔ اس نے اُن کو جونپور میں مستقل طور پر قیام کرنے کی درخواست کی لیکن انھوں نے جواب دیا کہ یہ تو ممکن نہیں لیکن تمھاری حدِ سلطنت سے باہر نہیں جاؤں گا[۲]۔ سلطان ان کے اس جواب سے بڑے خوش ہوا۔ پھر آپ تا حینِ حیات کچھوچھہ شریف[۳] ہی کو اپنا مرکز بنا کر علمی و دینی کام کرتے رہے۔

شیخ احمد عبدالحقؒ اور سلطان ابراہیم شاہ

شیخ احمد عبدالحق صابری ردولویؒ (المتوفیٰ ۸۳۶ھ) کا شمار پاک و ہند کے برگزیدہ مشائخ صابریہ میں ہوتا ہے[۴]۔ جب انھوں نے سارے ملک کی سیر و سیاحت کے بعد صابریہ سلسلہ کی خانقاہ ردولی (ضلع بارہ بنکی) میں قائم کی تو وہاں تمام شمالی ہندوستان کے لوگ جوق در جوق حاضر ہونے لگے اور ان کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی۔ وہ امراء و سلاطین کے ساتھ تعلق رکھنے سے ہمیشہ گریز کرتے۔ بعض نے ان کو جاگیریں بھی پیش کیں لیکن انھوں نے کبھی کوئی چیز قبول نہ کی[۵]۔ البتہ کسی امیر و سلطان کی اصلاح کی کوشش سے گریز نہ کرتے۔ ایک بار انھوں نے سلطان ابراہیم شاہ سے اسی غرض سے ملنا چاہا لیکن قاضی رضی حاکم اودھ نے ان کی سلطان کے ساتھ ملاقات کو حکومتی مصالح کے خلاف سمجھا[۶]۔ اور امتحاناً ان کو سلطان کی طرف سے خانقاہ کے مصارف کے لیے چار سو اصنعات اور دو ہزار بیگھہ اراضی کا فرمان اور اس کے ساتھ بہت سے تحائف بھی پیش کیے لیکن انھوں نے ان چیزوں کو قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا اور فرمایا: "قاضی کلمہ پڑھو تم تو کافر ہو گئے۔" قاضی صاحب نے تعجب سے پوچھا۔ "حضور میری زبان سے کونسا ایسا کلمہ نکلا کہ میں کافر ہو گیا۔" آپ نے فرمایا کیا یہ کفر نہیں کہ تم اور ابراہیم دونوں

---

۱ لطائف اشرفی جلد دوم ص ۱۰۵-۱۰۶ ۲ ایضاً بزم صوفیہ ص ۵۲۸

۳ کچھوچھہ ضلع و شہر فیض آباد (یوپی) میں فیض آباد سے ۵۰ میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔

۴ مراۃ الاسرار ورق ۴۷۴ ب اور ۴۷۵ ۵ ایضاً ورق ۴۷۴ ل

۶ ایضاً انوار العیون ص ۲۵-۲۶

رزاقی کا دعویٰ کرنے لگے ہو۔ وہ خدا جس نے تمھیں اور ابراہیم کو خدم وحشم، ہاتھی گھوڑے اور باقی چیزیں عطا کی ہیں۔ وہ میرا بھی خدا ہے۔ میں بھی اسی کی درگاہ کا ایک فقیر ہوں۔ کیا وہ مجھے اور میرے فرزندوں کو رزق نہ دے گا۔ تم اور ابراہیم کیوں درمیان میں آتے ہو۔" قاضی رضی نے فرمان اور دوسرے تحائف قبول کرنے کے لیے بڑا اصرار کیا مگر انھوں نے کوئی چیز وصول نہ کی اور فرمایا: "اگر میں ایسی چیزیں اپنی اولاد کے لیے قبول کرنے لگا تو وہ فقر کی قدر نہ پہچانے گی۔[۱] الفقر کنز من کنوز الجنۃ۔" بہر کیف سلطان ابراہیم بدستور ذوق وشوق کے ساتھ تمام عمر ان کی قدر ومنزلت کرتا رہا۔

شاہ مدارؒ اور سلطان

حضرت شاہ بدیع الدین مدارؒ نے پاک وہند میں سلسلہ مداریہ کو رواج دیا۔ ان کا اصلی وطن ملک شام تھا۔[۲] جب وہ بلادِ اسلامیہ کے سفر وسیاحت کے بعد ہندوستان پہنچے تو سلطان ابراہیم شاہ کی فیاضیوں سے متاثر ہو کر جونپور چلے آئے۔ سلطان ان کے علمی و روحانی فضل وکمال کا بڑا معتقد تھا۔

مکن پور میں مدرسہ اور خانقاہ کی تعمیر میں مدد

چنانچہ اس نے اُن کو مکن پور میں مداریہ سلسلہ کی خانقاہ آباد کرنے میں ہر ممکن مدد وسہولت بہم پہنچائی۔[۳] اس کے بعد آپ نے مکن پور کو اپنا مرکز بنا کر سارے ملک میں تبلیغ دین اور اپنے سلسلہ کی اشاعت کے لیے بڑا کام کیا۔ ان کا معمول تھا کہ وہ جونپور، لکھنؤ، کالپی، مانکپور اور اودھ کے دوسرے شہروں میں مذہبی وتبلیغی دوروں پر جایا کرتے۔[۴] ان کو اپنے مقصد میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور ہزاروں علماء، وصوفیا اور عوام ان سے فیض یاب ہوئے۔[۵] ایک بار جب وہ جونپور آئے تو سلطان ابراہیم شاہ، قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ اور خواجہ سید صدر جہاں

---

[۱] انوار العیون ص ۲۵-۲۶ - مراۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۷۲ و

[۲] مراۃ مداریہ (قلمی نسخہ ذاتی) ورق ۳ و

[۳] ایضاً ورق ۱۷ و

[۴] ایضاً ورق ۱۴-۳۱

[۵] ایضاً ورق ۲۳-۳۰ - سیر الاولیاء ص ۲۱۷ ب

اجملؒ ان کے استقبال کے لیے پہنچے اور ان کی بڑی خاطر مدارات کی[1]۔ وہاں دورانِ قیام میں اُن کی قیام گاہ پر ہر وقت عقیدت مندوں کا جمگھٹا لگا رہتا اور لوگ روزانہ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے لیے آتے[2]۔ ان کا اور قاضی صاحب کا آپس میں بعض مذہبی معاملات پر بحث و مباحثہ بھی ہوتا اور بعد ازاں بعض مذہبی و شرعی موضوعات پر خط و کتابت بھی رہی[3]۔ انھوں نے تقریباً ۱۲۵ سال عمر پائی۔ ان کے انتقال (۸۴۴ھ) کے بعد سلطان ابراہیم شاہ کے ایک صاحبزادے نے اُن کی قبر پر عالیشان روضہ تعمیر کروایا۔ یہ شہزادہ میر سید صدر جہاں اجملؒ کے مریدوں میں سے تھا[4]۔

شاہ عبداللہ شطاریؒ اور سلطان

حضرت شاہ عبداللہ شطاریؒ نے بھی ہندوستان پہنچ کر سلسلۂ شطاریہ کی تبلیغ و اشاعت کا مرکز جونپور ہی کو بنایا۔ وہ علومِ ظاہری و باطنی کے متبحر عالم تھے اور اپنے زمانہ کے عظیم المرتبت بزرگوں میں شمار ہوتے تھے[5]۔ وہ بڑے امیر طبع درویش تھے اور ہمیشہ فوجی لباس میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ رہتے تھے[6]۔ ان کی تبلیغ و اشاعت کا طریق یہ تھا کہ وہ اپنے مریدوں کی ایک جماعت کے ساتھ مذہبی دوروں پر جاتے اور جلسے کرتے اور ہر جلسہ میں حق نمائی کا دعوےٰ کرتے[7]۔ سلطان ابراہیم شاہ شرقی گو علماء و فقراء کا تہ دل سے گرویدہ تھا لیکن جب ان کو شاہ عبداللہؒ کے شاہانہ رہن سہن، طرزِ تبلیغ اور ان کے مریدوں کی فوجی لباس میں ڈھول ڈھمکوں کے ساتھ پریڈ کا علم ہوا تو اس پر اظہارِ تعجب کیا۔ اس کے دل میں ان کی ارادت

۱؎ مرآۃ مداریہ (قلمی نسخہ ذاتی) ورق ۲۳-۳۰۔ سیر الاولیا ص ۲۱۷ ب

۲؎ مرآۃ مداریہ ایضاً۔ سیر الاولیاء ایضاً

۳؎ سفینۃ العارفین (قلمی) ورق ۱۷۱ ا

۴؎ سفینۃ العارفین ایضاً، مرآۃ مداریہ (قلمی) ورق ۳۵-۳۶۔ خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۳۱۲

۵؎ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۷ ا

۶؎ اخبار الاخیار ص ۱۷۱ ۷؎ ایضاً

فضیلت کے بارے میں کسی طرح کے شبہے بھی گزرے۔ چنانچہ وہ ایک روز ان کے جلسہ میں پہنچا اور عرض کیا کہ سنا ہے آپ حق نمائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لیے مجھ پر بھی کوئی چیز آشکار کیجیے۔ شاہ عبداللہ نے جواب دیا کہ اللہ تعالےٰ نے ہر کسی کو کسی نہ کسی کام کے لیے پیدا کیا ہے اور آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ سلطنت کے کاموں میں مشغول رہیں کیونکہ آپ کے اس کام میں خلقت کو نفع ہے۔

سلطان نے دوبارہ عرض کیا کہ یہاں اس جلسہ میں بے شمار لوگ موجود ہیں ان میں سے کسی ایک پر ہی توجہ فرمایئے۔ شاہ عبداللہ نے جواب دیا کہ توجہ حاصل کرنے کے لیے جوہر قابل کا ہونا ضروری ہے۔ سلطان نے پھر عرض کیا کہ کیا اس مجلس میں ہزاروں لوگوں میں سے کوئی بھی اس جوہر قابل کا مالک نہیں ہے۔ بالآخر اس گفتگو سے شاہ عبداللہؒ جلال میں آگئے اور اپنی نظریں چاروں طرف دوڑانے لگے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک بڑا صاحب جمال نوجوان سلطان ابراہیم کے سرہانے کھڑا مگس رانی کر رہا ہے۔ چنانچہ جب انھوں نے اس پر توجہ باطنی فرمائی تو جو کچھ بھی اس کے ہاتھوں میں تھا وہ گر گیا اور وہ خود بھی مدہوش اور بے خود ہوکر گر پڑا۔ بعدازاں جب وہ ہوش میں آیا تو ہر چیز کو چھوڑ چھاڑ کر اُن کا مرید ہوگیا[۱]۔ سلطان ابراہیم اور دوسرے لوگ اس واقعہ سے بے حد متاثر ہوتے اور اس روز اس جلسہ میں بے شمار لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے[۲]۔

شاہ عبداللہؒ کی جونپور سے ہجرت

سلطان ابراہیم شاہ چونکہ ان کے طور طریقوں اور طرزِ تبلیغ سے زیادہ خوش نہیں تھا اس لیے شاہ عبداللہ جونپور سے مانڈو ہجرت کر گئے[۳]۔ اس واقعہ کے متعلق بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ شاہ عبداللہ کے شاہانہ رہن سہن

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۷۱
مراۃ الاسرار (قلمی) ورق ۷ ۴۹ ب

[۲] ایضاً ورق ۷ ۴۹ ب

[۳] ایضاً [۴] ایضاً۔ گلزارِ ابرار (قلمی) ورق ۱۰۱-۱۰۳

اور اُن کے مریدوں کے فوجی لباس اور پریڈ سے سلطان ابراہیم شاہ کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہوں گے اور وہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ ان کے دارالحکومت میں کوئی اس قسم کا فوجی گروہ پنپنے پائے جس سے سلطنت کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔ تاہم سلطان غیاث الدین خلجی والیٔ مالوہ نے مانڈو میں شاہ عبداللہ کی بڑی قدر افزائی کی اور وہاں انھیں اپنے مقصد میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی[1]۔ ان کا سالِ وفات ۸۵۴ھ ہے[2]۔ ان کا روضہ قلعہ مانڈو میں ہے۔ جو مرجع خلائق ہے اس کی عمارت کو بعد میں شہنشاہ جہانگیر نے بنوایا تھا[3]۔

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۷ ب ؛ گلزارِ ابرار (قلمی) ورق ۱۰۱-۱۰۳

[2] مرآۃ الاسرار ایضاً ، گلزارِ ابرار ایضاً

[3] گلزارِ ابرار ایضاً

سلطان محمود شاہ شرقی

سلطان محمود کا علماء و صوفیا سے نیک سلوک

سلطان محمود شاہ شرقی اپنے والد سلطان ابراہیم شرقی کی طرح بڑا مذہب پرست، علم دوست، علماء و صوفیاء کا مربّی اور اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا بہت خیال رکھنے والا تھا۔ اس نے علماء و صوفیاء کے لیے مدرسے، خانقاہیں اور مساجد تعمیر کروائیں اور اشاعت و تبلیغِ اسلام کے لیے بڑے کام کیے۔

ہمسایہ حکومتوں کے مسلمانوں کا تحفظ

سلطان محمود نے بھی مسلمانوں کے تحفظ کے لیے ہمسایہ حکومتوں کے خلاف جہاد کیا۔ اسے سلطان شمس الدین بنگالی (۱۴۳۱-۱۴۴۲ء)[1] کی رعایا پر ظلم و ستم کی خبر ملی تو اس نے اس کی سرکوبی کے لیے فوراً فوج کشی کی مگر سلطان شمس الدین نے اس خبر سے گھبرا کر اپنا طرزِ عمل بدلا اور اپنی سلطنت میں امن و امان قائم کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ جب پوری طرح امن و امان بحال ہو گیا تو سلطان محمود جونپور لوٹ آیا۔[2] ۱۴۴۴ء میں جب سلطان محمود نے نصیر خاں والی کالپی (محمود آباد) کے متعلق سنا کہ اس نے قصبہ شاہ پور سے مسلمانوں کو نکال دیا ہے اور بعض مسلمان عورتوں کو ناچ گانا سکھانے کے لیے ہندو نائیکوں کے حوالے کر دیا ہے تو وہ فوجیں لے کر کالپی جا پہنچا ادھر نصیر خاں کی مدد کے لیے سلطان محمود خلجی والی مالوہ بھی میدان میں کود پڑا اور دونوں کی فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ بالآخر شیخ جائیلدہ نے دونوں میں صلح کرا دی تاہم سلطان نے نصیر خاں سے پابندیٔ اسلام کا وعدہ لے کر اس کی جاں بخشی

---

[1] History of Bengal, Vol. II, p. 129.

[2] مطلع السعدین ص ۷۸۲-۷۸۳

کی[1]۔

جہادِ اڑیسہ

۴۴۳ھ میں اڑیسہ میں سلطان محمود نے تبلیغِ اسلام کے لیے ایک مسجد بنوائی[2] لیکن وہاں کے ہندو مسلمانوں کے ساتھ بدسلوکی پر اُتر آئے اور ان کا قافیہ حیات تنگ کر دیا۔ چنانچہ سلطان محمود نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ اس موقعہ پر اس نے اڑیسہ کو پوری طرح زیر کر لیا۔

پہاڑپور میں مساجد کی تعمیر اور تبلیغ اسلام

بعد ازاں پہاڑپور میں دو نئی مساجد تعمیر کروائیں اور وہاں قابل مفتیوں کا تقرر کیا تاکہ اس علاقے میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا کام باقاعدگی سے ہوتا رہے[3]۔

والیٔ ادجین کی گوشمالی

اسی طرح ۴۷۴ھ میں جب سلطان نے راجہ ایشور سنگھ والیٔ ادجین کی عملداری میں بدانتظامی اور بدامنی کی خبریں سنیں تو اس کے خلاف بھی فوج کشی کی اور وہاں بھی پوری طرح امن و امان قائم کیا[4]۔

شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ اور سلطان محمود

علماء و صوفیاء کی پاسداری اور ان کو ہر طرح کا آرام و آسائش پہنچانا اس کا مسلک تھا۔ شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ جونپور کے عظیم المرتبت مشائخ میں سے تھے اور سلطان کو اُن کے ساتھ والہانہ عقیدت تھی۔ شیخ نمازِ جمعہ کے لیے مسجد خالص مخلص جایا کرتے تھے جو ان کی خانقاہ سے کافی دور تھی۔ چنانچہ سلطان نے ان کی سہولت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اُن سے خانقاہ کے قریب ہی ایک مسجد تعمیر کرنے کی اجازت چاہی۔ انھوں نے سلطان کے اس ارادے کو پسند کیا۔ چنانچہ وہاں

---

۱ طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۶۹-۲۸۲ و ص ۳۲۶-۳۲۹

۲ Bihar Through The Ages p. 99

۳ طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۸۲ تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۹۵

۴ Bihar Through The Ages, p 393

ایک جامع مسجد کی بنیادیں استوار کردی گئیں لیکن سلطان محمود اس کو مکمل کروانے سے پہلے ہی چل بسا۔ یہ مسجد بعد میں سلطان حسین شرقی نے مکمل کروائی جو جامع الشرق کے نام سے مشہور ہے اور اب تک آباد ہے۔ یہ مسجد شرقی فنِ تعمیر کا شاہکار مانی جاتی ہے[1]۔

سلطان محمود کے اُمراء کے دینی کام

سلطان محمود شاہ شرقی کے بعض اُمراء نے بھی خدمتِ دین اور رفاہِ عام کے کاموں میں دلچسپی لی۔ وہ بھی علماء و صلحاء کے بڑے پرستار تھے۔ سلطان کے ایک امیر خالص مخلص تھے جنھوں نے جونپور کے ایک مشہور بزرگ حضرت شیخ عثمان شیرازیؒ کے لیے شہر جونپور میں ایک مسجد بنوائی جو مسجد خالص مخلص کے نام سے مشہور ہے اور شرقی فنِ تعمیر کے شاہکاروں میں شمار ہوتی ہے[2]۔

---

[1] تجلّی نور، جلد اوّل ص ۲۲

[2] جونپور نامہ ص ۵۴-۵۵۔ بعض مؤرخین کی رائے میں ملک خالص مخلص ایک ہی امیر کا نام تھا اور بعض کی رائے ہیں دو مختلف امیروں کا نام تھا اور بعض کی رائے میں ملک مخلص سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے بھائی تھے۔

ملکہ بی بی راجی

ملکہ کے ثقافتی کام

سلطان محمود شاہ شرقی کی ملکہ بی بی راجی سلطان محمد شاہ (۱۴۳۴ء۔ ۱۴۴۱ء) بادشاہ دہلی کی ہمشیرہ تھی[1]۔ وہ ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ میں اپنی مذہب پرستی، رعایا پروری اور دوسری ثقافتی خدمات کی وجہ سے بڑا نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس نے جونپور اور اس کے گرد و نواح میں مساجد و محلات کی تعمیر کے علاوہ رفاہِ عامہ کے لیے بھی کئی عمارات بنوائیں۔ اس نے شہر بنارس میں بھی ایک مسجد تعمیر کروائی۔ جو ایک چوک میں اونچی جگہ پر اب بھی موجود ہے[2]۔ علاوہ ازیں اس نے عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے بھی بڑے کام کیے۔

عُلماء و صوفیاء سے اظہارِ عقیدت

ملکہ بی بی راجی نے علماء و صوفیاء کے لیے مدارس خانقاہیں اور مساجد بنوائیں اور کئی ایک روضے بھی تعمیر کروائے۔ جونپور کے حضرت سلیمان شاہ (المتوفّٰی ۱۴۶۲ء) کے روضہ کی عمارت بھی آپ ہی نے بنوائی تھی۔ یہ عمارت ۶۵ فٹ بلندی پر واقع ہے اور اس کا گنبد بڑا عالیشان اور بلند ہے[3]۔ ملکہ کو جونپور کے ایک بزرگ شیخ علی داؤد سے بے حد عقیدت تھی لہٰذا اس نے ان کے نام پر ایک گاؤں بھی بسایا جو اب بھی علی پور کے نام سے آباد ہے[4]۔ اسی بزرگ کی سہولت کے لیے ملکہ نے

---

[1] Kings of The East, p. 41

[2] تاریخ آثار بنارس

[3] جونپور نامہ۔ سلاطین شرقی (قلمی) تجلیات العارفین (قلمی)

[4] The Sharqi Architecture of Jaunpur Vol. 1, p. 62

جونپور کی لال دروازہ مسجد تعمیر کروائی تھی[1]۔ اِس مسجد کے ساتھ ان کی خانقاہ تھی اور اس سے ملحقہ ایک کالج بھی تھا جس میں طلبا تعلیم کے لیے ملک کے گوشے گوشے سے پہنچتے تھے اور وہاں انھیں ہر طرح کی سہولتیں اور وظائف دیے جاتے تھے[2]۔

عورتوں کے واسطے عبادت و ریاضت کی سہولتیں

اس مہذب ملکہ نے لال دروازہ مسجد کی دوسری منزل پر مرکزی ھال کے دونوں طرف زنانہ گیلریاں بھی بنوائیں تاکہ عورتیں وہاں باپردہ بیٹھ کر عبادت کر سکیں اور جمعہ وعیدین اور دوسرے موقعوں پر درس و وعظ سُن سکیں[3]۔

تعلیم نسواں کے لیے کالج

اس نے ۱۴۴۱ء میں تعلیم نسواں کے لیے جونپور میں ایک کالج بھی بنوایا۔ جس میں عورتوں کی تعلیم کا کام بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوتا رہا[4]۔

عورتوں کی سہولت کیلیے اسلامی مہینوں کے نئے اور آسان نام

چونکہ اسے عورتوں کی فلاح و بہبود کا ہمیشہ پاس رہا۔ اِس لیے اس نے ان کی آسانی کے لیے اسلامی مہینوں کے نام بھی آسان ناموں کے ساتھ رائج کیے۔ مثلاً محرّم کو "داہا"، صفر کو "تیرہ تیزی" ربیع الاوّل کو "بارہ وفات"، ربیع الآخر کو "بڑے پیر"، جمادی الاوّل کو "مدا"، جمادی الآخر کو "خواجہ مدین"، رجب کو "مہ رجب"، شعبان کو "شبرات"، رمضان کو "روزہ" شوال کو "عید"، ذیقعد کو "خالی" اور ذی الحجہ کو "بقرید" کے نام سے رائج کیا تھا[5]۔ ان میں سے بعض نام اب تک زبان زدِ عام ہیں۔

---

[1] تجلی نور جلد اوّل ص ۴۶ ؛ جونپور نامہ ص ۵۲-۵۳

[2] جونپور نامہ ایضاً The Sharqi Architecture of Jaunpur, Vol. I, p. 62

[3] D. G. Jaunpur, p. 244, Indian Architecture Islamic Period, p. 45

[4] مسلم خواتین کی تعلیم ص ۳۶

[5] تاریخ آثار بنارس

سُلطان حسین شاہ شرقی

سلطان حسین شاہ شرقی تاریخِ پاک و ہند کے عہدِ وسطیٰ کی ایک نہایت ذی وقار و دلچسپ شخصیت تھا۔ اس کو فنونِ لطیفہ کا شوق اور رقص و سرود کا خاص ذوق تھا یہاں تک کہ بعض اوقات جنگ کے مواقع پر بھی وہ اس ذوق کی تسکین کا سامان کرنا نہیں بھولتا تھا۔

سلطان حسین کے رفاہِ عام کے کام گو اس کی حکومت کا زیادہ تر عرصہ لودھیوں کے خلاف جنگ و جدل میں گزرا تاہم اس نے اپنی رعایا کے لیے نئے نئے شہر بسائے اور بعض پرانے شہروں کو بھی از سرِ نو آباد کروایا۔ اس نے جونپور کے علاوہ اپنی سلطنت کے دُوسرے شہروں میں بھی رعایا کی حفاظت اور فلاح و بہبود کے لیے کئی مساجد اور قلعے بنوائے اپنے عہد کے کئی علماء و صوفیاء کے لیے مدرسے اور خانقاہیں بنوائیں اور بعض کی وفات کے بعد ان کے اعزاز میں روضے و مقبرے تعمیر کروائے[۱]۔ مچھلی شہر کی جامع مسجد بھی اس کی چھوڑی ہوئی ایک حسین یادگار ہے[۲]۔

جامع مسجد جونپور کی تعمیر جامع مسجد جونپور کی تعمیر کو سلطان نے (۱۴۷۸ء میں) مکمل کروایا تھا[۳]۔ یہ مسجد حضرت خواجہ محمد علیسیؒ کی سہولت کی غرض سے بنوائی گئی تھی۔ یہ مسجد شرقی فنِ تعمیر کا شاہکار مانی جاتی ہے۔ اس مسجد کے قریب اس نے طلباء کی دینی تعلیم کے لیے ایک کالج بنوایا تھا جس سے ملحقہ رہائش کمرے تھے۔ اس نے مسجد سے ملحقہ حجرے بھی تعمیر کروائے

---

[۱] تفصیلات کے لیے آئندہ صفحات ملاحظہ ہوں

[۲] ۔

[۳] جونپور نامہ ص ۴۸-۴۹

تھے تاکہ وہاں طلباء اور مسافروں کو ہر طرح کی سہولتیں میسر ہوں[1]۔ لال دروازہ مسجد کی طرح اس مسجد کی دوسری منزل پر بھی عورتوں کی سہولت کے لیے زنانہ گیلریاں بنوائی گئی تھیں[2]۔ تاکہ وہاں وہ باپردہ عبادت وریاضت کر سکیں نیز خطبہ و وعظ سُن سکیں۔

عیدگاہ کی تعمیر اس نے جونپور کے شہریوں کے واسطے نمازِ عید کی سہولت کے لیے دریائے گومتی کے کنارے ایک عالی شان عیدگاہ بھی بنوائی تھی جو اب تک آباد ہے۔ سلطان اس عیدگاہ میں اپنے امراء، طلباء اور فوج کے ساتھ بڑی شان وشوکت سے نمازِ عید کے لیے جایا کرتا تھا[3]۔

سیّد محمد جونپوریؒ اور سلطان حسین سلطان حسین شاہ شرقی علماء وصوفیاء کا بے حد قدردان تھا۔ وہ خود بھی عالم تھا اور سیّد محمد جونپوریؒ کے شاگردوں میں سے تھا۔ بادشاہ بننے کے بعد بھی وہ ان کے درس میں بڑے شوق سے شامل ہوتا تھا[4]۔ ایک مرتبہ وہ انھیں اپنے ساتھ راجہ دلپت رائے کے خلاف جہاد پر بھی لے گیا۔ وہاں سیّد محمدؒ نے بڑی بہادری اور جوانمردی کا ثبوت دیا تھا[5]۔ جن دنوں سیّد محمد عبادت وریاضت میں ہمہ تن مصروف رہنے لگے تھے اس نے ان کو اپنے اخراجات کے لیے سات قطعات بطور جاگیر کے پیش کیے لیکن انھوں نے اس کو قبول نہ کیا بلکہ متعلقہ فرمان ہی کو پھاڑ کر پھینک دیا[6]۔

شاہ مدارؒ سے اظہارِ عقیدت سلطان حسین شاہ حضرت شاہ مدارؒ کا بھی بڑا گرویدہ تھا۔ ان سے اظہارِ عقیدت کے لیے اس نے ان کی درگاہ واقع مکن پور کا ایک دروازہ

---

[1] The Sharqi Architecture of jaunpur, Vol. I, p. 52.

[2] جونپور نامہ ص ۴۵-۴۹

[3] ایضاً ص ۵۶-۵۸

[4] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۸، تجلّیٔ نور جلد اوّل ص ۵۸

[5] تجلّیٔ نور ایضاً

[6] ایضاً

بھی تعمیر کر دیا یا تھا جو چہار دروازہ کے نام سے مشہور ہوا۔ ان کے نام کا کتبہ (۱۴۶۸ء) اب تک وہاں موجود ہے۔[1]

مولانا صفی جونپوریؒ اور سلطان حسین

مولانا صفی جونپوریؒ اس دور کے متبحر علماء میں سے تھے۔ سلطان ابراہیم شاہ شرقی ان کی قابلیت و اخلاق کا اس قدر مداح تھا کہ اس نے انھیں شرقی شہزادوں کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ سلطان حسین شاہ کو بھی ان سے والہانہ عقیدت تھی اور وہ انھیں اکثر فوجی معرکوں میں بھی اپنے ساتھ رکھتا۔ ایک بار جب سلطان حسین نے بہلول لودھی سے شکست کھائی اور اس کے بہت سے امراء وغیرہ گرفتار کر لیے گئے تو اس موقع پر وہ بھی گرفتار ہو گئے لیکن بہلول نے اُن کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا اور بعد میں انھیں باعزت رہا کر دیا۔[2] سلطان سکندر لودھی نے جب جونپور میں شرقی عمارات کو برباد کرنے کے بعد شرقی مساجد کے گنبدوں، حجروں اور کتبوں وغیرہ کو مسمار کرنے کا ارادہ کیا تو مولانا صفیؒ نے علماء کی ایک جماعت کے ساتھ اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔[3] چنانچہ وہ مساجد بچ گئیں۔ یہ مساجد آج بھی اس ملک کی فنِ تعمیر کی تاریخ میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ اس واقعہ کے بعد سلطان سکندر کے ساتھ بھی ان کے بڑے اچھے مراسم پیدا ہو گئے۔ بعد ازاں اس نے ان کو آگرہ بلوا لیا تھا۔[4]

مولانا الہداد محشّی جونپوریؒ اور سلطان حسین

مولانا الہداد محشّی (المتوفیٰ ۱۵۱۷ء) جونپور کے بلند مرتبت علماء میں سے تھے۔ انھیں خاص طور پر علم فقہ پر بڑا عبور حاصل تھا اور بحیثیت فقیہہ کے ان کی شہرت سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔[5] وہ زہد و ورع میں بھی بے مثال تھے۔ سلطان حسین شاہ ان کے علمی تبحر اور روحانیت کے بڑے مداح تھے۔

---

[1] The Monumental Antiquities and Inscriptions in the N.W. Provinces and Oudh, Vol. II, pp. 169-170.

[2] A. Halim, J.A.S.P. Vol. III, No. 2, Dec. 1963, pp. 87-88.

[3] ایضاً [4] ایضاً

[5] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵، خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۱۲

جب انھوں نے کئی جلدوں میں شرح ہدایہ اور شرح بزدوی لکھیں تو اس نے انھیں سونے کے بطور انعام دیے لیکن اس رقم کو انھوں نے اسی وقت اپنے ضرورت مند طلباء میں تقسیم کر دیا۔[1] سلطان سکندر لودھی بھی ان کی بڑی تعظیم و تکریم کرتا تھا۔ جب وہ ایک بار جونپور آیا تو بطورِ خاص ان کے مکان پر ملاقات کے لیے گیا۔[2]

قاضی صلاح الدّین خلیل اور سلطان حسین

قاضی صلاح الدّین خلیل علم فقہ میں اس دور کی نامور شخصیت تھے وہ جونپور کے مشہور عالم قاضی نظام الدّین کیکلانی کے نبیرہ تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت بھی انہی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی تھی۔[3] جب وہ وفات پا گئے تو سلطان حسین نے انھیں ان کی جگہ قاضی کے عہدہ پر سرفراز کیا۔ اس عہدہ پر وہ بیس سال متمکن رہے اور اپنے فرائض منصبی کو بڑی قابلیت سے سرانجام دیتے رہے۔[4] سلطان حسین اس کی علمی قابلیت اور سرکاری فیصلوں کی بڑی قدر کرتا اور ان سے بڑی توقیر و تعظیم سے پیش آتا۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ان میں سے ایک تصنیف "شرح الاشباہ والنظائر فی الفروع" بڑی مشہور ہے۔[5]

قاضی سماء الدّین اور سلطان حسین

قاضی سماء الدّین جونپور کے بلند مرتبت علماء میں سے تھے۔ سلطان حسین ان کے علم و دانش کا بے حد گرویدہ تھا۔ اس نے ان کو قتلغ خاں کا خطاب دے کر عہدۂ وزارت پر سرفراز کیا تھا۔[6] انھوں نے بعض جنگوں میں بھی اس کے ساتھ شرکت کی۔ ایک مرتبہ جب سلطان حسین نے بہلول لودھی سے (۸۷۸ھ) شکست کھائی وہ بھی اس کے چالیس اُمراء کے ساتھ پکڑے گئے۔ بہلول لودھی نے انھیں اس موقعہ پر زنجیروں میں جکڑ کر قطب خاں لودھی کے حوالے کر دیا اور پھر دہلی بھیج دیا تھا۔[7] بہلول نے دہلی میں ان کو بڑی

---

[1] A. Halim, J.A.S.P. Vol: III, No. 2, Dec. 1963, pp. 87-88.

[2] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ۴۵۹ [3] تجلّیٔ نور جلد دوم ص ۴۲

[4] ایضاً [5] ایضاً [6] تذکرۂ علمائے ہند ص ۸۰ [7] ایضاً

طبقاتِ اکبری جلد دوم ص ۳۰۹

عزت و تکریم سے نوازا اور ان کو ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی۔ اس کے بعد پھر تا دمِ حیات وہ دھلی ہی میں رہے اور علومِ ظاہری کی درس و تدریس میں مصروف رہے[۱]۔

شیخ بڈھن شطاریؒ اور سلطان حسین

شیخ بڈھنؒ سلسلۂ شطاریہ کے نامور بزرگ تھے۔ وہ حافظ جونپوریؒ کے خلفاء اجل میں سے تھے اور انھوں نے اپنے سلسلہ کی ترقی و ترویج کے لیے بڑا کام کیا تھا[۲]۔ شیخ عبدالحق محدث دھلویؒ کے چچا شیخ رزق اللہ مشتاقیؒ ان ہی کے مرید و خلیفہ تھے اور سلطان حسین اور سلطان سکندر لودھی دونوں ان کی بے حد قدر و منزلت فرمایا کرتے تھے[۳]۔

مخدوم جہانگیر سہروردیؒ اور سلطان حسین

مخدوم شیخ جہانگیر سہروردیؒ جونپوری سلسلہ سہروردیہ کے مشہور مشائخ میں سے تھے اور انھوں نے ہزاروں کو روحانی فیوض بخشے تھے۔ سلطان حسین شاہ بھی اُن کے دامنِ عقیدت سے وابستہ تھا۔ اور ان کی دعاؤں سے مستفیض ہوتا رہتا تھا۔ شیخ ہمیشہ اپنی خانقاہ ہی میں مقیم رہتے اور تمام وقت یادِ الٰہی میں گزارتے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں صرف ایک بار خانقاہ سے باہر نکلے تھے۔ اور وہ بھی حضرت شیخ محمد عیسٰی تاج جونپوریؒ کی رسمِ تجہیز و تکفین کے موقع پر[۴]۔

شاہ نظام الدین قلندر بہاریؒ اور سلطان

جونپور کے ایک اور مشہور بزرگ شاہ نظام الدین قلندر بہاریؒ تھے جو اس دور کے ذی مرتبت بزرگوں میں سے تھے۔ وہ حضرت قطب الدین بینائے دل قلندر جونپوریؒ کے بھانجے تھے[۵]۔ سلطان حسین ان سے بھی بڑی گہری عقیدت رکھتا تھا۔ انھوں نے سلطان حسین کے لیے

۱؎ طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۰۹، تذکرہ علمائے ہند ص ۸۰۔
۲؎ گلزارِ ابرار ص ۱۳۱۔ طبقاتِ شاہجہانی (قلمی) ورق ۱۴۷-۱۴۸
۳؎ اخبار الاخیار ص ۱۹۵
۴؎ تجلی نور جلد اوّل ص ۴۴
۵؎ اصول المقصود (قلمی) ورق ۲۳ ب

قصیدۂ اکبری کی شرح صراط المستقیم کے نام سے لکھی تھی (۸۸۰ھ) جو بڑے پایہ کی شرح مانی گئی ہے۔[1]

شیخ قطبن اور سلطان

مشہور عالم و شاعر شیخ قطبن کے ساتھ بھی سلطان حسین کے نہایت اچھے مراسم تھے۔ اس کو اُن سے بڑی عقیدت تھی اور وہ ان کی علمی استعداد کا بڑا معترف تھا۔ شیخ ان کے درباری شاعر بھی تھے اور انھوں نے اپنی مرگاوتی بھی انہی کے نام سے معنون کی تھی۔ یہ مثنوی سلطان حسین کے آخری دورِ حیات میں ۱۵۰۳ء میں مکمل ہوئی تھی جبکہ وہ کلگنگ (کحل گاؤں) میں مقیم اپنی زندگی کے آخری دن پورے کر رہے تھے۔[2]

---

[1] اصول المقصود (قلمی) ورق ۳۳ ب

[2] A. Halim J.A.S.P. Vol. II, 1957, pp. 71-85.

باب ششم

سلاطینِ شرقی کا غیر مسلموں سے برتاؤ

صوبہ اودھ کے ہندوؤں کا مسلمانوں سے برا سلوک

سلطنت شرقی ہندوستان کے جس علاقہ میں پروان چڑھی وہاں مسلمانوں کی آبادی شروع ہی سے ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم تھی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کا قافیہ حیات تنگ کر رکھا تھا[1]۔ اس علاقہ کے مسلمانوں کی زبوں حالی اور ہندوؤں کے ظلم وستم کی خبریں جب ملک کے دوسرے حصوں میں پہنچیں تو وہاں سے علماء وصوفیاء اور مجاہدین جہاد وتبلیغ کے لیے یہاں آئے۔ جب انھوں نے سلاطینِ دہلی کو یہاں کے مسلمانوں کے مذہبی وسیاسی حالات کی طرف توجہ دلائی تو انھوں نے اس علاقے کے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے ہر ممکن کوشش اختیار کی۔ چنانچہ ایسے ہی حالات میں سلطان غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰ - ۱۳۲۵ء) کے عہد میں حضرت مخدوم چراغِ ہند، حضرت مخدوم آفتابِ ہند اور شہزادہ ظفر خاں وغیرہ یہاں پہنچے اور انھوں نے یہاں کے راجہ ساکیت سنگھ کو شکست دے کر منیچ گڑھ (ظفر آباد) پر قبضہ کر لیا[2]۔ اس کامیابی کے بعد وہ یہیں آباد ہو گئے اور اُن کے درس وتدریس اور وعظ وتلقین سے ہزاروں ہندو مشرف بہ اسلام ہوئے[3]۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں مسلمانوں کی آبادی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔

۱؎ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب
The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History, pp. 1-36.

۲؎ تجلی نور جلد اول ص ۱۱-۱۲، تاریخ ظفر آباد۔ چراغِ نور۔ منیچ گڑھ (ظفر آباد) کی فتح کے بعد راجہ ساکیت سنگھ اور اس کے کچھ وزیر و مشیر بھی مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔

۳؎ تجلی نور ایضاً۔ تاریخ ظفر آباد

لیکن جب سلطنت تغلق کا چراغ ٹمٹمانے لگا تو یہاں کے ہندوؤں نے دہلی کی سیاسی ابتری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دوبارہ مسلمانوں پر پھر ظلم و ستم شروع کر دیا اور تمام علاقہ میں شورشیں برپا کر دیں۔ چنانچہ انہی بغاوتوں کو فرد کرنے اور یہاں امن و امان قائم کرنے کے لیے ۱۳۹۴ء میں سلطان الشرق ملک سرور کو اس علاقہ کا حاکم بنا کر بھیجا گیا تھا[1]۔

سلطان الشرق اور ہندو باغیوں کی سرکوبی

سلطان الشرق نے بڑے تھوڑے ہی عرصہ میں کمپل، کول، اٹاوہ، دالمو، کڑہ، قنوج، برائچ، راپری، سنبھل، سندیلہ، کھور، اور اودھ کے ہندو باغیوں کو پسپا کر کے ان تمام علاقوں میں امن و امان بحال کیا[2]۔ اس نے اڑیسہ، اوجین، بنگال اور شمالی و جنوبی بہار کے ہندو راجاؤں کی بغاوتوں کو بھی فرد کیا اور ان کو اپنا باجگزار بنایا[3]۔ سلطان الشرق کے جونپور میں آباد ہو جانے سے اس علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی بتدریج بڑھتی گئی اور اس کے عہد میں کثیر التعداد علماء و صوفیاء یہاں پہنچے اور انھوں نے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا بڑا کام کیا۔ دہلی پر امیر تیمور کے حملہ کے بعد جب سلطان الشرق نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تو راپری، سنبھل اور کول کے جاگیردار پھر اس کے خلاف اٹھے مگر اس نے اُن کو یکے بعد دیگرے زیر کر لیا[4]۔ پھر اس نے روہیل کھنڈ اور بندھیل کھنڈ کے باغی ہندوؤں کی بھی سرکوبی کی۔ علاوہ ازیں اس نے اپنی طاقت و حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے پرانے قلعوں کو بھی مرمت کروایا[5]۔ چنانچہ اس کے آخرِ دورِ حکومت تک تمام ہندو مطیع و فرمانبردار ہو گئے، سلطنت میں امن و امان ہو گیا اور تمام ہندو مسلمان رعایا خوش حال ہو گئی[6]۔ اس کی وفات کے بعد اس کے منہ بولے بیٹے سلطان مبارک شاہ شرقی (۱۳۹۹-۱۴۰۱ء)

۱؎ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۵۶-۱۵۷ ۲؎ ایضاً، طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۲۴۸، جلد سوم ص ۲۷۲

۳؎ ایضاً۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۵۶-۱۵۷ Bihar Through The Ages, p. 393.

۴؎ تاریخ مبارک شاہی۔ ایضاً ۔ طبقاتِ اکبری ایضاً

۵؎ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۵۷۔ جونپور نامہ ص ۳۶

۶؎ طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۷۳۔ تاریخ محمدی (قلمی) ورق ۴۲۷ د

نے بھی سلطان الشرق کے مذہبی سیاسی طرزِ عمل کو برقرار رکھا۔ اس کے عہد میں کسی ہندو جاگیردار و باجگزار نے بغاوت نہ کی اور اس نے بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سے کام کیے[1]

سلطان ابراہیم شاہ کے عہد میں علماء و صوفیاء کی آمد اور اشاعتِ اسلام

سلطان مبارک شاہ شرقی کے بعد جب اس کا بھائی سلطان ابراہیم شاہ شرقی (۱۴۰۱ - ۱۴۴۰ء) سلطنتِ شرقی کا وارث ہوا تو اس کے عہدِ حکومت میں بھی دہلی سے امیر تیمور کے حملہ کی وجہ سے اور بلادِ اسلامیہ کے سیاسی انتشار کی وجہ سے سینکڑوں علماء، فضلاء اور صوفیاء شہر جونپور اور سلطنت کے دوسرے حصوں میں آکر آباد ہو گئے اور انھوں نے جگہ جگہ خانقاہیں اور مسجدیں آباد کر کے درس و تدریس اور وعظ و تلقین سے اشاعتِ اسلام کا کام شروع کر دیا[2]

میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے وعظ و مناظروں کا ہندوؤں پر اثر

اسی دور میں اس علاقہ میں حضرت میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے وعظ و مناظرہ سے بھی بے شمار ہندو مشرف بہ اسلام ہوتے۔ انھوں نے کئی نامور جوگیوں کے باطل دعوؤں کو بھی جھوٹا ثابت کیا اور ایک نامور جوگی بابا کمال پنڈت اور اس کے پانچ ہزار چیلوں کو بھی مشرف بہ اسلام کیا[3]۔ اسی طرح جب وہ ایک بار بنارس گئے تو وہاں کے بہت سے پجاریوں کو بھی مناظرہ کے بعد مشرف بہ اسلام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر بنارس میں بیک وقت ایک ہزار ہندوؤں نے اسلام قبول کیا تھا[4]

---

[1] تاریخ محمدی (قلمی) ورق ۴۲۷ و

[2] تفصیلات کے لیے اس کتاب کا حصہ دوم تا نہم اور ضمیمہ اول تا سوم ملاحظہ ہو

[3] لطائف اشرفی جلد اول ص ۴۰۲ - ۴۰۹ جلد دوم ص ۳۸۲ - ۳۸۵

[4] ایضاً

قاضی عبدالمقتدرؒ کے مواعظ اور مناظروں کا ہندوؤں پر اثر

سلطان ابراہیم شاہ نے جب دہلی کے عظیم المرتبت عالم و قاضی عبدالمقتدرؒ کو جونپور بلایا تو انھوں نے بھی اپنے وعظ و مناظرہ سے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا کام جاری رکھا۔ سلطان نے انھیں ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ یہاں ایک سال رہے اور اس عرصہ میں ہزاروں ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کیا۔[1] چنانچہ ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی بتدریج بڑھتی گئی۔

ہندوؤں کے علاقوں میں مسلمانوں کے تحفظ کے لیے امراء اور صوفیاء کو جاگیریں

سلطان ابراہیم نے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے اپنی سلطنت کے مختلف حصّوں میں صوفیاء اور امراء کو جاگیریں تقسیم کیں تاکہ وہ ان علاقوں میں آباد ہو کر مسلمانوں کے مذہب و ثقافت کا تحفظ کریں۔ مراۃ الاسرار میں ایسے امراء میں سے ملک شمعون مرید میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ جاگیردار پٹہ نحتہ پرگنہ ردولی اور اژدر خاں بدخشی جاگیردار سہرلیہ پرگنہ دریاآباد کا ذکر ملتا ہے۔[2] اسی مقصد کے پیشِ نظر سلطان نے پلادن کی جاگیر حضرت میر سید علم الدین سہروردی کو عطا کی تھی[3] تاکہ وہ اس علاقہ کے مسلمانوں کی حفاظت کریں۔ مؤخر الذکر نے یہاں اس مقصد کے لیے ایک قلعہ بھی تعمیر کیا تھا۔[4]

ترہت کے باغی ملک ارسلان کی گوشمالی

جب ۱۴۰۲ء میں سلطان ابراہیم کو پتہ چلا کہ اس کے باجگذار راجہ کیرتی سنگھ والیٔ ترہت کو وہاں کے ایک باغی مسلمان سردار ملک ارسلان نے حکومت سے بے دخل کر کے ترہت پر قبضہ جما لیا ہے تو وہ فوجیں لے کر وہاں جا پہنچا۔ اس نے باغی ملک ارسلان کی سرکوبی کی اور راجہ کیرتی سنگھ کو اس کی گدی پر بحال کر دیا۔[5]

---

[1] A. Halim, J.A.S.P. Vol. VIII, No. 2, Dec. 1963, pp. 89-90.

[2] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۱ ب

[3] ایضاً ورق ۵۰۱-۵۰۲ [4] ایضاً [5] کیرتی لتا ص ۱۴-۱۸

راجہ کنس کے ظلم وتشدد کا انسداد

سلطان ابراہیم شرقی جب کبھی ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اٹھتے یا بغاوت کرتے دیکھتا تو وہ فوراً ان کی سرکوبی کرتا۔ اس کے عہد میں راجہ کنس نے (۱۴۱۴ء) جب بنگال پر قبضہ کر کے مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا تو اس نے اس کے خلاف فوج کشی کی۔ راجہ کنس نے پھر حضرت نور قطب عالمؒ کی معرفت اپنے اعمال بد کی معافی مانگی اور اس کی جگہ پھر اس کے بیٹے جادو کو مشرف بہ اسلام کر کے سلطان جلال الدین (۱۴۱۴ء-۱۴۳۱ء) کے نام سے تخت نشین کیا گیا۔[1]

ترہت کے راجہ شیو سنگھ کی گوشمالی اور راجہ دیو سنگھ کی بحالی

اس طرح جب شیو سنگھ نے ترہت کی ریاست پر اس کے بے اولاد راجہ کیرتی سنگھ کی وفات پر قبضہ کر لیا اور راجہ کنس کے اکسانے پر وہاں کے مسلمانوں کا بھی قتل عام شروع کر دیا تو سلطان فوجیں لے کر وہاں بھی پہنچا اور اس نے ترہت کی راجدھانی لاھسرا پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے شیو سنگھ کے والد دیو سنگھ کو یہ سلطنت بحال کر دی۔[2]

والیٔ اوجین کی گوشمالی

جب ۱۴۱۶ء میں اوجین کے راجہ کمار گجراج اور اس کے بھائی جگ دیو نے اپنی رعایا پر ظلم وستم شروع کر دیا اور ساری سلطنت میں افراتفری ڈال دی تو سلطان نے وہاں کی رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے اوجین پر حملہ کر کے اس کے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح وہاں تمام ریاست میں امن وامان بحال کر دیا۔[3]

باجگزار راجاؤں سے نیک سلوک

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہد میں اس کی تمام سلطنت میں مسلمانوں کی آبادی میں کافی اضافہ ہو چکا تھا اور اس کے عہد میں ہر مذہب کے

۱؎ طبقات اکبری جلد سوم ص ۲۶۵ - تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۷۸
ریاض السلاطین جلد سوم ص ۱۱۱-۱۱۴۔ مکتوبات اشرفی (قلمی) خط نمبر ۹۴ ص ۹۲-۹۴۔

۲؎ Sayyid Hasan Askari, B.P.P. 1948, p. 37.

۳؎ Bihar Through the Ages, pp. 393-394.

ملت کے لوگوں کے لیے ہر طرح کی آسانی تھی۔ اس کے تمام باجگذار ہندو راجہ جو پہلے ہر وقت بغاوت پر آمادہ رہتے تھے، اب پوری طرح مطیع و فرمانبردار ہو گئے اور اُن کے ساتھ ان کی ہندو رعایا بھی پوری طرح وفادار بن گئی۔ درحقیقت اس کے عہد میں اس کی تمام ہندو مسلم رعایا خوش حال تھی[۱]۔ ان حالات میں دونوں قومیں ایک دوسرے کے مذہب و ثقافت اور روایات سے متاثر ہوتیں۔

ہندوؤں کو ملازمتیں

سلطان ابراہیم نے اپنے عہدِ حکومت میں ہندوؤں کو بھی ملازم رکھا۔ اس کے مالی انتظام کو ہندو افسروں نے سنبھالا اور نندلال جیسے مدبر و قابل انسان اس کی سلطنت کے دیوان تھے[۲]۔ ابراہیم شاہ کے شاہی داروغوں میں سے ایک داروغہ سمپت سنگھ تھے جو گھوڑوں کے عیب و ہنر کی شناخت اور ان کی نسل و پرورش میں بڑی مہارت رکھتے اور سلطان بھی اس کی قابلیت کا بڑا مداح تھا[۳]۔ اس نے ہندوؤں کو اپنی فوج کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز رکھا۔ اور اس کے رسالداروں میں باہن سنگھ، راتے سنگھ، سالونت سنگھ اور بھوجا سنگھ وغیرہ بڑے اہم اور نامور فوجی افسر تھے[۴]۔ ان میں سے مؤخر الذکر تو قنوج کے شاہی خاندان سے تھا[۵]۔

ہندو معماروں کی حوصلہ افزائی

اس کے عہدِ حکومت میں ہندو معماروں نے شرقی عمارات بنائیں اور ان میں سے بعض پور نماشی، رام کبیر اور بسنت فنِ تعمیر کے بڑے قابل اور ماہر مانے جاتے تھے۔ یہ ہندو ماہرینِ تعمیر دہلی سے آئے ہوئے کاریگروں کے دوش بدوش کام کرتے تھے[۶]۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شرقی فنِ تعمیر میں ہندو مسلم فنِ تعمیر کے عمدہ عناصر کا امتزاج پیدا ہو گیا اور جس کے اثرات بعد میں مغلیہ دور کی عمارات میں بھی بدرجۂ اتم نظر آتے ہیں[۷]۔

۱۔ تاریخ محمدی (قلمی) ورق ۴۲۷

۲۔ سلاطینِ جونپور ۳۔ ایضاً ۴۔ ایضاً ۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً ۷۔ The Charm of Islamic Architecture, p.13.

ہندوؤں کے مقدمات میں برہمنوں سے مدد

اس کے عہد میں ہندوؤں کے مقدمات میں برہمنوں سے مدد لی جاتی[1] اور ہندوؤں کی ٹکسالوں میں شرقی سکّے گھڑے جاتے[2]۔ ہندو نجومیوں، شاعروں اور جوگیوں سے بھی سلاطینِ شرقی کے بڑے عمدہ تعلقات تھے۔ ان کے دربار میں علمِ جیوتش کے ایک ماہر پنڈت نارائن داس تھے ان کا خاندان شرقی خاندان کے آخری دَور تک دربار سے منسلک رہا تھا[3]۔

ہندو علماء و ادباء اور شعراء کی قدر افزائی

سلطان ابراہیم ہندی زبان کے اُدباء و شعراء کی بڑی قدر افزائی کرتا تھا۔ ایسے شُعراء میں سے ایک شاعر ترہت کے ودیاپتی ٹھاکر تھے۔ سلطان ان کا حد درجہ مدّاح تھا[4]۔ جب وہ اس کے دربار میں باغی ارسلان کے ریاست ترہت پر قابض ہوجانے کی خبر لے کر آیا تو وہ فوراً اپنی فوجیں لے کر وہاں پہنچا اور راجہ کیرتی سنگھ کو دوبارہ اس کی ریاست بحال کی[5]۔

ہندوؤں کی دادرسی

سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے ہر قوم اور مذہب کے لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف اور رواداری کا برتاؤ کیا اور اس کی حدودِ سلطنت میں پوری طرح امن و امان قائم رہا۔ اس کو تخریب پسندی ہرگز پسند نہ تھی۔ اگر اسے ہندوؤں کے معاملہ میں کسی قاضی کے فیصلہ پر اطمینان نہ ہوتا تو وہ اس پر خود نظرِ ثانی کرتا اور ہندوؤں کی ہر طرح دلجوئی کرتا[6]۔ ایک دفعہ ایک ہندو فریادی اس کے دربار میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اس کے گاؤں کے مسلمانوں نے اس کی زمین پر مسجد بنانے کے لیے قبضہ کرلیا ہے۔ اور اب کسی صورت بھی واپس نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ انھوں نے اُلٹا اس کو مارا پیٹا بھی ہے۔ سلطان نے اسی وقت وہاں کے قاضی کو لکھا کہ وہ معاملہ کی نزاکت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے صحیح فیصلہ دیں لیکن قاضی نے مسلمانوں کی طرف داری کی اور بالآخر مسجد کی تعمیر ہونے لگی۔ جب سلطان کو اس بات کا علم

---

[1] سلاطینِ جونپور [2] ایضاً [3] ایضاً
[4] کیرتی لتا ص ۱۴۔۱۸ [5] ایضاً [6] سلاطینِ جونپور

ہوا تو آپ نے فوراً مسجد کی تعمیر روک دی اور مسلمانوں کو کہلا بھیجا کہ پہلے وہ زمین جائز طور پر حاصل کریں اور پھر مسجد کی تعمیر کریں[1]۔

مہمان سراؤں میں ہندوؤں کے لیے ہندو ملازمین

سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے اپنی رعایا کی آسائش و آرام کے لیے سلطنت کی تمام سڑکوں پر سایہ دار درخت لگوائے۔ کنوئیں کھدوائے، جگہ جگہ مہمان سرائیں اور چوکیاں تعمیر کروائیں اور اُن کے ساتھ ایک ایک مسجد، باورچی خانہ، کنُواں اور باغ بھی لگوایا۔ ان سراؤں میں ہندو مسلم دونوں قوموں کے مسافر ٹھہرتے تھے۔ ہندو مسافروں کے لیے ہندو اور مسلمان مسافروں کے لیے مسلمان ملازم رکھے جاتے۔ ان مسافروں کو اختیار ہوتا تھا کہ وہ پکا ہوا کھانا کھائیں یا سرائے سے سامان لے کر خود پکا کر کھائیں۔ ان کو اس سامان کی کوئی قیمت ادا نہیں کرنی پڑتی تھی۔ گرمیوں میں مہمان سراؤں کے علاوہ بہت سے مقامات پر ٹھنڈے اور شیریں پانی کی سبیلیں جاری رہتی تھیں اور ان پر الگ الگ ہندو مسلم منتظمین رکھے جاتے[2]۔

سلطان محمود کی ہمسایہ حکمرانوں کے مظالم کے خلاف جنگ

سلطان محمود شاہ شرقی گو بڑا مذہب پرست بادشاہ تھا مگر اپنی ہندو مسلم رعایا کے ساتھ برابری کا سلوک کرتا۔ اگر کبھی اسے اپنی کسی ہمسایہ سلطنت کے فرمانروا کے اپنی رعایا پر مظالم کی خبر ملتی تو وہ فوراً اس کے خلاف فوج کشی کرتا۔ چنانچہ جب اس کو سلطان شمس الدین احمد شاہ بنگالی (۱۴۳۱-۱۴۴۲ء) کے بنگال پر ظلم و ستم کی خبر ملی تو اس نے فوراً اس کے خلاف فوج کشی کی اور جب اس نے رعایا کے ساتھ عمدہ سلوک کا وعدہ کیا تو پھر واپس ہوا[3]۔ اسی طرح اس نے چنار کے

---

[1] سلاطین جونپور۔ سیر المتاخرین (قلمی)

[2] سلاطین جونپور

[3] مطلع السعدین جلد دوم ص ۷۸۲-۷۸۳

باغی ہندو سرداروں کے ظلم و ستم کا قلع قمع کر کے وہاں امن و امان قائم کیا[1]۔ ایک بار جب اسے پتہ چلا کہ اڑیسہ کے سیاسی حالات خراب ہیں اور وہاں کے ہندوؤں نے مسلمانوں کا قافیۂ حیات تنگ کر رکھا ہے، یہاں تک کہ انھوں نے بعض مساجد کی بے حرمتی کی ہے اور بعض کو شہید کر ڈالا ہے تو اس نے اڑیسہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا اور وہاں پہنچ کر ہندوؤں کی خوب گوشمالی کی۔ ہندوؤں نے چونکہ کئی مساجد کو شہید کر ڈالا تھا۔ اس لیے اس نے بھی از راہِ انتقام بعض مندروں کو مسمار کر دیا تاکہ آئندہ وہ ایسی حرکات کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ اس کے بعد اس نے پہاڑ پور میں دو مساجد تعمیر کروائیں اور وہاں قابل مفتیوں کا تقرر کیا تاکہ وہاں اشاعتِ اسلام کا کام باقاعدگی سے ہوتا رہے۔ اس علاقہ میں اس نے قابل افسروں کا تقرر بھی کیا تاکہ آئندہ وہاں امن و امان قائم رہے[2]۔ اس طرح ایک بار جب اسے یہ خبر ملی کہ راجہ الیشوری سنگھ والیٔ اوجین اپنی عیاشیوں میں مگن ہے اور بدانتظامی کی وجہ سے ساری ریاست میں سیاسی انتشار برپا ہے تو اس نے ۱۴۵۴ء میں اس کے خلاف بھی فوج کشی کی۔ بالآخر الیشوری سنگھ گرفتار ہو کر قتل ہوا اور اس کی ریاست میں امن و امان قائم ہو گیا[3]۔

ہندو عمارتوں کو مسمار کرنے کا غلط الزام

بعض مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ سلاطینِ شرقی نے ہندو مندروں اور عمارتوں کو مسمار کر کے وہاں مساجد تعمیر کروائی تھیں لیکن حقیقی صورتِ حال یہ ہے کہ شرقیوں کی آمد سے پہلے زمانۂ قدیم ہی سے جونپور اور اس کے گرد و نواح میں ہندوؤں اور بدھوں کی عمارتیں مسمار پڑی تھیں اور ان کو ہندوؤں اور بدھوں نے اپنے دورِ عروج میں تباہ و برباد کر دیا تھا[4]۔ اس کی مزید تصدیق راجہ شیو پرشاد کے مندرجہ ذیل اقتباس

---

[1] طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۸۳

[2] Bihar Through the Ages, p. 394.

[3] ایضاً ص ۳۹۳

[4] مرقع بنارس ص ۶۳

سے بھی ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں :

"سوامی شنکر اچاریہ نے غیر مذہب والوں کو خوب درست کیا۔ جو بُدھ مت کے پجاری تھے سب ہندوستان سے نکالے گئے یا ویدک کے پیرو بنا دیے گئے۔ بدھوں کے سب دیہار اور استوپ توڑ ڈالے گئے اور جلا دیے گئے ان کی جگہ شیوجی کی مورتی قائم ہوئی اور یہ مظالم محض بنارس، الہ آباد اور قنوج تک محدود نہ تھے بلکہ سب جگہ ایسا کیا گیا۔ یہاں تک کہ کشمیر سے لے کر اس کماری تک پھر برہمنوں کی پُوجا ہونے لگی۔ بنارس وغیرہ میں خانقاہیں برباد کی گئیں ۔ سارناتھ، قنوج اور الہ آباد میں بدھوں کے مندر اور استون منہدم کیے گئے۔ ان تمام وسائل اور ذرائع کو استعمال کرنے کے بعد برہمن اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کی واپسی کے خواب دیکھنے لگے"[1]

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شرقیوں کی آمد سے پہلے وہاں مسمار مندر اور استوپ کا ملبہ موجود تھا۔ البتہ ان مسمار عمارات کی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں اور پتھروں کو شرقی عمارات کی تعمیر میں ضرور استعمال کیا گیا اور اس کے علاوہ باقی تمام پتھر، چنار اور مرزا پور کی پہاڑیوں سے فراہم کیا گیا[2]۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ بعض شرقی عمارات کی بنیادیں اسی جگہ رکھ دی گئی ہوں جہاں پہلے ہندو اور بدھ مسمار شدہ عمارات کے کھنڈر موجود تھے۔

ہندو مسلم ملاپ کی روایات اور سلطان حسین

ہندو مسلم ملاپ کی جن روایات کو سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے شروع کیا تھا وہ سلطان حسین شاہ شرقی کے عہدِ حکومت میں انتہا کو پہنچیں۔ اس کے عہدِ حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی و ثقافتی تعلقات بہت عمدہ تھے گو اس کو اپنے دورِ حکومت کے شروع میں راجہ کپی لیندیو والی اڑیسہ اور راجہ مان سنگھ والی گوالیار

---

[1] مرقع بنارس ص ۶۰-۶۱ [2] جونپور نامہ۔ تجلی نور حصہ سوم (قلمی) چراغِ نور

کو باجگزار بنانے کے لیے فوج کشی کرنی پڑی۔[1] تاہم اس کے بعد اس کے

باجگزار راجاؤں کی سلطان حسین سے وفاداری

تمام باجگزار ہندو راجے اور ہندو رعایا اور راجپوت ہمیشہ اس کی وفا کا دم بھرتے رہے اور اس کی کھوئی ہوئی سلطنت کو حاصل کرنے کے لیے اس کے ساتھ دل کر آخری دم تک لڑتے رہے۔

۱۴۸۲ء میں جب سلطان حسین کو بہلول لودھی نے جنگِ سرسہ میں شکستِ فاش دی تو وہ بے خانماں دربدر اپنے باجگزار راجہ کیرت سنگھ کے پاس پہنچا جس نے اس کے ساتھ بہت عمدہ سلوک کیا اور بڑی ہمدردی، شرافت اور خلوص کے ساتھ پیش آیا اور اس کو کئی لاکھ تنگہ نقد کے علاوہ گھوڑے ہاتھی اور سپاہی بھی مدد کے لیے دیے۔ بعدازاں وہ اسے کالپی تک الوداع کہنے کے لیے بھی گیا۔[2] بدقسمتی سے سلطان حسین اپنی جونپور بھی نہ پہنچنے پایا تھا کہ بہلول لودھی راجہ تلوک چند حاکم بکسر کی دغا بازی سے پھر اس پر حملہ آور ہوا۔ سلطان حسین کو پھر شکست ہوئی اور وہ ریاست بھٹہ کی طرف بھاگ نکلا۔[3] ایسے برے حالات میں بھی وہاں کے راجہ بھید نے اس کا بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا اور مدد کے طور پر اس کو کئی لاکھ تنگہ نقد، سینکڑوں گھوڑے اور ہاتھی پیش کیے اور اس کو جونپور تک چھوڑنے بھی گیا۔[4]

ہندو رعایا کا سلطان حسین سے سلوک

اس کے بعد جب بہلول لودھی نے اپنے بیٹے باربک شاہ کو جونپور کا حاکم مقرر کر دیا تو سلطان حسین کے وفا شعار راجپوتوں نے پھر اس کی خاطر جونپور پر حملہ کر کے باربک شاہ کو وہاں سے مار بھگایا۔[5] لیکن سلطان حسین کی قسمت نے پھر یاوری نہ کی۔ اس کے بعد سلطان سکندر لودھی نے اس

---

[1] طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۸۴ - تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۶۰۱

[2] طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۱۱ - تاریخ بدایونی (قلمی) اوراق ۶۳-۶۴

[3] طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۱۱

[4] ایضاً - تاریخ داؤدی (قلمی) ورق ۲۰

[5] طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۱۲

علاقہ پر پوری طرح تسلط جمانے کے لیے اس کو لودھی جاگیرداروں میں تقسیم کر دیا[۱] مگر ان انتظامات کے باوجود سلطان حسین نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو حاصل کرنے کے لیے ہمت نہ ہاری اور اس کی مدد کے لیے ایک باچگوٹی راجپوت جگا (جگا) کثیر التعداد فوج جمع کر کے جونپور پر حملہ آور ہوا اور وہاں سے باربک شاہ کو دوبارہ مار بھگایا[۲]۔ مگر سکندر لودھی دوبارہ جونپور پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد سلطان حسین کو (۱۴۹۴ء) راجہ بھید کے بھائی سالباہن کی دغابازی سے سلطان سکندر کے مقابلہ میں بنارس کے قریب شکست ہوئی[۳]۔ لیکن ۱۵۰۰ء میں اس نے جب آخری بار قلعہ بہار کو فتح کرنے کی کوشش کی تو ہندو راجاؤں نے اس موقع پر بھی اس کی پوری طرح مدد کی مگر پھر اس کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان تمام واقعات سے سلطان حسین اور اس کی ہندو رعایا کے درمیان عمدہ تعلقات کا ثبوت ملتا ہے اور وہ اس کے بے تخت و تاج ہونے کے باوجود اس کی وفا کا دم بھرتے رہے۔

سلطان حسین اور ہندو موسیقی

سلطان حسین شرقی نے اپنی ہندو رعایا کے ساتھ ہر طرح کے ثقافتی روابط قائم کیے۔ وہ ہندو تہذیب و تمدن کا مداح تھا۔ اور خاص طور پر ہندو موسیقی کا بڑا دلدادہ تھا۔ وہ بخشو نائک کا شاگرد تھا۔ اس نے کئی شیام، ٹوڑیاں راگ اور راگنیاں ایجاد کیں اور وہ گندھروا کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا[۴]۔ اس کی موسیقی کا اثر اس کے ہم عصر راجہ مان سنگھ والی گوالیار اور اس کے عہد کے دوسرے موسیقاروں پر بھی پڑا[۵]۔ گوڑ کا راجہ عید سنگھ اور کھڑک پور کا راجہ رام شاہ بھی حسین کے رنگ میں بڑے پایہ کے مغنی تھے[۶]۔

---

۱ طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۱۲۔ ۲ ایضاً ص ۳۱۷-۳۱۹

۳ واقعاتِ مشتاقی (قلمی) ورق ۸۰ ۔ افسانۂ شاہاں (قلمی) اوراق ۳۲-۳۳

۴ مرآۃ آفتاب نما (قلمی) اوراق ۲۶۷ - ۲۷۰ معارف النغمات، راگ درپن (قلمی) ورق ۱۱-۱۲

معدن موسیقی، سرمایۂ عشرت، A. Halim, J.A.S.P. Vol. I, No. 1, May 1957, pp. 59 60.

۵ A. Halim, J.A.S.P. Vol. 1, 1956, pp. 59-80.

۶ A. Halim J.A.S.P. I-C. XIX No. 4, Jan. 1945, p. 355.

سلطان حسین کے گویوں میں سے رسول خاں کے علاوہ بہول، راما پنڈت بھی اپنے زمانہ کے مشہور موسیقار مانے جاتے تھے۔[1]

ہندوؤں کی مذہبی آزادی

سلطان حسین کے عہدِ حکومت میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کو پوری پوری مذہبی آزادی حاصل تھی اور دونوں کے آپس میں بڑے اچھے تعلقات تھے

بھگت کبیر

بھگت کبیر اسی کے عہد اور اسی علاقہ کی ایک مشہور اور قابلِ قدر شخصیت ہے۔ بھگت کبیر اور اس کے چیلوں نے اسی دور میں بستی بستی پھر کر بھگتی کے گیت گاتے اور مذہبی تعصبات سے بالاتر ہو کر ہندو مسلم دونوں قوموں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔[2]

ستیا پیر تحریک

سلطان حسین نے خود بھی ایک ستیا پیر تحریک چلانے کی کوشش کی۔[3] جس کا اس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا تھا۔

ہندو مسلم علماء و صوفیاء کے علمی و ادبی اور ثقافتی کام

شطاری سلسلہ نے بھی ہندوستان میں بلکہ جونپور ہی میں جنم لیا۔ شطاری صوفیوں نے اس دور میں ہندوؤں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کیے اور ان کے مذہبی افکار و نظریات کو ہمدردانہ سمجھنے کی کوشش کی۔ ان پر یوگا اور ویدانت کا بڑا اثر تھا۔ ایک طرف تو وہ وحدت الوجود کے قائل تھے اور دوسری طرف وہ یوگیوں کی طرح ریاضاتِ شاقہ کیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں سید محمد غوث گوالیاریؒ کی بحر الحیات قابلِ ذکر ہے جو ہندو مذہبی فکر کو سمجھنے اور سمجھانے کی بہترین کوشش ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس دور میں ہندوؤں

---

[1] سرمایۂ عشرت A. Halim, J.A.S.P. No. 1, Vol. I, 1957, pp. 59-60.

[2] تفصیلات کے لیے آئندہ صفحات ملاحظہ ہوں

[3] اوراقِ مصور ص ۴۷

اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے علوم کو پڑھنے اور سمجھنے کا شوق بڑھ رہا تھا۔ اگر ایک طرف شیخ رزق اللہ مشتاقی[۱] عربی و فارسی کے علاوہ سنسکرت کے زبردست عالم اور میاں طٰہٰ[۲] ہندوؤں کے علوم کے ماہرین میں سے تھے۔ تو دوسری طرف ایک ہندو برہمن کو علوم اسلامی پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ وہ مسلمانوں کو درس دیتا تھا[۳]۔ اسی طرح شیخ رکن الدین گنگوہیؒ جیسے بزرگ ایک جوگی بال ناتھ سے اسرارِ توحید معلوم کرتے تھے[۴]۔ اس دور کے ایک لودھن برہمن نے یہ اعلان کیا تھا کہ "اسلام حق است و دینِ من نیز درست ست[۵]"۔

ہندی ادب کی ترقی کے لیے علما و صوفیا کی خدمات

اس دور میں ہندو علما، شعرا اور بھگتوں کے علاوہ مسلمان علما، ادبا اور صوفیا نے بھی ہندی علم و ادب میں بڑے اضافے کیے۔ ہندی زبان کی تدریج و ترقی کے لیے شطاریہ صوفیا اور خاص طور پر چشتیوں نے بڑا حصہ لیا۔ انھوں نے گجراتی اور دوسری مقامی زبانوں کے علاوہ ہندی کو خاص طور پر ذریعۂ اظہار بنایا اور اس میں گرانقدر مذہبی لٹریچر پیدا کیا[۶]۔ جونپور کے شیخ بہاء الدین بتھنوؒ، مخدوم دانیال خضریؒ، شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، شیخ برہان الدین کالپویؒ، ملک محمّد جائسی اور سلطان حسین شرقی کے درباری شاعر قطب علی قطبن بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں[۷] اور ہندی زبان میں ان کے علمی و ادبی کارناموں سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔

---

[۱] صبح گلشن ص ۴۱۴
[۲] واقعاتِ مشتاقی (قلمی) ص ۱۳۳
[۳] منتخب التواریخ جلد اوّل ص ۳۲۳
[۴] لطائف قدوسی ص ۴۷
[۵] طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۲۲-۳۲۳
[۶] تفصیلات کے لیے اس کتاب کے ضمیمۂ اوّل کے باب اوّل و دوم ملاحظہ ہوں۔
[۷] ایضاً

حصۂ دوم

شرقی عہد کے علما

جب منگولوں اور تیموریوں کے حملوں سے عالمِ اسلام، مغربی ہندوستان اور دھلی کے علم و فضل کے مراکز تباہ و برباد ہو گئے تو وہاں سے علماء و فضلاء کی ایک کثیر تعداد اپنے وطن کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو گئی۔ اس طرح آسمان بلخ و بخارا و دھلی کے یہ ٹوٹے ہوتے تارے شرقی سلطنت کی فضائے علم پر آفتاب و ماہتاب بن کر نمودار ہوئے اور ان کی ضیاء پاشیوں سے ساری سلطنت منور ہو گئی۔

شرقی سلاطین علماء و مشائخ کی صحبت کے بڑے شائق تھے۔ جب وہ کسی بزرگ یا عالم کی خبر سنتے تو اسے فوراً اپنے ہاں مدعو کرتے۔ خاص طور پر سلطان ابراہیم شاہ شرقی مکارمِ اخلاق اور محاسن و اوصاف میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ وہ علم و فضل میں بے مثل تھا۔ اس کا حال یہ تھا کہ جب وہ کسی بزرگ یا عالم کی جونپور میں آمد کی خبر سنتا تو میلوں تک اُس کے اِستقبال کے لیے جاتا اور اس کو نہایت عزت و احترام سے محل شاہی میں لاکر سرکاری مہمان کی حیثیت سے رکھتا۔ جب قاضی عبدالمقتدرؒ کو اس نے جونپور مدعو کیا تو ان کی آمد پر علماء و صلحاء کے ایک جمِ غفیر کے ساتھ ان کے اِستقبال کے لیے پہنچا۔ ان کو گھوڑے سے اس نے خود اتارا اور پھر دربار میں لے جاکر تختِ شاہی پر بٹھایا اور خود اپنے اُمراء و وزراء کے ساتھ ان کے احترام میں کھڑا رہا۔[1]

---

[1] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۴۔ منتخب التواریخ جلد اوّل ص ۳۳۲

A. Halim, J.A.S.P. Vol VIII, No. 2, Dec. 1963, pp. 89.

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ جیسے وحیدِ عصر اور یکتائے روزگار عالم کو وہ اپنے دربار میں چاندی کی کرسی پر بٹھاتا تھا۔ علماء و مشائخ کا جو ہجوم دربارِ ابراہیمی میں دیکھا جاتا تھا وہ کہیں اور دیکھنے میں نہ آیا۔ فی الحقیقت جونپور اس کے عہد میں دہلی، بغداد اور قرطبہ کی ہمسری کا دعوےٰ کرنے لگا تھا۔ سلطان ابراہیم شاہ کو اپنی انتظامی صلاحیت، سیاسی بصیرت، علم دوستی اور مذہبی شغف کے باعث ایک خاص مقام حاصل تھا۔ اس کا دورِ حکومت سلطنتِ شرقی کی سیاسی، مذہبی، اور تمدنی تاریخ کا سب سے تابناک دور ہے۔ اس کے عہد میں دارالحکومت جونپور میں ایسے علماء اور ماہرینِ فن موجود تھے کہ جن کا ثانی بخارا، سمرقند، بغداد، خوارزم، دمشق، تبریز، رے، اور روم وغیرہ میں بھی تلاش کرنا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ علومِ اسلامی کا ہر گوشہ، منقولات و معقولات کا ہر پہلو تفسیر، فقہ، اصولِ فقہ، اصولِ دین، نحو، لغت، بیان اور منطق کا ہر شعبہ ان پر روشن تھا۔ ایک صدی تک شرقی مجلسوں میں دانشمندوں، کاملوں، فاضلوں اور شاعروں کے ہجوم لگے رہے اور انھوں نے گرانقدر علمی اور دینی خدمات انجام دیں۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان ابراہیم شاہ کے عہد میں ایک وقت میں نوسو چوراسی ۹۸۴ علماء کی پالکیاں نمازِ جمعہ و عیدین کے لیے نکلتی تھیں بعض مؤرخین نے ان کی تعداد ۱۴۰۰ لکھی ہے۔[۱]

شرقی سلاطین کی علم دوستی سے متاثر ہو کر صدہا علماء و مشائخ، شعراء و ادباء نہ صرف جونپور میں بلکہ ان کی سلطنت کے دوسرے شہروں اور قصبوں میں بھی آکر بس گئے تھے۔ درس و تدریس اور وعظ و تلقین ان بزرگوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ سلاطینِ شرقی نے اُن کے رہنے کے لیے مکان، وعظ و تلقین کے لیے خانقاہیں اور درس و تدریس کے لیے مدرسے بنوائے تھے۔[۳]

ان درسگاہوں میں صرف ملک کے گوشے گوشے ہی سے نہیں بلکہ عالمِ اسلامی کے گوشے گوشے سے طلبا جمع ہوتے تھے۔[۴] تاریخ نویسوں کا بیان ہے کہ عہدِ شرقی میں نہ صرف جونپور بلکہ سلطنت

---

[۱] تجلی نور جلد دوم، ص ۴۴ [۲] تاریخ شیراز ہند (جونپور) ص ۱۰۵
[۳] تفصیلات کے لیے اس کتاب کا حصہ دوم تا نہم ملاحظہ ہو۔ [۴] ایضاً

کے مختلف حصوں میں بھی سینکڑوں مدارس تھے ان میں سے قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا مدرسہ مشرق کی اعلیٰ ترین درسگاہوں میں تھا۔ اسے دُور دراز سے لوگ دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ شرقی مدرسوں میں طلبا کے قیام و طعام کا نہایت عمدہ انتظام تھا اور ان کو وظائف دیے جاتے تھے۔ مدرسوں میں جید علماء درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ علاوہ ازیں ہر مسجد سے ملحق بھی ایک مدرسہ ہوتا تھا۔ شرقی عہد میں تعلیم نسواں کا بھی خاص اہتمام تھا۔ خاص طور پر سلطان محمود شاہ شرقی کی مہذب ملکہ بی بی راجی نے اپنے عہد میں تعلیم نسواں کے لیے جو انتظامات کیے اس کی دُوسری مثال تاریخ ہند و پاک میں نہیں ملتی[1]۔ وہ عُلماء و مشائخ کی بے حد قدر دان تھی۔ ان کے لیے اس نے درسگاہیں اور خانقاہیں بنوائیں اور ان سے اظہار عقیدت کے طور پر ان کی وفات کے بعد مقبرے اور روضے تعمیر کروائے تھے[2]۔ جونپور کے علماء و مشائخ کی اس ملک میں اور سارے عالم اسلام میں بھی شہرت کا یہ عالم تھا کہ جب شہنشاہ ہمایوں ایران پہنچا تو شاہ طہماسپ صفوی نے اپنی پہلی ملاقات میں سب سے پہلے یہاں کے علماء و مشائخ کا حال پوچھا تھا[3]۔ شہنشاہ شاہجہاں نے بھی سترھویں صدی میں جونپور کو علمی و ادبی اور فنی کمالات کی بنا پر "دارالعلم" اور "شیراز ہند" کا خطاب دیا تھا[4]۔

شرقی علماء و مشائخ نے درس و تدریس اور وعظ و تلقین کے علاوہ تحریر و تصنیف میں بھی بڑا کام کیا اور ہر علم پر سینکڑوں تصنیفات یادگار چھوڑیں جو آج بھی ہمارا قابل فخر قومی سرمایہ ہیں۔ جونپور کی یہ علمی و ادبی روایات صدیوں تک قائم رہیں اور شرقی سلطنت کے زوال کے بعد بھی جونپور صدیوں تک علم و دانش اور تدریس کا مرکز بنا رہا۔ یہاں تک کہ سلطنت مغلیہ کے بادشاہ محمد شاہ (۱۷۱۹ء-۱۷۴۸ء) کے عہد میں بھی یہاں کم از کم بیس اچھے مدرسے موجود تھے[5]۔ اس

---

[1] مسلم خواتین کی تعلیم ص ۳۶ [2] جونپور نامہ ص ۵۰-۵۲

[3] جونپور نامہ ص ۵ [4] آب کوثر ص ۵۰۸

[5] The Monumental Antiquities and Inscriptions in the N.W. Provinces and Oudh, Vol. I, pp. 22.

سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنے عہدِ عروج میں یقیناً یہاں سینکڑوں مدارس ہوں گے۔ جن علمی و دینی روایات کو جونپور اور سلطنتِ جونپور کے علماء و مشائخ نے مختلف شہروں اور قصبوں میں رواج دیا تھا وہ آج بھی اس علاقہ میں جاری و ساری ہیں۔ ان میں سرائے میر، چڑیا کوٹ اور اعظم گڑھ کے علمی، ادبی اور دینی ادارے آج بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[1]۔

شرقی سلطنت کے تمام علماء و فضلاء کے تفصیلی حالات تاریخ کی کتابوں اور تذکروں میں نہیں ملتے تاہم نمونہ مشتے از خروارے کے مصداق جو معلومات بہم پہنچ سکیں ان کو ہم نے یہاں قلمبند کر دیا ہے۔ اس طرح یہاں صرف جونپور ہی کا نہیں بلکہ ظفر آباد، کالپی، خیر آباد اور لکھنؤ وغیرہ کے علماء و فضلاء کا بھی ذکر آگیا ہے۔

---

[1] آب کوثر ص ۵۰۹

بابِ اوّل

علمائے ظفر آباد

مُلّا نظام الدین علامیؒ

مُلّا نظام الدین علامیؒ بڑے عالی نسبت سیّد خاندان سے تھے اور حنفی عقائد کے پیرو کار تھے[1]۔ اُن کا شمار شرقی عہد کے دورِ اوّل کے ان علماء وصوفیاء میں ہوتا ہے جنھوں نے یہاں علم وادب اور تصوّف کی آبیاری کی۔ اُن کے سالِ ولادت، جائے پیدائش اور ابتدائی تعلیم و تربیت کا حوالہ کہیں نہیں ملتا لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ ان کی ثانوی تعلیم دہلی میں ہوئی تھی۔

وہ علوم ظاہری و باطنی کے بڑے زبردست عالم تھے لیکن ان کو سب سے زیادہ عبور علمِ فقہ، اصول، تفسیر اور حدیث پر تھا[2]۔ اپنے حلقۂ احباب میں وہ زبدۃ المحدّثین کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے[3]۔

ان کو عربی و فارسی دونوں زبانوں میں یدِطُولیٰ حاصل تھا اور ان دونوں زبانوں میں کئی کتابوں کے مصنّف بھی تھے۔ عربی میں ان کی بلند پایہ تصنیف زاد الصلحاء اور فارسی میں اَوراد السالکان ہے[4]۔ وہ فارسی کے بڑے اچھے شاعر تھے[5]۔ مندرجہ ذیل چند اشعار ان کی خوش کلامی اور نازک خیالی کا ثبوت ہیں ؎

---

[1] تجلّی نور جلد دوم ص ۲۲

[2] ایضاً   [3] ایضاً   [4] ایضاً ص ۲۲-۲۳   [5] ایضاً ص ۲۳

چوں غنچہ جز سکوت نباشد بیانِ ما
پیچیدہ شد زبانِ سخن در دہانِ ما

یار مارا بہ ازیں زار و حزیں می خواہد
بہ ازیں چیست کہ مارا بہ ازیں می خواہد
گر دی از خاک سر کوئی تو برخاست مگر
آسمان سرمۂ چشمی ز زمین می خواہد[1]

گرت اُمید درستی ست خویش را بشکن
کہ مومیائی آدم شکستگی دارد[2]

شروع میں وہ درس و تدریس کا کام کرتے رہے لیکن بعد میں ان کے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے بعد وہ دُنیا سے تصوّف میں گم ہو گئے[3] سیّد نُور الدین زیدیؔ لکھتے ہیں کہ ایک روز راستے میں انھیں ایک کاغذ کا پُرزہ ملا جس پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ اس کو پڑھتے ہی ان کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پہلے تو انھوں نے اس کو بوسہ دیا۔ پھر سر پر رکھا اور اس کے بعد اس کو نگل گئے۔ اسی رات انھوں نے خواب میں دیکھا کہ پردۂ غیب سے یہ ندا آ رہی ہے کہ "تو نامِ مارا تعظیم کردی من دلِ تُرا از انوارِ معرفت و اسرارِ حقیقت معمور کردم"۔ اس کے بعد اسی روز سے انھوں نے خرقۂ فقر اوڑھ لیا[4]۔ پہلے وہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ سے بیعت ہوتے، پھر حضرت مخدوم سیّد اسد الدین آفتابِ ہندؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے بڑا روحانی فیض حاصل کیا اور خرقۂ خلافت بھی پایا[5]۔ اس کے بعد

---

[1] تجلّی نُور جلد دوم ص ۲۳
[2] ایضاً
[3] ایضاً
[4] ایضاً ص ۲۲
[5] ایضاً

دنیائے تصوف میں ایسے گم ہوئے کہ عارفِ زمانہ مشہور ہوئے۔ جب حضرت مخدوم آفتابِ ہند
جہاد و تبلیغ کے لیے ظفر آباد تشریف لائے تو وہ بھی اُن کے ہمراہ چلے آئے اور ان کے ساتھ
جہاد و تبلیغ میں باقاعدہ شریک رہے[1] جہاد سے فارغ ہو کر وہ محلہ سیّدواڑہ میں مقیم ہو گئے
اور وہیں ۸۳۵ھ/۱۴۳۱ء میں وفات پائی[2] ان کا مزارِ اقدس ظفر آباد میں ہے[3]۔

سیّد نُورالدّین ابی محمّدؒ

سیّد نُورالدّین ابی محمّدؒ حضرت مخدوم سیّد اسدالدّین آفتابِ ہندؒ کے منجھلے بیٹے تھے اور
ان کی پیدائش ۷۴۳ھ میں مدینہ منورہ میں ایامِ حج میں ہوئی تھی[4]۔ ان کی ابتدائی تعلیم اپنے والدِ بزرگوار
کے سایۂ عاطفت ہی میں ہوئی لیکن صرف، نحو، تفسیر، معقولات، فقہ اور اصول وغیرہ کی تعلیم انھوں
نے مُلّا قیام الدّین ظفر آبادیؒ سے حاصل کی اور علمِ حدیث مُلّا نظام الدّین علّامیؒ سے پڑھا[5]۔ انھیں
ایک ہزار چالیس احادیث کی سند حاصل تھی[6]۔ جب انھوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع
کیا تو ان کو بحیثیت مدرّس ظفر آباد میں بڑی شہرت حاصل ہوئی اور ان کے درس میں ملکی اور غیر ملکی
طلباء کا جمگھٹا لگا رہتا تھا[7]۔

کچھ عرصہ بعد جب ان کا میلان روحانیت کی جانب ہوا تو انھوں نے اصلاحِ باطن
کی طرف توجہ مبذول فرمائی اور اپنے والد بزرگوار ہی کے دستِ مبارک پر بیعت ہوئے۔ اپنے
والد سے تصوف کی بعض کتابیں بھی پڑھیں جن میں نصوص الحکم اور عوارف المعارف بھی شامل تھیں[8]۔
خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد وہ دن رات بحرِ معرفت میں غوطہ زن رہتے تھے[9]۔ جب ان کے
والدِ بزرگوار انتقال کر گئے تو ان کی جگہ سجادہ نشین ہوئے۔ اس کے بعد تھوڑی ہی مدت میں ان
کی شہرت دنیائے تصوف میں پھیل گئی اور ان کے ارشاد و ہدایت سے ہزاروں لوگ مستفیض

---

[1] تجلی نور جلد دوم ص ۲۲ [2] ایضاً [3] ایضاً
[4] تجلی نور جلد دوم ص ۲۳ A. Halim, J.A.S.P. Vol. VIII, No 2, 1963, p. 105.
[5] تجلی نور جلد دوم ص ۱ [6] ایضاً [7] ایضاً [8] ایضاً [9] ایضاً [10] ایضاً

ہوئے[۱]

وہ طبعاً بڑے خوش اخلاق تھے۔ ضبطِ نفس ان کا شیوہ تھا۔ کم کھانا، کم سونا اور کم بولنا ان کی زندگی کا معمول تھا۔ ہر وقت سوزِ باطن میں ڈوبے ہوئے اور متحیّر حال نظر آتے[۲]۔ ان کا وصال ظفرآباد میں ۲۴ صفر المعظم ۸۲۶ھ المطابق ۱۴۲۲ء میں ہُوا۔ ان کا مزار اپنے والدِ بزرگوار کے روضہ کے حظیرہ میں ان کے مزار سے ایک قبر چھوڑ کر مشرق کی طرف ہے[۳]۔

سیّد قطب الدّین ابوالغیبؒ

سیّد قطب الدینؒ سیّد نورالدّین ابی محمدؒ کے فرزندِ ارجمند تھے۔ وہ ۸۰۲ھ میں پیدا ہوئے[۴]۔ انھوں نے پندرہ برس کی عمر میں ہی علومِ فارسیہ اور مختصراتِ عربیہ کی تعلیم اپنے والدِ بزرگوار سے حاصل کر لی تھی۔ پھر باقی تمام علوم کی تعلیم ملک العلماء قاضی شہاب الدّین دولت آبادیؒ سے حاصل کی[۵]۔ قاضی شہاب الدینؒ نے ان کی تعلیم میں خاص طور پر بڑی دلچسپی لی اور وہ ان کی بڑی قدر و منزلت فرمایا کرتے تھے۔ اس سبب سے ان کے دوسرے شاگرد ان سے خفا رہتے۔ جب قاضی صاحب کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے ایک روز اپنے تمام طلباء کو ایک جگہ جمع کیا اور انھیں بتایا کہ تمھیں اس طالبِ علم کی خوبیوں کا علم نہیں کہ اللہ تعالےٰ نے اس کو کن صفات سے نوازا ہے۔ یہ لڑکا اپنے وقت کا علومِ صوری و معنوی کا بہت بڑا عالم و فاضل ہوگا۔ ابھی تو اس کے کمالات کا سورج پوری طرح روشن اور عیاں نہیں ہوا اور وہ خود بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا چیز بنے گا اور پھر کہا "در کیسہ تختم خذف انداختہ اند یا لعل شبِ چراغ نہادہ[۶]"۔ قاضی صاحب نے جیسا کچھ کہا تھا وہ وہی کچھ ثابت ہوئے اور انھوں نے اس واقعہ کے چار سال بعد ہی تمام علوم کی تعلیم مکمل

---

[۱] تجلّی نور جلد دوم ص ۱۱ — [۲] ایضاً ص ۱۱ — [۳] ایضاً
[۴] ایضاً — [۵] ایضاً
[۶] ایضاً ص ۱۲

کرلی اور خاص طور پر علومِ معقول و منقول میں بڑی دسترس حاصل کی۔ اُن کا شمار قاضی شہاب الدین رح کے قابل ترین شاگردوں میں ہوتا تھا اور ان کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی[1]۔ وہ حافظِ قرآن بھی تھے اور حاجی الحرمین الشریفین بھی[2]۔ ان کے حلقۂ درس میں تمام ملک کے طلباء جمع ہوتے تھے[3]۔ اور ان کی حُسنِ اخلاق کا یہ عالم تھا کہ ہر کوئی ان کا گرویدہ تھا۔ ان کی مہمان نوازی اور زہد و تقویٰ بھی بے مثال تھا[4]۔

زندگی کے آخری دور میں وہ دنیا سے تصوّف کی طرف راغب ہو گئے اور اس سلسلہ میں اپنے والدِ بزرگوار ہی کے مرید و خلیفہ ہوئے۔ اس کے بعد وہ دن رات عبادت و ریاضت میں مستغرق رہنے لگے اور جب ان کے والدِ بزرگوار رحلت فرما گئے تو ان کی جگہ سجادہ نشین ہوئے[5]۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں حضرت شاہ بدیع الدین مدار رح سے بھی روحانی فیض حاصل تھا[6]۔ ان کے بعض شاگرد و مرید بھی بڑی شہرت کے مالک ہوئے۔ انھوں نے ۸۶۹ھ/۱۴۶۴ء میں رحلت فرمائی۔ ان کا مزار حضرت مخدوم آفتابِ ہند رح روضہ کے حظیرہ میں ان کی قبر سے مغرب کی طرف ایک قبر کے بعد گوشہ میں واقع ہے[7]۔

شیخ غلام رُکن الدّین رُکنِ عالم رح

شیخ غلام رُکن الدّین رح حضرت مخدوم شیخ صدر الدّین چراغِ ہند رح کے صاحبزادے تھے۔ جنھوں نے ان کا نام اپنے پیر و مُرشد حضرت شیخ رکن الدّین ملتانی رح کی یاد میں رکھا تھا[8]۔ وہ قریشی خاندان سے تھے اور حنفی عقائد کے پیروکار تھے[9]۔ علومِ عقلی و نقلی کے جید عالم تھے اور اس دور کے عالی مرتبت علماء و فضلاء میں شمار ہوتے تھے۔ مسائلِ فقیہہ کو وہ بڑی اچھی طرح سمجھنے اور سمجھایا

---

[1] تجلی نور جلد دوم ص ۱۲
[2] ایضاً ص ۱۳
[3] ایضاً
[4] ایضاً
[5] ایضاً ص ۱۲
[6] ایضاً ص ۱۳
[7] ایضاً
[8] ایضاً ص ۱۹
[9] ایضاً

کرتے تھے اور کئی سال تک درس و تدریس کا کام بھی کرتے رہے[1] لیکن بعد میں جب روحانی تشنگی بڑھی تو ہر چیز کو خیرباد کہہ کر راہِ طریقت اختیار کر لی اور اپنے والدِ بزرگوار ہی کے مرید و خلیفہ ہوئے[2]

وہ نظریہ وحدت الوجود کے حامل تھے اور دن رات دنیا سے معرفت میں مستغرق رہا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جس کسی کی نظریں ان کی نظروں سے ملتیں اس کی آنکھیں پُر آب ہو جاتیں اور وہ بے خود ہو جاتا[3]۔ وہ بڑے صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ ایک لمحہ بھی یادِ الٰہی سے غافل نہ رہتے اور ہمیشہ عزلت نشینی پسند کرتے[4]۔

ان کا وصال عالمِ جوانی ہی میں ہو گیا۔ تاریخِ وفات ۹ محرم الحرام ۷۹۶ھ/۱۳۹۳ء ہے[5]
ان کا مزار حضرت مخدوم چراغِ ہندؒ کے روضہ کے حظیرہ میں ان کی قبر کے بالمقابل دائیں طرف واقع ہے[6]۔ ان کے صاحبزادے شیخ شمس الحق بڈھنؒ بڑے پایہ کے بزرگ اور ولی اللہ تھے[7]۔

قاضی تاج الدین ابراہیم ناصحیؒ

قاضی تاج الدین فاروقی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا شجرۂ نسب حضرت سلطان التارکین ابراہیم بن ادہمؒ سے ملتا ہے[8]۔ ان کا آبائی وطن بلخ تھا اور وہیں سے وہ ہجرت کر کے دہلی چلے آتے تھے[9]۔ وہ علومِ ظاہری و باطنی کے بہت زبردست عالم تھے اور خاص طور پر علوم معقول و منقول میں بڑے مستند گردانے جاتے تھے[10]۔ انھوں نے تمام زندگی ایک عالمِ باعمل اور ایک عابدِ کثیر الامل کی حیثیت سے بسر کی[11]۔ وہ حافظ بھی تھے اور قرآن مجید کی تلاوت

---

[1] تجلّیِ نور جلد دوم ص ۱۹ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً ص ۲۰ [5] ایضاً
وہ شرقی سلطنت کے وجود میں آنے سے پہلے ہی رحلت فرما گئے تھے لیکن ہم نے ان کے ان شاگردوں اور مریدوں کی وجہ سے کہ جن کا تعلق شرقی عہد سے ہے ان کا ذکر اس باب میں شامل کر لیا ہے۔
[6] تجلّیِ نور جلد دوم ص ۲۰ [7] تجلیاتِ العارفین (قلمی) [8] تجلّیِ نور جلد دوم ص ۲۰
[9] ایضاً [10] ایضاً [11] ایضاً

اِس قدر عمدہ طریقے اور خوش الحانی سے کرتے کہ سامعین پر وجد طاری ہو جاتا[1] پہلے کئی سال وہ دھلی میں درس و تدریس میں مشغول رہے لیکن جب جذبہ روحانی جوش میں آیا تو دن رات عبادات و ریاضات میں مشغول رہنے لگے اور پھر اسی حال میں کئی سال گزار دیئے۔ بالآخر حضرت مخدوم سید اسد الدین آفتابِ ہندؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور ان سے بڑا روحانی فیض حاصل کیا اور خرقۂ خلافت بھی پایا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ان کا شمار اس دور کے عظیم المرتبت بزرگوں میں ہونے لگا تھا[2]

جب ان کے پیر و مُرشد حضرت مخدوم آفتابِ ہندؒ مجاہدین کے ساتھ جہاد و تبلیغ کے لیے دھلی سے ظفر آباد روانہ ہوتے تو وہ بھی ان کے ساتھ شامل جہاد ہو گئے اور کئی جنگوں میں باقاعدہ حصّہ لیا[3]۔ جب جہاد سے فارغ ہوتے تو ظفر آباد ہی میں سکونت اختیار کر لی اور پھر تادمِ آخر وہیں رہے[4]۔ جس محلہ میں انھوں نے رہائش کی تھی وہ ان کے نام کی نسبت سے ناصحیؒ کہلانے لگا تھا[5]۔

ظفر آباد میں ان کی زندگی بڑی کامیاب گذری اور انھوں نے وہاں ہزاروں طلبہ کو علومِ ظاہری کی تعلیم دی[6]۔ شرقی فرمانرواؤں نے بھی ان کے علم و فضل کی بڑی قدر افزائی کی اور ان کو قاضی ظفر آباد کے عہدہ پر فائز کیا[7]۔ وہ اس منصب کو کئی سال تک بڑی خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے

ان کے خاندان کے بعض دوسرے افراد بھی ان کی طرح علم و فضل اور دُنیائے تصوّف میں یکتائے روزگار ہوتے۔ ان میں سے ایک حضرت مخدوم بندگی جلال الحق قاضی خاں ناصحیؒ، (المتوفیٰ ۱۰۰۱ھ) بڑے ذی مرتبت بزرگ تھے[8]۔ اس خاندان کے ایک اور بزرگ حضرت بندگی شاہ شمس الحق شیخ بڑے ناصحیؒ (المتوفیٰ ۱۰۵۹ھ) تھے۔ جن کے ساتھ منعم خان خانخاناں کو بڑی

---

[1] تجلّی نور جلد دوم ص ۲۰ [2] ایضاً ص ۲۱ [3] ایضاً
[4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً
[7] ایضاً [8] ایضاً

عقیدت تھی۔ ان کی زیارت کے لیے ایک بار بادشاہ اکبر بھی ظفرآباد گیا تھا۔[1]

حضرت بندگی شاہ شمس الحق کے بیٹے حضرت بندگی شاہ نظام الحق پیر ناصحیؒ بھی اپنے زمانہ کے بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ ان کا مزار بھی حضرت بندگی قاضی خاں ناصحیؒ کے روضہ کے احاطہ میں ہے۔[2]

قاضی تاج الدین ناصحیؒ نے ۸۳۱ھ/۱۴۲۷ء میں وصال کیا۔[3] ان کا مزار ظفرآباد میں مرجع خلائق ہے۔

مُلّا رکن الدّین یک لکھیؒ

مُلّا رکن الدّین یک لکھیؒ کے مقامِ پیدائش اور ان کے خاندانی حالات کا حوالہ کسی بھی تذکرہ و تاریخ میں نہیں ملتا۔ وہ حضرت مخدوم سیّد اسد الدین آفتابِ ہندؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ انہی کے ساتھ وہ ظفرآباد آئے اور جہاد و تبلیغ میں شریک رہے تھے۔[4] وہ حنفی العقیدہ بزرگ تھے۔ اور علومِ ظاہری کے ایک ممتاز عالم تھے مگر سب سے زیادہ مہارت انھیں علمِ ریاضی اور دینیات میں حاصل تھی۔[5]

ان کو ایک لاکھ احادیث زبانی یاد تھیں۔ اس بنا پر وہ ملّا یک لکھیؒ کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔[6] انھوں نے پوری زندگی ایک عالمِ باعمل اور سالکِ طریقت کی حیثیت سے بسر کی۔[7] ان کے خاندان کے بہت سے دوسرے لوگ بھی اولیاء کرام میں سے ہوئے۔[8] ان میں سے حضرت مخدوم قطب الدین بینائے دل قلندر جونپوریؒ،[9] حضرت شاہ نور

---

[1] مناقب درویشیہ (قلمی) تاریخ ظفرآباد

[2] تجلیات العارفین (قلمی) بیاضِ درویشیہ (قلمی)

[3] تجلّی نور جلد دوم ص ۲۱

[4] ایضاً ص ۲۴ [5] A'Halim, J.A.S.P. Vol. VIII, No. 2, Dec. 1963, p. 104.

[6] تجلّی نور ایضاً [7] ایضاً [8] ایضاً

نور پوریؒ اور حضرت شاہ فتح قلندر قلند رپوریؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔[۱]

ان کا وصال ۸۲۰ھ/۱۴۱۷-۱۴۱۸ء میں ہوا[۲] اور ان کی قبر ظفرآباد میں حضرت مخدوم آفتاب ہندؒ کے روضہ کے حظیرہ میں ان کی قبر سے مشرق کی طرف چار قبریں چھوڑ کر واقع ہے۔[۳]

مولانا سید یعقوب شامیؒ

مولانا سید یعقوب شامیؒ اپنے دور کے جید علماء و فضلاء میں شمار ہوتے تھے۔ اُن کا آبائی وطن ملک شام تھا اور ان کی پرورش و تعلیم بھی وہیں ہوئی تھی۔[۴] وہ تمام علوم ظاہری کے بڑے پایہ کے عالم تھے لیکن علم مباحثہ و مناظرہ میں خاص طور پر مہارتِ تامّہ رکھتے تھے۔[۵] پہلے کافی عرصہ تک وہ اپنے وطنِ مالوف میں درس و تدریس کا کام کرتے رہے۔ لیکن جب پیشۂ معلّمی سے طبیعت بھر گئی۔ تو وہاں کے سلطان کی فوج میں افسر ہو گئے اور چند سال تک اس عہدہ پر مامور رہے۔ لیکن جب عشقِ حقیقی نے کشش کی اور روحانی پیاس بڑھی تو خیال کیا کہ کسی سلطان کی بجائے کیوں نہ اُسی ہستی کی خدمت کی جائے جو ساری کائنات کا خالق و مالک اور سلطانِ حقیقی ہے۔ چنانچہ فوجی ملازمت سے استعفاء دے دیا۔ اور اپنا تمام سرمایہ فقراء و مساکین میں بانٹ دیا اور ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے۔[۶]

سب سے پہلے وہ ملتان پہنچے اور حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے روضۂ اقدس کی زیارت اور روحانی فیض سے مستفیض ہوئے۔[۸] وہاں ان کا قیام چار روز رہا اور پھر ایک رُوحانی اشارہ کے تحت روحانیت کی تکمیل کے لیے ظفرآباد چلے آئے۔[۹] یہاں وہ سلسلۂ سہروردیہ میں حضرت مخدوم سید اسد الدین آفتاب ہندؒ سے بیعت ہوئے۔ اُن سے آپ نے

---

[۱] تجلّیِ نور جلد دوم ص ۲۴
[۲] تجلّیِ نور ایضاً
[۳] ایضاً
[۴] تجلّیِ نور ایضاً — A. Halim, J.A.S.P. Vol. VIII, No. 2, 1963, p. 104.
[۵] ایضاً ص ۲۵
[۶] ایضاً
[۷] ایضاً
[۸] ایضاً
[۹] ایضاً

سلوک و تصوف کی کتابیں بھی پڑھیں اور ساتھ ساتھ ریاضاتِ باطنیہ میں بھی مگن رہے۔ یہاں تک کہ منزلِ مقصود کو پہنچ کر خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ اس کے بعد بھی ظفرآباد ہی میں مقیم رہے اور تادمِ آخر لوگوں کی دینی اور روحانی اصلاح کرتے رہے[1]۔ ان کا وصال ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء میں ہوا[2] اور ان کا مزار دریائے گومتی کے کنارے حضرت مخدوم آفتابِ ہندؒ کے روضہ کے مشرقی جانب سو قدم کے فاصلہ پر واقع ہے[3]۔

مُلّا آدمؒ

مُلّا آدمؒ کے آبائی حالات کا حوالہ کہیں نہیں ملتا لیکن وہ حضرت مخدوم سید اسد الدین آفتابِ ہندؒ کے ممتاز خلفاء میں سے تھے اور انہی کے ساتھ ظفرآباد آئے تھے[4]۔ وہ اس دور کے جیّد علماء اور ذی مرتبت صوفیاء میں شمار ہوتے تھے۔ وہ تمام عمر درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ریاضاتِ باطنیہ بھی کرتے رہے[5]۔ دنیا اور اہلِ دنیا سے وہ ہمیشہ اجتناب فرماتے اور اگر کوئی امیر انہیں دعوت پر بلاتا تو صاف انکار کر دیتے[6]۔

ان کا وصال ۸۳۸ھ/۱۴۳۴ء میں ہوا اور ان کا مزار ظفرآباد میں مولانا سید یعقوب شامیؒ کے مزار کے ساتھ واقع ہے[7]۔ ان کی اولاد میں سے بعض لوگ اب تک ملّو پور پرگنہ انگلی ضلع جونپور میں آباد ہیں[8]۔

مولانا بدرالدینؒ

مولانا بدرالدینؒ حضرت مخدوم آفتابِ ہندؒ کے اجلّ خلفاء میں سے تھے[9]۔ وہ علومِ ظاہری

۱۔ تجلّیِ نور جلد دوم ص ۲۵ ۲۔ چراغِ نور، تجلیات العارفین ۳۔ تجلّیِ نور ایضاً
۴۔ تجلّیِ نور جلد دوم ص ۲۶ ۵۔ ایضاً ۶۔ ایضاً ۷۔ ایضاً
۸۔ ایضاً ۹۔ ایضاً

وباطنی کے متبحر عالم تھے۔ اور زہد و ورع میں بھی بے مثال تھے[۱]۔ انھوں نے تمام عمر درس و تدریس اور یاد اللہ کے سوا کوئی دوسرا کام نہ کیا اور سینکڑوں ہزاروں کو علومِ دینی کی تعلیم دی[۲]۔ حق پرستی اور خدا پرستی ان کا شیوہ تھا[۳]۔ بڑے منکسر المزاج اور فیاض طبع تھے[۴]۔ اگر اُن کے شاگرد یا عقیدت مند ان کو کوئی چیز بطورِ نذر و نیاز پیش کرتے تو اس کو فوراً مساکین و فقراء میں تقسیم کرا دیتے۔ تاکہ ان کے پاس اتنا سرمایہ جمع نہ ہونے پائے جس پر زکوٰۃ واجب آئے نیز خداوند تعالےٰ کے ہاں بھی کسی چیز کے بارے میں پرسش نہ ہو[۵]۔

وہ پہلے حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ سے بھی بیعت ہوئے تھے اور ان سے بھی انھوں نے بڑا روحانی فیض حاصل تھا[۶]۔ ان کا وصال ۸۴۵ھ/۱۴۴۱-۴۲ء میں ہوا اور مزار اقدس حضرت مخدوم آفتاب ہندؒ کے روضہ کے احاطہ کی مغرب کی طرف سر راہ ایک چبوترے کی شکل میں موجود ہے[۷]۔ ان کے خاندان کے بعض لوگ پٹنہ عظیم آباد اور شاہ آباد میں صدیوں تک آباد رہے[۸]۔

ملّا بہرامؒ

ملّا آدمؒ کے آبائی حالات کا حوالہ کہیں نہیں ملتا۔ تاہم ان کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ انھوں نے علومِ ظاہری کا اکتساب دہلی سے کیا[۹]۔ وہ نجیب الطرفین اور حاجی الحرمین الشریفین تھے وہ حافظِ قرآن بھی تھے اور اپنے دور کے برگزیدہ علماء میں شمار ہوتے تھے[۱۰]۔ وہ شہزادہ ظفر خاں کے ساتھ ظفر آباد آئے اور وہاں جامع مسجد ظفر خاں کے خطیب مقرر ہوتے تھے۔ ان کی رہائش بھی اس مسجد کے قریب ہی تھی اور وہ اسی مسجد میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے[۱۱]۔

---

۱ تجلی نور جلد دوم ص ۲۶ — ۲ ایضاً ص ۲۷ — ۳ ایضاً — ۴ ایضاً ص ۲۶
۵ ایضاً — ۶ ایضاً ص ۲۷ — ۷ ایضاً — ۸ ایضاً
۹ ایضاً — ۱۰ ایضاً — ۱۱ ایضاً

علومِ عقلیہ یا نقلیہ کی کوئی شاخ ایسی نہ تھی جس کو وہ محققانہ طور پر نہ جانتے ہوں تاہم علمِ معقولات سے ان کو بڑی گہری دلچسپی تھی اور اس پر وہ بحث و مباحثہ بھی بڑے جوش و خروش سے کیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس بحث و مباحثہ کی نسبت سے ان کی اقامت گاہ بعد ازاں منطق ٹولہ کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔[۱]

ایک روز وہ حسبِ معمول مسجد میں علوم عقلیہ پر درس دے رہے تھے کہ اچانک حضرت مخدوم آفتابؒ وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے آپ سے مخاطب ہو کر فرمایا "مولانا بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ نے تمام عمر مسائل جزئیہ و کلیہ اور مساحتِ ارض و افلاک کے سمجھنے سمجھانے میں بسر کر دی لیکن آج تک آپ اللہ تعالیٰ کا خلقت کو پیدا کرنے کا سبب نہ جان سکے۔ خدائے وحدہٗ لاشریک قرآن مجید میں فرماتے ہیں کہ" وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ؕ" بس ان الفاظ کا سننا تھا کہ ان پر عجیب حالت طاری ہو گئی۔ جسم کانپنے لگا اور وہ پسینہ پسینہ ہو گئے۔ چنانچہ اسی وقت انھوں نے حضرت مخدوم آفتابِ ہندؒ سے بیعت کر لی اور تمام کتابوں سے کنارہ کشی کر کے باقی تمام عمر مجاہداتِ نفس اور ریاضاتِ باطنیہ میں صرف کر دی۔[۲] انھوں نے اپنے پیر و مرشد سے بڑا روحانی فیض حاصل کیا۔[۳] اور جلد ہی اولیائے عظام میں شمار ہونے لگے۔ ان کا وصال ۸۲۹ھ/۱۴۲۵ء میں ہوا اور ان کا مزار جامع مسجد ظفر خاں کے قریب واقع ہے۔[۴] ان کے خاندان کے ایک مولانا حسام الدین عرف شیخ بڑن بھی بڑے جلیل القدر عالم و صوفی تھے۔[۵]

شاہ مسعود خلوتیؒ

شاہ مسعود خلوتیؒ کے ابتدائی حالاتِ زندگی کا حوالہ کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ تاہم یہ معلوم ہے

۱۔ تجلی نور جلد دوم ص ۲۷ ۲۔ ایضاً ص ۲۶، ۲۷ ۳۔ ایضاً ص ۲۷
۴۔ ایضاً ۵۔ ایضاً ص ۲۸-۲۹

کہ وہ ہر علم و فن کے متبحر عالم و فاضل تھے اور بڑے صالح انسان تھے[1]۔ انھوں نے اکتسابِ علوم اس دور کے ممتاز عالم و فقیہہ مولانا الہداد جونپوریؒ (المتوفی ۹۲۳ھ) سے کیا اور ہر علم کی سندِ تکمیل بھی حاصل کی[2]۔ اس کے بعد وہ کئی سال تک درس و تدریس کا کام کرتے رہے تھے[3]۔ لیکن ان کا دِل دولتِ علم اور دُوسری نعمتوں کے باوجود مطمئن نہ ہُوا اور وہ دنیا سے فقر کی طرف راغب ہوگئے۔ اور ہر وقت کسی خضرِ راہ کی تلاش میں رہنے لگے۔ بالآخر حضرت مخدوم بندگی جلال الحق قاضی خاں ناصحیؒ ظفرآبادیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے۔ اور تزکیۂ نفس اور ریاضاتِ باطنیہ میں اِس قدر محو ہوئے کہ پھر اس دور کے عظیم المرتبت مشائخ میں شمار ہوئے۔ انھوں نے صفائیٔ قلب کے لیے بارہ سال خلوت میں مجاہدات و ریاضات کی تھیں۔ اسی بنا پر وہ خلوتیؒ کے لقب سے مشہور ہوئے[4]۔

ان کا مزار ظفرآباد کے قریب موضع رام داس میں موجود ہے[5]۔

---

[1] تجلی نور جلد دوم ص ۳۰ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً

باب ۲ دوم

عُلمائے جونپور

مولانا شرف الدین لاہوریؒ

مولانا شرف الدینؒ سلطنتِ شرقی کے دورِ اوّل کے علماء و صوفیاء میں سے تھے۔ ان کے آبائی حالات کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ ان کے آباء و اجداد یا کم سے کم وہ خود لاہور سے تھے جس وجہ سے وہ اپنے نام کے ساتھ لاہوری لکھتے تھے وہ علومِ ظاہری کے بہت بڑے عالم تھے اور بحیثیتِ علم ان کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔[1] جب سلطان الشرق کو ان کی قابلیت و شہرت کا علم ہوا تو اس نے انھیں جونپور آنے کی دعوت دی جس کو انھوں نے بخوشی قبول فرمایا۔[2]

جونپور میں سلطان الشرق ملک سرور نے ان کو ایک مدرسہ و خانقاہ ایک مسجد کے قریب بنوا کر دی جہاں وہ طلبا کو درس دیتے اور مریدوں کو وعظ و تلقین فرمایا کرتے تھے۔[3] وہ بڑے کامیاب معلم تھے اور اُن کے حسنِ کمال سے ہزاروں نے علمی فیوض حاصل کیے۔[4] مزاج کے اعتبار سے وہ بڑے نفیس طبع اور شریف النفس انسان تھے اور جونپور میں ان کو بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل تھی۔[5] وہ بڑے بلند پایہ مصنّف تھے اور انھوں نے کئی مستند کتابیں تصنیف کیں جن میں سے شرحِ کافیہ، نحو، حاشیہ تفسیر بیضاوی اور شرح ازدوی بڑی اہم ہیں۔[6] وہ بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے اور خلقِ خدا نے ان سے بے حد فیوض حاصل کیے۔[7] وہ فرمایا کرتے تھے کہ علماء و صوفیاء کو ضرور کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش اختیار کرنا چاہیے۔[8] وہ اپنے مریدوں کو ہمیشہ توکّل کی تعلیم دیا

---

۱ A Halim J.A.S.P. Vol. VIII, No. 2, Dec. 1963, p. 79.

۲ ..

کرتے تھے۔ اور اس بات پر خاص طور پر زور دیتے تھے کہ وہ حصولِ رزق کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کریں۔ ان کا قول تھا کہ دنیا میں ایک لمحہ صحیح بسر کرنا موت کے بعد کی زندگی کے ہزارہا سال سے بہتر ہے۔[1]

ملا شیخ عثمان صالحؒ

ملا شیخ عثمان صالحؒ جون پور کے مشہور علماء اور اہلِ باطن میں سے تھے۔ سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے ان کو دہلی سے جونپور مدعو کیا اور وہاں وہ سالہا سال تک درس و تدریس کا کام کرتے رہے۔[2] ان کے بعض شاگرد نامور علماء ہوئے اور بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ علم کیا۔[3] فقر و درویشی میں وہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔[4] اور وہ بھی علوم نقلی و عقلی میں ان کی استعداد و قابلیت کے بے حد مداح تھے۔ ملا عثمانؒ کئی سال تک اُن کی خدمت میں رہے اور وہاں تصفیۂ قلب میں شغف رکھنے کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا کام بھی کرتے رہے۔[5] وہ بڑے بلند پایہ مصنف تھے۔ بلاغت میں شرحِ تلخیص اور اصول میں شرح منار ان کی گرانقدر تصنیفات ہیں۔[6]

انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی اور ایک سو چودہ سال کی عمر میں ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء میں وصال فرمایا۔[7] ان کا مزار جونپور کے محلہ سپاہ میں ہے۔[8] ان کی اولاد صدیوں تک اِس محلہ میں آباد رہی۔[9]

قاضی نصیر الدین گنبدیؒ

قاضی نصیر الدینؒ دہلی کے کسی شیخ خاندان سے تھے اور وہیں ان کی پرورش بھی ہوئی۔[10] قاضی عبدالمقتدرؒ جیسے جلیل القدر عالم ان کے استاد تھے جو ان کی تعلیم و تربیت میں بڑی گہری

---

[1] A. Halim, J.A.S.P. Vol. VIII, No. 2, Dec. 1963, p. 79.

[2] تاریخ شیراز ہند (جونپور) ص ۶۰۷-۶۰۸ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً [7] ایضاً [8] ایضاً [9] ایضاً [10] تجلی نور جلد دوم ص ۳۲

دلچسپی لیتے۔ اور اُن کے ساتھ بڑی شفقت و محبّت سے پیش آیا کرتے تھے۔ بالآخر انھوں نے تمام علومِ ظاہری و باطنی کی تعلیم انہی کی شاگردی میں مکمل کی۔ وہ اُن کے محبوب ترین شاگردوں میں شمار ہوتے تھے[۱]۔ قاضی نصیرؒ اپنے ہم عصر علماء میں اپنے علمی تبحر و تقدس کی بنا پر بڑا مقام رکھتے تھے اور اس دور کے علمائے عظام میں ان کا شمار ہوتا ہے[۲]۔

امیر تیمور نے جب دہلی پر حملہ کیا تو وہ بھی ہجرت کر کے جونپور چلے آئے جہاں انھوں نے علومِ اسلامیہ پر درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا اور ان کے کمالاتِ علمی سے سینکڑوں ہزاروں لوگ فیضیاب ہوئے۔ جونپور میں ان کو بڑی کامیابی و شہرت حاصل ہوئی[۳]۔ سلطان الشرق ملک سرور اُن کے بڑے قدردان تھے اور اس نے ان کو قاضی جونپور کے عہدہ پر بھی فائز کیا لیکن وہ تھوڑے ہی عرصہ بعد مستعفی ہو گئے کیونکہ ان کو دنیاوی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی[۴]۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ ان کے ہم عصر تھے۔ وہ بھی ان کے علم و تقدس کا بڑا احترام کرتے تھے[۵]۔ انھوں نے جب اپنی کتاب حواشی کافیہ لکھی تو ان کے پاس بھیجی تاکہ وہ اس کو اپنے درس و نصاب میں شامل کر لیں لیکن انھوں نے اُسے ایک اجمالی نظر سے دیکھ کر واپس کر دیا اور کہلوا بھیجا کہ یہ کتاب آپ نے خوب لکھی ہے مگر میں اس کو اپنے درس و نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا[۶]۔ شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ شاید یہ جواب انھوں نے اپنی اشغالِ باطنیہ کی مصروفیات کی بنا پر دیا ہوگا، یا پھر بحث و نزاع سے محفوظ رہنے کے لیے یوں کہہ دیا ہوگا[۷]۔

قاضی صاحب کا روحانی تعلق کئی خانوادوں سے تھا اور ہر خانوادہ سے انھیں بے حد رُوحانی فیض حاصل ہوا تھا[۸]۔ وہ درس و تدریس اور ذکر و اذکار کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہ

---

۱ تجلّی نور جلد دوم ص ۳۲ ۲ ایضاً ۳ ایضاً ۴ ایضاً ۵ ایضاً
۶ اخبار الاخیار ص ۱۷۶ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳۸
۷ اخبار الاخیار ایضاً
۸ تجلّی نور ایضاً

کرتے اور تمام عمر توکّل علی اللہ پر عمل پیرا رہے۔ دُنیاوی حرص وطمع سے نفرت کرتے اور ان کے پاس کوئی دنیاوی چیز کبھی نہیں رہتی[۱]۔ ان کے مریدوں اور طالب علموں کا فقر و فاقہ سے یہ عالم تھا کہ ان کی خانقاہ میں وہ زنجیریں پکڑ کر بمشکل تمام اُٹھ بیٹھ سکتے[۲]۔

قاضی صاحب کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے لیکن ان میں سے کسی کو بھی مقبولیت وشہرت حاصل نہ ہوئی کیونکہ اپنے اشغالِ باطنیہ کی وجہ سے وہ ان کی تصنیف پہ خاطر خواہ محنت نہ کر سکے[۳]۔

انھوں نے آخری عمر میں ہر چیز سے قطع تعلّق کر کے حجرہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ جب انھوں نے وصال فرمایا تو اپنے حجرہ ہی میں دفن ہوئے[۴]۔ ان کے حجرۂ عبادت کے گنبد کی وجہ سے اُن کا لقب گنبدیؒ پڑ گیا تھا[۵]۔ ان کا مزار جونپور شہر کے محلّہ چاچک پور میں ریلوے روڈ کے قریب واقع ہے مگر اس کا گنبد اب مسمار ہو چکا ہے۔ ان کی تاریخِ وصال ۳ صفر ۸۱۷/ ۱۴۱۴ء ہے[۶]۔

مولانا قاضی شہاب الدین ملک العلماءؒ

قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ شیخ خاندان سے تھے اور ان کے آباؤ اجداد کا وطنِ مالوف غزنی تھا[۷]۔ ان کے والد بزرگوار کا نام مبارک شمس الدین اور دادا کا نام عمر الزوالی تھا[۸]۔ ان کی ولادت دولت آباد دکن میں اور تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی تھی[۹]۔ جہاں انھوں نے قاضی عبدالمقتدرؒ اور مولانا خواجگیؒ سے اکتسابِ علم کیا[۱۰]۔ تاہم ان دونوں حضرات

---

۱ تجلّی نور جلد دوم ص ۲۲ ۲ ایضاً ۳ ایضاً ۴ ایضاً ص ۲۲-۲۳
۵ ایضاً ص ۲۳ ۶ ایضاً ص ۲۲-۲۳
۷ ایضاً ص ۲۳
۸ مآثر الکرام (قلمی) ورق ۱۲۵ ب تذکرہ علمائے ہند ص ۸۹
۹ تجلّی نور ایضاً ۱۰ مآثر الکرام ایضاً۔ تجلّی نور ایضاً

میں سے قاضی عبدالمقتدرؒ نے ان کی علمی تربیت میں زیادہ حصہ لیا اور وہ ان کے نہایت قابل اور محبوب ترین شاگردوں میں شمار ہوتے تھے[۱] مناقب الصدیقین اور تذکرۂ علمائے ہند میں ہے کہ ایک روز قاضی شہاب الدین کو کہیں سے سونا پڑا ہوا ملا۔ جسے اٹھا کر وہ گھر لے آئے اور اپنی والدہ سے کہا کہ اسے کہیں دبا یا چھپا دیں۔ اس کے بعد جب وہ قاضی عبدالمقتدرؒ کے حضور پہنچے تو انھوں نے ان کی طرف ایک نظر دیکھا اور فرمایا "تم نے اگر اس طرح سونا دبانا یا چھپانا شروع کر دیا تو علم کس طرح سیکھو گے؟" یہ الفاظ سنتے ہی وہ چونکے اور اپنے کیے پر نادم ہوئے[۲]۔ وہ بچپن ہی سے بلا کے ذہین اور بڑے ہونہار تھے۔ ایک بار قاضی عبدالمقتدرؒ نے ان کے متعلق فرمایا کہ میرے پاس ایک ایسا طالب علم ہے "کہ پوست او علم و مغز او علم و استخوان او علم است" چنانچہ انھوں نے بعد میں یوں ہی ثابت کیا اور چند ہی سال میں تمام علومِ نقلی و عقلی کی تعلیم مکمل کر لی اور ان کا شمار اس دور کے برگزیدہ علماء و فضلاء میں ہونے لگا[۳]۔

جب میر سید محمد گیسو دراز بندہ نوازؒ کو امیر تیمور کے دہلی پر حملہ آور ہونے کا روحانی اشارہ ہوا اور یہ خبر دہلی کے علماء و مشائخ اور دوسرے لوگوں میں عام ہوئی تو بہت سے لوگ دہلی سے ہجرت کر کے ملک کے دوسرے حصوں میں چلے گئے۔ چنانچہ قاضی شہاب الدینؒ بھی اپنے استاد و مرشد مولانا خواجگیؒ کے ہمراہ دہلی سے کالپی پہنچے[۴]۔ مولانا خواجگیؒ تو کالپی میں ہی ٹھہر گئے لیکن قاضی شہاب الدین سلطان ابراہیم شرقی کی دعوت پر جونپور چلے آئے۔ وہاں سلطان ابراہیم نے انھیں ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی اور ان کو رہنے کے لیے ایک عمدہ گھر اور تعلیم و تدریس کے لیے ایک عالیشان مدرسہ تعمیر کروا کے دیا[۵]۔ انھوں نے جونپور ہی میں سالہا سال

۱؎ خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل ص ۳۹۰ ۲؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۳-۱۳۴، اخبار الاخیار ص ۱۴۸
۳؎ اخبار الاخیار ص ۱۷۵ ۴؎ ایضاً ص ۱۴۲ مآثر الکرام (قلمی) ورق ۱۲۵ اب ۱۲۶ ؁
۴؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۸۸، تجلی نور جلد دوم ص ۳۳-۳۴
۵؎ تجلی نور ایضاً، اخبار الاخیار ص ۱۴۲، مآثر الکرام (قلمی) ورق ۱۲۶ ؁۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۸۸

تک علومِ ظاہری کی تدریس کی۔ ان کے مدرسہ میں ہندوستان اور عالمِ اسلام کے گوشے گوشے سے طالب علم جمع ہوتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں سے شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ، مولانا صفی جونپوریؒ اور مولانا الہداد جونپوریؒ جیسی نامور ہستیاں نکلیں، جن کی علمی استعداد و قابلیت اور روحانی عظمت سے ایک زمانہ رُوشناس ہے۔[۱]

سلطان ابراہیم شاہ شرقی ان کی بے حد تعظیم کرتا تھا۔ اس نے انھیں قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز کیا[۲]۔ اور ان کو دربارِ شاہی میں چاندی کی کرسی پر بٹھایا کرتا تھا[۳]۔ اس سے ان کی شہرت و عظمت پُورے ملک میں چھا گئی۔ اس دور میں اس برصغیر پاک و ہند میں اگرچہ بہت سے اور بھی جید عُلماء و فقہاء موجود تھے لیکن جو شہرت و عظمت اور مقبولیت قاضی صاحب کو نصیب ہُوئی وہ کسی اور کے حصّے میں نہ آئی[۴]۔ وہ ہر علمِ ظاہری و باطنی کے ماہر تھے اور ملک العلماء کے لقب سے سرفراز تھے۔ ان کی اس قدر شہرت اور تقرب سلطان سے بعض ہم عصر علماء ان کے حاسد بھی ہو گئے ان میں سے مولانا احمد تھانیسریؒ کے بیٹے سب سے پیش پیش تھے[۵]۔ ان حاسدوں کی شکایت جب انھوں نے ایک بار اپنے پیر و مُرشد استاد مولانا خواجگیؒ سے کی تو انھوں نے ان کو شیخ سعدیؒ کی مندرجہ ذیل رباعی تسلی و تشفی کے لیے لکھ بھیجی۔ ؎

اے پیش آنکہ آید ثنائی تو
واجب بر اہلِ مشرق و مغرب دُعائی تو
اے در بقائی عمر تو نفع جہانیاں
باقی نماند آنکہ نخواہد بقائی تو[۶]

چنانچہ اسی طرح ہوا اور اس واقعہ کے تھوڑے سے ہی عرصہ بعد وہ تمام حاسد ختم ہو گئے[۷]۔

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۷۵ ؛ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۲۱۴
[۲] تذکرہ علمائے ہند ص ۸۹، تجلّی نور جلد دوم ص ۳۴ [۳] ایضاً
[۴] اخبار الاخیار ص ۱۷۵ [۵] ایضاً ص ۱۴۲ [۶] تجلّی نور، جلد دوم ص ۳۴
[۷] تجلّی نور ایضاً

قاضی صاحب کا فقر و درویشی سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ انھوں نے اصلاحِ باطن کے لیے بڑی ریاضت و عبادت کی[1] اور مولانا خواجگیؒ کے وہ اجل خلفاء میں تھے[2]۔ قاضی شہاب الدینؒ نے حضرت میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی صحبتِ روحانی سے بھی فیوض حاصل کیے تھے۔ ایک بار جب سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ مذہبی دورہ پر جونپور تشریف لائے تو قاضی صاحب ان کی زیارت سے ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ پھر اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ میر سید اشرف بھی اُن کے علم و فضل کی بڑی قدر افزائی فرماتے۔ چنانچہ انھوں نے ہی ان کو ملک العلماء کا خطاب دیا اور خرقۂ خلافت بھی عطا کیا[3]۔ لطائفِ اشرفی میں ہے:

"حضرت قاضی خدمتے شائستہ و ملازمتے بایستہ شد و الباس خرقہ کردند بخطاب ملک العلماء مخاطب کردند"[4]

بعد میں ان دونوں بزرگوں کے درمیان بعض شرعی اور مذہبی مسائل کی تحقیقات پر خط و کتابت بھی رہی۔ ایک بار انھوں نے حضرت شیخ سمنانیؒ کو فرعون کے ایمان کی تحقیق کے بارے میں بھی ایک طویل خط لکھا تھا جس کا جواب اخبار الاخیار میں موجود ہے[5]۔

قاضی صاحب اتباعِ سُنّت و شریعت کا خاص خیال رکھتے اور احکامِ شریعت سے سرِ مُو انحراف نہ کرتے اور نہ کسی کو کرنے دیتے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت شاہ بدیع الدین مدارؒ جونپور تشریف لائے۔ وہ اس ملک میں سلسلۂ مداریہ کے بانی تھے اور دُنیائے تصوّف میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ تاہم ان کے بعض ظاہری معاملات ان کے حسبِ حال نہ تھے۔ مثلاً انھوں نے اپنی مونچھیں ضرورت سے زیادہ بڑھا رکھی تھیں۔ قاضی شہاب الدینؒ جب ان کی ملاقات کے لیے گئے اور انھوں نے ان کے بعض خلافِ شرع معاملات دیکھے تو ان پر بحث و مباحثہ شروع ہو گیا[6]۔ قاضی

---

[1] تجلّی نور جلد دوم ص ۳۴ [2] اخبار الاخیار ص ۱۸۱؛ خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۳۹۰
[3] خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۳۹۰، تجلّی نور جلد دوم ص ۳۶، لطائفِ اشرفی جلد دوم ص ۴۱۰
[4] لطائفِ اشرفی ایضاً [5] اخبار الاخیار ص ۱۶۲
[6] اخبار الاخیار ص ۱۶۰، تجلّی نور جلد دوم ص ۳۶

صاحب نے اس کو دُوسری چیزوں کی اصلاح کے علاوہ مونچھیں بھی چھوٹی کروانے کا مشورہ دیا لیکن اصرار کے باوجود وہ ان کو اس کام کے لیے آمادہ نہ کر سکے۔ بعد ازاں دونوں میں خط و کتابت بھی رہی۔ قاضی صاحب اسی طرح کئی دُوسرے ہم عصر علماء کے ساتھ بھی شرعی نکات اور مذہبی معاملات پر بحث و تکرار اور بعض کے ساتھ خط و کتابت بھی کرتے رہتے[1]۔

وہ بڑے اعلیٰ پایہ کے مصنف بھی تھے۔ انھوں نے دُوسری کتابوں کے علاوہ جلال الدین عثمانؒ بن عمر المشہور ابن الحاجب کی مشہور عربی گرامر کافیہ کی ایک شرح کافیہ بھی لکھی جو شرحِ ہندی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا طرزِ نگارش بے نظیر ہے۔ یہ شرح ان کی زندگی ہی میں بڑی مقبول ہو چکی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وحیدِ عصر ملا عبدالرحمٰن جامی نے بھی شرح کافیہ لکھی تھی لیکن جب قاضی صاحب نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ مُلّا جامی نے میری شرحِ ہندی ہی کا یہ خلاصہ لکھ دیا ہے[2]۔ ان کی دُوسری ایک کتاب علمِ نحو میں کتابِ ارشاد ہے جس میں انھوں نے ایک جدید ترتیب اور اُسلوب اختیار کیا اور اس کا متن بھی نہایت لطیف و متین انداز میں لکھا ہے۔ یہ علمِ نحو پر ایک نئی طرز کی کتاب سمجھی جاتی ہے اس کے متعلق حضرت میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے ایک بار فرمایا:

"اینکہ می گویند کہ سحر از ہندوستان راست آمد غالباً ایں راست سحر بودہ[3]۔"

ان کی تیسری کتاب بدائع البیان علمِ بلاغت کے موضوع پر ہے[4]۔ ان کی چوتھی کتاب تفسیر بحر مواج ہے جو غالباً پاک و ہند میں فارسی میں اپنی نوعیت کی قرآنِ مجید کی اوّلین تفسیر ہے[5]۔ اس کتاب کے اصلی نسخہ کو راقم الحروف نے ماہ اگست ۱۹۷۰ء میں اپنے وسطِ ایشیا کے سفر کے دوران میں تاشقند کی لائبریری میں دیکھا تھا۔ یہ کتاب اب تک بڑی عمدہ حالت میں ہے اور وہاں بڑے قرینہ سے محفوظ رکھی گئی ہے۔ ان کی پانچویں کتاب اصول ابراہیم شاہی ہے جسے انھوں نے اپنے

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۹۰

[2] اخبار الاخیار ص ۱۷۵ تجلی نور جلد دوم ص ۳۴

[3] لطائفِ قدوسی جلد اول ص ۱۰۱ [4] اخبار الاخیار ص ۱۷۵

[5] قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ ہندوستان میں سندھی زبان میں ہوا یہ ترجمہ ۲۷۰ھ میں اروڑ کے راجہ کے لیے لکھا گیا تھا۔ (گلزار ابرار ص ۱۳۱)

مربّی سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے نام معنون کیا تھا۔ اس میں عربی زبان میں اصولِ شرح پر بحث ہے[۱]
ان کی چھٹی کتاب اصولِ فقہ پر شرح بزدوی ہے[۲]۔ ان کی ساتویں کتاب فتاویٰ ابراہیم شاہی ہے[۳]
جس میں انھوں نے عہدِ ابراہیم شاہی کے تمام حنفی فتاویٰ کو مرتّب اور مدون کیا ہے[۴]
ان کی آٹھویں کتاب مناقب السادات ہے جس میں انھوں نے سادات اور اہلِ بیت سے
محبّت و عقیدت کا اظہار کیا ہے[۵]۔ ان کی نویں کتاب رسالہ تقسیم علوم اور دسویں کتاب رسالہ در
صنائع ہے[۶]۔ علاوہ ازیں انھوں نے کئی اور بھی کتب و رسائل لکھے۔ قصیدۂ بانت سعاد کی ان
کی طویل شرح بھی بڑی پایہ کی تحریر مانی گئی ہے[۷]۔ یہ قصیدہ کعب ابنِ زہیر نے حضرت محمد
صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شان میں لکھا تھا۔ انھوں نے اپنے ہم عصر علماء و صوفیاء کو بہت سے خطوط
بھی لکھے جن میں انھوں نے مذہبی و شرعی معاملات پر بحث کی ہے۔ قاضی صاحب کی یہ تمام تصنیفات
بڑی اہم اور بلندی پایہ مانی گئی ہیں[۸]۔ ان میں سے بعض تو صدیوں تک علومِ اسلامیہ کے مدارس میں
شاملِ نصاب رہیں۔

قاضی صاحب بڑے عمدہ شاعر بھی تھے اور انھوں نے قصائد کے علاوہ نظمیں غزلیں
اور قطعات بھی لکھے اور اپنے دیوان کو جامع الصنائع کے نام سے مرتّب کیا تھا[۹]۔ ان کا
مندرجہ ذیل قطعہ بہت مشہور ہے جو انھوں نے کسی بادشاہ یا شاہی امیر کو ایک کنیز کی طلبی
کے سلسلہ میں لکھا تھا۔ ؎

اے نفس خاکسار کہ آتش سزای اوست
بر باد گشت لائق بی آب کردن است

۱۔ تجلّی نور جلد دوم ص ۳۴

۲۔ اخبار الاخیار ص ۱۷۵ — ۳۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۸۸

۴۔ اخبار الاخیار ص ۱۷۶ — ۵۔ ایضاً ص ۱۷۵

۶۔ ایضاً — ۷۔ مآثر الکرام (قلمی) ورق ۱۲۶

۸۔ تجلّی نور جلد دوم ص ۳۴ — ۹

The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History, p. 182.

شخصی چناں فرست کہ پا بر سرم نہد
ریزد ہمہ منی و تکبر کہ در من است[۱]

تذکرہ علمائے ہند اور تجلی نور کے مصنفین لکھتے ہیں کہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کو ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ کے ساتھ بے پناہ عقیدت تھی۔ ایک بار وہ بڑے سخت بیمار ہو گئے اور ان کی حالت تشویش ناک ہو گئی۔ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ فوراً عیادت کے لیے پہنچا۔ پہلے تو اس نے مولانا کے ظاہری حال کو دیکھ کر مزاج پرسی کی۔ اس کے بعد پانی کا ایک بھرا ہوا پیالہ منگوا کر ان کے سر کے گرد گھمایا اور یہ کہتے ہوئے پی گیا کہ اے خدایا! جو تکلیف اور بیماری ان کو ہے وہ مجھے لگ جائے اور ان کو شفا ہو جائے۔ مشہور ہے کہ اس کے بعد سلطان ابراہیم تو بیمار ہو کر فوت ہو گیا مگر قاضی صاحب تندرست ہو گئے[۲]۔ قاضی صاحب کو بھی سلطان ابراہیم شاہ کے ساتھ والہانہ عقیدت تھی اس لیے بادشاہ کی وفات کے دو سال بعد وہ بھی ان کے غم میں چل بسے[۳]۔

مولانا قاضی شہاب الدینؒ جونپور کے محلہ خواجگی میں رہا کرتے تھے[۴]۔ جب ان کا وصال ہوا تو وہ اس محلہ کے قریب اٹالہ مسجد کے جنوبی دروازہ کے پاس مدفون ہوئے[۵]۔ ان کا مزار تو موجودہ مشن سکول کے احاطہ میں موجود ہے[۶] لیکن مکانات اور مدرسہ کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ مولانا سید عبدالحی صاحبِ تصنیف یادِ ایام کا خیال ہے کہ اٹالہ مسجد کے گرد و پیش اب بھی جو حجرے ہیں انہیں میں قاضی صاحب کا عظیم الشان مدرسہ رہا کرتا تھا[۷]۔ تذکرہ علمائے ہند کے مصنف ان کی تاریخ وصال ۲۵ رجب ۸۴۹ھ لکھتے ہیں[۸]۔ مآثر الکرام ۸۴۹ھ اور تجلی نور کے مصنفین ایک جگہ ۸۴۰ھ

---

[۱] خزینۃ الاصفیاء ص ۳۹۱، جلد اوّل، تجلی نور جلد دوم ص ۳۵
[۲] تذکرہ علمائے ہند ص ۸۹، تجلی نور جلد دوم ص ۳۶ [۳] تاریخ فرشتہ، تجلی نور ایضاً
[۴] تجلی نور جلد دوم ص ۳۶ [۵] ایضاً ص ۳۷ [۶] ایضاً ص ۳۷
[۷] یادِ ایام ص ۳۵
[۸] تذکرہ علمائے ہند ص ۸۹ مآثر الکرام (قلمی) ورق ۱۲۶ و

اور دُوسری جگہ ۸۴۲ھ لکھتے ہیں[1]۔ میری تحقیقات کے مطابق سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی تاریخ وفات ۸۴۴ھ/۱۴۴۰ء ہے۔ اگر فرشتہ کے بیان کو درست تسلیم کر لیا جائے تو قاضی صاحب کی تاریخ وصال ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء ہونی چاہیے۔

ملّا شیخ عبدالملک عادلؒ

ملّا شیخ عبدالملک عادلؒ فاروقی خاندان سے تھے اور ان کا شجرۂ نسب کئی واسطوں سے سلطان التارکین ابراہیم ادہمؒ سے ملتا ہے[2]۔ وہ شرقی وزیر نواب عماد الملک کے بیٹے تھے اور جونپور ہی میں پیدا ہوئے تھے[3]۔ وہ بچپن ہی سے بڑے ہونہار اور ذہین تھے۔ جب سنِ شعور کو پہنچے تو ان کی تعلیم مولانا شہاب الدّین دولت آبادیؒ کی زیرِ نگرانی شروع ہوئی اور انھوں نے اٹھارہ برس کی عمر میں ہی تمام علومِ معقول و منقول پر اور خاص طور پر علمِ اصول پر کامل دسترس حاصل کر لی[4]۔ جب انھوں نے شرحِ ہندی کا حاشیہ لکھا اور اس کو اپنے استاد کے پاس لے گئے تو وہ اسے پڑھ کر بے حد خوش ہوئے اور فرمایا "علمِ قاضی بہ سفینۂ عادل آمد"[5]۔ اس کے بعد استاد و شاگرد میں اور بھی زیادہ قربت ہو گئی، بلکہ قاضی صاحب نے اپنے مدرسہ کا تعلیم و تدریس کا کام بھی انہی کے سپرد کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد ان کے علم و فضل کی شہرت دُور دور تک پھیل گئی[6]۔

وہ تزکیۂ نفس کے لیے حضرت مخدوم رکن الدّین جونپوریؒ کے مرید ہوئے۔ ان کے مرید ہونے کا واقعہ اس طرح ہے کہ ایک روز قاضی صاحب نے ان کو مخدوم کے پاس مسئلۂ توحید کے بعض نکات اور ان کو یا دُوسرے صُوفیوں کو سجدہ کرنے کے سلسلے میں سوال و جواب کے لیے

---

[1] تجلّیٔ نور جلد دوم ص ۳۷
[2] ایضاً
[3] ایضاً
[4] ایضاً
[5] ایضاً ص ۳۸
[6] ایضاً

بھیجا۔ مگر مخدوم کے ہاں پہنچتے ہی ان کی حالت عجیب تر ہوگئی اور وہ بے اختیار ان کے سامنے سربسجود ہوگئے اور اسی وقت ان کے مرید ہوگئے۔ اس کے بعد پھر انھوں نے انہی سے علوم باطنی کی تعلیم حاصل کی اور بڑا روحانی فیض حاصل کیا۔[۱]

ان کا وصال ۱۲ ربیع الاول ۸۹۷ھ/۱۴۹۱ء کو ہوا۔[۲] ان کی قبر جونپور کے محلہ کٹ گڑھ کے بچتہ باغ المعروف شکستہ باغ میں ان کے خاندانی قبرستان میں تھی لیکن اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔[۳]

ملّا علاءالدّین عطاءالملکؒ

ملا علاءالدین عطاءالملکؒ شرقی وزیر نواب عمادالملک کے چھوٹے صاحبزادے تھے اور ملا عبدالملک عادلؒ کے حقیقی بھائی تھے۔[۴] انھوں نے علوم ظاہری کی تعلیم قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ سے حاصل کی اور ان کے قابل ترین شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔[۵] سید نورالدین زیدیؒ لکھتے ہیں کہ انھوں نے جب قاضی صاحب سے قافیہ پر درس لینا شروع کیا تو ان کو بعض موضوعات کو سمجھنے میں دقت پیش آنے لگی۔ چنانچہ انہی کی سہولت کی خاطر قاضی صاحب نے شرح ہندی لکھی تھی اور اس کا ذکر انھوں نے اس کے دیباچہ میں بھی کیا ہے۔[۶] اس کے بعد اس کے مطالعہ سے ان کا ذہن دینی مسائل کو اور دوسرے مضامین کو بھی اچھی طرح سمجھنے لگا۔[۷] ان کے استاد ان کی کامیابی پر بڑے خوش ہوتے۔ بعد ازاں پھر انھوں نے خود بڑی تحقیق و تفحص کے ساتھ شرح ہندی پر ایک حاشیہ لکھا۔ اس کے دیباچہ کا آغاز مندرجہ ذیل الفاظ سے کیا۔[۸]

"الحمد للہ الذی انعم علینا بنعمۃ العظام"

---

[۱] تجلی نور جلد دوم ص: ۳۸
[۲] ایضاً ص ۳۸
[۳] ایضاً ص ۳۸
[۴] ایضاً ص: ۳۸
[۵] ایضاً
[۶] ایضاً
[۷] ایضاً ص ۳۸ - ۳۹
[۸] ایضاً ص ۳۹

ان کا سالِ وصال معلوم نہیں ہو سکا لیکن ان کا مزار جونپور شہر کے محلہ کٹ گڑھ کے باغ کہنہ میں تھا، لیکن اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔[1]

شیخ چندن شہیدؒ

شیخ چندن شہیدؒ کے والدِ بزرگوار امیر تیمور کے دہلی پر حملہ کی وجہ سے جونپور آ گئے اور محلہ فیروز شاہ میں سکونت اختیار کی۔[2] ان کی ولادت جونپور میں ۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء میں ہوئی۔[3] انھوں نے ابتدائی تعلیم جونپور کے علماء سے حاصل کی مگر تمام علومِ ظاہری کی تکمیل قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ سے کی۔[4] وہ ایک عرصہ تک درس و تدریس کا بھی کام کرتے رہے۔[5] لیکن جب طبیعت کا رجحان علمِ باطنی کی طرف ہوا تو قاضی نصیر الدین گنبدیؒ کے مرید ہو گئے[6] اور ایک عرصہ ریاضت و عبادت میں منہمک رہے۔ کہا جاتا ہے کہ مہینوں تک ضروری کام کے بغیر اپنے حجرہ سے باہر نہ نکلتے اور کسی سے گفتگو نہ کرتے۔ انھوں نے اپنے پیر سے شہیدِ نفس کا خطاب پایا تھا[7] اور ان کے دامنِ کمال سے سینکڑوں نے روحانی فیض حاصل کیا۔

ان کا وصال ۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء میں ہوا۔[8] اور مزارِ اقدس محلہ فیروز پور میں ہے۔ اس کے قریب ایک مسجد بھی ہے[9] اور وہاں ان کے بعض خلفاء اور مریدین کے مزار بھی ہیں۔[10]

مولانا صفی جونپوریؒ

مولانا صفیؒ کی تاریخ و جائے ولادت اور آبائی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ وہ قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ کے محبوب و مقبول شاگردوں میں سے تھے۔[11] سلطان ابراہیم شاہ

---

[1] تجلی نور جلد دوم ص ۳۵ — [2] فیوض الابرار (قلمی) — [3] ایضاً

[4] ایضاً — [5] ایضاً — [6] ایضاً — [7] ایضاً

[8] ایضاً — [9] ایضاً — [10] ایضاً

[11] A. Halim, J.A.S.P. Vol. VIII, No. 2, Dec. 1963, p. 87.

شرقی ان کی قابلیت و اخلاق کا اس قدر معترف تھا کہ اس نے ان کو اپنے بیٹوں کا اتالیق مقرر کیا تھا۔[۱] انھوں نے شرقی شہزادوں کی تعلیم و تربیت میں بڑی گہری دلچسپی لی اور اپنے فرضِ منصبی کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔ شہزادوں کی سہولت کے لیے انھوں نے قافیہ کی ایک شرح بھی لکھی تھی جو بڑی مقبول ہوئی۔[۲] علاوہ ازیں انھوں نے کتاب الہدایہ اور تفسیر بیضاوی پر بھی حواشی لکھے تھے۔[۳]

سلطان حسین شرقی کو ان سے والہانہ عقیدت تھی۔ ان کو وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کرتا۔ بلکہ انھوں نے اس کے ساتھ بعض جنگی معرکوں میں بھی شمولیت کی۔[۴] سلطان حسین شاہ شرقی اور بہلول لودھی میں جب لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ اُن میں باقاعدہ حصّہ لیتے رہے اور ایک موقعہ پر گرفتار بھی ہو گئے لیکن بہلول نے ان کے ساتھ بڑا عمدہ سلوک کیا اور ان کو باعزت رہا کر دیا۔ بعد ازاں بہلول بھی ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہو گیا۔[۵]

سلطان سکندر لودھی نے جب جونپور پر قبضہ کیا تو اس نے تمام شاہی محلات و عمارات کو تباہ و برباد کر دیا لیکن جب اس نے شرقی مساجد اور خاص کر ان کے گنبدوں اور کتبوں کو بارُود سے اُڑا دینے کا تہیہ کیا تو مولانا صفی علماء کا ایک وفد لے کر اُن کے پاس پہنچے اور اس کے اس عزمِ بد کے خلاف سخت احتجاج کیا۔[۶] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شرقی مساجد تباہ و برباد ہونے سے بچ گئیں۔[۷] اس کے بعد ان کے اور سلطان سکندر کے درمیان اچھے تعلقات استوار ہو گئے اور جب ان کو سلطان سکندر نے آگرہ آنے کی دعوت دی تو اسے انھوں نے بخوشی قبول فرمایا۔[۸] ان کی وفات آگرہ میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔[۹] ان کا سالِ وفات معلوم نہیں ہو سکا۔

---

[۱] A. Halim, J.A.S.P. Vol. Vol. VIII, No. 2, Dec. 1963, p. 87.

[۲] Ibid [۳] Ibid [۴] Ibid

[۵] Ibid [۶] Ibid [۷] Ibid

[۸] Ibid [۹] Ibid

مولانا الہداد محشی جونپوریؒ

مولانا الہدادؒ کی تاریخ ولادت اور بچپن کے حالات کسی کتاب میں نہیں ملتے مگر وہ جونپور کے عظیم المرتبت علماء و فقہاء میں سے تھے[۱]۔ انھوں نے علوم ظاہری کی تعلیم ملّا عبدالملک عادل جونپوریؒ[۲] اور مولانا عبداللہؒ صاحب مصنف بدیع المیزان سے حاصل کی تھی۔ اور ایک واسطہ سے قاضی شہاب الدینؒ دولت آبادیؒ کے شاگردوں میں بھی شمار ہوتے تھے[۳]۔

ان کا علمی تبحر بے مثال تھا اور اس دور کے تمام علماء و صلحاء ان کا علمی سکہ مانتے تھے[۴]۔ خاص طور پر ان کو علم فقہ پر بڑا عبور حاصل تھا اور ان کی شہرت بحیثیت فقیہ کے سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی[۵]۔ درس و تدریس ان کا محبوب مشغلہ تھا اور ان کی جائے رہائش اور مدرسہ میں مشرقی ملکی اور غیر ملکی طلبہ اور سامعین کا جمگھٹا لگا رہتا تھا[۶]۔

وہ درس و تدریس کے بعد اپنا تمام وقت تصنیف و تالیف میں صرف کرتے۔ وہ کئی کتابوں، رسالوں اور تفسیروں کے مصنف تھے، جن میں سے علم نحو میں شرح کافیہ، علم فقہ میں شرح ہدایہ کی چند جلدیں، تفسیر میں شرح مدارک، تفسیر بیضاوی، شرح بزدوی اور حواشی بر حواشی ہندیہ بڑی پایہ کی تصنیفات ہیں[۷]۔ ان تمام کتابوں کا اسلوب تحریر بہت عمدہ ہے اور یہ بڑی تحقیق کے بعد لکھی گئی ہیں[۸]۔ سلطان حسین شاہ شرقی ان کی قابلیت کے بڑے مداح تھے چنانچہ جب انھوں نے شرح ہدایہ اور شرح بیضاوی مکمل کیں تو اس نے ان کو ایک لاکھ تنکے بطور انعام دیے جن کو انھوں

[۱] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۱۲ [۲] تجلّی نور جلد دوم ص ۲۹

[۳] مآثر الکرام (قلمی) ورق ۱۲۸ ا۔ اخبار الاخیار ص ۱۹۱۔ تجلّی نور ایضاً [۴] تجلّی نور ایضاً

[۵] ایضاً

[۶] ایضاً۔ مآثر الکرام ایضاً۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۵

[۷] تجلّی نور ایضاً

[۸] A. Halim. J.A.S.P. Vol. VIII, No. 2, Dec. 1963, p. 88.

نے اسی وقت اپنے مستحق طلبا میں تقسیم کر دیا تھا۔[۱] سلطان سکندر لودھی بھی ان کی بڑی عزت اور قدر کرتا اور جب وہ ایک بار جونپور گیا تو اُن کے مکان پر ملاقات کے لیے گیا۔[۲]

وہ حضرت سید راجی حامد شاہؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔[۳] ان کے ان سے بیعت ہونے کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ اخبار الاخیار میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سید راجی حامد شاہؒ جونپور تشریف لائے تو حضرت شیخ حسن بن طاہرؒ جونپوری اُن کے رُوحانی تقدس سے اتنے متأثر ہوئے کہ ان کے مرید ہو گئے۔ جب اس کا علم مولانا الٰہدادؒ کو ہوا تو انھوں نے حضرت شیخ حسن بن طاہرؒ سے کہا کہ آپ نے سید راجی حامد شاہؒ سے بیعت کر کے اپنے علم کی توقیر اور طالب علموں کی ناموس کو برباد کر دیا ہے مگر شیخ حسنؒ نے جواب دیا کہ مولانا آپ خود اُن سے مل لیں اور اُن کے تصوّف و بصیرت کا امتحان لے لیں۔ تب مجھے غلط یا صحیح گردانیں۔ چنانچہ ان دونوں نے ایک روز حضرت سید راجی حامد شاہؒ سے ملاقات و امتحان کا ارادہ کیا اور امتحان کے لیے ہدایہ اور بزدوی سے چند مسئلے بھی یاد کر لیے۔ جب وہ ان کی منزل پر پہنچے تو سید راجی انھیں دیکھتے ہی مسکرائے اور فرمایا کہ آج ہمارے اور تمھارے امتحان کا دن ہے۔ چنانچہ دورانِ ملاقات میں حضرت راجی حامد شاہؒ نے حسبِ عادت ان کو ایک ایسی کہانی سنانا شروع کی جس سے ان کے تمام مسائل خود بخود حل ہو گئے۔ مولانا الٰہدادؒ ان کی روحانی بصیرت اور علمی مرتبہ کے ایسے قائل ہوئے کہ اُسی وقت اُن سے بیعت ہو گئے۔[۴]

مولانا کے بعض مرید و خلیفہ بھی بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ ان میں سے شیخ معروفؒ کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو بڑے صاحبِ ریاضات و مجاہدات بزرگ تھے۔[۵]

ان کے فرزند ارجمند شیخ بھکھاری جونپوریؒ بھی بڑے پایہ کے عالم تھے۔[۶] وہ سلسلۂ ان

---

۱ A. Halim, J.A.S.P. Vol. VIII, No. 2, Dec. 1963. P. 88

۲ افسانۂ شاہاں (قلمی) ورق ۲۹-۳۱

۳ اخبار الاخیار ص ۱۹۱-۱۹۲

۴ ایضاً

۵ ایضاً ص ۱۹۲

۶ تذکرہ علمائے ہند ص ۳۳

سکندر لودھی کے دورِ حکومت میں علمائے فحول میں سے تھے۔ سلطان سکندر ان کے علمی تبحر کے بڑے مداح تھے۔ سلطان کو چونکہ علمی بحث و مباحثہ کا بڑا شوق تھا اس لیے اس نے ایک روز اپنی سلطنت کے بعض نامور علماء کا اجلاس منعقد کیا جس میں شیخ عبداللہ تلنبیؒ اور شیخ عزیز اللہ تلنبیؒ کو ایک طرف اور مولانا الہدادؒ اور ان کے بیٹے شیخ بھکاریؒ کو دوسری طرف کھڑا کر دیا۔ فریقین میں زبردست مقابلہ ہوا۔ آخر میں سلطان نے یہ فیصلہ دیا کہ شیخ عبداللہؒ اور شیخ عزیز اللہ تقریر میں بہتر ہیں اور مولانا اور ان کے صاحبزادے تحریر میں بہتر ہیں[1] لیکن مولوی رحمان علی صاحب تذکرہ لکھتے ہیں کہ وہ تحریر و تقریر دونوں میں یکتائے روزگار تھے[2]

ان کے ایک اور فرزندِ ارجمند مولانا عبداللہ بھی علم و فضل اور زہد و ورع میں بے مثال تھے[3] وہ بھی ان کے شاگرد تھے تاہم انھوں نے دوسرے علماء و فضلاء سے بھی علومِ ظاہری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کا شغل بھی درس و تدریس تھا اور وہ بڑی تحقیق و تنقیح کے ساتھ درس دیا کرتے تھے۔ ان کے بہت سے شاگرد اپنے عہد کے نامور علماء ہوئے۔ مولانا عبداللہ کو تمام مسائل جزیہ و کلیہ پر کامل مہارت حاصل تھی اور وہ اس دور کے بڑے ذی مرتبہ و ذی وقار علماء و فضلاء میں شمار ہوتے تھے[4] مولانا الہداد ان کے متعلق اکثر فرمایا کرتے "عبداللہ مغزِ استخوانِ علم و سرمایۂ نازشِ الہداد است[5]" ان کی ایک یادگار تصنیف شرح میزان المنطق ہے[6] ان کا سالِ وفات معلوم نہیں ہو سکا لیکن ان کا مزار عیدگاہ جونپور کی شمالی دیوار کے ساتھ آپ کے والدِ بزرگوار کے مزار کے دائیں طرف موجود ہے[7]

تاہم مولانا الہدادؒ کے مزارِ اقدس کے متعلق اختلافِ رائے ہے۔ گنجِ رشیدی کے مصنف لکھتے ہیں کہ ان کا مزار شہر بہار کے قریب موضع سرائے الہدین میں ہے[8] لیکن زیادہ

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۳۳ [2] ایضاً [3] تجلّیِ نور جلد دوم ص ۴۰ [4] ایضاً
[5] ایضاً [6] ایضاً [7] ایضاً [8] ایضاً

قرین قیاس اور مشہور یہی ہے کہ ان کا مزار عید گاہ جونپور کی شمال مغربی دیوار کے ساتھ واقع ہے[1] ان کی خانقاہ اور مدرسہ جونپور کے محلہ رضیاں میں ہوتا تھا[2] لیکن اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ ان کا سالِ وصال ۱۵۱۷ء/۹۲۳ھ ہے[3]۔

قاضی نظام الدّین کیکلانی جونپوریؒ

قاضی نظام الدینؒ حضرت صدیقؓ کے خاندان سے تھے۔ ان کا اصل نام شہاب الدین احمد بن محمد تھا[4] مگر قاضی نظام الدین کیکلانیؒ کے لقب سے مشہور تھے[5]۔ ان کا وطنِ مالوف کیکلان تھا جو ملک عرب کا ایک خطّہ ہے جہاں سے اُن کے آباء واجداد ہجرت کر کے گجرات آئے تھے[6]۔ ان کی پرورش گجرات میں ہوئی اور وہیں انھوں نے علومِ نقلی و عقلی کی تعلیم مکمل کی۔ تاہم سب سے زیادہ عبور انھیں علومِ فقہ، اصول، تفسیر اور حدیث پر تھا[7]۔ اس دور کے جید علماء و فضلاء میں شمار ہوتے تھے اور ان کے علم و فضل کی شہرت سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی[8]۔

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کو جونپور میں علماء و فضلاء اور صلحاء کو جمع کرنے کا بے حد شوق تھا اس لیے جب اُس نے ان کی شہرت سنی تو اس نے ان کو بھی جونپور مدعو کیا۔ اس دعوت کو انھوں نے بخوشی قبول کیا[9]۔ جب وہ جونپور پہنچے تو سلطان ابراہیم نے ان کا شاہانہ استقبال کیا۔ بعد ازاں بھی اس کے ہاں ان کو بڑا تقرب حاصل رہا۔ وہ دیانت و امانت میں بے مثال تھے اس لیے قاضیِ جونپور کے عہدہ پر فائز کیے گئے[10]۔ اس منصب کے ساتھ ساتھ وہ سالہا سال تک درس و تدریس کا کام بھی کرتے رہے اور انھوں نے ہزاروں افراد کو علمی فیوض سے مستفیض

---

[1] تجلّی نور ص ۴۰، جلد دوم [2] ایضاً ص ۳۹ [3] ایضاً ص ۴۰ - خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۱۲ ان کا سالِ وفات ۹۲۳ھ لکھتے ہیں مگر تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵ پر ان کا سالِ وفات ۹۳۲ھ ہے
[4] تجلّی نور جلد دوم ص ۴۰ [5] ایضاً [6] ایضاً ص ۴۰-۴۱ [7] ایضاً ص ۴۱ [8] ایضاً ص ۴۱
[9] ایضاً ص ۴۱ [10] ایضاً ص ۴۱

فرمایا۔[۱]

قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ بھی اُن کے علم وفضل کے بڑے مدّاح تھے اور خاص طور پر علومِ دینیہ میں ان کی قابلیت کے بڑے معترف تھے۔[۲] جن دِنوں وہ جونپور کے قاضی القضاۃ تھے وہ کسی سرکاری فیصلہ، فتویٰ یا تحریر پر اپنی مہر توثیق نہ ثبت کرتے جب تک کہ اس پر قاضی کیکلانی کے دستخط نہ دیکھ لیتے۔[۳]

وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ اُن میں سے ایک ابراہیم شاہیہ، مجموعہ فتاویٰ حنفیہ بڑی پایہ کی تصنیف ہے۔ اس میں قاضیوں کے فتاویٰ کو بڑے عمدہ طریقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ کتاب انھوں نے سلطان ابراہیم شاہ کے حکم و مشورہ سے مرتب کی تھی۔ اس کا دیباچہ مندرجہ ذیل الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

"الحمد لله الذی رفع منار العلم واعلا مقداره"

یہ بڑی کثیر الحجم کتاب ہے اور اس کو بڑی شہرت و امتیاز حاصل رہا ہے۔[۴]

قاضی کیکانی کا وصال ١٤٧٠ء/٨٧٥ھ میں ہوا۔[۵] ان کا مزار جونپور شہر کے محلہ چاچک پور میں ہے۔[۶] جونپور کی جامع مسجد کے قریب جس محلہ میں ان کی رہائش تھی وہ بعد میں محلہ قاضی نظام کہلانے لگا تھا۔[۷] وہاں اب بھی غالباً ان کے خاندان کے لوگ آباد ہیں۔ جونپور کے مشہور میر محمد عسکری نبیرہ میر ذاکر علی کسوہ بھی انہی کے خاندان سے تھے۔[۸]

۱۔ تجلّی نور جلد دوم ص ۱۴۱

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً۔ بعض آپ کا سالِ وصال ١٤٦٩ء/٨٧٤ھ لکھتے ہیں۔

۶۔ ایضاً ص ۱۴۱

۷۔ ایضاً ص ۱۴۱

۸۔ ایضاً ص ۱۴۱

قاضی صلاح الدّین خلیلؒ

قاضی صلاح الدّینؒ کے سالِ ولادت اور وفات کا حوالہ کہیں نہیں ملتا مگر وہ قاضی نظام الدّین کیکلانیؒ کے نبیرہ تھے جنھوں نے ان کی بڑے عمدہ طریقے سے تعلیم و تربیت کی تھی[1]۔ وہ علومِ ظاہری کے بڑے بلند پایہ عالم تھے اور خاص طور پر ان کو علمِ فقہ پر کامل عبور حاصل تھا[2]۔ ان کے علم و فضل کی شہرت سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی اور اس دور کے جید علماء اور فضلاء بھی ان کے درس میں استفادۂ علمی کی غرض سے شامل ہوا کرتے تھے[3]۔ ان کے حسنِ اخلاق اور خوش گفتاری کے لوگ بڑے گرویدہ تھے[4]۔ انھوں نے ہزاروں کو علمی فیوض بخشے اور ان کے بعض شاگرد بڑے قابل اور نامورِ زمانہ ہوئے[5]۔

جب ان کے جدِ محترم قاضی نظام الدین کیکلانیؒ وفات پاگئے تو وہ ان کی جگہ قاضی جونپور کے عہدہ پر متمکن ہوئے اور اس فرضِ منصبی کو انھوں نے بیس سال تک بڑی دیانت داری اور سلیقہ سے نبھایا[6]۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ اُن میں سے ایک شرح الاشباہ والنظائر فی الفروع" یادگارِ زمانہ ہے[7]۔

ان کا انتقال پچاس سال کی عمر میں ہوا[8]۔ ان کے مقبرہ کی بلند عمارت مسجد عید گاہ کے پاس ہے اور مقبرہ قاضی صلاح کے نام سے مشہور ہے[9]۔

ان کے ایک قابل ترین شاگرد سیّد عبدالاوّل مجشیؒ[10] تھے۔ جو حضرت سیّد علاء الدین لاجوری جونپوریؒ کی اولاد میں سے تھے[11]۔ آخر عمر میں وہ بعض ناسازگار حالات کی وجہ سے ہجرت کر کے

---

[1] تجلّیِ نور جلد دوم ص ۴۳ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً [7] ایضاً
[8] ایضاً [9] ایضاً [10] ایضاً [11] ایضاً

گجرات چلے گئے[1]۔ وہاں سے وہ حج و زیارات کے لیے عرب گئے اور واپسی پر وہ احمد آباد میں آباد ہو گئے[2]۔ نواب بیرم خاں خانخاناں نے جب ان کے علم و فضل کا حال سنا تو انھیں دہلی مدعو کیا اس طرح وہ باقی تمام عمر دہلی میں رہے[3]۔ اور وہیں ۱۵۴۱ء/ ۹۴۸ھ میں فوت ہوتے[4]۔

انھوں نے علوم ظاہری سے متعلق بھی کئی کتابیں لکھیں[5]۔ انھوں نے صحیح بخاری کی شرح فیض الباری کے نام سے لکھی۔ ایک منظوم رسالہ فرائض سراجی کے نام سے لکھا۔ ایک رسالہ نفس و معرفت کے موضوع پر بڑے محققانہ انداز سے لکھا اور ایک سفر نامہ سفر السعادت کے نام سے قلمبند کیا[6]۔ علاوہ ازیں انھوں نے بہت سی کتابوں کے حواشی اور شرح بھی لکھیں[7]۔ جن کی وجہ سے اُن کے نام کو بقائے دوام حاصل ہوئی۔

ان کا وصال ۱۵۶۰ء/ ۹۶۸ھ میں ہوا[8]۔

قاضی سماءالدینؒ

قاضی سماء الدینؒ، قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ کے شاگردوں میں سے تھے اور سلطان حسین شرقی کے اُستاد تھے[9]۔ وہ اس دور کے متبحر علماء میں سے تھے اور اُن کی قابلیت کی شہرت ملک کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی تھی۔ سلطان حسین شاہ شرقی ان کی قابلیت اور علم و دانش کے بڑے گرویدہ تھے اور اس نے ان کو قتلغ خاں کے لقب سے منصب وزارت سے سرفراز کیا تھا[10]۔

مولانا سماء الدین سلطان حسین شاہ شرقی کے ساتھ جنگوں میں بھی برابر شریک ہوتے رہے۔ ایک بار جب بہلول لودھی نے ۱۴۷۸ء/ ۸۸۳ھ میں سلطان حسین شاہ کو شکست دی[11] اور اس کے

---

۱ تجلّی نور، حصّہ دوم ص ۴۲ ۲ ایضاً ۳ ایضاً ۴ ایضاً ۵ ایضاً ۶ ایضاً ۷ ایضاً ۸ ایضاً
۹ اذکارِ ابرار (اُردو ترجمہ گلزارِ ابرار) ص ۴۹۲ ۱۰ اذکارِ ابرار ایضاً
تذکرہ علمائے ہند ص ۸۰ ۱۱ طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۰۸۔ لیکن تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۳۸۵ پر اور تذکرہ علمائے ہند ص ۸۰ پر اس جنگ کا سال ۱۴۷۹۔ ۱۴۸۰ء/ ۸۸۴ھ لکھا ہے جو غلط ہے۔

بہت سے گھوڑے، ہاتھی فوجی سامان قبضہ میں لینے کے علاوہ اس کے چالیس اُمراء بھی گرفتار کر لیے تو یہ بھی گرفتار ہونے والوں میں سے ایک تھے۔ بہلول لودھی نے ان کو اس موقعہ پر زنجیر ڈال میں جکڑ کر قطب خاں لودھی کے حوالے کر دیا اور خود سلطان حسین کے تعاقب میں نکل گیا تاہم اس کو گرفتار کرنے میں ناکام رہا[1]۔

بعد میں مولانا کو دھلی بھیج دیا گیا[2]۔ جہاں بہلول لودھی نے اُن کی بڑی خاطر مدارات کی۔ دھلی میں بہت سے لوگ اُن کے فیضِ علم اور صحبت سے مستفیض ہوئے۔ جن میں سے شیخ عیسےٰ ابن شیخ بدھا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[3]۔ اُن کا وصال ۹۷۴ھ میں ہوا اور ان کا روضہ باغِ کہنہ (جونپور) میں ہے۔ جہاں اُن کا عرس ہر سال ۲۳-۲۴-۲۵ ذی قعدہ کو بڑی شان سے منایا جاتا ہے[4]۔

شیخ عبد الصمدؒ

شیخ عبد الصمدؒ کی تاریخِ پیدائش و وفات اور ابتدائی حالات کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ وہ وحیدِ عصر قاضی عبد المقتدر دھلویؒ کے پوتے اور شیخ عبد الواحدؒ کے صاحبزادے تھے[5]۔ قاضی عبد المقتدرؒ بھی سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی دعوت پر جونپور آتے تھے۔ یہاں وہ ایک سال مقیم رہے اور اپنے وعظ و مناظرات سے انھوں نے ہزاروں کو مشرف بہ اسلام کیا[6]۔ پھر وہ دھلی واپس چلے گئے اور جاتے وقت شیخ عبد الواحدؒ کو سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے پاس چھوڑ گئے[7]۔

شیخ عبد الصمدؒ علوم ظاہری کے بڑے زبردست عالم تھے[8]۔ انھوں نے جونپور میں سلطنتِ شرقی کے آخری دور تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا[9]۔ لیکن سلطان سکندر لودھی نے جب

---

[1] طبقاتِ اکبری جلد اول ص ۳۰۹ ۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۸۰ [2] اذکارِ ابرار (اردو ترجمہ گلزارِ ابرار) ص ۹۲-۴ [3] ایضاً [4] تذکرۃ الامراء (قلمی) حصّہ سوم ص ۷۱-۲۰ [5] اخبار الاخیار ص ۱۴۸

[6] تاریخ بدایونی جلد اول ص ۳۲ [7] ایضاً

[8] اخبار الاخیار ایضاً [9] ایضاً

جونپور پر قبضہ کر لیا تو ان کو دھلی مدعو کر لیا گیا۔ وہاں ان کا شاھانہ استقبال کیا گیا۔ دھلی میں بھی انھوں نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور وہاں بھی ہزاروں لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے[1]۔ سلطان سکندر لودھی بھی اُن کا بہت معتقد تھا[2]۔ چنانچہ ان کا شمار سکندر لودھی کے عہدِ سلطنت کے عظیم المرتبت علماء و صلحاء میں ہوتا ہے[3]۔

جب وہ دھلی پہنچے تھے تو سب سے پہلے انھوں نے اپنے جدِ امجد قاضی عبد المقتدرؒ کا بڑا عالیشان مقبرہ تعمیر کروایا جو بعد میں خانقاہ عبد الصمدؒ کے نام سے مشہور ہوا[4]۔ یہ مقبرہ اور خانقاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ کے روضہ کے پاس حوضِ شمسی کے جنوب میں واقع ہے۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۴۸ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً

باب ۳ سوم

عُلمائے کالپی

مولانا خواجگی کالپویؒ

مولانا خواجگی کالپویؒ مولانا معین الدین عمرانیؒ کے نامور شاگرد اور حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلویؒ کے اجل خلفا میں سے تھے۔ وہ اس دور کے بہت بڑے عالم تھے اور ان کے دامن کمال سے ان گنت لوگوں نے علمی فیوض حاصل کیے تھے[1]

حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے حلقۂ ارادت میں ان کے داخل ہونے کا واقعہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے یوں لکھا ہے کہ جن دنوں وہ مولانا عمرانیؒ کے پاس پڑھا کرتے تھے، وہ سبق سے فارغ ہو کر روحانی اصلاح کے لیے شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے پاس چلے جایا کرتے تھے۔ مولانا عمرانیؒ کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے ان کو شیخ نصیر الدینؒ کی خانقاہ پر جانے سے منع فرمایا اور کہا کہ علما کو فقرا سے حتی الوسع الگ ہی رہنا چاہیے۔ وہ خود بھی شیخ نصیر الدینؒ سے ملنے نہیں جایا کرتے تھے۔ مگر انھی دنوں وہ ریشہ اور بلغم کے مرض میں مبتلا ہو گئے انھوں نے ہر طرح کا علاج کروایا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا[2] اس صورت حال کو دیکھ کر مولانا خواجگیؒ نے اس سے عرض کیا کہ اطبا نے آپ کے مرض کو لاعلاج قرار دے دیا ہے۔ اس لیے اب آپ د

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۴۱۔ ریاض الاولیا (قلمی) ورق ۱۱۵ ب بحر ذخار (قلمی) ورق ۳۴۰ ا۔ خزینۃ الاصفیا جلد اوّل ص ۲۷۸، تذکرۂ علمائے ہند ص ۵۸

[2] اخبار الاخیار بحر ذخار (قلمی) ورق ۳۴۰ ب خزینۃ الاصفیا جلد اوّل ص ۲۷۸۔ ۲۷۹

اور دوا کے لیے کسی مردِ خدا کی طرف رجوع کریں کیونکہ وہ تو دلوں کے امراض کا علاج بھی کر سکتے ہیں ۔میرے خیال میں اگر آپ حضرت شیخ نصیر الدینؒ کے ہاں دعا کے لیے جائیں تو توقع ہے کہ ضرور صحت یاب ہو جائیں گے ۔پہلے تو انھوں نے حیل و حجت کی، بالآخر آمادہ ہو گئے ۔چنانچہ شیخ نصیر الدینؒ کو اُن کے آنے کی اطلاع کر دی گئی ۔جب مولانا خواجگیؒ ان کی خانقاہ کے دروازہ پر پہنچے تو وہ ان کے استقبال کے لیے آئے اور انھیں اپنی خانقاہ میں لے جا کر بڑی عزت و احترام سے بٹھایا ۔کچھ دیر گفتگو کے بعد جب کھانا چُنا گیا تو وہ چاول اور دہی تھا جو ان کے مرض کے لیے مضر تھا ۔پہلے تو وہ اس کو کھانے سے ہچکچائے مگر شیخ نصیر الدینؒ نے عرض کیا کہ مولانا بسم اللہ کیجیے ۔اور شوق سے کھائیے ۔بہرطور انھوں نے مجبوراً چند لقمے لیے لیکن ان کو کھانسی اور بلغم کا ایسا شدید دورہ پڑا کہ بلغم تھوکنے کے لیے طشتری منگوائی گئی اور اس میں انھوں نے اس قدر کھانسا کہ سینہ میں جما ہوا تمام بلغم اور بلغمی مادہ خارج ہو گیا اور وہ بالکل صحت مند ہو گئے ۔اس کے بعد ان کی شیخ نصیر الدینؒ کے ساتھ بڑی گہری عقیدت ہو گئی اور وہ بھی ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے ۔[1]

امیر تیمور کے دہلی پر حملہ آور ہونے کا رُوحانی اشارہ جب حضرت میر سیّد محمّد گیسو دراز ' بندہ نوازؒ کو ملا اور اس کی خبر دہلی میں عام ہو گئی تو مولانا خواجگیؒ بھی دہلی سے ہجرت کر گئے ۔اس سفر میں اُن کے ساتھ اُن کے ذی مرتبت شاگرد قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ بھی تھے جب وہ کالپی پہنچے تو وہیں ٹھہر گئے ۔[2] لیکن قاضی صاحب سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی دعوت پر جونپور چلے گئے ۔[3] کالپی میں انھوں نے کئی سال تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا ۔ وہ بہت بڑے عالم ہونے کے علاوہ سلسلۂ چشتیہ کے عظیم المرتبت مشائخ میں شمار ہوتے تھے اور

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۴۱-۱۴۲ ۔بحر ذخار (قلمی) ورق ۲۴۷ ب ۔خزینۃ الاصفیا ۔جلد اوّل ص ۳۷۸ - ۳۷۹

[2] اخبار الاخیار ص ۱۴۲

[3] ایضاً خزینۃ الاصفیا ۔جلد اوّل ص ۳۷۹

ہزاروں نے ان سے علم کے موتی چُنے اور روحانی فیوض حاصل کیے تھے[۵] ان کا وصال کالپی میں ۸۱۱ھ/۱۴۰۸ء میں ہوا[۲] جہاں اُن کا روضۂ اقدس مرجع خلائق ہے[۳]

مولانا احمد تھانیسری کالپویؒ

مولانا احمد تھانیسری کالپویؒ علومِ ظاہری کے بہت زبردست عالم تھے اور حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلویؒ کے خلفائے کبار میں سے تھے[۴] اگرچہ مولانا خواجگیؒ کے ساتھ ان کے بڑے عمدہ مراسم تھے لیکن انھوں نے امیر تیمور کے دہلی پر حملہ کے وقت مولانا خواجگی کا ساتھ نہ دیا اور دہلی میں ہی رہے[۵] جب امیر تیمور کے دہلی پر حملہ کے بعد عام و خاص کی گرفتاریاں شروع ہوئیں تو وہ بھی اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ گرفتار کر لیے گئے مگر امیر تیمور نے جب ان کی علمی عظمت اور شہرت کا حال سُنا تو اپنے پاس بلوایا اور شیخ الاسلام کے ساتھ بعض مذہبی موضوعات پر ان کا مقابلہ و مناظرہ کروایا۔ جب اس موقعہ پر وہ جیت گئے تو امیر تیمور نے اُن کو بتایا کہ یہ شیخ الاسلام صاحب ہدایہ مولانا برہان الدین مرغینانیؒ کے نبیرہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ اگر اُن کے جدِ امجد سے ہدایہ میں بعض موقعوں پر غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں تو ان سے بھی کسی غلطی کا سرزد ہو جانا معمولی بات ہے۔ یہ شیخ الاسلام یہ سنتے ہی مخاطب ہوئے کہ میرے جدِ امجد سے ہدایہ میں کونسی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، اُن کا ثبوت فراہم کیا جائے۔ اس پر انھوں نے اپنے بیٹوں اور شاگردوں کی طرف اِشارہ کیا اور فرمایا صرف میں ہی نہیں یہ بھی اس موضوع پر آپ کی تسلی کر سکتے ہیں لیکن امیر تیمور نے مولانا مرغینانی اور شیخ الاسلام کی عزت و ناموس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس مجلس کو برخاست کر دیا[۶] اس واقعہ کے بعد جب ان کی

---

[۱] خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل ص ۳۷۹ [۲] ایضاً [۳] ایضاً، اخبار الاخیار ص ۱۴۲، تذکرہ علمائے ہند ص ۵۸ [۴] اخبار الاخیار ص ۱۴۲

[۵] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۷۹

[۶] ایضاً

رہائی ہوئی تو وہ مع اپنے اہل و عیال کے کالپی چلے آئے اور وہاں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔[1] ان کو عربی زبان پر بڑا عبور حاصل تھا جس میں انھوں نے ایک قصیدہ بھی نعتِ رسول[2] کی شکل میں لکھا جو فصاحت و بلاغت میں لاجواب ہے۔[3] یہ قصیدہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اخبار الاخیار میں موجود ہے۔ ان کا وصال ۱۴۱۷ء/۸۲۰ھ میں ہوا۔[4] ان کا روضۂ اقدس کالپی میں قلعہ کالپی کے اندر واقع ہے اور مرجعِ خلائق ہے۔[5]

شیخ ابوالفتح علائی قریشی کالپویؒ

شیخ ابوالفتح علائی حضرت سید محمد گیسو دراز بندہ نوازؒ کے خلفائے کبار میں سے تھے۔[6] وہ علومِ ظاہری و باطنی کے بڑے ممتاز عالم تھے اور اسرارِ شریعت و طریقت سے بھی پوری طرح واقف تھے۔[7] آپ بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے جن میں سے سب سے اعلیٰ شرح عوارف المعارف تھی۔[8] علاوہ ازیں اُن کی بیس اور بھی تصانیف تھیں جن میں سے ایک تکملہ در نحو اور دُوسری "مشاہدہ در تصوف" بڑی پایہ کی مانی جاتی ہیں۔[9]

ان کو حرمین شریفین کی زیارت کا بھی شرف حاصل تھا۔[10] ان کا وصال ۱۴۵۷ء/۸۶۲ھ میں ہوا اور ان کا مزار پُر انوار کالپی میں ہے۔[11]

---

[1] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۷۹ [2] ایضاً اخبار الاخیار ص ۱۴۲-۱۴۳
[3] خزینۃ الاصفیاء ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً ص ۳۹۷ [6] ایضاً
[7] ایضاً [8] ایضاً [9] ایضاً [10] ایضاً

بابِ چہارم

عُلمائے خیرآباد

شیخ سعدالدین خیرآبادیؒ

شیخ سعدالدینؒ خیرآبادی کے قاضی بدھن کے صاحبزادے تھے[1] لیکن بچپن ہی میں ان کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے تھے[2]۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کی عظمت کے آثار اوائلِ عمر ہی سے ہویدا تھے۔ ان کو بچپن میں جب مکتب جانے کے لیے کہا جاتا تو وہ ہر روز اپنی تختی چھپا دیا کرتے مگر قرآنِ حکیم سے چندر کو ع ہر رات ہزار بار تلاوت فرمایا کرتے اس طرح انھوں نے بڑی چھوٹی عمر میں مکمّل قرآن مجید حفظ کر لیا تھا[3]۔ اس کے بعد وہ مولانا اعظم لکھنویؒ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے اور تمام علومِ ظاہری کی تعلیم مکمل کی[4]۔ ان کا شمار اِس دور کے جیّد علما میں ہوتا تھا[5]۔ دنیائے تصوّف میں وہ حضرت شیخ مینا لکھنویؒ کے مرید و خلیفہ تھے[6]۔ مگر ان کے وصال کے بعد وطنِ مالوف لوٹ آئے اور وہیں باقی ماندہ تمام زندگی درس و تدریس اور وعظ و تلقین میں مصروف رہے[7] اور ان کے ارشاد و ہدایت اور فیضانِ صحبت سے خلقِ خدا نے بے اندازہ فیوض حاصل کیے۔

ان کے خلفائے کبار میں سے ایک حضرت شیخ صفی سائی پوری تھے[8]۔ جو بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے اور انھیں بھی ان کی طرح مجلسِ سماع کا بے حد شوق تھا[9]۔ ان کے ایک دُوسرے

---

[1] مآثرالکرام (قلمی) ورق ۱۲۶ ا ب [2] ایضاً [3] ایضاً ورق ۱۲۶ ب و ۱۲۷ و

[4] اخبارالاخیار ص ۱۸۸ [5] ایضاً [6] ایضاً

[7] تذکرہ علمائے ہند ص ۷۵ [8] اخبار الاخیار ایضاً مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۶ ب

[9] اخبارالاخیار ایضاً۔

اجل خلیفہ حضرت میر سید خرد زید پوریؒ تھے[1]۔ وہ بھی بڑے صاحبِ باطن بزرگ تھے اور ان کے بیٹے بھی بڑے صاحبِ مرتبہ شیوخ تھے[2]۔ مگر ان کے سب سے باکمال خلیفہ شیخ الہدیہ خیرآبادیؒ تھے جو علومِ ظاہری و باطنی کے بڑے زبردست عالم تھے اور دُنیائے تصوف میں گم ہونے سے پہلے وہ سالہا سال تک درس و تدریس کا کام کرتے رہے تھے[3]۔ ان کے ایک مشہور و معروف خلیفہ شیخ مبارک سندیلویؒ تھے جو اتباعِ سُنّت کا بڑا اہتمام کرتے تھے[4]۔

حضرت شیخ سعدالدین خیرآبادیؒ حد درجہ مہمان نواز اور اقربا پرست بزرگ تھے۔ ان کے مرید اور عقیدت مند کبھی فتوح لاتے بھی تو وہ ان کو فوراً لوگوں میں تقسیم کر دیتے۔ انھوں نے اپنے تمام رشتہ داروں کو بلوا کر خیرآباد میں آباد کیا اور وہاں ان کی رہائش کے لیے مکان بنوا کر دیے تھے۔ ان کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ فوت ہوئے تو گھر میں کفن تک کے لیے کوئی کپڑا موجود نہ تھا[5]۔

وہ بڑے پایہ کے مصنف بھی تھے اور انھوں نے علمِ نحو و فقہ اور اصول پر کئی کتابیں لکھیں جن میں سے شرحِ مصباح، شرحِ کافیہ، شرحِ جامی، شرحِ بزودی اور شرحِ رسالہ مکیہ بڑی مقبول ہوئیں[6]۔ انھوں نے حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے ملفوظات خزانۂ جلالی کی طرز پر اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ مینا لکھنویؒ کے حالات و ملفوظات بھی جمع کیے اور اس کا نام مجمع السلوک رکھا[7]۔

ان کا وصال ۱۴۷۷ء/ ۸۸۲ھ میں ہوا[8]۔ اور ان کا روضہ مبارک خیرآباد میں مرجعِ خلائق ہے۔

---

۱ مراۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۶۳ ب ۲ ایضاً ۳ اخبارالاخیار ص ۱۸۸ ۴ ایضاً۔ منتخب التواریخ حصۂ سوم ص ۲۷۔ انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی اور ان کا انتقال ۹۹۳ھ میں ہوا۔

۵ اخبارالاخیار ایضاً ۶ مآثر الکرام (قلمی) ورق ۱۲۷ا

۷ اخبارالاخیار ایضاً ۸ ایضاً

۹ خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل ص ۱۰۴، تذکرہ علمائے ہند ص ۷۶

شیخ الٰہدیہ خیرآبادیؒ[1]

شیخ الٰہدیہؒ کی تاریخِ پیدائش اور آبائی حالات کا ذکر کسی تذکرہ یا تاریخ میں نہیں ملتا۔ وہ علومِ ظاہری کے زبردست عالم تھے اور اُن کا شمار اُس دَور کے جیّد علماء و فضلاء میں ہوتا تھا[2] وہ پہلے ایک مدت تک درس و تدریس کا کام کرتے رہے اور اُن کے بعض طلبا بھی بڑے پایہ کے عالم تھے[3]

لیکن جب ان کو اصلاحِ باطن کی فکر دامن گیر ہوئی تو وہ حضرت شیخ صفی سائی پوریؒ کے خلیفہ حضرت شیخ سعدالدین خیرآبادیؒ کے مرید ہو گئے اور ان سے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا[4] ان کو وجد و سماع کا بے حد شوق تھا اور جب اُن پر وجد طاری ہوتا تو اہلِ مجلس ان کو سنبھال نہ سکتے تھے[5] ان کی طبیعت میں بے حد استغنا تھا اور وہ کبھی کسی کی ضیافت قبول نہ فرماتے[6]

انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی اور ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء میں وصال فرمایا[7]

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۸۸۔ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۶ ب۔ ان کا نام تذکرہ علمائے ہند (ص ۲۶) کے مصنف غلطی سے اللہ دیا لکھتے ہیں۔

[2] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶

[3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً [7] ایضاً

باب ۵ پنجم

علمائے لکھنو

شیخ اعظم ثانی لکھنوی

شیخ اعظمؒ شیخ ابوالبقا بن شیخ موسیٰ بن شیخ ضیاء الدین کرمانیؒ کے خاندان سے تھے[1]۔ مؤخر الذکر ان کے جدِ امجد تھے جو ہلاکو خاں کے حملوں سے ہراساں ہو کر کرمان سے ہجرت کر کے لکھنو چلے آئے تھے۔ وہاں ان کی ملاقات شاہ سمرقندیؒ سے ہوئی اور ان سے ایسی محبت بڑھی کہ پھر وہیں آباد ہو گئے۔ ان کا شمار اپنے دور کے جلیل القدر علماء و فضلاء میں ہوتا تھا[2]۔

شیخ اعظمؒ کی پیدائش غالباً لکھنو ہی کی ہے لیکن انھوں نے علومِ ظاہری و باطنی کی تکمیل شیخ ابوالفتح جونپوریؒ سے کی[3] اور انھیں کے وہ مرید و خلیفہ بھی تھے[4]۔ وہ تا دمِ مرگ درس و تدریس ہی کا کام کرتے رہے اور انھوں نے سینکڑوں ہزاروں کو علمی فیوض بخشے[5]۔ شیخ سعد الدین خیرآبادی اور شیخ ضیا لکھنویؒ ان کے ارشد تلامذہ میں سے تھے[6]۔ شیخ ضیا لکھنوی بھی بہ یک واسطہ ان کے شاگرد تھے اور ان سے انھوں نے عوارف المعارف پر درس لیا تھا[7]۔

شیخ سعد اللہ کندوری فرماتے ہیں کہ ان کے ہم عصر تھے اور ان دونوں کے آپس میں بڑے عمدہ مراسم تھے[8]۔ ان کو خاص طور پر علمِ فقہ پر بڑا عبور حاصل تھا اور اس کے افہام و تفہیم میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ فی الواقعہ وہ اپنے زمانہ کے بڑے زبردست فقیہہ مانے جاتے تھے۔ انھوں نے

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳ [2] ایضاً ص ۲۳-۲۴ [3] ایضاً ص ۲۳
[4] ایضاً ص ۲۳ [5] ایضاً ص ۲۳ [6] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۰۱
[7] اخبار الاخیار ص ۱۸۸
[8] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳

علمِ فقہ پر چند رسالے بھی لکھے[1]

ان کے تین بیٹے تھے جن کے نام شیخ محمد عرف شیخ قاضی، شیخ احمد فیاض اور شیخ نصیر الدین تھے[2] ان کے بعض جانشین لکھنو، دیوہ اور انام میں آباد ہو گئے تھے[3]

ان کا سالِ وصال معلوم نہیں لیکن اُن کا مزار لکھنؤ میں ہے۔

شیخ سعد الدین لکھنویؒ

شیخ سعد الدینؒ، شیخ الاسلام سعد اللہ کندوری فراز لکھنویؒ کے فرزندِ ارجمند تھے[4] ۔ اور علومِ ظاہری و باطنی کے متبحر عالم تھے[5] ان کا بیشتر وقت اپنی علوم کی درس و تدریس میں گزرتا اور ان کے مدرسہ میں اکثر ہونہار طلباء اور عقیدت مندوں کا جمگھٹا لگا رہتا[6]

وہ بڑے اچھے شاعر بھی تھے اور سعدی تخلص کرتے تھے[7] ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

چو داری سوئےی چون قُل ھو اللہ

خطی درکش بگردِ ماسوی اللہ

چوں دوست موافق است سعدی

سہل است جفائی ہر دو عالم

گریہ بر عیوب کس مکنی

خندہ بر عیبِ دیگیراں چہ زنی[8]

ان کا وصال ۲۹ جمادی الاوّل ۱۴۷۶ء/۸۸۱ھ میں ہوا[9] ان کا روضۂ اقدس غالباً لکھنو ہی میں ہے۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳ [2] ایضاً ص ۲۳-۲۴ [3] ایضاً ص ۲۴
[4] ایضاً ص ۷۵ [5] ایضاً [6] ایضاً [7] ایضاً [8] ایضاً [9] ایضاً

حصّہ سوم

شرقی عہد کے صوفیا

ازمنۂ وسطیٰ میں صوفیاء نے جگہ جگہ مذہب و اخلاق اور رُوحانیت کی شمعیں روشن کیں اور وہ جہاں جہاں پہنچے، اُنھوں نے اپنے ارشاد و تلقین، درس و تدریس اور تقریر و تحریر کے ذریعے عوام و خواص کے مذہب و اخلاق کی اصلاح کا کام کیا فِی الحقیقت اِن رُوحانی ہستیوں نے ہر زمانے میں ملّت کے عروقِ مُردہ میں نئی رُوح پھونکی اور اس کے زوال و انحطاط میں اس کے لیے تجدید و احیاء کے راستے تلاش کیے۔

قرونِ وسطیٰ میں صُوفیاء نے اپنے مسلک و مقصد کی تبلیغ کو ہر طرح سے جاری رکھا۔ ان کا ایک طریقِ کار تو یہ تھا کہ وہ اپنے صُوفیانہ مشاغل اور پُرخلوص برتاؤ سے عوام کے مذہب و اخلاق کی اصلاح کرتے۔ ان کا دوسرا طریق یہ تھا کہ وہ حکمران طبقہ کو اپنی سرکاری فرائض سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہونے کا احساس دلاتے تاکہ اس سے عوام کی فلاح و بہبود ہو سکے۔ بعض حکمران بھی صُوفیا کی خوشنودی کے ذریعے اپنی رعایا کو خُوش رکھنے کی کوشش کرتے اور عوام بھی اپنے رُوحانی پیشواؤں کی معرفت حکمران طبقہ کو اپنے حقوق کی نگہبانی کا احساس دلاتے —— ان خُوش آئند کوششوں کا اثر غیر مسلموں پر بھی پڑا اور خاص طور پر برصغیر ہند و پاکستان میں جہاں ہندو قوم ذات پات کے جھمیلوں میں اُلجھی ہوئی پریشان حال تھی وہاں اسلامی مساوات و اخوّت اور اسلامی طرزِ زندگی نے ان کو اِس قدر متاثر کیا کہ ہندو لاکھوں کی تعداد میں مشرّف بہ اِسلام ہوتے اور یہ عمل ملک کے گوشے گوشے میں جاری و ساری رہا۔ اس طرح مسلم آبادی میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔

صُوفیا، عوام و خواص کی سماجی اور اخلاقی قدروں کی اصلاح کرنے اور ان کو خدا کے قریب لانے کی کوشش کرتے۔ وہ سطحی مذہبی جھگڑوں سے بے نیاز رہتے، بے معنی رسم و رواج، کھوکھلی ظاہرداری اور نمود و نمائش سے گریزاں رہتے۔ وہ مہر و محبت سے بُرے سے بُرے آدمی کی بھلائی کے لیے بھی سوچتے اور اپنی فروتنی و خاکساری سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیتے۔ وہ اپنے نفس کا محاسبہ بھی کرتے۔ حسنِ عمل سے دُوسروں کو اپنی طرف کھینچتے۔ ہر ایک کے رنگِ طبیعت کو پہلے سمجھتے اور جیسی کسی کی افتادِ طبع ہوتی اسی کے مطابق اس کی تربیت کرتے اور اس مقصد کے لیے وہ بعض اوقات اپنے اندر بڑی لچک اور گنجائش بھی پیدا کرتے۔ فی الحقیقت صُوفیاء حضرات انسانی نفسیات کے بڑے ماہر ہوتے ہیں اور حالات کی نبض کو خوب پہچانتے ہیں۔ وُہ دِلوں میں اُتر کر انسان کے چُھپے ہُوتے داعیات سے واقف ہو جاتے ہیں اور جسم سے پہلے دِل کو ہاتھ میں لینا مقدم سمجھتے ہیں۔ کیونکہ بقول کسے

"دِل بدست آور کہ حجِ اکبر است"

فی الحقیقت علماء، اُمراء، حاکموں اور بادشاہوں سے وہ کام نہ ہو سکے جو فقیر اور درویش کر گُزرے۔ کیونکہ بادشاہوں کے دربار خاص ہوتے ہیں اور فقیروں کے دربار عام ہوتے ہیں جہاں بڑے چھوٹے، امیر غریب اور عالم و جاہل کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ بادشاہ جسموں پر حکومت کرتے ہیں لیکن فقیروں کا قبضہ دِلوں پر ہوتا ہے۔ بادشاہوں کا اثر محدود ہوتا ہے اور اہل اللہ کا اثر بے پایاں۔ یہی وجہ ہے کہ درویش کو وُہ قوت و اقتدار حاصل ہو جاتا ہے کہ بڑے سے بڑے اور باجبروت بادشاہوں کو بھی ان کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔

صُوفیا، سرزمین ہند و پاک کے پُرخطر اور دُشوار گذار راستوں، سربفلک پہاڑوں اور لق و دق بیابانوں کو طے کر کے ایسے ایسے مقامات پر پہنچے جہاں کوئی شخص اسلام اور مسلمان کے نام تک سے واقف نہ تھا اور جہاں کی ہر چیز اجنبی اور ان کی طبیعت کے مخالف تھی۔ جہاں کی آب و ہوا رسم و رواج، رہن سہن، آداب و اطوار، لباس و ہیئت اور زبان، غرض ہر چیز ایسی تھی کہ ان کو

اُن لوگوں سے اور اُن لوگوں کو اِن سے وحشت ہو لیکن اس کے باوجود خدا کے ان بندوں نے اپنے کام سے کام رکھا اور اپنے مقصد کی دُھن میں لگے رہے۔

ایسی رُوحانی ہستیاں جو جونپور اور شرقی سلطنت جونپور کے مختلف شہروں و قصبوں میں آکر آباد ہُوئیں وہ تین وجوہ کی بنا پر یہاں آئیں اُن میں سے ایک طبقہ تو وہ تھا جو یہاں اشاعتِ اسلام اور مسلمانوں کے تحفّظ کے لیے پہنچا۔ اس نے مقامی مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ہندوؤں کے خلاف جہاد کیا اور سینکڑوں ہزاروں کو مشرّف بہ اسلام کیا۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جو عالمِ اسلام سے یا مغربی ہندوستان اور دہلی وغیرہ سے منگولوں اور تیموریوں کے حملوں اور لُوٹ مار سے ہراساں ہو کر یہاں پناہ گزیں ہوا اور اس کو سلاطینِ شرقیہ نے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ تیسرا طبقہ وہ تھا جن کے عِلم و تقدس کی شہرت سے شرقی سلاطین متاثر ہوئے اور ان کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ جب بھی کوئی عالم یا صُوفی یہاں پہنچتا تو سلطان اس کے استقبال کے لیے میلوں چل کر جاتے۔ ان کو شاہی محل میں مہمان ٹھہراتے اور نہایت عزّت و احترام سے پیش آتے۔ ان کو رہنے کے لیے گھر، پڑھانے کے لیے مدرسے، وعظ و تلقین کے لیے خانقاہیں، عبادت و ریاضت کے لیے مساجد تعمیر کرا کر دیتے اور معاش کے لیے جاگیریں عطا کرتے بلکہ ان کے وصال کے بعد ان کی عقیدت میں اُن کے مقبرے و روضے بھی بنواتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قدر دلجوئی علماء و صلحاء کی سلاطینِ شرقیہ نے کی اس کی دُوسری مثال قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

صُوفیاء کا سب سے پہلا طبقہ جو ظفر آباد اور جونپور پہنچا وہ سلسلۂ سہروردیہ کے مشائخ حضرت مخدوم سیّد اسدالدّین آفتابِ ہندؒ، حضرت مخدوم صدرالدّین چراغِ ہندؒ اور ان کے خلفاء، مریدین اور مجاہدین کا تھا جنھوں نے اس علاقہ میں بقائے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کے لیے جہاد کیا اور سینکڑوں ہزاروں ہندوؤں کو مشرّف بہ اسلام کیا۔ ان کے بعد ان کے جانشینوں اور خلفاء نے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے لیے سلطنتِ شرقی کے مختلف شہروں اور قصبوں میں مدرسے اور خانقاہیں قائم کیں اور اپنے بزرگوں کی روایات کو جاری رکھا۔ صُوفیاء کا دُوسرا طبقہ جو جونپور اور سلطنت کے

مختلف شہروں وقصبوں میں آکر آباد ہوا وہ زیادہ تر چشتیہ مشائخ کا تھا اور جو عالم اسلام، شمال مغربی ہندوستان اور دہلی وغیرہ سے تیموری حملہ سے ہراساں ہو کر یہاں پہنچا تھا۔ ان میں خواجہ ابوالفتحؒ، قاضی عبدالمقتدر[1] اور شیخ محمد عیسیٰ چشتیؒ جیسی مایۂ ناز ہستیاں پیش رو تھیں۔ چشتیہ مشائخ کا دوسرا گروہ جو جونپور اور سلطنتِ جونپور کی حدودِ سلطنت میں آکر آباد ہوا وہ شیخ علاء الحقؒ پنڈوہ کے اجل خلیفہ میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ اور حضرت نور قطب عالمؒ کے اجل خلیفہ شیخ حسام الدین کے خلفاء و مریدین کا تھا۔ ان لوگوں نے کچھوچھہ اور مانکپور میں چشتیہ سلسلہ کی بڑی شاندار روایات قائم کیں۔ ان کے بعد ان مشائخ کے جانشین و خلفاء نے بھی اپنے بزرگوں کی روایات کو پورے انہماک کے ساتھ جاری وساری رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شرقی سلطنت میں جگہ جگہ چشتیہ سلسلہ کے مراکز قائم ہو گئے جن میں سے جونپور، کچھوچھہ اور مانکپور کے علاوہ ظفرآباد، لکھنؤ، ایرج، کنتور، اودھ، فتح پور، انچولی، کڑہ، جھنجانہ، بہرائچ، سرورپور، سدھور اور امیٹھی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

عہدِ شرقی میں نئے نئے رُوحانی سلاسل اور رُوحانی تحریکیں بھی منصّۂ شہود پر آئیں اور سہروردیہ و چشتیہ سلسلوں کے علاوہ صابریہ سلسلہ کا بھی سب سے پہلا اور اہم مرکز یہیں قائم ہوا۔ اس کا اجراء شیخ جمال الدین پانی پتیؒ کے عالی مرتبت خلیفہ حضرت شیخ احمد عبدالحقؒ نے ردولی سے کیا اور اس کو

---

[1] سلطان ابراہیم شرقی نے قاضی عبدالمقتدرؒ کے علمی و رُوحانی کمالات سے متأثر ہو کر انھیں بھی جونپور مدعو کیا۔ جب وہ جونپور پہنچے تو سلطان اپنے علماء، صلحا اور اُمراء سے ایک جمِ غفیر کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے گئے انھوں نے ان کو گھوڑے سے خود اُتارا۔ پھر دربارِ شاہی میں لے جا کر تختِ شاہی پر بٹھایا اور خود اس موقعہ پر اپنے اُمراء و وُزراء کے ساتھ تعظیم و تکریم میں کھڑے رہے۔ اس کے بعد شاہی مہمان کی حیثیت سے ان کی خاطر مدارات کی۔ قاضی صاحب ایک سال یہاں رہے اور اپنے وعظ و تلقین اور بحث و مناظرہ سے سینکڑوں ہزاروں ہندوؤں کو مشرّف بہ اسلام کیا۔ وہ ہر جمعہ کو درس بھی فرمایا کرتے اور سینکڑوں ہزاروں لوگ ان کے درس میں شامل ہوا کرتے۔ سلطان نے انھیں جونپور میں رہنے کے لیے بڑا اصرار کیا لیکن وہ دہلی کو نہ بھلا سکے اور واپس چلے گئے۔ لیکن جاتے ہوئے اپنے بیٹے شیخ عبدالواحدؒ کو جونپور چھوڑ گئے۔
مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ بدایونی جلد اوّل ص ۳۳۲۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۲۴

پھران کے جانشین و خلفا نے بڑی کامیابی و شہرت بخشی۔ اِس طرح سیّد نجم الدین غوث الدہر قلندرؒ کے مرید و خلیفہ شیخ قطب الدین بینائے دِل قلندرؒ نے قلندریہ سلسلہ کا سب سے پہلا مرکز اس برِّصغیر میں جونپور ہی میں قائم کیا اور حضرت شاہ بدیع الدین مدارؒ شام و عرب سے یہاں پہنچے اور انھوں نے مداریہ سلسلہ کی سب سے پہلی اور اہم خانقاہ مکن پور میں قائم کی۔ ان کے مذہبی دوروں نے اُن کے سلسلہ کو عوام و خواص میں بڑا مقبول و مشہور کیا اور پھر ان کے بعد بھی ان کے خلفا نے اس سلوک کو سارے ملک میں رواجِ عام دیا۔ حضرت شاہ عبداللہ شطاریؒ ایران سے یہاں پہنچے اور انھوں نے بھی شطاریہ سلسلہ کا اجراء جونپور ہی سے کیا۔ اُنھوں نے اپنے مذہبی دوروں سے اس سلسلہ کو عوام و خواص میں ہر دلعزیز بنایا اور اس سلسلہ کو اس علاقہ میں شیخ حافظ جونپوری اور شیخ فاضن بنگالیؒ نے بڑی کامیابی و شہرت بخشی۔ سیّد محمد جونپوریؒ نے بھی یہیں جنم لیا اور اُنھوں نے بھی اپنی مہدوی تحریک کا اجراء جونپور ہی سے کیا اور اس تحریک نے اس ملک اور عالمِ اسلام میں بھی اتباعِ سُنّت کے لیے گرانقدر کام کیا۔ شرقی فرمانرواؤں نے اپنی ہندو رعایا کے ساتھ بڑا عُمدہ سلوک روا رکھا اور ان کی مذہبی و معاشرتی روایات کی قدر کی۔ ان کی ہر طرح کی دلجوئی کی اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ شاہ کبیر کی بھگتی تحریک بھی بالآخر یہیں سے شروع ہوئی اور اسی علاقہ میں پھلی اور پھُولی۔

شرقی عہد کے اِن تمام رُوحانی سلاسل و رُوحانی تحریکوں کے بزرگوں کے حالات جس قدر بھی فراہم ہو سکے ہم نے آئندہ صفحات میں قلمبند کر دیے ہیں۔ جو ملاحظہ فرمائے جائیں۔

باب اوّل

سُہروردیہ سِلسلہ

سُہرورد ایران کے علاقہ جبل کا ایک شہر ہے۔ اس جگہ کے ایک بزرگ شیخ نجیب الدّین عبدالقاہرؒ (المتوفیٰ ۱۱۶۹ء) اپنے نام کے ساتھ سہروردی لکھتے تھے اور انہی نے اس سِلسلہ کی بنیاد ڈالی تھی۔[1] ان کو شیخ احمد غزالیؒ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور کئی دُوسرے بزرگوں سے بھی بڑا رُوحانی فیض حاصل ہُوا تھا۔[2] وہ بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ کئی کتابوں کے مصنّف بھی تھے۔ جن میں سے سب سے زیادہ مشہُور آداب المریدین ہے۔[3] ان کی خانقاہ بغداد میں دریائے دجلہ کے مغربی کنارے آباد تھی اور اس سے مُتصل ایک مدرسہ بھی تھا۔ جہاں سے وہ درس و تدریس اور اصلاح و تربیت کا کام بڑے عمدہ طریق سے کرتے رہے۔[4] تاہم اس سِلسلہ کے سب سے زیادہ مشہُور بزرگ شیخ نجیب الدینؒ کے بھتیجے حضرت شیخ شہاب الدّین سہروردیؒ (المتوفیٰ ۱۲۳۴ء) ہیں۔[5] ان کی خانقاہ بھی بغداد میں تھی جہاں سے وہ اس سِلسلہ کی نشر و اشاعت کا کام بڑے اعلیٰ پیمانہ پر کرتے رہے۔[6] ان کی ایک مشہُور کتاب 'عوارف المعارف' ہے جس میں اُنھوں نے تصوّف کے بنیادی اعتقادات، خانقاہوں کی تنظیم، مریدین اور شیوخ کے تعلّقات اور دیگر مسائل کو کتاب و سُنّت کی روشنی میں نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔[7] ان کا عقیدہ تھا کہ ایک

---

[1] آئینِ اکبری حصہ دوم ص ۲۲۱ - خزینۃ الاصفیا۔ جلد دوم ص ۱۱

[2] تاریخ مشائخِ چشت ص ۱۱۰ [3] آئینِ اکبری ایضاً [4] تاریخ مشائخ چشت۔ ایضاً

[5] ایضاً ص ۱۲۰ [6] ایضاً ص ۱۳۱

[7] ایضاً ص ۱۴۱ و ۱۳۱

صوفی دنیاوی معاملات کو انجام دیتے ہوئے کسی نقصان کے بغیر اپنے روحانی مقامات پر پہنچ سکتا ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص کے پاس تریاق موجود ہو اس کو زہر سے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ بغداد میں خلیفہ الناصر نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی۔ اس نے ایک مرتبہ ان کو اربل میں سفیر بنا کر بھی بھیجا۔ اس منصب کو انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔[1]

سہروردی سلسلہ کو وسطِ ایشیا اور شرقِ اوسط میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن جب غز اور منگول قبائل نے ان علاقوں میں تباہی و بربادی مچادی تو اس سلسلہ کے بہت سے صوفیاء برصغیر ہند و پاکستان چلے آئے۔[2] شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا "خلفائی فی الهند کثیرة" (ہندوستان میں میرے خلفا بہت سے ہیں) ہندوستان میں اُن کے خلفاء کبار میں سے شیخ جلال الدین تبریزیؒ، شیخ نورالدین مبارک غزنویؒ، مولانا مجدالدین حاجیؒ، قاضی حمیدالدین ناگوریؒ اور شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔[3] ان میں سے شیخ جلال الدین تبریزیؒ ہانسی، دہلی اور بدایوں ہوتے ہوئے بنگال پہنچے۔[4] اور انھوں نے وہاں اس سلسلہ کی بڑی عمدہ خانقاہ قائم کی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے وہاں ہزاروں ہندوؤں کو بھی مشرف بہ اسلام کیا۔[5] قاضی حمیدالدین ناگوریؒ اپنے دور کے متبحر علماء میں سے تھے اور بڑے پایہ کے مصنف بھی تھے۔ تاہم وہ سلسلہ کی ترویج و اشاعت کی قابلیت نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے صرف دہلی کے ایک قصاب، بدایوں کے ایک رسی بنانے والے اور شیخ احمد نہروالہؒ کو مرید کیا تھا۔[6] شیخ نورالدین مبارک غزنویؒ، مولانا مجدالدین حاجیؒ اور شیخ ضیاءالدین رومیؒ کو بادشاہوں اور اُمراء کی قربت سے نقصان پہنچا اور وہ اس سلسلہ کی ترویج و ترقی کے لیے کچھ نہ کر سکے۔[7] شیخ نورالدین مبارک غزنویؒ

---

1 تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۲۱

2 K.A. Nizami, Some Aspects of Religion and Politics in India during the 13th Century, p. 220.

3 ایضاً، مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ اخبار الاخیار۔ فوائد الفواد، خیر المجالس 4 سیر العارفین ص ۱۷۱،
5 ایضاً 6 ایضاً ص ۱۵۰-۱۵۱ فوائد الفواد ص ۳۲ و ۲۴۱، اخبار الاخیار ص ۴۶، ۴۷ 7

Some Aspects of Religion and Politics during the 13th Century, p. 221.

(المتوفی ۶۴۵ھ-۱۲۴۷ء)، سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں کچھ عرصہ شیخ الاسلام کے عہدہ پر بھی مامور رہے[1]۔ اور مولانا مجد الدین حاجی سلطان التمش کے صدر الصدور رہے ہیں[2]۔ یہ دونوں بزرگ بھی اس سلسلہ کی خاطر خواہ خدمت نہ کر سکے لیکن جس بزرگ نے اس سلسلہ کو ہند و پاکستان میں سب سے زیادہ پھیلایا وہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی تھے۔ وہ ۱۱۸۲-۸۳ء میں کوٹ اور ضلع ملتان میں پیدا ہوئے[3]۔ وہ حافظِ قرآن تھے اور سبعہ قرأت کے ماہر تھے[4]۔ علومِ ظاہری کی تعلیم کے لیے وہ خراسان، بخارا، مدینہ منورہ اور فلسطین پہنچے تھے۔ علمِ حدیث انھوں نے شیخ کمال الدین یمنیؒ سے حاصل کیا تھا۔ اور کئی سال تک وہاں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر عبادات و ریاضات میں مشغول رہے۔ انھوں نے فلسطین اور دوسرے علاقوں میں پیغمبروں کے روضوں کی زیارات بھی کیں اور پھر جب بغداد پہنچے تو شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید ہو گئے[5]۔ اور صرف سترہ دن کی روحانی تربیت کے بعد خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے انھیں اپنا جانشین بنا کر ملتان بھیجا۔ جہاں انھوں نے اس سلسلہ کی ایک عظیم الشان خانقاہ قائم کی اور نصف صدی سے زائد عرصہ تک وہ اس سلسلہ کی ترویج و اشاعت میں مصروف رہے۔ ان کا وصال ملتان میں ۲۱ دسمبر ۱۲۶۲ء کو ہوا[6]۔

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اپنے زمانہ کے بڑے عظیم المرتبت بزرگوں میں شمار ہوتے تھے مگر اُن کا صوفیانہ فلسفہ اپنے ہم عصر چشتیہ مشائخ سے بہت مختلف تھا۔ بلکہ وہ مذہبی اور سیاسی معاملات میں بھی اُن سے مختلف اور آزادانہ رائے رکھتے تھے۔ وہ ایک متوازن زندگی کے قائل اور عادی تھے۔ ایک ایسی زندگی جس میں روح اور جسم دونوں کو مساوی رکھا جاتے۔ وہ

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۰ [2] ایضاً ص ۴۹ [3] ایضاً ص ۲۶-۲۷ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، فوائد الفواد ص ۵-۱۰۔ خیر المجالس ص ۱۲۱، ۱۳۷ و ۲۸۳۔ سیر الاولیاء ص ۶۰ و ۷۷۔ سراج الہدایہ (قلمی) سیر العارفین ص ۱۰۲-۱۲۸ [4] فوائد الفواد ص ۱۸۴ [5] ایضاً ص ۱۷۹

[6] Some Aspects of Religion and Politics in India during the 13th Century, p. 222.

اپنے پیر و مرشد کو چشتیہ صوفیاء کی طرح سجدہ کرنے کے بھی خلاف تھے۔ اُن کے مرید صرف السلام علیکم کہا کرتے تھے اور ہر قسم کی بدعتوں سے گریز کرتے۔ چشتیہ روایات کے برخلاف وہ دولت کو جمع کرنے اور سنبھال کر رکھنے کے حق میں تھے۔ اپنے عہد کے سیاسی معاملات میں بھی دخل دیتے اور شاہانِ وقت سے بھی ملا کرتے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود وُہ خانقاہ اور اپنے سلسلہ کی ترقی و ترویج کی بھی بڑی اہمیت رکھتے تھے[1]۔ انھوں نے فی الحقیقت سہروردیہ سلسلہ کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا اور اس میں بڑی قابل ہستیوں کو شامل کر لیا، اُن کے حلقۂ ارادت میں سینکڑوں ہزاروں لوگ شامل تھے اور اُن کے بے شمار خلفاء ملتان اور سندھ کے علاقہ میں پھیلے ہوتے تھے[2]۔

اِن کے سات بیٹے تھے[3] اور ان کے وصال کے بعد ان کے سب سے بڑے بیٹے حضرت شیخ صدر الدّین عارفؒ (المتوفّٰی ۱۲۸۵ء) سجادہ نشین ہوئے[4]۔ انھوں نے بھی ملتان میں اپنے والدِ بزرگوار کی روایات کو بڑی خوش اسلوبی سے جاری رکھا۔ شیخ زکریا ملتانیؒ کے ایک عظیم المرتبت خلیفہ حضرت سید جلال الدّین سُرخ پوش بخاریؒ (المتوفّٰی ۱۲۹۱ء) تھے[5] جنھوں نے اوچ شریف میں اس سلسلہ کی ایک عظیم الشان خانقاہ قائم کی[6]۔ فی الحقیقت اِس سلسلہ کی بعد کی تاریخ اس ملک میں انہی دو شاخوں سے تعلق رکھتی ہے۔

شیخ صدر الدّین عارفؒ نے اپنے والدِ بزرگوار کے بعد ۲۳ سال تک اِس سلسلہ کی خدمت کی، مگر مذہب و سیاست کے متعلق اُن کے خیالات اپنے والد سے قدرے مختلف تھے۔ وُہ دولت سے نفرت کرتے تھے اور انھوں نے اپنے والدِ بزرگوار کی جمع کی ہوئی تمام دولت فقرا،

---

[1] Some Aspects of Religion and Politics in India during the 13th Century, p. 222.

[2] ایضاً۔ تاریخ مشائخ چشت ص ۱۳۲

[3] تاریخ فیروز شاہی ص ۶۶-۶۷ [4] سیر العارفین ص ۱۲۸-۱۴۰۔ اخبار الاخیار ص ۶۰-۶۲

[5] اخبار الاخیار ص ۶۰ [6] ایضاً

و مساکین میں بانٹ دی تھی جو تقریباً سات لاکھ تنکے تھی[۱]۔

حضرت شیخ جلال الدین سرخ پوش بخاریؒ کا وطنِ مالوف بخارا تھا[۲]۔ وہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی شہرت سن کر ملتان آئے اور خرقہ خلافت حاصل کرنے کے بعد اپنے پیر و مرشد کے حکم کے مطابق اوچ میں آباد ہو گئے تھے۔ وہاں انھیں بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور ہزاروں لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے[۳]۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بے شمار ہندوؤں کو بھی مشرف بہ اسلام کیا تھا[۴]۔ ان کا وصال ۱۲۹۱ھ میں ہوا۔ اُن کے تین بیٹے تھے۔ سید احمد کبیرؒ، سید بہاء الدینؒ اور سید محمدؒ۔ ان میں سید احمد کبیرؒ کے بیٹے حضرت سید جلال الدین مخدوم جہانیاںؒ کے نام سے مشہور ہوئے[۵]۔ انھوں نے اس سلسلہ کی اوچ شریف والی شاخ کو بڑی ترقی دی۔ پھر یہ سلسلہ دُور دراز تک رائج اور مشہور ہو گیا اور خاص طور پر صوبہ سندھ کی سیاسی و مذہبی زندگی پر اس کا بڑا اثر پڑا[۶]۔

شیخ صدر الدین عارفؒ کے بعد اُن کے فرزندِ ارجمند حضرت شیخ رکن الدین ابو الفتحؒ (المتوفّٰی ۷۳۵ھ) سجادہ نشین ہوئے[۷]۔ اُن کو سلسلۂ سہروردیہ میں وہی حیثیت و اہمیت حاصل ہے جو حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کو سلسلۂ چشتیہ میں ہے۔ انھوں نے تقریباً پچاس سال اس سلسلہ کی اشاعت و ترقی کے لیے بڑی پُرخلوص محنت کی۔ مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ صوبہ سندھ کے تمام لوگوں کو اُن کے ساتھ والہانہ عقیدت تھی اور اس زمانہ کے بے شمار علماء بھی اُن کے حلقۂ مریدین میں شامل تھے[۸]۔

سہروردیہ خانقاہوں کی تنظیم چشتیہ جماعت خانوں سے بڑی مختلف ہوتی تھی۔ ان میں ایک بنیادی فرق یہ تھا کہ سہروردیہ سلسلہ کے بزرگ سیاستِ وقت سے احتراز نہ کرتے تھے۔ حضرت

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۶۰۔ سیر العارفین ص ۱۲۸ - ۱۴۰

[۲] سیر العارفین ص ۱۵۵ - ۱۵۶ [۳] ایضاً [۴] ایضاً

[۵] اخبار الاخیار ص ۱۳۹ - ۱۴۰ [۶] ایضاً

[۷] سیر الاولیاء ص ۱۳۵ - ۱۴۱ [۸] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۷

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ جو اس سلسلہ کی بنیادوں کو صحیح معنوں میں استوار کرنے والے تھے وہ شاہان وقت سے علانیہ ملتے تھے۔ سیاسی معاملات میں باقاعدہ حصّہ لیتے اور شاہوں سے تحفے تحائف بھی قبول کرتے۔ وہ عہدِ وسطیٰ کے امیر ترین صوفی مانے جاتے تھے اور بے اندازہ تحفے تحائف اور فتوح اُن کی خانقاہ میں پہنچتے تھے۔ وہ ان کو چشتیہ مشرب کی طرح فوری طور پر غرباء اور مساکین میں بانٹنے کے بجائے جمع کر لیا کرتے۔ اور اس دولت کو سنبھال کر رکھا کرتے تھے۔ اُن کے خزانہ میں سونے کے صندوق بھرے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض شاہانِ وقت بھی ضرورت کے وقت اُن سے اُدھار مانگ لیتے تھے۔ ایک بار مُلتان کے والی نے بھی اُن سے غلّہ اُدھار لیا۔ اور کہا جاتا ہے کہ جب اس غلّہ کے بورے غلّہ خانوں سے اُٹھائے جا رہے تھے تو نیچے سے چاندی کے تنکوں سے بھرے ہوئے گھڑے برآمد ہوئے[1]۔ ان کے بعد ان کے پوتے حضرت رکن الدینؒ نے بھی سلطان محمد بن تغلق سے ایک سو گاؤں کی جاگیر قبول کی تھی[2]۔

سہروردیہ سلسلہ کی خانقاہیں چشتیہ سلسلہ کے جماعت خانوں سے کئی لحاظ سے مختلف تھیں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی خانقاہ بڑے وسیع رقبہ میں تھی۔ اس میں ہر مہمان اور مسافر کو رہنے کے لیے علیحدہ علیحدہ کمرے میسّر ہوتے تھے۔ لیکن چشتیہ جماعت خانوں میں تمام مہمان اور مسافر ایک ہی بڑے ہال میں قیام کرتے تھے۔ وہیں سوتے اور وہیں عبادت و ریاضت کرتے تھے۔ شیخ بہاء الدینؒ اپنے مہمانوں کی مہمان نوازی بڑی فیاضی سے کرتے لیکن اُن کا لنگر عام لوگوں کے لیے نہ ہوتا تھا وہ صرف خاص لوگوں ہی کو مدعو کرتے تھے۔ سہروردیہ خانقاہوں میں غلّہ اور اناج کے انبار لگے رہتے تھے اور اُن کے خزانوں میں سونے اور چاندی کے سکّوں کی بھرمار ہوتی تھی[3]۔ لیکن چشتیہ جماعت خانوں میں ایسی کوئی چیز نہ پائی جاتی تھی۔ چشتیہ صوفیاء اور

---

[1] سیر العارفین ص ۱۰۶ و ۱۱۴، فوائد الفواد ص ۲۲۳ ۔ سیر الاولیاء ص ۱۵۹

[2] رحلۃ (ابن بطوطہ) جلد دوم ص ۶۱

[3] فوائد الفواد ص ۱۰۵ و ۱۳۶

جماعت خانوں کی آمدنی کا انحصار صرف بے قاعدہ قسم کی فتوح پر ہوتا لیکن سہروردیہ خانقاہوں کو آمدنی باقاعدہ طور پر جاگیرداروں سے بھی حاصل ہوتی۔ سہروردیہ خانقاہوں میں ہر عام و خاص نہیں جاسکتا تھا۔ حضرت شیخ بہاءالدین زکریا ملتانیؒ فرمایا کرتے تھے۔ کہ لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک عام اور ایک خاص، اور مجھے عام لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ میں ان پر کسی قسم کا اعتماد کرسکتا ہوں۔ لیکن جو خاص ہیں انھیں میرا روحانی فیض باقاعدہ پہنچتا رہتا ہے۔ اور وہ اپنی ہمت و مرتبہ کے مطابق فوائد حاصل کرتے رہتے ہیں[1]۔ اسی وجہ سے سہروردیہ صوفیاء قلندر اور جوالق لوگوں کو اپنی خانقاہوں میں داخل نہ ہونے دیتے اور انھیں روحانی تربیت کے ناقابل سمجھ کر اپنا وقت ضائع نہ کرتے[2]۔ انھوں نے ملاقات کے اوقات بھی متعین کر رکھے تھے اور عام لوگوں یا مسافروں کی بے روک ٹوک ملاقاتوں سے خود کو پریشان نہ کرتے۔ اگرچہ وہ روحانی عظمت اور تقویٰ و پرہیزگاری میں بے مثال تھے لیکن ان کے ہم عصر صوفیاء ہمیشہ ان کی دولت کے ذخائر پر تنقید کرتے اور کہتے کہ ان کی روحانی بلندیوں سے دولت کے ایسے وسیع ذخائر کا کیا تعلق! لیکن وہ انھیں سمجھایا کرتے تھے کہ دولت بذاتِ خود ایسی چیز نہیں بلکہ اس کا بے جا استعمال ایسی چیز ہے جو روحانی زندگی میں حارج ہوتا ہے[3]۔

تیرھویں صدی میں جب ملتان، اوچ اور دوسرے مغربی علاقوں پر منگولوں نے لوٹ مار شروع کی تو بہت سے سہروردیہ مشائخ سلطنتِ دہلی کے مشرقی علاقوں میں ہجرت کر گئے، پھر سلطنتِ شرقی کی داغ بیل پڑنے کے کچھ عرصہ پہلے جب ہندوؤں نے اودھ کے علاقہ

۱۔ فوائد الفوائد ص ۱۰۵ و ۱۳۶ - سیر العارفین ص ۱۱۴-۱۲۷

۲۔ شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی نے گو قلندروں کے ساتھ زیادہ تعلقات بڑھانے کی کوشش نہ کی لیکن قلندریہ سلسلہ کی کئی جماعتیں اپنا روحانی تعلق انہی کے ساتھ وابستہ کرتی ہیں اور سندھ کے مشہور بزرگ شاہ باز قلندر خاص طور پر اپنا روحانی تعلق انہی کے ساتھ ثابت کرتے ہیں۔ اخبار الاخیار ص ۶۰

Some Aspects of Religion and Politics in India during the 13th Century, p. 225.

۳۔ سیر الاولیاء ص ۱۵۸

کے مسلمانوں پر ظلم وستم شروع کر دیا تو بہت سے سُہروردیہ صوفیا، مجاہدین کے ساتھ مسلمانوں کی حفاظت اور اشاعتِ اسلام کے لیے وہاں پہنچے۔ ان حضرات میں سے دو قابلِ قدر ہستیاں حضرت مخدوم شیخ صدرالدین چراغِ ہندؒ اور مخدوم سید اسدالدین آفتابِ ہندؒ تھیں[۱]۔ یہ دونوں بزرگ حضرت شیخ رُکن الدین ملتانیؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ جنھوں نے اُن کو چراغِ ہندؒ اور آفتابِ ہندؒ کے خطابات عطا کر کے ظفرآباد و جونپور کے علاقہ میں بھیجا اور وہ وہاں اپنے کئی نامور خلفاء، مریدین اور مجاہدین کے ساتھ پہنچے تھے[۲]۔ چنانچہ شرقی عہد کی سلسلہ سہروردیہ کی تاریخ ان بزرگوں کے خلفاء اور مریدین کی کہانی ہے جو آئندہ صفحات میں بیان کی جارہی ہے۔

۱۔ تجلی نور جلد اوّل ص ۷۔۱۴ ۲۔ ایضاً ۸۔۱۵

باب دوم

سہروردیہ مشائخ ظفر آباد

مخدوم سیّد اسد الدّین آفتابِ ہندؒ

مخدوم آفتابِ ہندؒ سیّد زیدی خاندان سے تھے مگر حنفی عقائد کے پیرو کار تھے۔ ان کا شجرۂ نسب سترہ پشتوں کے بعد حضرت سیّد الساجدین امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے[۱]۔ ان کی عمر صرف سترہ برس کی تھی کہ ان کے والدِ بزرگوار میاں سیّد تاج الدّین واسط (عراق) سے چنگیز خانی حملوں سے تنگ آ کر ہندوستان چلے آئے۔ ان کے ساتھ ان کے خاندان کے دوسرے رشتہ دار بھی تھے جن میں سے مخدوم ضیاء الدّین زاہد کڑویؒ اور سیّد اسماعیل کڑویؒ بڑے ذی مرتبت بزرگ تھے[۲]۔ پہلے وہ کچھ عرصہ اپنے تمام اعزّہ و اقارب کے ساتھ دھلی میں مقیم رہے۔ لیکن جب سلطان ناصر الدّین محمود (۱۲۴۶-۱۲۶۶ء) نے انھیں کٹرہ مانکپور کی نظامت پر مامور کر دیا تو سب کو لے کر وہاں منتقل ہو گئے اور وہاں قصبہ منجھن پور میں مستقل طور پر آباد ہو گئے[۳]۔

مخدوم سیّد اسد الدّینؒ نے بیس سال کی عمر میں علومِ ظاہری کی تعلیم اپنے نانا مخدوم ضیاء الدّین زاھد کڑویؒ سے مکمل کی[۴]۔ تصفیۂ باطنی کے لیے بھی پہلے وہ انہی کے مرید ہوئے لیکن بعد میں ملتان جا کر حضرت شیخ رکن الدّین ملتانیؒ کے مرید ہو گئے[۵]۔ چند سال وہاں عبادت و ریاضت میں مصروف رہے۔ اور جب منزلِ مقصود کو پہنچے تو پیر و مرشد نے ان

---

[۱] تجلّیٔ نور جلد اوّل ص ۷-۸ [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] ایضاً [۵] ایضاً

کو خرقۂ خلافت اور آفتابِ ہند کا لقب عطا فرمایا۔[1] اس کے بعد وہ دھلی پہنچے اور حضرت شیخ نظام الدین اولیا سے رُوحانی فیض حاصل کیا۔[2] بالآخر وہ اپنے پیر و مُرشد کے حکم کے مطابق بہت سے خلفاء و مریدین اور مجاہدین کے ساتھ جہاد و تبلیغ کے لیے ظفرآباد چلے گئے[3] کیونکہ وہاں ان دِنوں ہندو سرداروں نے مسلسل بغاوت پھیلا رکھی تھی اور وہ مسلمانوں پر بڑا ظلم و ستم کر رہے تھے اور خاص طور پر راجہ ساکیت سِنگھ راٹھور نے تو منہیچ گڑھ/ظفرآباد کے مسلمانوں کا قافیہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔[4] ان کے ایک خط کا مندرجہ ذیل اقتباس جو انھوں نے اس سلسلہ میں اپنے پیر و مُرشد کو ملتان لکھا تھا۔ اس صُورتِ حالات کی مزید وضاحت کرتا ہے:

"کمترین بندگان اسدالدین حسینی اُمیدوار برکت مخدوم .... بہ آں جملہ کہ ایں بندہ بعد اداتے بجماعت در دُعا مشغول می ماند رجا کہ مددے در کار بندہ شود۔ باخداتے تعالٰے اسباب دینی و دنیوی ساختہ گردانَد۔ دیگر عرض می افتد چوں بندۂ بندگان بحکم آں مخدوم زماں در جہاد بناوی[5] مشغول و سرگرم است لیکن معرکہ آرائی ختم نہ شُد۔ ھمدریں اثنا راجیار بدعت آثار راجہ منہیچ کہ او سخت قلب ظُلم و کشت وخُونِ بیگناھاں و بر مسلمان انواع انواع بدعت و ایذا می رسانند و از خوف و درجاتے یومِ انتقال غافل است۔ جماعۂ فُقراء کہ در زاویہ متابعت ایں بندہ بندگان معمُور است بہ جوش و خروش می خواہند کہ برآں عاقبت اندیش نعرۂ تکبیر بلند کنند الاانتظار ایں معرکہ موقوعہ بدل عقیدت گزین است۔ اگر نوسے مدد در کار بندہ بزرگاں شود حق سبحانہٗ تعالٰے آن سخت قلباں را بخلقت نُور اسلام مزین کند و جملہ مسلماناں را فیروزی باد

---

[1] تجلی نور جلد اوّل ص ۸ [2] ایضاً [3] ایضاً

[4] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History. pp. 1-30

[5] بناوی (اعظم گڑھ)

منہ ذکرمہ فقط[1]

(مناقبِ درویشیہ قلمی - خاندانی ڈائری)

ان کے ساتھ اس مہم میں مخدوم شیخ صدرالدین چراغِ ہندؒ اور ان کے خلفاء و مریدین اور دُوسرے مجاہدین بھی شامل تھے۔ جب ان دونوں نے وہاں کے خراب حالات کی اطلاع سلطان غیاث الدین تغلق کو دھلی پہنچائی تو اس نے ان کی مدد کے لیے اپنے بیٹے شہزادہ ظفر خاں کو چھ ہزار سوار دے کر روانہ کیا۔[2] شہزادہ ظفر خاں نے وہاں پہنچتے ہی مخدوم آفتاب ہندؒ و مخدوم چراغِ ہندؒ کے ساتھ مل کر منہیچ گڑھ کا محاصرہ کر لیا۔ بالآخر فریقین میں مکالمہ و مقابلہ ہوا جس میں راجہ ساکیت سنگھ کو شکست ہوئی۔ بعد ازاں وہ اپنے مشاہیر و اراکینِ حکومت سمیت مسلمان ہو گیا اور منہیچ گڑھ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔[3] اس فتح و نُصرت کی خبر جب دھلی پہنچی تو سلطان غیاث الدین تغلق نے شہزادہ ظفر خاں کو ہی وہاں کا حاکم مقرر کر دیا۔[4] اس نے اپنے عہد میں منہیچ گڑھ میں کئی مساجد اور عمارات بنوائیں اور وہاں بہت سی اصلاحات کیں جن سے شہر کی بڑی ترقی ہوئی اور جلد ہی منہیچ گڑھ کے بجائے ظفر آباد کے نام سے مشہور ہو گیا۔[5]

اِس فتح و نُصرت کے بعد مخدوم آفتابِ ہندؒ بھی اپنے خلفاء اور مجاہدین کے ساتھ ظفر آباد ہی میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔[6] اور باقی ماندہ تمام زندگی وہیں درس و تدریس اور

---

۱ مناقبِ درویشیہ (قلمی) ۲ تجلیات العارفین ص ۳، چراغِ نور ص ۱۹-۲۰

۳ تاریخ ظفر آباد۔ چراغِ نور۔ مناقبِ درویشیہ۔ تجلیات العارفین۔ گزٹیر جونپور۔ راجہ کے اسلام قبول کرنے کے متعلق اختلافِ رائے ہے۔ چراغِ نُور کے مُؤلف لکھتے ہیں کہ اس نے حسبِ وعدہ اسلام قبول کیا جس کے صِلے میں اس کو خلعت و جاگیر دی گئی ہے۔ گزٹیر جونپور میں لکھا ہے کہ راجا اپنے عہد سے پھر گیا اور مرزا پور بھاگ گیا جہاں اس نے ایک قلعہ بھی ساکیت گڑھ (سکیت گڑھ) کے نام سے تعمیر کیا۔

۴ تجلیات العارفین ص ۳۔ چراغِ نور ص ۲۱، ۲۳۔

۵ چراغِ نُور ص ۲۴، ظفر خاں نے تھوڑا عرصہ حکومت کی۔ بعد میں اس نے وہاں کے بزرگوں کی صحبت اختیار کر لی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ ان کا مزار ظفر آباد میں مخدوم چراغ ہندؒ کے مزار کے برابر ہے۔

۶ تجلّی نور جلد اوّل ص ۸-۱۰

وعظ و تلقین میں گزار دی[1]۔ ان سے لاکھوں بندگانِ خدا نے بے اندازہ فیوض حاصل کیے۔

مخدوم آفتاب ہندؒ بڑے صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ اپنے حجرۂ عبادت میں مشغول تھے۔ اسی دوران میں ایک چور آیا اور ان کے جوتے اُٹھا کر بھاگنے لگا۔ لیکن ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ اس کے ہاتھ ٹیکڑ گئے اور وہ وہیں رُک گیا۔ مخدوم جب حجرہ سے باہر آئے اور اس کی طرف دیکھا تو وہ فوراً قدموں میں گر پڑا اور اپنے کیے کی معافی مانگنے لگا چنانچہ آپ نے اس کے حق میں دُعائے خیر کی تو اس کے ہاتھ پھر پہلے کی طرح ہو گئے[2]۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ اُن کے عہد میں جونپور کا ایک نائب حاکم عبداللہ بیگ تھا جو بڑا شراب خور تھا، ایک روز وہ نشہ کی حالت میں اُن کے پاس پہنچ گیا، اس کی اس گستاخانہ حرکت میں وہ جلال میں آگئے۔ اور غصّے میں فرمایا "اے اجل رسیدہ۔ یہاں سے دُور ہو جا"۔ ان الفاظ کا منہ سے نکلنا تھا کہ اس پر ہیبت طاری ہو گئی اور وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے تیسرے دن بعد ہی وہ کسی واقعہ میں قتل ہو گیا[3]۔

مخدومؒ اس دور کے علومِ ظاہری کے بہت بڑے عالم مانے جاتے تھے۔ وہ حافظِ قرآن تھے اور قاری سبعہ قرأت بھی تھے[4]۔ کلام اللہ کو اس قدر خوش الحانی سے پڑھا کرتے کہ سامعین پر رقت طاری ہو جاتی[5]۔ ان کا معمول تھا کہ وہ ایک دن اور رات میں دو بار قرآن مجید ختم کر لیا کرتے تھے[6]۔ وہ زہد و تقویٰ، ریاضت و عبادت اور ترک و تجرید میں بے مثال تھے۔ ہر روز روزہ رکھتے اور تمام رات نوافل میں مصروف رہتے اور اکثر اوقات سجدہ میں مستغرق دیکھے جاتے[7]۔ وہ بڑے پایہ کے مصنّف بھی تھے۔ انھوں نے اسرار

---

[1] تجلّیٔ نور، جلد اوّل ص ۸-۱۰۔ جہاد کے سلسلہ میں مخدوم آفتاب ہندؒ نے جن جن مقامات پر پڑاؤ ڈالے تھے اور جہاں جہاں رہے تھے وہاں اب تک ان کی عبادت گاہوں اور حجروں کے نشان قائم ہیں جن میں سے کنتت ضلع مرزاپور، سھتن دیہہ ضلع الہ آباد بناوی ضلع اعظم گڑھ اور ظفرآباد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

[2] تجلّیٔ نور ایضاً ص ۹ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً

[7] ایضاً ص ۹-۱۰

صوفیہ پر کئی کتب و رسائل لکھے جن میں سے ایک سلوک و معرفت پر عشقیہ نام کی بڑی مستند تصنیف ہے[1] وہ بڑے عمدہ شاعر بھی تھے اور اُن کا یہ شعر اُن کے ذوقِ سخن کا عمدہ ثبوت ہے:-

یا در اہم مجال قرب نیست
در دولت یاد دوستاں کہ دہد[2]

تجلّی نور کے مصنّف لکھتے ہیں کہ ایک بار سلطان فیروز شاہ (المتوفی ۱۳۸۸ء) ظفرآباد آئے اور ان کی زیارت کی خواہش کی۔ انھوں نے جواب بھیجا کہ میں ایک فقیر ہوں اور تم تاجدار ہو۔ میں تارک الدنیا ہوں اور تمھاری دُنیا سے دوستی ہے۔ اس لیے تم سے میری کیا مناسبت ہوسکتی ہے کیونکہ ہم دونوں کے راستوں میں بڑا فرق ہے۔ مگر اس جواب کے باوجود سلطان فیروز نے بار بار اظہارِ عقیدت کیا اور ملاقات کے لیے بڑی منت و سماجت کی۔ بالآخر آپ کو چند لمحوں کے لیے اندر آنے کی اجازت مِل گئی۔ سلطان فیروز ان کو دیکھتے ہی قدم بوس ہو گئے۔ مخدوم نے اُن کے حق میں دُعائے خیر کی اور پھر انھیں رُخصت کیا۔[2]

اُنھوں نے بڑی لمبی عمر پائی۔ ان کی ولادت ۱۹ رجب ۶۶۱ھ/۱۲۶۲ء کو ہوئی تھی اور اُن کا وصال ۱۳۲ سال کی عمر میں بروز چہارشنبہ ۱۶ جمادی الاوّل ۷۹۳ھ/۱۳۹۰ء میں ہوا۔[2]

اُن کے وصال کا واقعہ صاحبِ تصنیف تجلّی نور بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ۱۰ جمادی الاوّل کو نمازِ عصر کے بعد مجلسِ سماع منعقد کی اور جب قوالوں نے شیخ سعدیؒ کا یہ شعر:-

اگر ہلاکتِ سعدی بہ تیغ فرقت تست
حلال باشد دخونی کہ دوستاں ریزد

بڑے پُر درد انداز میں گانا شروع کیا تو ان پر وجد طاری ہو گیا یہاں تک کہ فنا فی الوجد ہو گئے

---

[1] تا [2] تجلّی نور جلد اوّل ص ۱۰

پھر اُسی حالت میں ان پر فالج گرا اور اُنھوں نے ۱۶ جمادی الاوّل کو نمازِ تہجّد کے وقت اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کردی[1]۔

اُن کا روضۂ اقدس ظفرآباد کے محلّہ سیدواڑہ میں دریائے گومتی کے کنارے مرجعِ خلائق ہے۔ ان کی اولاد بھی اُن کے روضہ کے احاطہ میں مدفون ہے[2]۔

مخدوم آفتابِ ہندؒ کے خلفاً

مخدوم آفتابِ ہندؒ کے بیٹوں، خلفاء اور مجاہدین نے بھی ان کے ساتھ مل کر جہاد اور تبلیغِ اسلام کے لیے بڑا کام کیا۔ اُن میں سے بعض کے حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا مگر جن کے حالات دستیاب ہوتے بھی ہیں وُہ نہایت مختصر ہیں۔

ان کے صاحبزادے سیّد نُورالدّین ابی محمّدؒ[3]، سیّد شمس الدّین مکّیؒ[4] اور سیّد صدرالدّین مکّیؒ بھی بڑے پایہ کے عالم و صُوفی تھے۔[5] سیّد شمس الدّینؒ (المتوفّٰی ۷۸۵ھ/۱۳۸۳ء) کی ولادت ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء میں مکّۂ معظمہ میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے والدِ بزرگوار ہی کے مرید و خلیفہ تھے اور بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے۔ اُن کا وصال اُن کی زندگی ہی میں ہوگیا تھا[6]۔ اُن کا مزار اپنے والدِ بزرگوار کے مزار کے بالمقابل مغرب کی طرف ہے۔ سیّد نُورالدّین ابی محمّدؒ کے بیٹے سیّد قطب الدّین ابُوالغیبؒ اور سیّد شمس الدّین مکّیؒ کے صاحبزادے سیّد گوشا ہینؒ (المتوفّٰی ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء) بھی بڑے صاحبِ کرامات اور عالی مراتب بزرگ تھے[7]۔ موخرالذکر اپنے والدِ بزرگوار کے مرید و خلیفہ تھے اور ان کا مزار بھی اپنے والدِ بزرگوار کے روضہ کے احاطہ

---

[1] تجلّیِ نور، جلد اوّل ص ۱۰-۱۱ [2] ایضاً ص ۱۱ [3] تجلّیِ نور جلد دوم ص ۹-۱۰
[4] تاریخ ظفرآباد۔ مناقبِ درویشیہ [5] ایضاً
[6] ایضاً
[7] تجلّیِ نور جلد دوم ص ۱۱-۱۳

میں ہے۔ مخدوم آفتابِ ہندؒ کے ساتھ جہادِ ظفرآباد میں قاضی اعز الدین لنگر دہانش (المتوفیٰ ۲۵ شعبان ۸۴۸ھ/۱۴۳۹ء) بھی شامل تھے اور انھوں نے جہاد میں بڑے کارنامے دکھائے تھے۔ وہ بڑے خدارسیدہ بزرگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کا مزار موضع ردنی ضلع شاہ آباد میں ہے[1]۔ مخدوم کے ایک خلیفہ شیخ محمد کوئی سہروردیؒ بھی اس جہاد کے لیے ظفرآباد آئے تھے مگر فتح کے بعد بہت کم عرصہ ظفرآباد میں ٹھہرے۔ اس کے بعد وہ قصبہ منڈیاہوں ضلع جونپور چلے گئے۔ ان کا وصال بھی مخدوم کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا اور اُن کا مزار بھی مخدوم کے روضہ کے احاطہ میں ہے[2]۔ ایک اور بزرگ خواجہ شمس الدین غازیؒ (المتوفیٰ ۱۶ جمادی الاول ۷۸۷ھ/۱۳۸۵ء) تھے جو شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے خلفاء میں سے تھے مگر انھیں مخدوم سے بھی بڑا روحانی فیض حاصل تھا۔ وہ ایک غار میں دن رات عبادت و ریاضت میں منہمک رہتے تھے۔ ان کا مزار مخدوم کے روضہ کے سامنے دروازہ کے ساتھ ہے[3]۔ مخدوم آفتابِ ہندؒ بعض دوسرے خلفاء کے حالات آئندہ صفحات میں درج ہیں اور بعض کے حالات علمائے ظفرآباد کے سلسلہ ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

سیّد صدرالدین مکیؒ

سیّد صدرالدین اپنے والدِ بزرگوار مخدوم سیّد اسعدالدین آفتابِ ہندؒ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اور انہی کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کی ولادت مکہ معظمہ میں ۱۰ ذی قعدہ ۷۰۹ھ/۱۳۱۰ء کو ہوئی تھی۔ وہ مادرزاد ولی تھے۔ زبان سے جو کچھ کہہ دیتے وہ پورا ہو جاتا۔ وہ بڑے تنہائی پسند تھے اور ہر وقت بحرِ معرفت میں غوطہ زن رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات وہ شیر کو گھوڑا اور سانپ کا کوڑا بنا کر جنگلوں میں پھرا کرتے۔ مخدوم آفتابِ ہندؒ کی اولاد پر ان کی دعا کا یہ اثر

---

[1] تاریخ ظفرآباد، انتخاباتِ درویشیہ [2] ایضاً، تاریخ ظفرآباد
[3] ایضاً، انتخاباتِ درویشیہ

تھا کہ ان کو کبھی سانپ نہیں کاٹتا تھا۔ اور اگر کبھی کاٹ بھی لیتا تو زہر کا اثر بالکل نہ ہوتا۔ وہ تمام عمر مجرّد رہے اور انھوں نے ۲۹ ذی قعدہ ۸۰۶ھ/۱۴۰۳ء کو وصال فرمایا۔ ان کا مزار مخدوم کے روضہ کے احاطہ میں سیّد نور الدّینؒ کے مزار کے ساتھ واقع ہے۔[1]

وہ میاں مکّی کے نام سے بھی یاد کیے جاتے تھے۔ یہ بات بہت مشہور ہے کہ اگر کسی کو سانپ کاٹ لیتا اور اس کے کان میں یہ کہہ دیا جاتا کہ "میاں مکّی کی دُھائی" تو زہر کا اثر فوراً زائل ہو جاتا تھا۔[2]

شیخ چاند سہروردیؒ

شیخ چاند سہروردیؒ گھر سے تلاشِ روزگار کے لیے نکلے تھے کہ کسی بزرگ کے مشورہ سے ملتان پہنچ گئے، جہاں ان کی ملاقات حضرت مخدوم اسد الدّین آفتابِ ہندؒ سے ہوئی اور وہ ان کے مرید ہو گئے۔ کچھ عرصہ وہ ریاضات و عبادات میں مشغول رہے اور بالآخر خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ جب مخدوم آفتابِ ہندؒ جہاد و تبلیغِ اسلام کے لیے ظفر آباد آئے تو وہ بھی ساتھ تھے اور انھوں نے بھی جہاد و تبلیغ میں نمایاں حصّہ لیا۔ جہاد کے بعد وہ مستقل طور پر ظفر آباد میں مقیم ہو گئے۔ جہاں ان کا وصال ۸۱۱ھ/۱۴۰۸ء میں ہوا۔ ان کا مزار مخدوم آفتابِ ہند کے روضہ کے احاطہ میں مولانا رکن الدّین یک لکھّیؒ کے مزار کے ساتھ واقع ہے۔[3]

---

[1] مناقبِ درویشیہ۔ تاریخ ظفر آباد   [2] ایضاً

[3] تاریخ ظفر آباد

A. Halim, J.A.S.P. Vol. VIII, No. 2, Dec. 1963, p. 104.

شاہ عالم سہروردیؒ

شاہ عالم سہروردیؒ مخدوم آفتاب ہندؒ کے مرید و خلیفہ تھے اور انہی کے ساتھ ظفر آباد آئے تھے۔ انھوں نے بھی جہاد ظفر آباد میں بڑا نمایاں حصہ لیا تھا۔ ان کا وصال ۸۳۸ھ/۱۴۳۴ء میں ہوا۔ ان کا مزار ظفر آباد کے محلہ سید واڑہ میں ہے۔[1]

شاہ محمدی سہروردیؒ

شاہ محمدی سہروردیؒ مخدوم سید اسد الدین آفتاب ہندؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ ان کی ملاقات مخدوم سے ملتان میں ہوئی تھی۔ جب حضرت شیخ رکن الدین ملتانیؒ نے مخدوم آفتاب ہندؒ کو ظفر آباد کے علاقہ میں جہاد و تبلیغ اسلام کے لیے منتخب کیا تو وہ بھی اُن کے ہمراہ چلے آئے اور پھر تادم مرگ ان کے ساتھ ہی رہے۔[1]

وہ تمام عمر مجرّد رہے اور انھوں نے ساری زندگی ریاضات و عبادات میں گذاردی۔ اُن کا معمول تھا کہ وہ بغیر کسی ضرورت کے اپنے حجرۂ عبادت سے باہر نہ نکلتے۔ مخدوم آفتاب ہندؒ کو ان سے بڑی محبت تھی اور وہ ان کی روحانی عظمت کے بڑے قائل تھے۔ مخدوم نے جب بھی کسی مرید کو خرقۂ خلافت عطا کرنا ہوتا تو سب سے پہلے اس کو ان کے پاس بھیجتے اور اُن کے صلاح و مشورہ کے بعد اس کو خرقۂ عطا کرتے۔ ان کا وصال ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء میں ہوا اور اُن کا مزارِ اقدس مخدوم آفتاب ہندؒ کے روضہ کے احاطہ میں ہے۔[2]

---

[1] A. Halim, J.A.S.P. Vol. VIII, No. 2, 1963, p. 105.

[2] تجلیات العارفین [3] ایضاً

A. Halim, J.A.S.P. Vol. VIII, No. 2, P.104.

میراں شاہ قلندرؒ

میراں شاہ قلندرؒ مخدوم آفتابِ ہندؒ کے خلفائے کبار میں سے تھے۔ وہ بہت حسین و جمیل اور طاقتور انسان تھے۔ انھوں نے بھی مخدوم آفتابِ ہندؒ کے ساتھ جہاد و تبلیغ میں بڑا حصّہ لیا۔ وہ اکثر بحرِ معرفت میں مستغرق دیکھے جاتے۔ انھوں نے بڑی لمبی عُمر پائی اور ۱۳۰ سال کی عُمر میں ۸۵۴ھ / ۱۴۵۰ء میں اِنتقال کیا[1]۔ کہا جاتا ہے کہ قوّتِ روحانی کی وجہ سے بڑھاپے میں بھی ان کا جوش و خروش اور ہمّت و اِستقلال جوانوں سے بڑھ کر تھا۔ موضع قلندر پور ظفر آباد کے پاس دریائے گومتی کے کنارے انھی کا آباد کیا ہوا ہے اور وہیں ان کا مزار شریف بھی ہے[2]۔

مُلّا قیام الدّین سہروردیؒ

مُلّا قیام الدّین سہروردیؒ قریشی خاندان سے تھے۔ اور مخدوم آفتابِ ہندؒ کے اجلّ خلفا میں سے تھے۔ پہلے وہ دہلی میں رہا کرتے تھے لیکن بعد میں اپنے پیر و مُرشد کے ساتھ ظفر آباد چلے آئے اور وہاں دریائے گومتی کے کنارے سکونت اختیار کر لی تھی[3]۔

آپ علومِ ظاہری کے بڑے زبردست عالم تھے اور کئی سال تک درس و تدریس بھی کرتے رہے مگر ایک روز یک لخت دُنیاوی معاملات سے ایسے بیزار ہوئے کہ راہِ طریقت اختیار کر لی۔ ان کو حضرت شیخ نظام الدّین اولیاؒ سے بھی بڑا روحانی فیض حاصل تھا۔ وہ زہد و ورع میں بے مثال تھے اور بیشتر وقت تزکیۂ نفس اور صفائی قلب میں مصروف

---

[1] تجلّیات العارفین۔ تاریخ ظفر آباد۔ چراغِ نُور ص ۸۴ [2] ایضاً
[3] تجلّی نور جلد اوّل ص ۱۴۱

رہتے۔ ہر روز روزہ رکھتے اور تمام رات سُنن و نوافل میں مصروف رہتے۔ اس معمول کے وہ تمام عمر پابند رہے۔ ان کا وصال ۱۳ ذی قعدہ ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء میں ہوا اور اپنے حجرۂ عبادت ہیں ہی دفن ہوئے ان کا مزار ظفر آباد کے محلّہ احد میں ہے[1]۔

ان کے صاحبزادے مخدوم احد سہروردیؒ بھی بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے انھوں نے علومِ ظاہری و باطنی کی تعلیم اپنے والدِ بزرگوار ہی سے حاصل کی تھی اور وہ انہی کے مرید و خلیفہ بھی تھے اور ان کے وصال کے بعد سجادہ نشین ہوئے تھے۔ وہ کتاب و سُنّت کے خلاف کوئی کام نہ کرتے اور شریعت کی بڑی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ انھوں نے تمام عُمر عبادت و ریاضت میں گزاری اور سینکڑوں ہزاروں کو روحانی فیض بخشا۔ ان کا مزار اپنے والدِ بزرگوار کے روضہ کے دروازہ کے سامنے ہے[2]۔

سیّد حسن جلال بخاری سہروردیؒ

سیّد حسن جلال بخاریؒ حضرت سیّد جلال الدین سُرخ پوش بخاریؒ و بچی خاندان سے تھے اور مخدوم آفتاب ہندؒ کے لشکرِ مجاہدین کے ساتھ جہاد کے لیے ظفر آباد آئے تھے۔ وہ علومِ ظاہری و باطنی کے متبحر عالم تھے اور ان کو تصوّف کی کتابوں کے مطالعہ کا اس قدر شوق تھا کہ فصوص الحکم ان کو زبانی یاد تھی۔ بعض اوقات وہ برہنہ سر اور برہنہ پا ویرانوں میں گھوما کرتے۔ اس حالتِ جذب میں بھی سب سے ملتے اور اپنا تمام کام بہ احسن و خوبی انجام دیتے۔ اِس حالت میں وہ جو کچھ بھی کہہ دیتے پورا ہو جاتا۔ ان کا مزار ظفر آباد میں دریائے گومتی کے کنارے سیڑھی گھاٹ کے ساتھ بڑی اُونچی اور پُرفضا جگہ پر واقع ہے[3]۔

---

[1] تجلّیِ نُور جلد اوّل ص ۱۴۴ [2] تذکرۃ الصالحین
[3] تجلّیات العارفین۔ تاریخ ظفر آباد

سیّد نظام الدّین سہروردیؒ

سیّد نظام الدّین سہروردیؒ سیّد قطب الدّینؒ کے صاحبزادے اور مخدوم آفتاب ہندؒ کے پوتے تھے اور اپنے والدِ بزرگوار ہی کے مرید و خلیفہ تھے۔ علومِ ظاہری و باطنی پر اُن کو پورا عبور حاصل تھا۔ جب ان کے والدِ بزرگوار وصال کر گئے تو ان کی جگہ سجادہ نشین ہُوئے۔ وہ زہد و ورع میں بے مثال تھے۔ روزانہ فقراء و مساکین کے لیے طرح طرح کے کھانے پکواتے اور سینکڑوں لوگ ان کے دسترخوان پر جمع ہوتے لیکن وہ خُود ہر روز روزہ رکھتے اور تمام رات عبادت و ریاضت میں گزارتے۔[۱]

ایک روز کا واقعہ ہے کہ جونپور کے حاکم نے ان کی دعوتِ افطار کی۔ لیکن جب کھانا ان کے سامنے آیا تو انھوں نے واپس کر دیا اور کہا کہ اس میں سے ناجائز پیسہ اور ظُلم کی بُو آتی ہے۔ چنانچہ جب دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا کہ گوشت میں جو ساگ ڈالا گیا تھا وہ واقعتاً بغیر قیمت کے لایا گیا تھا۔ ان کا وصال ۲۷ محرّم ۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء میں ہُوا اور ان کا مزار مخدوم آفتاب ہندؒ کے روضہ کے احاطہ میں سیّد قطب الدّین ابوالغیبؒ کے مزار کے ساتھ مغرب کی طرف واقع ہے۔[۲]

مخدوم شیخ صدرالدین چراغِ ہندؒ

مخدوم چراغِ ہندؒ قریشی خاندان سے تھے۔ اُن کا شجرۂ نسب حضرت خواجہ حسن بصریؒ سے ملتا ہے۔[۳] ان کا وطنِ مالوف بصرہ تھا۔ اُن کے جدِامجد شیخ کمال الدین علی شاہ اُن کے

---

[۱] مناقب درویشیہ۔ تاریخ ظفرآباد ص ۵۷ [۲] ایضاً
[۳] تجلی نور جلد اوّل ص ۱۱

خاندان کے سب سے پہلے فرد تھے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ بصرہ سے ہجرت کر کے ملتان میں آباد ہوئے تھے[1]

اُن کی ولادت ۷۰۵ھ/۱۳۰۵ء میں ملتان میں ہوئی[2]۔ سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد انھوں نے سب سے پہلے علومِ ظاہری کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد اپنے خالہ زاد بھائی حضرت شیخ رُکن الدین ملتانیؒ کے مرید ہو گئے اور انہی سے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا[3]۔ ان دنوں جب صوبۂ اودھ کے مسلمانوں پر ہندوؤں کے ظلم و ستم کی خبریں ملتان پہنچیں تو شیخ رکن الدین ملتانیؒ نے ان کو چراغِ ہندؒ کا لقب دے کر مجاہدین کے ساتھ جہاد اور تبلیغ کے لیے ظفر آباد کے علاقے میں بھیجا[4]۔ اس علاقہ میں انھوں نے تبلیغِ اسلام کے لیے بڑا کام کیا۔ ان کی چلّہ گاہوں کے نشانات اب تک مرزا پور، بنارس اور جونپور کے اضلاع میں موجود ہیں۔ جو اُن کی عبادت و ریاضت اور تبلیغِ اسلام کی کوششوں کے گواہ ہیں[5]۔ وہ اور اُن کے خلفاء اور مجاہدین اس علاقے کے دورِ اوّل کے اُن علماء و صوفیاء میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اِس علاقہ میں علمی و دینی کام کے لیے صحیح معنوں میں بنیادیں اُستوار کیں۔ وہ جہادِ ظفر آباد میں مجاہدین کے سردار تھے اور انھوں نے مخدوم آفتابِ ہندؒ اور شہزادہ ظفر خاں کے ساتھ مِل کر ہندوؤں کے مقابلہ میں شاندار فتوحات حاصل کیں[6]۔ انھوں نے راجہ ساکیت سنگھ کے ظلم و ستم اور شر و فساد کا قلع و قمع کر دیا۔ بعد ازاں راجہ ساکیت سنگھ مع اپنے ارکانِ حکومت کے مسلمان ہو گیا۔ اِس طرح ظفر آباد پر مسلمانوں کا مستقل طور پر قبضہ ہو گیا[7]۔ اس شاندار فتح و نصرت کے بعد وہ اپنے بہت سے خلفاء و مجاہدین کے ساتھ مستقل طور پر ظفر آباد ہی میں آباد ہو گئے اور باقی ماندہ زندگی درس و تدریس اور وعظ و تلقین میں گزار دی۔ ان کے حُسنِ کمال سے لاکھوں

---

[1] تجلّی نور جلد اوّل ص ۱۱ [2] ایضاً ص ۱۱ [3] ایضاً [4] ایضاً ص ۱۱-۱۲ [5] ایضاً ص ۱۱-۱۲
[6] ایضاً ص ۱۱-۱۲ [7] ایضاً ص ۱۲۔ تاریخ ظفر آباد۔ چراغِ نور
[8] ایضاً

بندگانِ خدا نے بے اندازہ فیوض حاصل کیے۔[۱]

مخدوم چراغِ ہند سلسلۂ سہروردیہ کے بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے۔ وہ جلالی طبیعت کے مالک تھے اور پانچ چھ مرید اکثر اُن کے ساتھ رہا کرتے تھے۔[۲] اپنی عُمر کے آخری حصّہ میں وہ ہمیشہ یادِ الٰہی میں مستغرق رہا کرتے اور سوائے ادائیگی نماز کے کوئی دُوسرا کام نہ کرتے۔[۳] علمی تبحر کے علاوہ حافظِ قرآن بھی تھے۔[۴] انھوں نے سات بار پیدل حج بھی کیا تھا۔ وہ ہمیشہ سیاہ لباس زیب تن رکھتے۔[۵] لوگ ان کو حاجی الحرمین کے خطاب سے بھی یاد کرتے تھے۔[۶]

تجلّیٔ نور میں ہے کہ ایک بار حضرت میر سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ ظفرآباد تشریف لائے۔ ان کا معمول تھا کہ جب وُہ تبلیغی دَوروں پر نکلتے تو اپنے ساتھ مریدین کے علاوہ گھوڑے، اُونٹ اور دُوسرا سامانِ ضرورت بھی رکھتے۔ چنانچہ ظفرآباد میں آکر انھوں نے جامع مسجد ظفر خاں میں ڈیرے جما دیے۔ مخدوم چراغِ ہندؒ کو جب یہ خبر ملی تو انھوں نے ان سے اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو مسجد سے دُور رکھنے کے لیے کہا لیکن وہ نہ مانے۔ اس پر دونوں میں بحث و مباحثہ شروع ہو گیا بلکہ معاملہ نزاع کی صورت اختیار کر گیا۔ بالآخر مخدوم چراغِ ہندؒ غصّہ کی حالت میں اپنے حجرۂ عبادت میں چلے گئے اور جب متوجہ بہ قلب ہوتے تو مسجد آگ کا ایک کرّہ بن گئی اور میر سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے تمام گھوڑے، اُونٹ اور ہاتھی گرمی سے بے تاب ہو گئے۔[۷] دریں اثناء حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم آپ کے سامنے جلوہ فرما ہوئے اور ان سے فرمایا "میری اولاد اِس قدر تو سزا کی مستحق نہ تھی۔" انھوں نے عرض کیا حضورؐ مجھے تو آپ کی شرع نے مجبور کیا تھا ــــ اس واقعہ

---

۱ A. Halim, J.A.S.P. Vol. VIII, No. 2, Dec. 1963, p. 107.

۲ تجلّیٔ نور جلد اوّل ص ۱۲۔ تاریخ ظفرآباد۔ چراغ نور

۳ تجلّیٔ نور ایضاً

۴ ایضاً ۵ ایضاً ۶ ایضاً

۷ ایضاً ص ۱۲-۱۳

کے بعد پچیر میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ واپس کچھوچھہ چلے گئے[۱]۔

تجلئ نور میں ہے کہ وہ بڑے دولت مند تھے۔ ان کے پاس تقریباً سات لاکھ سونے کی اشرفیاں تھیں۔ علاوہ ازیں اور بھی بہت سا مال و متاع تھا۔ ایک روز انھوں نے یہ سب کچھ فقراء و مساکین میں بانٹنا شروع کر دیا۔ ہر چند ان کے اعزہ اور خدام مال و متاع کو اس طرح بٹتے دیکھ کر مانع ہوئے مگر وہ اس کی تقسیم سے باز نہ آئے اور فرمایا کہ میرے جن بزرگوں نے اس مال کو جمع کیا تھا اُن پر دُنیا غالب تھی۔ لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ مال و دولت میری عبادت و ریاضت میں حائل نہ ہو جائے۔ اس کے دُور ہو جانے سے مجھے دِل جمعی حاصل ہوگی اور میں سکون و یکسوئی سے یادِ الٰہی میں مصروف ہو سکوں گا[۲]۔

ان کا وصال ۸ ذی قعد ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء میں ہوا[۳]۔ اور ان کا روضۂ اقدس ظفرآباد کے محلہ شیخزاڑہ میں ہے۔ جہاں ان کا عرس ہر سال ۹ ذی الحجہ کو منایا جاتا ہے[۴]۔

مخدوم چراغ ہندؒ کے خلفا

مخدوم چراغِ ہندؒ کے بیٹے، خلفاء اور مجاہدین بھی بڑے باکمال لوگ تھے۔ انھوں نے بھی جہاد ظفرآباد اور تبلیغ اسلام کے لیے بڑا کام کیا تھا اور وہ بھی فتح ظفرآباد کے بعد اس علاقہ میں آباد ہو کر اپنے سلسلہ کی رُشد و ہدایت کا کام کرتے رہے۔ مخدوم چراغِ ہندؒ کے فرزندِ ارجمند شیخ غلام رُکن الدین رُکن عالمؒ (المتوفی ۷۹۶ھ/۱۳۹۳ء[۵]) اور پوتے شیخ شمس الحق عرف بڈھنؒ اور ان کے مرید و خلیفہ مخدوم ملا قیام الدین سہروردی (المتوفی ۸۷۰ھ) جیسی ہستیاں اُن کے خلفائے کبار میں تھیں[۶]۔ یہ سب بڑے جید عالم اور ذی مرتبت

۱؎ تجلئ نور، جلد اوّل ص ۱۳ ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً لیکن خزینۃ الاصفیاء کے مصنف جلد دوم ص ۵ پہ ان کا سالِ وفات ۷۷۴ھ لکھتے ہیں۔
۴؎ تجلئ نور، ایضاً ۵؎ ایضاً ص ۱۸ - ۲۰
۶؎ ایضاً ص ۱۴ - ۱۵

بزرگ تھے۔ مخدوم چراغِ ہندؒ کے ایک اور صاحبزادے شاہ شہر اللہ سہروردیؒ بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے جو اُن کی بیوی سلطان غیاث الدین تغلق کی صاحبزادی کے بطن سے تھے[۱]۔ وہ علومِ ظاہری و باطنی کے جیّد عالم تھے اور انھوں نے بھی جہادِ ظفر آباد میں اپنے والد کے ساتھ شرکت کی تھی حضرت شہر اللہ کے صاحبزادے شیخ ابوالفتح سہروردیؒ بھی بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے[۲]۔ وہ زہد و تقویٰ میں بے مثال تھے اور صوفیانہ شرف سے صحیح طور پر واقف تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس قدر عبادات و ریاضاتِ شاقہ کیں کہ اُن کے جسم کی تمام ہڈیاں نظر آنے لگی تھیں وہ بھی اِس دور کے عظیم المرتبت بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اُن کے بے شمار مرید اور عقیدت مند تھے جو انھیں اپنے وقت کا غوث سمجھتے تھے[۳]۔ مخدوم چراغِ ہندؒ کے پرپوتے حضرت شیخ راجو قتالؒ بھی ایک نامور ہستی تھے[۴]۔ وہ دنیاوی معاملات سے قطعِ تعلق کرکے ہمیشہ عبادت و ریاضت میں مشغول رہا کرتے تھے۔ کتاب و سُنّت کے بڑے پابند تھے اور بڑے کامل و صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ اُن کا مزار مخدوم چراغِ ہندؒ کے روضہ کے گنبد کے نیچے شیخ شمس الحقؒ کے مزار کے پاس مغرب کی طرف واقع ہے[۵]۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے' فتح ظفر آباد کے بعد جب راجہ ساکیت سنگھ مشرّف بہ اِسلام ہُوا تو اس کے ساتھ اس کے بیشتر اعیانِ حکومت مسلمان ہو گئے تھے۔ اُن میں سے ایک اُس کا راجہ پنڈت بال دت تھا[۶] جو سنسکرت کا زبردست عالم تھا۔ اس کو ہندو شاستروں پر کامل عبور تھا۔ اس نے حضرت مخدوم آفتابِ ہندؒ کے ساتھ مقابلہ و مناظرہ کیا تھا۔ مگر شکست کھا کر مشرّف بہ اِسلام ہوا اور پھر ان کا مرید ہو گیا۔ وہ بعد میں بابا پنڈت بال دت

---

[۱] چراغِ نور ص ۱۲۳' مناقبِ غوثیہ (قلمی) جلد پنجم ص ۸۷
A. Halim J.A.S.P. Vol. VIII, No. 2, Dec. 1963, p. 107.

[۲] تذکرۂ غوثیہ ص ۸۸

[۳] ایضاً [۴] چراغِ نور ایضاً [۵] ایضاً [۶] تذکرۃ الصالحین ص ۱۵

جوگی سہروردیؒ کے نام سے مشہور ہوا۔[۱] اس کا مزار بھی مخدوم چراغِ ہندؒ کے روضہ کے احاطہ میں ہے[۲]۔ اسی طرح ایک دُوسرا پنڈت جسے پال تھا جو پہلے راجہ ساکیت سنگھ کا وزیر تھا۔[۳] اور شعبدہ بازی میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ وہ مُلّا قیام الدینؒ کے ساتھ مقابلہ و مناظرہ میں شکست کھا کر مشرف بہ اسلام ہوا۔[۴] وہ بھی بعد میں ان کا مرید ہو گیا اور باقی تمام زندگی انہی کی خدمت میں رہا۔ وہ خرقۂ خلافت کی نعمت سے بھی سرفراز ہوا اور باباجوگی جسے پال سہروردی کے نام سے مشہور ہوا۔[۵] راجہ ساکیت سنگھ کا ایک اور درباری پنڈت پال ناتھ بیر تھا جو اپنی شجاعت و بہادری کی بنا پر بڑا مشہور تھا۔[۶] اس نے مُلّا بہرام منطقیؒ کے سامنے مقابلہ و مناظرہ میں شکست کھائی اور مسلمان ہوا۔[۷] وہ مخدوم آفتابِ ہند کا مرید تھا اور بابا پال ناتھ بیرؒ کے نام سے مشہور ہوا۔[۸] ان مریدوں اور خلفاء کے علاوہ ان کے اور بھی بے شمار خلفاء اور مرید تھے۔ اُن میں سے بعض کے حالات آئندہ صفحات میں دیے جا رہے ہیں۔

شیخ شمس الحق عُرف بڈھنؒ

شیخ شمس الحقؒ مولانا غلام رُکن الدینؒ کے سب سے بڑے صاحبزادے اور مخدوم شیخ صدرالدین چراغِ ہندؒ کے پوتے تھے۔ ان کو علومِ ظاہری و باطنی پر پُورا عبور تھا۔ اور غالباً اپنے والدِ بزرگوار ہی کے مرید و خلیفہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے حضرت شاہ بدیع الدین مدارؒ سے بھی خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا اور ان کے خرمنِ کمال سے بھی سینکڑوں فیض یاب ہوتے تھے۔ ان کی تاریخ وصال تو معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ ان کا مزار بھی مخدوم چراغِ ہندؒ کے روضہ کے احاطہ میں اپنے والدِ بزرگوار کے مزار کے ساتھ مغرب کی طرف واقع ہے۔[۹]

---

[۱] تذکرۃ الصالحین ص ۱۵، چراغِ نور — [۲] تذکرۃ الصالحین، ایضاً
[۳] ایضاً ص ۱۵ — [۴] چراغِ نور — [۵] تذکرۃ الصالحین ص ۱۵ — [۶] ایضاً
[۷] چراغِ نور — [۸] تذکرۃ الصالحین ص ۱۵
[۹] چراغِ نور، تجلیات العارفین، تذکرہ غوثیہ۔

سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے جونپور میں اُن کی چلہ کشی کے لیے ایک حجرہ بنوایا تھا جو اب صدر ڈاکخانہ کے پچھلی طرف واقع ہے۔ وہاں ہر سال ۱۷ جمادی الاول کو میلہ لگتا ہے۔ اسی حجرہ کے ساتھ سلسلۂ مداریہ کے چند بزرگوں کے مزارات بھی مرجعِ خلائق ہیں۔[۱]

باباعبدالرحمٰن سہروردیؒ

باباعبدالرحمٰنؒ حضرت مخدوم چراغِ ہندؒ کے مرید و خلیفہ تھے اور انہی کے ساتھ ظفرآباد آئے تھے۔ مخدوم ان کی بڑی عزت و احترام کرتے اور فرمایا کرتے تھے کہ عبدالرحمٰنؒ میرا ولی عہد ہے۔[۲] وہ تمام عمر مجرّد رہے اور ساری زندگی عبادت و ریاضت میں گزار دی۔[۳] ان کو گڑ اور بھنے ہوئے چنے بہت پسند تھے۔ چنانچہ اب بھی لوگ ان کی فاتحہ گڑ اور بھنے ہوئے چنوں پر کرتے ہیں۔[۴] ان کا مزار مخدومؒ کے روضہ کے احاطہ کی دکھنی دیوار کے ساتھ ہے۔[۵]

شاہ سمن سہروردیؒ

شاہ سمن سہروردیؒ بھی مخدوم چراغِ ہندؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے۔[۶] وہ پہلے برہمن تھے اور بعد میں مشرف بہ اسلام ہوتے تھے۔[۷] ان کے مسلمان ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ ایک بار جب مخدوم چراغِ ہندؒ تبلیغِ اسلام کے لیے بہار گئے تو راستے میں ہندوؤں کے ایک گاؤں سے گزرے۔ وہاں ان کو ایک برہمن ملا جو بے اولاد تھا۔ اس نے ان سے اولاد

۱؎ چراغِ نور۔ تجلیات العارفین۔ تذکرہ غوثیہ۔ ۲؎ تجلیات العارفین ۳؎ ایضاً ۴؎ ایضاً
۵؎ ایضاً
۶؎ مناقب درویشیہ۔ تاریخ ظفرآباد
۷؎ ایضاً

کے لیے دعا کی درخواست کی۔ انھوں نے اسے ایک نقش لکھ کر دیا اور فرمایا کہ تمھارے گھر یکے بعد دیگرے سات بیٹے پیدا ہوں گے اور اُن میں سے سب سے بڑا بیٹا ہمیں دینا۔ وہ برہمن اس بات پر راضی ہو گیا اور حضرت وہاں سے اپنی منزلِ مقصود کو چل دیے۔ برہمن کو اِس واقعہ کے بعد اللہ تعالےٰ نے سات بیٹے عطا کیے جن میں سے اس نے سب سے بڑے بیٹے کا نام سمن رکھا۔ کئی سال گزر جانے کے بعد جب مخدوم چراغِ ہندؒ دوبارہ اسی گاؤں گئے اور اس برہمن سے ملے تو اسے اپنا وعدہ یاد دلایا لیکن اس نے بیٹا دینے سے گریز کیا۔ اس پر انھوں نے فرمایا! اچھا اب میں جاتا ہوں اگر سمن میرا بیٹا ہوگا تو خود بخود میرے پیچھے چلا آئے گا۔ چنانچہ یونہی ہوا۔ ابھی وہ تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ سمن اپنے والدین کے روکنے کے باوجود ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ ظفرآباد لے آئے۔ جہاں اسے علومِ ظاہری و باطنی کی تعلیم دے کر اس کو اپنا مرید بنایا اور بعد میں اسے خرقۂ خلافت بھی عطا کیا۔ وہ اپنی عمر کا زیادہ حصّہ ظفرآباد ہی میں رہے۔ لیکن اپنے وصال سے کچھ عرصہ پہلے مخدوم چراغِ ہندؒ نے ان کو سید پور بھیتری کی ولایت عنایت فرمائی جہاں وہ باقی تمام عمر وعظ و تلقین کرتے رہے اور اُن کا وصال بھی وہیں ہوا۔[1]

ہر سال جیٹھ کے مہینہ میں اُن کا عرس منایا جاتا ہے جو ایک ماہ تک رہتا ہے۔ کثیر التعداد ہندو مسلمان اس میں شریک ہوتے ہیں۔[2] ان کے روضے پر سینکڑوں کبوتر ہر وقت جمع رہتے ہیں۔[3]

---

[1] مناقب درویشیہ۔ تاریخ ظفرآباد
[2] ایضاً [3] ایضاً

سیّد ضیاءالدین محمّد سہروردیؒ

ضیاءالدین محمد سہروردیؒ کی ابتدائی زندگی کے حالات کسی تذکرہ و تاریخ کی کتاب میں نہیں ملتے۔ وہ بڑے متّقی و پرہیزگار تھے اور اتّباعِ سنت کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ ہر وقت ذکر و اذکار اور اشغالِ باطنیہ میں محو رہتے۔ ان کی خانقاہ میں ہر روز لنگر جاری رہتا اور سینکڑوں مسافر اور مساکین کھانا کھاتے۔ لاتعداد طالبانِ حق نے ان کے خرمنِ کمال سے رُوحانی فیوض حاصل کیے۔[۱]

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ان کی مجلس میں مسئلہ توحید پر بحث شروع ہوگئی۔ یہ سردیوں کا موسم تھا اور قریب ہی آگ جل رہی تھی۔ حضرت مجلس سے اُٹھے اور کچھ دیر کے لیے اِس آگ پر جا کر بیٹھ گئے لیکن اُن پر آگ کا کوئی اثر نہ ہوا جس سے لوگ بہت حیران ہوئے۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ "توحید کے لیے حال چاہیے نہ کہ قال، جب انسان پر حال غالب آجاتا ہے تو آگ، پانی، ہوا، خاک، سانپ، بچھو یا کوئی اور چیز اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتی بلکہ ہر چیز اس کی مطیع و فرمانبردار ہو جاتی ہے۔"[۲]

ایک دفعہ کسی شخص نے چوری کا مال ان کی نذر کیا۔ انھوں نے اسے فوراً کہا کہ "چوری کا مال اور فقیروں کی نذر۔" وہ شخص یہ سُنتے ہی خوفزدہ ہو کر بے ہوش ہوگیا اور ہوش آتے ہی اُن کا مرید ہو گیا۔ اُن کا وصال ۱۸ صفر ۹۲۱ھ/۱۵۱۵ء کو ہوا اور ان کا مزار بھی مخدوم چراغِ ہندؒ کے احاطہ میں ہے۔[۳]

اُن کے صاحبزادے سیّد غیاث الدین ابو محمّد درویش کلاںؒ بھی بڑے عالی مرتبہ بزرگ تھے[۴] اور اُن کے وصال کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ وہ آپ ہی کے مرید و خلیفہ تھے۔

---

[۱] مناقبِ درویشیہ [۲] ایضاً [۳] ایضاً تاریخ ظفر آباد
[۴] چراغِ نور

دن رات اشغالِ باطنیہ میں مصروف رہتے اور انھوں نے ساری زندگی ریاضات و عبادات میں گزار دی۔ وہ بڑے صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ سینکڑوں نے اُن سے روحانی فیض حاصل کیا[1]۔ وہ مخدوم جلال الحق قاضی خاں ناصحیؒ کے ہم مکتب اور ہم عصر تھے۔ ان دونوں کی میر علی عاشقاں سرائے میریؒ اور مخدوم ادھن جونپوریؒ سے بڑی گہری دوستی تھی[2]۔

سید غیاث الدین کا معمول تھا کہ وہ خود تو جَو کی رُوکھی روٹی کھاکر گزارہ کرتے مگر غربار اور مساکین کو دونوں وقت اپنے لنگر میں پکا ہوا کھانا اپنے ہاتھوں سے تقسیم کرتے۔ ان کا وصال ۲۹ ذی الحجہ ۹۴۴ھ/ ۱۵۳۷ء کو ہُوا اور اُن کا مزار مخدوم آفتابِ ہندؒ کے روضہ کے احاطہ میں اُن کے مزار سے جنوب کی طرف دس قدم کے فاصلہ پر ہے[3]۔

شیخ درویش کلاںؒ کے ایک صاحبزادے شیخ حبیب اللہ سہروردیؒ تھے جو بڑے شاہانہ مزاج کے درویش تھے۔ ان کے ہاں ہر وقت نوکر چاکر سواری یا پالکی موجود رہتی۔ وہ اپنے والدِ بزرگوار ہی کے مرید و خلیفہ تھے اور علومِ ظاہری و باطنی کے جید عالم تھے۔ اُن کے دروازہ پر اکثر عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا۔ بڑے خوشحال تھے اور صبح و شام لنگر جاری رکھتے خُود تو ہمیشہ جَو کی روٹی کھاتے مگر فقراء اور مساکین کو قسم قسم کے کھانے کھلاتے اور دن رات یادِ الٰہی میں محو رہتے۔ ان کا وصال عینِ جوانی میں ۹۱۵ھ/۱۵۰۹ء ہُوا اور ان کا مزار مخدوم آفتابِ ہندؒ کے روضہ کے احاطہ میں ان کے والدِ بزرگوار کے مزار کی پائینتی میں ہے[4]۔

---

[1] مناقبِ درویشیہ۔ تاریخ ظفر آباد ص ۶۰ [2] تجلّی نور جلد اوّل ص ۱۷
[3] مناقبِ درویشیہ۔ تاریخ ظفر آباد [4] چراغِ نور

باب ۳ سوم

سہروردیہ مشائخ جونپور

خواجہ سید صدر جہاں اجملؒ

خواجہ سید صدر جہاں اجملؒ جونپور کے بڑے برگزیدہ مشائخ میں شمار ہوتے تھے۔ وہ علومِ شریعت و طریقت کے متبحر عالم تھے اور دُنیائے تصوّف میں حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے مرید و خلیفہ تھے[۱]۔ وہ زُہد و ورع میں بے مثال تھے اور اپنا زیادہ تر وقت عبادت و ریاضت میں گزارتے تھے[۲]۔

کچھ عرصہ اُنھوں نے ملکی سیاسیات میں بھی حصّہ لیا۔ سلطان ابراہیم شاہ شرقی ان کی سیاسی بصیرت کا بڑا مدّاح تھا اور اس نے ان کو عہدۂ وزارت پر بھی فائز کیا تھا مگر وہ جلد ہی مستعفی ہو گئے[۳]۔ سلطان ابراہیم شاہ کو اُن سے واقعتہً بے حد عقیدت تھی اور اس نے اُن کی سہولت کے لیے دریائے گومتی کے کنارے محلّہ سپاہ میں ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر کروائی تھی۔ یہ مسجد شرقی فنِ تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ مانی جاتی ہے[۴]۔ سلطان ابراہیم شاہ کا ایک بیٹا بھی ان کا مرید تھا اور جب وہ فوت ہُوا تو اُن کی خانقاہ کے پاس ہی دفن ہُوا وہاں اس کا بلند گنبد مقبرہ اور ایک بارہ دری اب تک موجود ہے[۵]۔ جو شاہ و گدا کی محبت و عقیدت کا ایک عمدہ ثبوت ہے۔

---

[۱] ریاض الاولیاء (قلمی) ورق ۱۳۶ا، تجلّی نور جلد اوّل ص ۵۰ [۲] ایضاً

[۳] ریاض الاولیاء ایضاً [۴] تجلّی نور ایضاً۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب
The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History, pp. 134-36.

[۵] تجلّی نور ایضاً

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ ایک بار خواجہ سید صدر جہاں اجملؒ اور قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ میں "سید" اور "عالم" کی برتری پر بحث چھڑ گئی۔ قاضی صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ایک عالم کو ایک سید پر فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ بعد میں انھوں نے اس موضوع پر ایک رسالہ بھی لکھا جس میں انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت کر دی۔ خواجہ صاحب کو یہ بات ناگوار گذری اور وہ اُن کے ساتھ ناراض ہو گئے۔ اِس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ایک رات قاضی صاحب نے خواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ ان سے ناراض ہیں اور خواجہ صاحب کی ناراضی کو دُور کرنے کا اشارہ فرما رہے ہیں۔ صبح جب اُن کی آنکھ کھلی تو وہ بھاگتے ہوئے اُن کے پاس پہنچے اور اپنے کیے پر ندامت کا اظہار کیا اور ان سے معافی مانگی اور جو رسالہ لکھا تھا اس کو بھی دریا بُرد کر دیا۔ بلکہ اس کے بعد انھوں نے ایک اور رسالہ مناقبِ سادات کے نام سے لکھا اور اُس میں انھوں نے اہلِ بیت کی مدح سرائی کی اور یہ ثابت کیا کہ حضورؐ کے خاندان کے لوگ علماء پر فوقیت رکھتے ہیں اور ان کی عزت و احترام لازمی ہے۔[1]

مولوی خیر الدین محمد لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب بڑے حسین و جمیل ہوتے تھے اور جوانی میں اپنے سر کے بال لمبے رکھا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے عشاق انھیں دیکھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ایک روز جب وہ صبح کے وقت اُٹھے تو دیکھا کہ بالوں میں خوشبودار تیل لگا ہوا ہے اِس لیے انھیں گمان ہوا کہ یہ کام اُن کے سوتے میں کوئی عقیدت مند عورت کر گئی ہے چنانچہ انھوں نے فوراً حجام کو بلوایا اور سر کے بال مونڈ دینے کو کہا۔[2] ابھی حجام نے تھوڑے ہی بال کاٹے تھے کہ خواجہ ابوالفتح سوبزلیس جونپوریؒ دوڑے ہوئے آئے اور عرض کیا کہ یہ آپ

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۶۔ ریاض الاولیاء (قلمی) ورق ۱۳۶ الف۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۹۱

[2] جونپور نامہ ص ۸۶ - ۸۸۔ تجلی نور جلد اوّل ص ۵۰

کیا کرتے ہیں جب کہ حضورؐ[1] وہاں یہ فرمارہے ہیں کہ اس کام سے باز آؤ۔ خواجہ صاحب یہ سنتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور پوچھا کہ حضورؐ[1] کہاں تشریف رکھتے ہیں، وہ جگہ مجھے دکھاؤ۔ چنانچہ جب دونوں اس جگہ پہنچے تو وہاں حضورؐ کے قدموں کے نشان پاتے۔ اس کے بعد دونوں نے ازراہِ عقیدت اس جگہ پر ایک چھوٹا سا حجرہ بنوادیا اور بعد میں اس کے ساتھ ایک چبوترا اور مسجد بھی تعمیر کروادی[1]۔ یہ مسجد شہر جونپور میں اب بھی موجود ہے اور مسجد قدم رسولؐ کے نام سے مشہور ہے[2]۔

خواجہ صاحب کے دامنِ کمال سے سینکڑوں نے رُوحانی فیوض حاصل کیے۔ اُن کے خلفا میں سے ایک شیخ سعداللہ کندوری فراز لکھنویؒ مشہور بزرگ گزرے ہیں جنھوں نے سلسلۂ چشتیہ میں خرقۂ خلافت اپنے والدِ بزرگوار شیخ سماء الدین لکھنویؒ سے حاصل کیا اور سلسلۂ سہروردیہ میں خرقۂ خلافت خواجہ صاحب سے پایا تھا[3]۔

خواجہ صاحب کی تاریخ وصال معلوم نہیں ہوسکی۔ ان کا مزار محلہ سپاہ میں ہے۔ وہیں اُن کی خانقاہ بھی ہوا کرتی تھی[4]۔

مخدوم شیخ رُکن الدین سہروردیؒ

مخدوم شیخ رُکن الدینؒ حضرت خواجہ عبداللہ انصاریؒ کے خاندان سے تھے[5]۔ ان کے والدِ بزرگوار مخدوم صدرالدین ہجرت کرکے ہندوستان آئے اور دہلی میں آباد ہوتے تھے[6]۔ مخدوم رُکن الدینؒ کی جائے پیدائش اور تاریخِ پیدائش کا حوالہ کسی تذکرہ و تاریخ کی کتاب میں نہیں ملتا لیکن زیادہ قیاس یہی ہے کہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے مگر جب دہلی پر امیر تیمور کے

---

[1] جونپور نامہ ص ۸۶ - ۸۸ - تجلّیٔ نور جلد اوّل ص ۵۰ [2] ایضاً
[3] تذکرہ علمائے ہند ص ۷۲ [4] تجلّیٔ نور ایضاً
[5] ایضاً ص ۳۲ [6] ایضاً

حملہ کی خبر عام ہوئی تو وہ دہلی سے ہجرت کر کے جونپور چلے آئے۔[1] وہ سلسلۂ سہروردیہ میں حضرت بابو تاج الدینؒ کے مرید و خلیفہ تھے اور انھیں حضرت مخدوم جہانیاںؒ سے بھی بڑا روحانی فیض حاصل تھا۔[2]

وہ ہر وقت عشقِ حقیقی میں جذب رہتے اور دنیا کی ہر چیز سے محترز رہتے۔[3] تجلی نور کے مصنف لکھتے ہیں کہ انھوں نے کئی بار اپنے گھر کا تمام سامان فقراء میں بانٹ دیا تھا۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ چند قلندر اُن کے ہاں آئے اور پوچھا کہ سُنا ہے آج آپ نے اپنا سارا گھر فقراء میں لٹا دیا ہے؟ مگر ہمیں بھی تو کچھ عنایت فرمائیں۔ جب گھر میں ان کے لیے کچھ نہ ملا تو انھوں نے اپنے بیٹے شیخ جلال ہی کو اٹھا کر اُن کے حوالے کر دیا اور کہا کہ اس کو فروخت کر کے اپنی ضروریات پُوری کر لیں۔ یہ خبر جب شرقی وزیرِ سلطنت عماد الملک قاسمی خاں کو پہنچی تو وہ بھاگے ہُوئے آئے اور قلندروں کو پانچ سو تنگے دے کر شیخ جلال کو واپس لے لیا اور گھر لے جا کر اپنی بیٹی کی نسبت اس سے ٹھہرا دی۔[4] مخدوم مال و دولت سے بڑی نفرت کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز ان کے پاس فتوح و نذرانہ کے ایک لاکھ تنگے جمع ہو گئے۔ انھوں نے وہ تمام رقم اسی وقت فقراء و مساکین میں بانٹ دی یہاں تک کہ اگلے روز کی ضروریات کے لیے بھی کچھ پاس نہ رکھا۔[5]

مخدوم بڑے صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ ایک بار فاطمہ نام کی ایک عورت کا ایک بارہ سالہ بیٹا فتح خاں بہت سخت بیمار ہو گیا اور اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ عورت بچے کو لے کر روتی پیٹتی ان کے پاس آئی۔ انھوں نے اس لڑکے پہ اسمِ پاک کا دم کیا اور اس کے لیے دُعائے خیر کی اور لڑکا اسی وقت تندرست ہو گیا۔[6]

---

[1] تجلی نور جلد اول ص ۳۲ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً
[6] ایضاً ص ۳۳

ان کے مرید جب ان کی زیارت کے لیے جاتے تو سجدہ کرتے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ ان دنوں جونپور کے قاضی القضاۃ تھے اور اسی وجہ سے ان سے ناراض رہتے چنانچہ انھوں نے ایک روز اپنے طلبہ کی ایک جماعت شیخ عادل کی سرکردگی میں اُن کے پاس بھیجی تاکہ وہ مسائل توحید اور ادائے سجدہ کے متعلق معلومات حاصل کریں اور ساتھ یہ بھی کہلا بھیجا کہ اگر مخدوم تسلی بخش جواب نہ دے سکیں تو انھیں شہر بدر کر دیا جائے لیکن شیخ عادل جب اُن کے پاس پہنچے تو ان کو دیکھتے ہی اُن پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی اور جو کچھ ان کے ذہن میں تھا وہ سب کچھ بھول گئے اور اسی وقت اُن کے مرید ہو گئے[۱]۔ اس صورتِ حال کا جب قاضی صاحب کو پتہ چلا تو وہ بڑے برہم ہوئے اور نصرت خاں کو توال کو حکم دیا کہ وہ جا کر مخدوم کو اُن کے مکان سے بے دخل کر کے شہر بدر کر دیں۔ لیکن کوتوال بھی ان کی خانقاہ میں پہنچتے ہی ان کا مرید ہو گیا[۲] بلکہ واپس آ کر اس نے سلطان ابراہیم شاہ سے یہ عرض کیا کہ ان کی سلطنت کی فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ وہ مخدوم کی طرف سے خاطر جمع رکھیں اور اس معاملہ میں تفرقہ پیدا نہ کریں کیونکہ فقراء کی مزاحمت کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ سلطان ابراہیم شاہ کو جب ان کی روحانیت کا علم ہوا تو وہ بھی ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا[۳]۔

مخدوم نے سینکڑوں کو راہِ حق پر گامزن کیا۔ ان کے بے شمار خلفاء تھے۔ جن میں سے مخدوم شیخ منکنؒ اور شیخ تاجؒ جو پٹنہ میں مدفون ہیں۔ بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے[۴]۔ ان کا وصال ۱۳ جمادی الثانی ۸۷۴ھ/۱۴۶۹ء میں ہوا[۵] اور ان کا مزار دریائے گومتی کے کنارے جونپور کے محلہ تاڑتلہ میں ہے[۶]۔

---

[۱] تجلی نور جلد اوّل ص ۳۲

[۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] ایضاً [۵] ایضاً [۶] ایضاً

مخدوم شیخ جہانگیر سہروردیؒ

مخدوم شیخ جہانگیرؒ مخدوم شیخ رکن الدین سہروردیؒ کے منجھلے بیٹے تھے اور انہی کے مرید و خلیفہ تھے[۱]۔ جب وہ وصال فرما گئے تو ان کی جگہ سب سے بڑے بیٹے شاہ جلالؒ سجادہ نشین ہوئے[۲]۔ انھوں نے جونپور میں ایک پختہ مسجد، ایک حجرہ اور اس کے ساتھ ایک خانقاہ بھی بنوائی تھی[۳]۔ ان کے والد بزرگوار شیخ رکن الدینؒ کا مزار بھی اسی خانقاہ کے صحن میں ہے[۴]۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کی روایات کو بارہ تیرہ سال تک جاری رکھا اور سینکڑوں کو روحانی فیض بخشا[۵]۔ لیکن اُن کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ چھوٹی عمر میں ہی ۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء میں وصال کر گئے[۶]۔ ان کی جگہ پھر مخدوم شیخ جہانگیر سجادہ نشین ہوئے[۷]۔

مخدوم شیخ جہانگیر بڑے صاحب ارشاد اور عالی مرتبت بزرگ تھے اور انھوں نے تمام زندگی اپنے سلسلہ کی تبلیغ و استواری میں صرف کر دی۔ وہ بہت ہی نیک طبع انسان تھے اور ہمیشہ ریاضت و عبادت اور مراقبہ میں مشغول رہتے تھے۔ اُن کا شمار سہروردیہ سلسلہ کے بڑے ذی مرتبت بزرگوں میں کیا جاتا ہے[۸]۔

سلطان حسین شاہ شرقی کو اُن کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور وہ اکثر ان کی زیارت اور خدمت کے لیے حاضر ہوتا رہتا تھا[۹]۔ وہ بہت تنہائی پسند تھے اور کبھی کسی مجلس میں شرکت کے لیے نہ جاتے۔ وہ اپنی خانقاہ سے صرف ایک بار باہر نکلے تھے اور وہ بھی حضرت شیخ عیسٰی تاج چشتیؒ کی رسم تجہیز و تکفین کے لیے گئے تھے[۱۰]۔ ان کا وصال ۲۲ شوال ۹۱۵ھ/۱۵۰۹ء میں ہوا اور ان کا مزار مخدوم شیخ رکن الدینؒ کے مزار کے دائیں طرف واقع ہے[۱۱]۔ ان کے بیٹے مخدوم شاہ کبیر سہروردیؒ بھی بلند پایہ عالم و صوفی تھے[۱۲]۔

---

[۱] تا [۸] تجلی نور جلد اول ص ۳۴

[۹] ایضاً ص ۳۴-۳۵   [۱۲] ایضاً ص ۳۵-۳۷

مخدوم شیخ محمد جونپوری رح

مخدوم شیخ محمد حضرت فاروق رض کی نسل سے تھے۔ ان کے والدِ بزرگوار مخدوم خضر حضرت شیخ رکن الدین رح ملتانی کے عالی مرتبت مرید و خلیفہ تھے۔ ان کی ولادت دھلی میں ہوئی اور وہیں تعلیم و تربیت پائی[1]۔ وہ اپنے والدِ بزرگوار کے مرید ہوئے اور انھی سے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا۔ انھوں نے بے حد عبادت و ریاضت کی اور اپنے دَور کے قطب مانے جاتے تھے۔ لوگوں میں بے حد مقبول تھے اور دھلی کے اس دور کے بلند پایہ بزرگوں میں شمار ہوتے تھے[2]۔

جب امیر تیمور نے دھلی پر حملہ کیا تو وہ بھی اپنے اھل وعیال کے ساتھ ہجرت کر کے جونپور پہنچے اور وہاں انھوں نے محلہ سپاہ کے قریب ایک ویرانہ میں ایک درخت کے نیچے ڈیرے لگا دیے[3]۔ وہاں اس حال میں اُن کو کئی ماہ گزر گئے۔ یہاں تک کہ موسم گرما شروع ہو گیا۔ دریں اثناء کوئی بارش نہ ہوئی جس کی وجہ سے تمام خلقت بڑی پریشان تھی۔ سلطان ابراھیم شاہ شرقی بھی اس صورتِ حال سے بہت پریشان اور متفکر تھا۔ اس نے اس صورتِ حال کا ذکر شیخ المشائخ قاضی نصیر الدین گنبدیؒ سے کیا۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ ہمارے خیال میں اللہ میاں کے پیارے لوگوں میں سے کوئی شخص بے گھر ہے اور کسی درخت کے نیچے ڈیرہ ڈالے بسر اوقات کر رہا ہے۔ بارش بھی اسی وجہ سے نہیں ہو رہی ہے کہ کہیں وہ مزید پریشان نہ ہو جائے[4]۔ سلطان ابراھیم اس راز سے واقف ہوا تو اس نے اس اللہ کے پیارے کی تلاش کے لیے اپنے ملازمین کو بھیجا۔ بالآخر معلوم ہوا کہ

---

[1] تجلی نور جلد اوّل ص ۴۶ [2] ایضاً [3] ایضاً
[4] ایضاً ص ۴۶ - ۴۷

واقعی ایک درویش اپنے اہل و عیال کے ساتھ ایک ویرانہ میں درخت کے نیچے ڈیرہ ڈالے بیٹھے ہیں اور ان کی شخصیت سے ہی اُن کی روحانیت ہویدا ہے۔[۱]

سلطان ابراہیم شرقی یہ خبر سُن کر خود اُن کے پاس پہنچا اور اُن کو رہائش کے لیے گھاس پھوس کا ایک مکان بنوا کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جونہی انھوں نے اس مکان میں قدم رکھا رحمتِ حق جوش میں آگئی اور اِس قدر بارش ہوئی کہ تمام دُنیا سیراب ہوگئی۔ سلطان ابراہیم شاہ بھی بے حد خوش ہوا اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجا لایا۔ اِس واقعہ کا علم جب لوگوں کو ہوا تو بے شمار خلقت ان کی گرویدہ ہوگئی۔[۲]

تجلیٔ نور میں ہے کہ اہیرن نام کی ایک ہندو عورت ان سے غائبانہ طور پر بڑی عقیدت رکھتی تھی اور ہر روز ان کے لیے گائے کا دُودھ لے کر آیا کرتی تھی۔ ایک مُدت تک اس کا یہی معمول رہا۔ لیکن پھر وہ بیمار ہو کر فوت ہوگئی۔ جب نوبت کفن دفن تک پہنچی تو لوگوں میں جھگڑا پیدا ہو گیا۔ بالآخر معاملہ قاضیٔ شہر کے پاس پہنچا۔ قاضی صاحب نے شیخ صاحب سے پُوچھا تو انھوں نے بتایا کہ مرحومہ نے اسلام قبول کیا ہوا تھا اور اب ایسی صُورتِ حال میں یہی بہتر ہے کہ وہ خُود لوگوں کے سامنے اِقرار کرے۔ چنانچہ وہ اس کے جنازہ کے پاس گئے اور کہا کہ اگر تو صدقِ دل سے مسلمان ہوئی تھی تو کلمۂ شہادت پڑھ۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالٰے کے حکم سے اس عورت نے کفن سے سر باہر نکالا اور کلمۂ شہادت پڑھا اور پھر اپنا سر کفن کے اندر کر لیا۔ (وَاللہُ اعلم بالصواب) اس کے بعد اسے دفن کر دیا گیا۔[۳] وہ بڑے خوارقِ عادات بزرگ تھے اور انھوں نے سینکڑوں کو رُوحانی فیض بخشا تھا۔

---

[۱] تجلیٔ نور، جلد اوّل ص ۴۶-۴۷ [۲] ایضاً ص ۴۷

[۳] ایضاً ص ۴۷-۴۸

ان کا وصال ۳ جمادی الاوّل ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء میں ہوا اور ان کا مزار جونپور کے محلہ سپاہ میں حضرت خواجہ ابوالفتح سوبزلیسؒ کے روضہ کے جنوب میں واقع ہے[1]۔

ان کی اولاد ضلع اعظم گڑھ کے مواضع بہیرہ اور لوھرہ میں آباد ہوئی تھی اور اُن میں سے مخدوم شاہ اسماعیل بہردی اور مخدوم شاہ ابوالغوث گرم دیوان لوہرویؒ اپنے دور کے بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے اور اپنے وقت کے شیخ الشیوخ اور قطب مانے جاتے تھے[2]۔

---

[1] تجلی نور جلد اوّل ص ۴۸ [2] ایضاً ص ۴۸

باب چہارم

سہروردیہ سلسلہ کے دوسرے مشائخ

شاہ موسیٰ سلطانِ عاشقاں اودھیؒ

شیخ شاہ موسیٰؒ حضرت مخدوم شیخ صدرالدین چراغ ہندؒ کے مرید و خلیفہ تھے اور انہی کے ساتھ ظفرآباد جہاد کے سلسلہ میں پہنچے تھے۔ وہ بڑے عزلت پسند تھے۔ ہمیشہ عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے تھے۔ حضرت مخدوم چراغ ہندؒ نے ان کو خرقۂ خلافت عطا کرنے کے بعد انھیں ولایتِ اودھ عطا کی جہاں انھوں نے باقی ماندہ زندگی وعظ و تلقین میں بسر کی۔ ان کا معمول تھا کہ وہ عام طور پر ننگے سر رہتے اور اکثر وجد کی حالت میں پائے جاتے۔ وہ اپنے وقت کے قطب مانے جاتے تھے۔ ان کی خانقاہ میں سینکڑوں فقراء اور مساکین مقیم رہتے جن کے لیے ہر وقت لنگر جاری رہتا تھا۔[1]

شیخ پیارے حسام پوریؒ

شیخ پیارےؒ کا وطنِ مالوف گجرات تھا جہاں سے وہ علومِ باطنی کی تحصیل کے لیے ملتان پہنچے۔ وہاں ان کی ملاقات حضرت مخدوم چراغِ ہندؒ سے ہوئی اور ان کے مرید ہو گئے۔ پھر انہی کے ساتھ جہاد کے لیے ظفرآباد چلے آئے۔ جب جہاد سے فارغ ہو گئے تو ایک عرصے تک ریاضات و عبادات میں مشغول رہے اور بالآخر خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ اس

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی)

کے بعد ان کو مخدوم نے حسام پور ضلع بہرائچ میں وعظ و تلقین کے لیے بھیج دیا جہاں وہ باقی عمر وعظ و تلقین میں مصروف رہے۔ وہ بڑے عظیم المرتبت اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ ان کا وصال حسام پور میں ہوا جہاں ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔[1]

مخدوم شیخ اخی جمشید راجگیریؒ

مخدوم شیخ اخی جمشید راجگیریؒ قدوائی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔[2] ان کا شجرۂ نسب انبیاء بنی اسرائیل تک پہنچتا ہے۔ وہ دریاآباد کے قریب زہرا نام کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔[3] جب سن بلوغ کو پہنچے تو جذبۂ حقیقی نے کشش کی اور تمام دنیاوی معاملات سے بیزار ہو کر اوچ شریف پہنچے اور وہاں حضرت مخدوم سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاںؒ کے مرید ہو گئے۔[4] مخدوم ان کو محبت و شفقت سے اخی (میرے بھائی) کے نام سے پکارتے تھے۔ چنانچہ بعد میں وہ اسی نام سے مشہور ہو گئے۔[5] وہ مخدوم سے سالہاسال تک روحانی تربیت حاصل کرتے رہے اور جب منزل مقصود کو پہنچے تو خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ اس کے بعد حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے ان کو جونپور کا صاحب ولایت مقرر کیا۔ لیکن انھوں نے رہائش کے لیے قنوج کو پسند کیا۔ پھر بعد میں وہ وہاں سے خلقت کے جھگڑوں سے بیزار ہو کر دریائے گنگا کے کنارے موضع راجگیر میں آباد ہو گئے اور پھر تادمِ زیست وہیں ارشاد و تلقین میں مصروف رہے۔[6] ان کے دامنِ کمال سے سینکڑوں ہزاروں نے روحانی فیوض حاصل کیے۔

مخدوم اخیؒ اپنے روحانی کمالات کو لوگوں سے مخفی رکھا کرتے تھے لیکن بعض اوقات

---

۱ تجلیات العارفین (قلمی) ۲ مراۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۱ و ۳ ایضاً
۴ ایضاً خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۶۳ ۵ مراۃ الاسرار ایضاً۔ اخبار الاصفیا ورق ۲۲ ب
۶ مراۃ الاسرار ایضاً

ان سے خوارقِ عادات واقعات کے ظہور سے ان کی رُوحانی بلندی ظاہر ہو جاتی تھی جس کی بنا پر وہ بہت جلد لوگوں میں معروف و مقبول ہو گئے[1] بلکہ کئی سلاطینِ وقت بھی اُن کی آستاں بوسی اور زیارت کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک سلطان الشرق ملک سرور بھی تھے۔ جن کو ان سے بڑی عقیدت تھی اور فی الواقعہ انھوں نے اللہ تعالےٰ کی رحمت اور مخدوم کی دعاؤں ہی سے اِس قدر ترقّی کی اور سلطنت جونپور کے وارث ہوئے[2]

اُن کے پیر و مُرشد حضرت مخدوم جہانیاںؒ بھی اُن کے رُوحانی کمالات کے بڑے معترف و مدّاح تھے اور ان کی فلاح و ترقی کے لیے ہمیشہ دست بدعا رہتے۔[3] شیخ نظام الدین امیٹھوی جو اپنے وقت کے قطب اور اُن کے ہم عصر تھے۔ اپنی محفلوں میں ان کے رُوحانی کمالات کی بڑے جوش و خروش سے تعریف کرتے اور فرمایا کرتے کہ "شیخ سعد اللہ خیر آبادیؒ حالت داشت و شیخ اخی راجگیریؒ پردہ نہ داشت۔[4]"

مخدوم اخیؒ کو سماع کا بڑا شوق تھا۔ شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ مرآۃ الاسرار میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ ہولی کا تہوار منایا جا رہا تھا۔ اس موقعہ پر بعض خوبصورت ہندو لڑکے زیورات میں ملبوس، گاتے اور رقص کرتے ہوئے ان کے مکان کے پاس سے گزرتے۔ وہ بھی بے خود ہو کر اُن کے ساتھ شامل ہو گئے اور اُن کے ساتھ تین روز اور تین راتوں تک لگاتار شہر کی گلیوں میں ناچتے اور گاتے رہے۔ جب شہر قنوج اور اُس کے اطراف کے لوگوں کو یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ بھی اُن کے ساتھ شامل ہو گئے اور اِس طرح سارے شہر میں ناچ گانے کا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس صورت حال کو شہر قنوج کے قاضی مفتی اور راسخ العقیدہ لوگ برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے اس کے متعلق سلطان الشرق ملک سرور کو شکایت کی کہ، شیخ

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۱۵۴ ا [2] ایضاً
[3] ایضاً [4] ایضاً ورق ۱۵۴ ب

اخیؒ دائرۂ اسلام سے خارج ہو چکے ہیں اور شرعی سزا کے مستحق ہیں۔ لیکن سلطان الشرق نے قنوج کے علماء و شیوخ کے اس فتویٰ اور شکایت کو چنداں اہمیت نہ دی۔ اب لوگوں نے اس ساری صورتِ حال سے جونپور کے علماء کو آگاہ کیا اور انھوں نے بھی اُن سب سے اتفاق کیا[۱]۔ حضرت مخدوم اخیؒ کو جب اس ساری صورتِ حال کی خبر ہوئی تو انھوں نے سلطان الشرق ملک سرور کو ایک طویل خط لکھا اور اس میں سارے حالات و واقعات کی تشریح کر دی اور آخر پہ یہ بھی لکھا: "در زمین رقص کردہ شدہ است رقصِ ہوا را از اقبالِ شاہ آرزو دارم۔" (میں نے زمین پر تو رقص کر لیا ہے لیکن اب میری آرزو ہے کہ میں اقبالِ شاہی سے ہوا میں بھی رقص کروں) اور اس کے بعد یہ بھی لکھا کہ عشقِ حقیقی میں مرنا میری زندگی کا مدعا ہے۔ سلطان الشرق نے جب یہ خط پڑھا تو ان کے خلاف علماء کے فتویٰ اور فیصلہ کو رد کر دیا[۲]۔

مرآۃ الاسرار میں ہے کہ اس موقعہ پر میر سید احمد منجھلیؒ نے حضرت مخدوم اخیؒ کا بڑا ساتھ دیا[۳]۔ وہ ان دنوں قنوج کے علماء و اکابر کے صدر تھے اور علماء کے فتویٰ کو سب سے پہلے انھی نے رد کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے مخدومؒ کے خلاف آواز اٹھائی تھی ان کا بعد میں بڑا برا حشر ہوا اور وہ مختلف مصائب میں گرفتار ہو گئے تھے مگر مخدوم اخیؒ نے میر سید احمد منجھلیؒ اور اُن کی اولاد کے حق میں بڑی دعائیں کیں۔ اس لیے اللہ تعالےٰ کی رحمت اور ان کی دعاؤں سے اُن سب کو بڑی عزت و وقار ملا[۴]۔ میر سید احمد منجھلیؒ کو سلاطینِ وقت نے بڑی عزت و اعزاز بخشے۔ اُن کے نبیرہ میر سید صدر الدین قنوجیؒ کو بھی بڑی عزت و احترام ملا۔ وہ سلطان سکندر لودھی کے عہد میں علماء و اکابر کے صدر تھے اور سلطان سکندر لودھی اور سلطان ابراہیم

۱؎ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۲ ب ۲؎ ایضاً ورق ۴۵۳ ب ۴۵۴ ا۔ یہ خط مرآۃ الاسرار کے اوراق ۴۵۲ ب سے لے کر ۴۵۴ ا پر ہے۔

۳؎ ایضاً ورق ۴۵۲ ا

۴؎ ایضاً

لودھی دونوں ان کو اپنا دستِ راست سمجھتے تھے[1]۔ اس کے بعد ان کے بیٹے سید عبدالغفارؒ بھی بڑے اُونچے مراتب پر فائز رہے اور اُن کو دربارِ شاہی سے معاش کے لیے باون ہزار (۵۲) بیگھہ زمین منظور ہوئی جن کی تمام آمدنی وہ غربا، و مساکین اور محتاجوں میں صرف کر دیا کرتے تھے۔ وہ بعد میں قنوج کو چھوڑ کر قصبہ بھانی میں چلے گئے تھے[2]۔ اس خاندان کے معززین میں سے ایک میر سید صدر جہاں تھے جو میر سید صدر الدینؒ کے نبیرہ تھے۔ وہ بھی اپنے دادا بزرگوار کی طرح بڑے بلند درجات کو پہنچے۔ اور ظاہری و باطنی کمالات کی وجہ سے سارے ملک میں مشہور ہوئے۔ وہ اکبر بادشاہ اور جہانگیر کے عہد میں صاحب نوبت اور صدر الصدور کے عہدہ پر فائز رہے۔ انھیں دنیا کی تمام نعمتیں میسر تھیں اور انھوں نے اپنی زندگی میں خواص و عوام پر احسانات فرمائے تھے۔ ان کا وصال ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱ء میں ہوا اور اس کا روضہ اقدس بھانی میں مرجع خلائق ہے[3]۔ ان کے بعد ان کے فرزندِ ارجمند میر سید نظام الدینؒ کو شاہجہان نے بڑی عزت و مرتبہ دیا اور وہ مرتضٰے خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ وہ بھی اپنی سخاوت اور خدا ترسی کی وجہ سے بڑے معروف و مقبول تھے[4]۔ فی الحقیقت یہ مخدوم اخی کی دعاؤں کا ثمر تھا جو اس خاندان کے ہر فرد کو نصیب ہوا۔

مخدوم اخی تمام عمر مجرد رہے۔ انھوں نے اپنی بہن کے ایک لڑکے نورؒ ولد شیخ قیام الدینؒ کو اپنے بیٹے کی طرح تعلیم و تربیت دی اور وہی ان کے بعد سجادہ نشین ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو کئی بیٹے عطا کیے جن میں سے حضرت فتح اللہ راجگیریؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[5]۔ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے بزرگ تھے[6]۔

---

۱ مرآۃ الاسرار ورق ۴۵۲ و
۲ ایضاً ص ۴۵۲ و
۳ ایضاً ورق ۴۵۲ ب
۴ ایضاً
۵ ایضاً ورق ۴۵۴ و
۶ ایضاً

حضرت مخدوم اخیؒ کے شیخ حسام الدین فتح پوریؒ کے ساتھ بھی بڑے عمدہ مراسم تھے اور اُن دونوں میں خط و کتابت بھی رہی۔ مرآۃ الاسرار میں شیخ حسام الدین کا ایک ایسا خط درج ہے جس سے ان کی بزرگی و فروتنی کا علم ہوتا ہے[1]۔

مخدوم اخیؒ کا وصال بروز چہارشنبہ ۱۱ شوال ۸۰۱ھ/۱۳۹۸ء میں ہوا[2]۔ مگر صاحب تصنیف مرآۃ الاسرار کا خیال ہے کہ وہ سلطان ابراہیم شرقی کے عہدِ حکومت کے آخر تک حیات تھے[3]۔

میر سیّد علم الدّین بلاوٰنی سہروردیؒ

میر سیّد علم الدینؒ ترمذی سادات سے تھے۔ ان کے خاندان کے سب سے پہلے بزرگ جو سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۶-۱۳۱۶ء) کے عہد میں ہندوستان آئے وہ میر سیّد کمال ترمذیؒ تھے۔ وہ قصبہ کیتھل میں آباد ہوئے تھے[4]۔ اُن کے بیٹے میر سیّد علم الدینؒ کے اجداد میں سے تھے۔ جو کیتھل چھوڑ کر قنوج میں آباد ہو گئے تھے مگر ان کی اولاد بعد میں تین مختلف جگہوں پر آباد ہوئی تھی۔ میر سیّد علم الدین بلاوٰنیؒ کے چچا میر سیّد عبدالغفار اور میر سیّد صدر جہاں قنوج چھوڑ کر بہانی چلے گئے۔ میر سیّد علم الدین مخدوم اخی راجگیریؒ کے مشورہ سے بلاون پہنچے لیکن اس خاندان کے دوسرے افراد قنوج ہی میں رہے۔ میر سیّد شہاب الدین قنوجیؒ وغیرہ بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے[5]۔

میر سیّد علم الدینؒ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے اور اس دور کے عالی مرتبت بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ ہمیشہ لباس فاخرہ زیب تن کرتے اور اسی

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۶۱ الف ب

[2] خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۶۴

[3] مرآۃ الاسرار ورق ۴۶۵ ا

[4] ایضاً ورق ۵۰۱ ا خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۶۴

[5] مرآۃ الاسرار ایضاً ورق ۵۰۱ ب

حالت میں اپنے مسلک سلوک کا پرچار کرتے تھے۔ حضرت مخدوم اخی راجگیریؒ کے ساتھ ان کے بڑے عمدہ مراسم تھے اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے وہ اُن ہی کے مشورہ و ارشاد سے جونپور گئے جہاں سلطان ابراہیم شرقی نے ان کا بڑا شاندار استقبال کیا اور ان کو بلاوان کی جاگیر عطا کی[1]۔ یہ جاگیر ان کو ان کے اعلیٰ حسب و نسب کی بنا پر اور اس علاقے میں مسلمانوں کے تحفظ اور تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی غرض سے دی گئی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ یہ جاگیر دلانے میں مخدوم اخی راجگیری کے علاوہ اژدر خاں بدخشی کا بھی ہاتھ ہو۔ جو بہرلیہ کے جاگیردار تھے اور ترکوں کے کسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بدخشان کے رہنے والے تھے لیکن امیر تیمور کی تباہ کاریوں سے تنگ آکر جونپور چلے آتے تھے اور یہاں سلطان ابراہیم شرقی نے انھیں بہرلیہ کی جاگیر سے سرفراز کیا تھا۔ وہ سلطان ابراہیم کے درباریوں میں بھی شامل تھے اور اپنی شجاعت و جوانمردی کی وجہ سے مشہور تھے[2]۔ مرآۃ الاسرار اور مرآۃ مداریہ کے عالی مرتبت مصنف شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ بھی انھی کی اولاد میں سے تھے[3]۔ اژدر خاں اور میر سید علیم الدین بلاوانی سہروردیؒ کے آپس میں نہایت خوشگوار تعلقات تھے[4]۔ سلطان ابراہیم شرقی کی اسلام دوستی، رعایا پروری اور عمدہ طرزِ حکومت کی تاریخ ہند شاہد ہے۔ اُن کا قاعدہ تھا کہ اودھ کے جس علاقہ میں بھی ہندوؤں کی آبادی گنجان اور مسلمانوں کی آبادی کم دیکھتے وہاں مسلمان امراء و صلحاء کو جاگیریں اور مددِ معاش کے لیے عطیات عطا کرتے تاکہ وہ وہاں آباد ہو کر مسلمانوں کی مذہبی و ثقافتی آزادی برقرار رکھنے میں مدد دیں اور سلطنت میں امن و امان کے قیام کے ساتھ ساتھ اشاعتِ اسلام کا کام بھی ہوتا رہے[5]۔ اسی

---

[1] مرآۃ الاسرار ایضاً - ورق ۱۰۵ ب، خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۶۴
[2] مرآۃ الاسرار (قلمی) ایضاً ورق ۱۰۵ ب - بہرلیہ واقع پرگنہ، دریا آباد - اژدر خاں کا سلسلہ نسب سلطان سنجر سلجوقی سے ملتا ہے۔
[3] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۱۰۵ ب [4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً

طرح کے ایک جاگیردار ملک شمعون تھے جو سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے مرید تھے اور ان کو بھی شجاعت و بہادری کی بنا پر پرگنہ ردولی میں نکھنتہ کی جاگیر عطا ہوئی تھی تاکہ وہ وہاں آباد ہو کر مسلمانوں کا تحفظ کریں۔[1] میر سید علم الدینؒ کو بھی جاگیر اسی نقطۂ نظر کے تحت عطا ہوئی تھی۔ یہ جاگیر باون ہزار بیگھہ زمین پر مشتمل تھی اور پرگنہ سدھور میں واقع تھی۔[2]

میر سید علم الدینؒ کو ابھی پلاؤن میں رہتے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ وہاں کے ہندوؤں کے ایک گروہ نے ان کے خلاف سر اٹھایا اور وہاں ان کا جینا دوبھر کر دیا۔ انھوں نے اس صورتِ حالات کا ذکر مخدوم اخی راجگیریؒ سے کیا اور عرض کیا کہ وہ ہندوؤں کے اس فتنہ و فساد کو رفع کرنے کے لیے مدد فرمائیں۔ مخدوم اخیؒ یہ خبر سنتے ہی وہاں پہنچے اور ان کو مشورہ دیا کہ وہ وہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کر لیں۔[3] بلکہ انھوں نے اس کی تعمیر میں خود بھی خاطر خواہ مدد فرمائی۔[4] اس کے ساتھ یہ دعا بھی فرمائی کہ اس پلاؤن کے سادات تا قیامت سلامت رہیں۔ ان کی زبان مبارک سے اس وقت جو کچھ نکلا وہ حرف بحرف پورا ہوا۔ پلاؤن میں امن و امان قائم ہو گیا اور میر سید علم الدینؒ اور ان کے جانشین ہمیشہ وہاں آباد رہے۔[5]

میر سید علم الدینؒ اور میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ ہم عصر تھے اور دونوں کا وصال بھی ایک ہی سال ہوا۔[6] ان دونوں کی آپس میں بڑی محبت اور بڑے اچھے مراسم تھے۔ دونوں کی باہم خط و کتابت بھی رہی اور ان خطوط میں مذہبی و روحانی معاملات پر بحث و تشریح ہوتی تھی۔[7] میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا اس طرح کا ایک خط مرآۃ الاسرار میں بھی ہے جو انھوں نے ان کو لکھا تھا۔[8]

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۱ ب [2] ایضاً [3] ایضاً خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۶۴
[4] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۱ ب [5] ایضاً اوراق ۵۰۱ ب۔ ۵۰۲ الف
[6] خزینۃ الاصفیاء، جلد دوم ص ۶۴-۶۵ [7] مرآۃ الاسرار ایضاً ورق ۵۰۲ الف
[8] مرآۃ الاسرار ایضاً۔ یہ خط ورق ۵۰۲ الف۔ ب پر درج ہے۔

ان کا وصال ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں ہوا[1] اور ان کا روضۂ اقدس پلاون میں مرجع خلائق ہے کہا جاتا ہے کہ بدائوں (بدایوں) کے سادات آپ ہی کی اولاد ہیں[2]۔

شیخ سراج سوختہ کالپویؒ

شیخ سراج سوختہؒ حافظِ قرآن تھے اور وہ شیخ سراج حافظ قرآن کے لقب سے بھی مشہور تھے۔ وہ بڑی چھوٹی سی عمر میں حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے تھے۔ اور اُن کے بڑے بلند مرتبت خلفاء میں سے تھے[3]۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ ان پر بڑی شفقت و عنایت فرماتے رہے۔ اور ان کی جگہ سالہا سال تک انھوں نے امامت کے فرائض بھی ادا کیے۔ اس اعزاز کی وجہ سے دُوسرے کئی امام و علماء جو خُود بھی اس وقت کے بڑے بلند پایہ فقیہہ و محدث تھے وہ ان پر بڑا رشک کرتے تھے۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے ان کو بتایا کہ یہ سراج جب تک کعبہ شریف نہ دیکھ لیں تکبیر تحریمہ نہیں پڑھتے[4]۔ اس واقعہ سے اُن کی بزرگی و عظمت کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے لیکن ایسی چیزوں کو ہمیشہ لوگوں سے مخفی رکھتے[5]۔

شیخ عبدالحق محدث دھلویؒ لکھتے ہیں کہ جب ایک بار حضرت شاہ مدارؒ کالپی گئے تو بے شمار لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے اور انھیں وہاں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ قادر شاہ (۱۴۱۱-۳۲ء) والی کالپی کو جب یہ خبر ملی تو وہ بھی ان کی زیارت کے لیے پہنچے لیکن وہاں پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ وہ اس وقت کسی جوگی سے گفتگو میں مصروف ہیں۔ اس لیے ملاقات مشکل ہے۔ اس پر اس نے غصّے میں آکر ان کو یہ کہلوا بھیجا کہ وہ ہمارے شہر سے فوراً

۱؎ خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۶۵ لیکن بزمِ صوفیہ کے مصنف ص ۴۳۷ پر میر سیّد اشرف جہانگیرؒ کا سالِ وصال ۸۲۵ھ لکھتے ہیں ۲؎ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۱۰۵ ا
۳؎ اخبار الاخیار ص ۱۵۹ ۴؎ ایضاً ۵؎ ایضاً

نکل جائیں۔ چنانچہ حضرت شاہ مدارؒ نے وہاں سے اپنا ڈیرہ اُٹھایا اور دریا کے پار چلے گئے۔ اور وہاں سے قادر شاہ کے حق میں بد دعا کی جس سے اُس کے تمام بدن پر چھالے نکل آئے[1] اور وہ ان کی جلن اور تپش سے مرنے کے قریب ہوگیا[2]۔ بالآخر وہ اسی مصیبت و پریشانی سے نجات حاصل کرنے کے لیے شیخ سراجؒ کے پاس جا پہنچا۔ انھوں نے اس کو اسی وقت اپنا پیراہن خاص عطا کیا جسے پہنتے ہی اس کے بدن کے تمام چھالے ٹھنڈے پڑ گئے اور وہ رو بصحت ہوگیا[3]۔ جب اس کا علم شاہ مدارؒ کو ہوا تو انھوں نے غصے میں آکر کہا۔

"پس سراج چرا نہ سوخت" نتیجتہً اب شیخ سراج کے تمام بدن پر چھالے نکل آئے اور ان کی حرارت سے اب وہ جلنے لگے حتیٰ کہ وہ جاں بحق ہوگئے۔ اسی وجہ سے وہ سراج سوختہ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں[4]۔

ان کا وصال ۸۳۰ھ/۱۴۲۶ء میں ہوا اور ان کا روضہ شہر کالپی میں ہے[5]۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۵۹-۱۶۰ [2] ایضاً ص ۱۶۰ [3] ایضاً ص ۱۶۰۔ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۰ ب خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۶۹ [4] اخبار الاخیار۔ ایضاً۔ مرآۃ الاسرار ایضاً

[5] ایضاً ورق ۴۵۱ ا۔ خزینۃ الاصفیاء ایضاً۔

حصّہ چہارم

بابِ اوّل

چشتیہ سلسلہ

دسویں صدی میں بعض بزرگانِ دین نے خراسان کے ایک شہر چشت میں رُوحانی اصلاح و تربیت کے لیے ایک بہت بڑا مرکز قائم کیا۔ جس کو بڑی شہرت حاصل ہُوئی اور وہ نظام اس شہر کی نسبت سے چشتیہ سلسلہ کہلانے لگا۔[1] حضرت خواجہ اسحاق شامیؒ (المتوفّٰی ۳۲۹ھ / ۹۴۰ء) پہلے بزرگ ہیں جن کے اسمِ گرامی کے ساتھ تذکروں میں چشتی لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ شام کے رہنے والے تھے لیکن بغداد پہنچے تو حضرت خواجہ ممشاد علو دینوریؒ (المتوفّٰی ۲۹۸ھ/۹۱۰ء) کے مرید و خلیفہ ہو گئے۔[2] ان کے پیرو مُرشد نے انھیں تذکیر و ارشاد کے لیے چشت بھیجا جہاں ان کی پُرخلوص جدّ و جہد سے ایک عظیم الشان سلسلہ کی داغ بیل پڑی اور چشت بہت جلد ایک زبردست رُوحانی نظام کا مرکز بن گیا۔[3] دُوسرے سلسلوں کی طرح یہ سلسلہ بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ ہی سے شروع ہوتا ہے۔[4]

یہ صحیح ہے کہ حضرت خواجہ معین الدّین چشتیؒ سے قبل بھی کئی چشتی بزرگ ہندوستان تشریف لائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلہ کو ہند و پاکستان میں جاری کرنے کا شرف انھیں کو حاصل ہے۔ وہ پرتھوی راج کے عہد میں یہاں آئے اور انھوں نے اجمیر کو اپنا مرکز بنا کہ تبلیغ و اشاعت

---

[1] شجرۃ الانوار [2] سیر الاولیا۔ ص ۳۹-۴۰ [3] ایضاً ص ۴۰
[4] فتوح السلاطین ص ۷-۸

کا کام شروع کیا۔[1] یہاں انھیں اپنے مقصد میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ ان کے بہت سے خلفاء
تھے جن میں سے دو بزرگ حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت شیخ حمید الدین ناگوریؒ
خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شیخ حمید الدین ناگوریؒ (المتوفی ۱۲۷۳ء) نے ناگور میں قیام کیا اور
وہاں تبلیغ و اشاعتِ دین کا کام کرتے رہے۔[2] جبکہ شیخ قطب الدین بختیار کاکی (المتوفی ۱۲۳۵ء)
نے دہلی کو اپنا مرکز بنایا اور وہاں سے اشاعتِ اسلام کا کام شروع کیا اس وقت سلطان
شمس الدین التمش کا عہدِ حکومت تھا اور دہلی کی تعمیر و تشکیل پورے جوش و خروش کے ساتھ
کی جارہی تھی۔ وہاں وسطِ ایشیا سے منگولوں کی تباہ کاریوں سے بھاگے ہوئے ہزاروں
علماء و مشائخ، شعراء و اُدباء پہنچ رہے تھے[3] اور اس طرح دہلی کی حیثیت ایک بین الاقوامی
شہر کی بن گئی تھی۔ فی الواقعہ وہاں عالمِ اسلام کے گوشے گوشے سے لوگ آ آ کر پناہ گزین ہوتے
تھے[4]۔ اس لحاظ سے حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا وہاں قیام کرنا اس سلسلہ کی ترویج
و اشاعت کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔ انھوں نے ہر طبقہ کے لوگوں کو اپنے مسلک و
مشرب سے متاثر کیا۔ ان کے بے شمار خلفاء و مریدین تھے۔ مگر اس سلسلہ کی توسیع و اشاعت
کا کام صرف حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ اور حضرت شیخ بدر الدین غزنویؒ ہی نے انجام دیا[5]۔
متوخر الذکر بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے لیکن ان کا کام بابا فریدؒ کے مقابلے میں کم ہے۔ بابا
فریدؒ نے پہلے ہانسی اور پھر اجودھن میں آباد ہو کر اشاعت و تبلیغِ دین کا کام شروع کیا اور اُن
کے اثرات نہ صرف پنجاب بلکہ سارے شمالی ہندوستان میں
پہنچے[6]۔ ان کے خلفاء نے چشتیہ سلسلہ کی خانقاہیں ملک کے گوشے گوشے میں قائم کر دیں۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۴۵ [2] ایضاً ص ۱۵۶-۱۵۷
[3] طبقاتِ ناصری۔ منہاج السراج ص ۱۶۶ [4] فتوح السلاطین ص ۱۱۴-۱۱۵
[5] اُن کے حالاتِ زندگی کے لیے ملاحظہ ہو۔ فوائد الفواد۔ سیر الاولیاء۔ روضۃ الاقطاب اور مرآۃ الاسرار وغیرہ۔
[6] فوائد الفواد ص ۱۴۹

اُن میں سے شیخ جمال الدین ھانسوی، شیخ بدر الدین اسحاق، شیخ نظام الدین اولیاء، شیخ علی احمد صابر، اور شیخ عارف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[1]۔ ان بزرگوں میں سے درحقیقت شیخ نظام الدین اولیاء اور شیخ علی احمد صابر ہی نے اس سلسلہ کو چلایا۔ شیخ علی احمد صابر خود اس سلسلہ کی ترقی کے لیے کچھ نہ کر سکے[2]۔ لیکن اُن کے بعد اُن کے سلسلہ کے لوگوں نے اس کو فروغ دینے میں بڑی کوشش کی۔ شیخ نظام الدین اولیاء نے اس سلسلہ کو صحیح معنوں میں بڑی ترقی دی۔ ان کی خانقاہ دھلی میں نصف صدی سے زائد عرصہ تک اُن کی ارشاد و تلقین کا مرکز اور رشد و ہدایت کا سرچشمہ بنی رہی اور ہزاروں لوگ اُن کے روحانی فیوض سے مستفیض ہوئے[3]۔ انھوں نے اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت بڑے عظیم الشان طریقہ سے کی۔ ان کے بے شمار خلفاء تھے جنھوں نے اس سلسلہ کی خانقاہیں ملک میں جگہ جگہ قائم کر دیں اور اس سلسلہ کو عوام و خواص میں مشہور و مقبول کیا[4]۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے بعد اس سلسلہ کے مرکزی نظام کو اُن کے خلیفہ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دھلوی نے سنبھالا۔ وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے اور انھوں نے باوجود انتہائی نامساعد حالات کے اس سلسلہ کا کام بڑے عمدہ طریقہ سے کیا۔ بادِ مخالف کے بہت سے تند و تیز جھونکے آئے مگر وہ ایک مضبوط چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے اور ہمت و استقلال کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے[5]۔ سلطان محمد بن تغلق نے انھیں ہر طرح سے پریشان کیا[6]۔ لیکن انھوں نے اپنے پیر کے حکم سے قطعی انحراف نہ کیا[7]۔ ان کے بے شمار خلفاء تھے جنھوں نے اس سلسلہ کی اشاعت و تبلیغ اس ملک کے گوشے گوشے میں کی۔ ان کا وصال ۱۸ رمضان المبارک ۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء کو ہوا[8]۔ اُن کے ساتھ ہی اس سلسلہ کا

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص ۱۶۳ [2] سیر الاولیاء ص ۱۸۵ - اخبار الاخیار ص ۶۹

[3] سیر الاولیاء ص ۱۱۲-۱۳۰ [4] تاریخ مشائخ چشت ص ۱۷۵ - ۱۸۲

[5] ایضاً ص ۱۸۲ [6] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو پروفیسر خلیق احمد نظامی کا مضمون "محمد بن تغلق کے مذہبی رجحانات" مطبوعہ "برہان" مارچ ۱۹۴۶ء - ص ۱۵۴-۱۸۰ [7] ایضاً [8] اخبار الاخیار ص ۸۵

دورِ اوّل ختم ہوگیا۔ بلکہ اِس سلسلہ کا مرکزی نظام ہی تباہ و برباد ہوگیا۔

چشتیہ سلسلہ کے پہلے اہم مراکز اجمیر، نارنول، سوال، ناگور اور منڈل راجپوتانہ میں ھانسی، اجودھن، پنجاب میں اور کچھ اودھ کے شہروں میں قائم ہوتے تھے۔ بعد میں سلسلہ بہار، بنگال، آسام اور دکن میں بھی پھیل گیا[1]۔ چشتیہ سلسلہ کے جو بزرگ شرقی سلطنت کے مختلف شہروں اور قصبوں میں آکر آباد ہوئے ان میں بہت سے حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے خلفاء یا ان کے خلفاء کے خلفاء و مریدین تھے۔ جو امیر تیمور کے دہلی پر حملہ کی وجہ سے ہجرت کر کے یہاں آگئے تھے۔ علاوہ ازیں اس سلسلہ کے بہت سے مشائخ اس ملک کے مغربی علاقوں سے اور بعض بلادِ اسلامیہ سے بھی منگولوں کے حملوں سے ھراساں ہو کر یہاں پہنچے تھے۔ ان بزرگوں کو شرقی سلاطین نے بڑی عزت و احترام سے نوازا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عہدِ شرقی میں اس سلسلے کے اہم مراکز جونپور بلکہ لکھنؤ، ظفر آباد، کچھوچھہ، مانکپور، ایرج، کنتور، فتح پور، انجولی، کڑہ، بہرائچ اور جھنجانہ وغیرہ میں قائم ہو گئے[2]۔

اِس سلسلہ کے بزرگ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے۔ دُنیاوی معاملات سے دُور رہتے سلاطین و اُمراء سے کسی قسم کا تعلق رکھنا اپنی روحانی فلاح کے منافی سمجھتے اور اپنی خانقاہوں کے پُرسکون ماحول کو کسی طرح متاثر نہ ہونے دیتے۔ اگر کوئی امیر یا سلطان ملاقات کے لیے اصرار کرتا تو اس کو صرف مجبوری کے تحت ہی ملتے اور اُس سے کسی قسم کا تحفہ یا نذرانہ قبول نہ کرتے۔ اگر کوئی چیز بطور فتوح ان کی خانقاہ میں بھیج دی جاتی تو وہ اُسے فوراً خانقاہ کے درویشوں میں تقسیم کر دیتے۔ سرکاری عہدے قطعی قبول نہ کرتے اور نہ ملک کے سیاسی معاملات ہی میں حصّہ لیتے۔ اپنی گذر اوقات کے

---

[1] Some Aspects of Religion and Politics in India during the 13th Century, p. 178.

[2] ان مقامات کے چشتیہ صوفیاء کے حالات آئندہ صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔

لیے کوئی معمولی سا ذریعۂ معاش اختیار کر لیتے یا کھیتی باڑی کرتے۔ چشتیہ صوفیاء کو مجلسِ سماع کا بھی بے حد شوق تھا اور وہ راگ کو رُوحانی کیف کے لیے ضروری خیال کرتے وہ چالیس روز کی چلّہ کشی بھی بہت ضروری سمجھتے اور یہ چلّہ کسی مسجد کے کونے یا حجرہ میں کرتے۔ علاوہ ازیں وہ بزرگوں کے روضوں کی زیارت کو بھی ضروری خیال کرتے۔

اس سلسلہ کے بزرگوں کو ہندوستان میں پھلنے پھولنے میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوتی کیونکہ وہ ہندو رسم و رواج اور مذہبی روایات کو سمجھتے تھے بلکہ ابتدائی دور میں انھوں نے کئی ہندو رسموں کو بھی اپنا لیا تھا۔ پیر کو سجدہ کرنا[1] ملاقات کے لیے آنے والوں کو پانی پیش کرنا[2] زنبیل پھیرنا[3]، نئے مریدوں کا سر منڈوانا[3] اور راگ اور چلّہ معکوس وغیرہ سب ہندوؤں اور بدھوں ہی کی رسمیں تھیں جو انھوں نے اپنالی تھیں اور جن کی وجہ سے یہ سلسلہ غیر مسلم ماحول میں عوام و خواص کے لیے بڑا پُرکشش ثابت ہوا۔

---

[1] فوائد الفواد ص ۱۲۷ — [3] خیر المجالس ص ۱۵۰ ؛ سیر الاولیاء ص ۶۶ و ۱۵۶ - ۱۵۷

[2] خیر المجالس ص ۶۵ - ۶۶

باب ۲ دوم

چشتیہ مشائخِ جونپور

خواجہ ابوالفتح سوبرنیس چشتیؒ

خواجہ ابوالفتحؒ کا شمار اُس دور کے متبحر علماء اور ذی مرتبت بزرگوں میں ہوتا ہے۔ وہ دھلی میں پیدا ہوئے تھے[1] ان کے والدِ بزرگوار کا نام شیخ عبدالحئیؒ اور دادا کا اسمِ گرامی قاضی عبدالمقتدرؒ تھا[2]

شیخ عبدالرحمن چشتیؒ لکھتے ہیں کہ وہ پیدائش سے پہلے چودہ ماہ تک اپنی والدۂ محترمہ کے بطن میں رہے جس کی بناء پر ان کے دادا سخت پریشان ہو گئے۔ بالآخر ایک رات انھوں نے شیخ رکن الدین ابوالفتح ملتانیؒ کو خواب میں دیکھا۔ جنھوں نے فرمایا کہ اے قاضی! تیرے گھر ایک پوتا پیدا ہو گا۔ اس کا نام ابوالفتح رکھنا۔ اس کے بعد ان کی ولادتِ باسعادت ۱۴ محرم ۷۷۲ھ کو ہوئی۔ جس روز وہ پیدا ہوئے تھے اسی روز شیخ جمال الدین قاضی صاحب کے گھر آئے۔ وہ حضرت عثمان سیاحؒ کے مریدوں میں سے تھے اور بڑے کامل درویش تھے۔ ان کی نظر جب آپ کے پرنور چہرے پر پڑی تو بے حد متاثر ہوئے اور فرمایا! قاضی صاحب اِس پُرنور بیٹے سے آپ کا گھر انوار و کرامات سے منور ہو گا[3] ان کی یہ پیشین گوئی بعد میں بالکل صحیح ثابت ہوئی۔

اُن کی تعلیم و تربیت میں اُن کے دادا محترم نے بڑی دلچسپی لی اور ان کو تمام علومِ ظاہری

---

[1] تجلّیٔ نور، جلد اوّل ص ۱۹ [2] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۹ و

[3] اخبار الاخیار ص ۱۷۰ [4] مرآۃ الاسرار ایضاً ورق ۴۵۸ ب - ۴۵۹ و

و باطنی کی تعلیم دی۔ وہ مرید و خلیفہ بھی انہی کے تھے[1] ان کے والد شیخ عبدالحقؒ کا انتقال چونکہ ان کے دادا کی حیات ہی میں ہو گیا تھا اس لیے اپنے دادا کے وصال کے بعد وہ سجادہ نشین ہوئے[2]۔ اور کئی سال تک دہلی میں درس و تدریس اور وعظ و تلقین کا کام کرتے رہے[3]۔

جب دہلی پر امیر تیمور کے حملہ آور ہونے کی خبر عام ہوئی تو وہ وہاں سے جونپور چلے آئے اور ایک دیوار کے سایہ تلے فقر و فاقہ کی زندگی شروع کر دی[4]۔ کہا جاتا ہے کہ جب کوئی عقیدتمند اُن سے ملنے جاتا تو ان کے مرید اُن پر بوریے یا پھٹے پرانے کپڑوں کا سایہ کر دیتے۔ اُن کے ہاں کئی روز تک فاقہ رہتا اور خوراک کی کمی کی وجہ سے وہ اس قدر نحیف و نزار ہو گئے کہ ان کے سر اور پاؤں میں لرزہ پیدا ہو گیا اور ان میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے کی طاقت بھی نہ رہی۔ تاہم ان مشکلات کے باوجود وہ عبادت و ریاضت اور زہد و تقویٰ پر بڑے استقلال کے ساتھ قائم رہے[5]۔ شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ لکھتے ہیں کہ ایک روز ایک سوداگر اُن کی خدمت میں حاضر ہوا جو ان کے دادا بزرگوار کے مریدوں میں سے تھا۔ اس نے عرض کیا کہ فلاں جامع مسجد کے قریب ایک گھر پچاس تنگہ میں فروخت ہو رہا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے لیے اسے خرید لوں بلکہ اس نے اس گھر کی قیمت بھی آپ کو پیش کر دی۔ لیکن انھوں نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا اور فرمایا کہ ایسی چیزوں کا قبول کرنا بزرگانِ چشت کے مسلک کے خلاف ہے[6]۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد اللہ تعالےٰ کی رحمت سے اُن کے پاس اِس قدر پونجی ہو گئی کہ انھوں نے وہی گھر خرید لیا۔ اس گھر کے ساتھ پھر انھوں نے ایک حجرۂ عبادت اور ایک عالی شان خانقاہ بھی تعمیر کروائی۔ ایک روز وہ اپنے حجرۂ عبادت میں یادِ الٰہی میں مصروف تھے کہ وہی سوداگر دوبارہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے اس کو بڑی شفقت و محبت سے پاس

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۰ [2] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۹ ا [3] اخبار الاخیار ایضاً؛ تجلی نور جلد اول ص ۱۹
[4] اخبار الاخیار ایضاً، مرآۃ الاسرار ایضاً [5] ایضاً۔ اخبار الاخیار ایضاً۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اول
ص ۳۹۵-۳۹۶ [6] مرآۃ الاسرار ایضاً ورق ۴۵۹ ا-ب

بٹھایا۔ تاہم وہ اس گھر اور خانقاہ کی عالیشان عمارت کو دیکھ کر کشمکش و پیچ میں پڑ گیا اور دل میں خیال کرنے لگا کہ جس شخص کے پاس اس قدر عالیشان گھر اور خانقاہ ہو وہ یقیناً بڑا مالدار ہوگا۔ خواجہ صاحب فوراً اس کے اس خیال کو اپنے نورِ باطن سے بھانپ گئے اور ان کی غیرت و حمیت جوش میں آگئی اور فرمایا کہ ہاں میرے پاس بہت دولت ہے۔ میرا یہ حجرہ تو سونے سے اور دوسرا چاندی سے بھرا ہوا ہے اور میں جس قدر دولت بھی صرف کرنا چاہوں ان سے نکال لیتا ہوں اور کسی چور اور ڈاکو کو یہ ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ میرے اس مال و دولت کی چوری کر سکے جبکہ دوسروں کا مال ایسا ہے کہ چور اس کی چوری کر سکتے ہیں۔ وہ سوداگر ان کی اس بات کو فوراً سمجھ گیا کہ یہ اشارہ اسی کی طرف ہے اور یہ بد دعا اسی کے حق میں ہے۔ بہر حال وہ اپنی جسارت و غلطی کی معافی مانگنے لگا۔ مگر انھوں نے جواب دیا کہ یہ بات اب ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ ہم سے جو بات کہلوائی جاتی ہے وہ پوری ہو جاتی ہے[1]۔

چنانچہ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ہی جب وہ سوداگر اپنا کئی ہزار کا مال لے کر جونپور کی طرف آرہا تھا تو راستے میں لُوٹا گیا۔ اس واقعہ کی خبر جب ان کے مریدوں کو معلوم ہوئی تو انھوں نے آپ کو آکر بتایا اور کہا کہ آپ واقعی بڑے صاحبِ کرامات ہیں۔ آپ کی زبان سے جو بات نکلتی ہے وہ سچ مچ پوری ہو کر رہتی ہے۔ لیکن انھوں نے اس بات کو پسند نہ کیا اور فرمایا کہ ایسی باتوں کو کرامت نہیں کہتے۔ ایسی باتیں تو کشف و جذب میں سرزد ہو جایا کرتی ہیں اور بے بنیاد ہوتی ہیں[2]۔

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ شیخ ابو الفتحؒ بھی اپنے دادا محترم قاضی عبد المقتدرؒ کی طرح بلند پایہ عالم و فاضل اور دانشمند بزرگ تھے اور اپنے دادا مرحومؒ کی وصیت کے مطابق تمام عمر علومِ دینی کی درس و تدریس کرتے رہے[3]۔ وہ بڑے زبان آور اور

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۹ ا۔ب۔ خزینۃ الاصفیاء، جلد اول ص ۳۹۶ [2] ایضاً مرآۃ الاسرار ایضاً
[3] اخبار الاخیار ص ۱۷۰

فصیح اللسان تھے اور عربی و فارسی پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ انھوں نے عربی میں بھی بڑے عمدہ قصائد لکھے[1]۔ اسی طرح وہ دوسرے علمی و ادبی اور ظاہری و باطنی کمالات سے متصف تھے۔ ان کے علم و فن اور صوفیانہ محاسن کی شہرت سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ اُن کے خرمنِ کمال سے سینکڑوں شہسواروں نے خوشہ چینی کی۔ سلطان ابراہیم شاہ شرقی ان کے کمالات کا بہت گرویدہ تھا۔ اس لیے ان کے ساتھ بڑی محبت و تکریم سے پیش آتا۔ اس نے ان کو جونپور میں ہر طرح کی سہولتیں مہیا کر رکھی تھیں[2]۔

خواجہ ابوالفتحؒ قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ کے ہم عصر تھے۔ قاضی صاحب اُن کے زہد و ورع اور کمالات کے بڑے مداح تھے۔ دونوں میں اکثر علمِ اصول، کلام اور فقہ پر بحث و مباحثے بھی ہوتے رہتے۔ ایک بار دونوں میں بلی کے نجس و ناپاک ہونے پر بحث چھڑ گئی۔ جس میں قاضی صاحب نے بلی کو نجس و ناپاک ثابت کیا جبکہ خواجہ صاحب نے اسے پاک قرار دیا[3]۔ انھوں نے بعض ایسے مباحث و موضوعات پر کئی رسائل بھی لکھے تھے[4]۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ اُن کے گھر میں سونے کے ٹکڑوں کی بارش ہوئی تھی[5]۔ (واللہ اعلم) اور صاحب تجلی نور لکھتے ہیں کہ وہ اسی وجہ سے سوبرنیس کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے[6]۔ شیخ عبدالحقؒ مزید لکھتے ہیں کہ اگرچہ یہ کہانی عام لوگوں کی زبانی سنی گئی ہے لیکن ان کے ملفوظات میں اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا[7]۔ اور ان کے پوتے شیخ عبدالوہابؒ اس واقعہ کو ان کی بجائے ان کے جدِ امجد قاضی عبدالمقتدرؒ کی طرف منسوب کرتے ہیں[8]۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ١٧٠ [2] ایضاً۔ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ٤٥٩ ل [3] اخبار الاخیار ایضاً
[4] ایضاً [5] ایضاً [6] تجلی نور جلد اول ص ٢٠ [7] اخبار الاخیار ایضاً
[8] ایضاً

شیخ عبدالوہاب نے ان کے ملفوظات جمع کیے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ واقعہ قاضی عبدالمقتدرؒ کے خلیفہ قاضی شہدؒ سے سنا تھا جو اسے حضرت شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلوی کے سامنے بیان کر رہے تھے[1]۔ ان کا قول ہے کہ ایک روز وہ قاضی صاحب کے گھر گئے اور وہ اس روز تین دن کے فاقہ سے تھے۔ اس کا اندازہ انھوں نے قاضی صاحب کی باتوں سے کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب میں قاضی صاحب سے ملاقات کے لیے گھر سے باہر نکلا تو میں بڑا متفکر تھا۔ چنانچہ میں اُن کے گھر کے دروازہ کے پاس ہی رُک گیا اور اُن کے حال پر غور کرنے لگا کہ اسی اثنا میں مجھ پر دس پندرہ یا پچیس سونے کے ٹکڑوں کی بارش ہوئی۔ میں ان کو لے کر قاضی صاحب کے پاس گیا اور سارا واقعہ سنایا لیکن وہ غصّے میں آ گئے۔ میں نے ان سے اصرار کیا کہ وہ اُن میں سے چند ٹکڑے ضرور لے لیں لیکن انھوں نے قبول نہ فرمایا بلکہ ان کا غصّہ مزید بڑھ گیا۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اُن سونے کے ٹکڑوں کو بعد میں قاضی صاحب کے بعض عقیدت مندوں نے ازراہِ عقیدت زیادہ قیمت پر خرید لیا تھا[2]۔

شیخ ابوالفتح کے بے شمار شاگرد و خلفاء تھے جنھوں نے علم و ادب اور سلوکِ چشتیہ کی بیش بہا خدمات سر انجام دیں۔ ان کے اجل خلفاء میں سے ایک شیخ فخرالدین بجلوریؒ تھے جو شیخ الاسلام سعداللہ بجلوریؒ کے صاحبزادے تھے۔ وہ آٹھ بھائی تھے اور اُن میں سے بعض مجذوب اور بعض سالک تھے مگر تمام کے تمام بڑے پایہ کے عارف و درویش تھے[3]۔ شیخ فخرالدین بجلوریؒ خود بڑے ذی مرتبت بزرگ تھے اور ان کا سلسلۂ رشد و ہدایت آج تک لکھنؤ میں جاری و ساری ہے۔ ان کے ایک بھتیجے شیخ عبدالسلامؒ بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ ان کا روضۂ اقدس بھی لکھنؤ میں ہے[4]۔ شیخ الاسلام کے ایک خلیفہ سید علاءالدین اودھیؒ (المتوفی ٩٧٧ھ) تھے۔ وہ

---

[1] تجلی نور جلد اوّل ص ٢٠ [2] اخبار الاخیار ص ١٧٠ [3] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ٤٥٩ ب

[4] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ٣٩٦
مرآۃ الاسرار ایضاً

میر سید احمد ماہرؒ و کی اولاد میں سے تھے اور وہ بغداد سے یہاں پہنچے تھے۔ انہی کے اولاد، سادات ماہر و یہ ہیں۔ اس کے متعلق میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے بھی تصدیق کی ہے[1]۔ شیخ ابوالفتحؒ کے اجل خلفاء میں سے ایک شیخ محمد آب کشؒ تھے جو مخدوم شیخ عبدالکریم قدوائیؒ کے بیٹے تھے۔ وہ بڑے کامل اور صاحب کرامات درویش تھے۔ ان کی اولاد میں سے شیخ اسماعیلؒ اور شیخ جہاں دریاآبادیؒ بھی بڑے پایہ کے درویش ہوئے[2]۔

شیخ ابوالفتحؒ کو سماع کا بے حد شوق تھا۔ تجلی نور کے مؤلف لکھتے ہیں کہ ایک روز قوالوں نے ان کی خانقاہ میں مجلس سماع منعقد کی اور جب ان پر وجد طاری ہو گیا تو قوالوں نے عطیہ کی خواہش کی لیکن اس وقت ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس موقعہ پر خدا کی رحمت سے خانقاہ کی چھت سے چند اشرفیاں ٹپکیں جو اٹھا کر انھوں نے قوالوں کی نذر کر دیں[3]۔ (واللہ اعلم)

ان کا وصال بروز جمعہ ۱۳ ربیع الاول ۸۵۸ھ کو ہوا[4]۔ ان کے وصال کے متعلق روایت ہے کہ ایک روز انھوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ حضورؐ اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے درمیان بیٹھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ انھوں نے یوم وصال حضور صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ ربیع الاول اور یوم وصال خواجہ صاحب ۱۴ ربیع الاول کے درمیان ۱۳ ربیع الاول کو وصال کیا[5]۔ ان کا روضہ جونپور شہر کے محلہ سپاہ میں مرجع خلائق ہے۔ وہاں ان کے خاندان کے لوگ غالباً اب تک موجود ہیں[6]۔

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۹۴ ب
[2] ایضاً ورق ۶۰۴ ،۱ خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۳۹۶
[3] تجلی نور جلد اول ص ۲۰-۲۱
[4] مرآۃ الاسرار ایضاً ورق ۶۰۴ ۱۔ خزینۃ الاصفیاء ایضاً
[5] تجلی نور جلد اول ص ۲۱
[6] ایضاً

شیخ محمد عیسیٰ جونپوری رح

شیخ محمد عیسیٰ رح جونپور کے عظیم المرتبت مشائخ میں سے تھے۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بزرگوار شیخ احمد عیسیٰ رح تاج دہلی کے برگزیدہ لوگوں میں سے تھے۔ ان کا شجرہ نسب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے ملتا ہے۔[1] وہ سات آٹھ برس کے تھے کہ دہلی پر امیر تیمور کے حملہ کی وجہ سے اپنے والد بزرگوار کے ساتھ جونپور ہجرت کر آئے۔[2] ان کی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی۔ ان کو بچپن ہی سے تصوّف کے ساتھ بڑا لگاؤ تھا اس لیے پہلے وہ حضرت شیخ ابو الفتح جونپوری رح کے مرید ہوئے۔ پھر شیخ فتح اللہ اودھی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔[3] کچھ عرصہ بعد وہ اپنے پیر و مرشد کے اشارہ سے قاضی شہاب الدین دولت آبادی رح کے شاگرد ہو گئے اور علومِ ظاہری پر عبور حاصل کیا۔[4] شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح لکھتے ہیں کہ قاضی موصوف نے اصولِ بزدوی کی شرح ان ہی کی خاطر لکھی تھی تاکہ اس مضمون کو سمجھنے میں انھیں آسانی ہو جائے۔[5]

جب وہ علومِ ظاہری کی تعلیم سے فارغ ہو گئے تو تصفیۂ باطن کی طرف متوجہ ہوئے اور رات دن عبادت و ریاضت میں منہمک رہنے لگے یہاں تک کہ خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس قدر عبادت و ریاضت اور مراقبات کیے تھے کہ ان کی گردن کی ہڈی باہر نکل آئی تھی اور ان کی ٹھوڑی جھک کر سینہ سے جا لگی تھی۔[6] تجلّی نور کے مؤلف لکھتے ہیں کہ انھوں نے بارہ سال تک اپنی کمر کو زمین پر نہ لگنے دیا تھا۔ وہ دن رات اپنے حجرہ میں عبادت میں مصروف رہتے اور صرف نمازِ جمعہ اور پانچ وقت کی نماز با جماعت ادا

---

۱ اخبار الاخیار ص ۱۷۵ ۔ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۷ و

۲ اخبار الاخیار ایضاً

۳ ایضاً ۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۱۱ ۔ تجلّی نور جلد اوّل ص ۲۲ ۔

۴ ایضاً ۔ اخبار الاخیار ایضاً

۵ اخبار الاخیار ایضاً ۔ تجلّی نور ایضاً

۶ ایضاً

کرنے کے لیے مسجد جاتے۔ مسجد کو بھی وہ اکیلے ہی جاتے۔ جب چلتے تو سر کو جھکاتے گریبان میں چھپائے رہتے۔ کبھی اِدھر اُدھر نہ دیکھتے اور اُن کو یہ خبر نہ ہوتی کہ وہ کہاں ہیں[1]۔ ان کے حجرۂ عبادت کے دروازہ پر کتنی سال سے ایک درخت اُگا ہوا تھا ان کو اس کی کوئی خبر نہ تھی ایک روز کا واقعہ ہے کہ اس درخت سے ایک پتا اُن کی نشست گاہ پر گر پڑا۔ انھوں نے حیرت سے اپنے خدام سے پوچھا کہ یہ پتا کہاں سے آیا۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضور یہ اسی درخت کا پتا ہے جو سالہا سال سے یہاں اُگا ہوا ہے[2]۔

شیخ صاحب نے چالیس سال تک عزلت نشینی اختیار کیے رکھی اور تمام عمر توکل علی اللہ پر گزار دی۔ اگر کوئی بادشاہ یا امیر ان کی خدمت میں ہدیہ پیش کرتا تو اُسے قبول نہ فرماتے۔ ایک بار سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے ان کی خدمت میں کچھ رقم اور کپڑوں کے چند جوڑے پیش کیے لیکن اُنھوں نے اس کو واپس کر دیا اور جواب میں یہ رباعی لکھ بھیجی[3]

من دلق خود با طلس شاہاں نمیدہم

من فقر خود بملکِ سلیماں نمیدہم

از رنجِ فقر در دِل کنجی کہ یافتم

ایں رنج را براحتِ شاہاں نمیدہم

ان کے فقر کا یہ عالم تھا کہ حجرۂ عبادت میں چراغ تک روشن نہ کرتے۔ اگر فتوح وغیرہ کہیں سے آجاتے تو شام تک اُن پر نگاہ نہ ڈالتے[4]۔ سلطان ابراہیم شاہ شرقی اور سلطان محمود شاہ شرقی کو ان کے ساتھ والہانہ عقیدت تھی اور وہ دونوں ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے[5]۔ وہ نمازِ جمعہ ادا کرنے کے لیے محلہ دریبہ کی مسجد خالص مخلص میں جایا کرتے

---

[1] تجلّی نور جلد اوّل ص ۲۲
[2] تجلّی نور ایضاً ص ۲۲-۲۳
[3] ایضاً ص ۲۳
[4] ایضاً مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۷۸۴ و بحر زخار (قلمی) ورق ۱۵۵
[5] ایضاً

اِس لیے سلطان محمود نے ان کی سہولت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ایک روز اُن سے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی خانقاہ کے قریب ہی ایک جامع مسجد تعمیر کروا دی جائے۔ آپ نے فرمایا ہاں، خیال تو نیک ہے۔ چنانچہ سلطان محمود نے ایک جامع مسجد کی تعمیر شروع کروا دی لیکن اس کی تعمیر سے پہلے فوت ہو گیا۔ اس کے بعد سلطان حسین شاہ شرقی نے اس کی تکمیل کروائی۔[1] یہ مسجد شرقی فنِ تعمیر کا ایک شاہکار ہے اور آج بھی جونپور کی خاص مساجد میں شمار ہوتی ہے۔

شیخ محمّد عیسیٰ بڑے صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ ان کا وصال ۱۴ ربیع الاوّل کو ہوا[2] لیکن ان کے سالِ وصال کے متعلّق اختلاف ہے۔ صاحبِ تجلّیٔ نور ان کا سالِ وصال گنجِ ارشدی کے حوالہ سے ۸۷۰ھ/۱۴۶۵ء لکھتے ہیں۔[3] شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں، ان کا سالِ وصال ۸۴۵ھ/۱۴۴۱ء لکھا ہے۔[4] اور خزینۃ الاصفیاء کے مصنّف ان کا سالِ وصال ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء لکھتے ہیں۔[5] (واللہ اعلم) ان کا روضۂ اقدس جونپور کے محلّہ ارزن میں جامع مسجد کے قریب ہے اور مرجعِ خلائق ہے۔[6] ان کے روضہ اور خانقاہ کی عمارت کو بعد میں مخدوم جنید برلاس نے بنوایا تھا۔ وہ مغل بادشاہ بابر کے عہدِ حکومت میں جونپور کا حاکمِ اعلیٰ تھا اور اُس کو اُن سے غائبانہ عقیدت تھی۔[7] بعد میں اُن کے روضۂ اقدس کی مرمّت اُس کے جانشینوں میں سے ایک صاحب مولانا شیخ محمد ماہؒ نے کروائی اور اس پر یہ کتبہ بھی لگوایا تھا۔ "تعمیر خاکروب ایں درگاہ فقیر محمّد ماہؒ تاریخ تعمیر نو شدہ۔ قابلہ الشیخ ابوالحب امان اللہ۔"[8]

ان کے خرمنِ کمال سے سینکڑوں ہزاروں نے رُوحانی فیوض حاصل کیے۔ ان کے بعض جانشین اور خلفاء بڑے پایہ کے بزرگ تھے جنھوں نے شمعِ ہدایت کو ملک کے

---

[1] تجلّیٔ نور جلد اوّل ص ۲۳ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] بحوالہ تجلّیٔ نور ایضاً
[5] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۱۱ [6] تجلّیٔ نور ایضاً
[7] ایضاً ص ۲۴ [8] ایضاً

گوشے گوشے میں روشن کیے رکھا۔ ان کی اولاد میں سے مؤخر الذکر شیخ محمد ماہؒ بڑے ذی مرتبت بزرگ تھے[۱]۔ شیخ صاحب کے چھوٹے بھائی شیخ احمد علیمیؒ بھی بلند مرتبت بزرگ تھے۔ وہ بھی شیخ فتح اللہ اودھیؒ کے مرید تھے۔ انھوں نے ان سے بھی خرقہ خلافت حاصل کیا تھا۔ ان کا روضۂ اقدس شہر بہار میں ہے[۲]۔

شیخ محمد علیمی کے عظیم المرتبت مریدوں میں سے ایک حضرت شیخ بہاء الدین ننھو جونپوریؒ تھے مگر انھوں نے خرقۂ خلافت حضرت سید راجی حامد شاہؒ سے حاصل کیا تھا[۳]۔ حضرت شیخ محمد علیمیؒ کے داماد حضرت شیخ طاہر حسن چشتیؒ بھی اپنے وقت کے نامور عالم بزرگ تھے[۴]۔ جن کے بیٹے شیخ محمد حسن چشتیؒ المعروف شاہ خیالیؒ بھی عارف زمانہ تھے[۵]۔ ان کے اجل خلفاء میں سے ایک اور حضرت شیخ شمس الحق بدہ حقانی جونپوریؒ بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے[۶]۔ جن کے ایک بھائی شیخ مبارک بنارسیؒ بھی ان ہی کے مرید و خلیفہ تھے[۷]۔ جن کے اجل خلفاء میں سے ایک شیخ وجیہہ الدین اشرفؒ المعروف بہ شیخ فرید جونپوریؒ تھے[۸]۔ شیخ محمد علیمیؒ کے دوسرے خلفاء میں سے شیخ سعد اللہؒ اور شیخ بدہ کڑویؒ بھی بڑے بلند مرتبت بزرگ تھے۔ جنھوں نے جونپور کے علاقہ میں چشتیہ سلسلہ کو بڑا فروغ دیا[۹]۔ اور سینکڑوں ہزاروں کو روحانی فیض بخشا۔ شیخ محمد علیمیؒ کے ایک دوسرے نامور خلیفہ شیخ بڈھنؒ تھے جو قصبہ

---

[۱] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۷ و۔ بحر ذخار (قلمی) ورق ۲۵۵ ا۔ انہی نے اُن کے روضۂ اقدس پر کتبہ لکھوایا تھا جس کا ذکر اس سے پچھلے صفحہ پر کیا گیا ہے۔

[۲] مرآۃ الاسرار ایضاً

[۳] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۱۸-۴۱۹۔ [۴] اخبار الاخیار ص ۱۹۰

[۵] ایضاً ص ۲۲۸ [۶] بحر ذخار (قلمی) ورق ۲۵۵ ا-۲۵۶ ب

[۷] تجلی نور جلد اوّل ص ۲۵ [۸] بحر ذخار (قلمی) ورق ۲۵۶ ب

[۹] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۷ ب

انجولی کے رہنے والے تھے۔ وہ بھی بڑے صاحبِ کرامات بزرگ تھے[1]۔ ان کے بیٹے شیخ صدرالدینؒ بھی بڑے عظیم المرتبہ بزرگ تھے[2]۔ جو ان کے وصال کے بعد سجادہ نشین ہوئے، جن کے جانشینوں نے اس سلسلہ کو صدیوں تک قائم رکھا۔ شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ کے اجلّ خلفاء میں سے ایک میر سید معزالدین عرف سید ملیٹھہؒ تھے۔ وہ املیٹھی کے رہنے والے تھے۔ اور صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ اُن کا تعلق ساداتِ رضویہ سے تھا[3]۔ شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ مرآۃ الاسرار میں لکھتے ہیں کہ اُن کے ایک نبیرہ میر سید الٰہ داد مجذوبؒ اپنے زمانہ کے مشہور و معروف اور صاحبِ کرامات درویش تھے۔ جب وہ (شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ) دس یا بارہ سال کے تھے تو حضرت سے ملنے کے لیے کئی بار اُن کے آستانہ پر گئے اور ان سے بڑا روحانی فیض حاصل کیا[4]۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ قصبہ املیٹھی کے سادات میر سید معزالدینؒ کی اولاد میں سے تھے اور قصبہ لساوہ، قصبہ بجلور اور شہر لکھنؤ کے سادات کا ایک دوسرے سے جدّی تعلق تھا[5]۔ وہ تمام اصلاً میر محمد حوض خاص دہلویؒ کی اولاد میں سے تھے[6]۔

شیخ محمد عیسیٰ کے جانشین جونپور کے محلّہ ارزن پورہ، مصطفےٰ آباد اور بھنڈاری آباد میں آباد تھے۔ اور وہ جونپور کے قدیم رؤسا اور شرفاء میں شمار کیے جاتے تھے[7]۔

شیخ شمس الحق بدہ حقّانیؒ

شیخ شمس الحق بدہ حقانیؒ، شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ کے خلفائے کبار میں تھے[8]۔ اور جونپور کی برگزیدہ ہستیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ انھوں نے علومِ ظاہری کی سند اٹھارہ

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۷ ب [2] ایضاً

[3] ایضاً، بحرِ ذخّار (قلمی) ورق ۲۵۵ و لیکن مرآۃ الاسرار کے مصنف انھیں شیخ محمد عیسیٰؒ کے بھائی شیخ احمد عیسیٰؒ کا مرید و خلیفہ لکھتے ہیں۔ [4] مرآۃ الاسرار ایضاً [5] ایضاً ورق ۴۸۷ ب

[6] ایضاً [7] تجلّیٔ نور جلد اوّل ص ۲۴

[8] اخبار الاخیار (ص ۱۹۰) کے مؤلف ان کو بدہ حقانی، گلزارِ ابرار (ص ۵۹۴) کے مؤلف ان کو بدھا حقانی، بحرِ ذخار (قلمی) ورق ۲۵۵ ب کے مؤلف ان کو بڈہ حقانی اور تجلّیٔ نور (جلد اوّل) کے مؤلف ان کو بڈی حقانی لکھتے ہیں۔

برس کی عمر میں حاصل کر لی تھی۔ وہ علومِ شریعت و طریقت میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے[1]۔ وہ صوفیانہ مشاغل کے ساتھ درس و تدریس کا کام بھی کرتے رہے۔ ان کے پڑھانے کا انداز بہت عمدہ تھا۔ چنانچہ اُن کے درس میں شہر کے معززین بھی شامل ہوتے تھے[2]۔ ان کا اصول یہ تھا کہ وہ امرِ حق کو کسی سے کہنے سے نہ رُکتے تھے، خواہ کوئی بادشاہ ہوتا یا گدا، وہ ہر ایک کو حق بات سنا دیتے اور اِس وجہ سے وہ حقّانی کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے[3]۔ وہ زُہد و وَرَع میں بے مثال تھے۔

ان کو مجلسِ سماع کا بے حد شوق تھا۔ تجلّیٔ نور کے مؤلف لکھتے ہیں کہ ایک بار ان کے ہاں مجلسِ سماع منعقد ہوئی۔ قوالوں نے اس موقع پر فراق و جدائی کے اشعار گانا شروع کر دیے۔ جس سے اُن پر وجد طاری ہو گیا یہاں تک کہ ان کی حالت نازک ہو گئی۔ ایک شخص اس مجلس میں ان کی حالت کو سمجھ گیا۔ اس نے قوالوں سے کہا کہ وہ اس موضوع کو فوراً بدل دیں اور کوئی ایسی چیز گائیں جس سے وہ ہوش میں آجائیں۔ چنانچہ قوالوں نے وصل و طرب کے اشعار گانا شروع کر دیے جن سے اُن کے چہرے پر تازگی اور فرحت کی لہر دوڑ گئی اور وہ دوبارہ ہوش میں آگئے[4]۔

اُن کی اولاد میں سے شیخ فتح اللہ حقانی قادری جونپوریؒ بھی بڑے عالی مرتبت درویش تھے اور وہ سیّد صدرالدین راجہ بخاریؒ کے خلیفہ تھے[5]۔ ان کے بھائی شیخ مبارک بنارسیؒ بھی بڑے ذی مرتبت اور صاحبِ کرامات بزرگ تھے[6]۔

انھوں نے ایک سو تیس سال عمر پائی۔ کہا جاتا ہے کہ جونپور میں بچّوں کی سالگرہ کے موقعہ پر اُن کی فاتحہ خوانی کا عام رواج ہے تاکہ ان کی طرح بچوں کی عمر بھی دراز ہو۔ آپ

---

[1] تجلّیٔ نور جلد اوّل ص ۲۴ ۔ وہ ان کا نام شیخ شمس الحق بڑی حقانی لکھتے ہیں۔
[2] ایضاً ص ۲۴ - ۲۵ [3] ایضاً
[4] ایضاً ص ۲۴ - ۲۵ [5] ایضاً ص ۲۶
[6] ایضاً ص ۲۵

کی تاریخِ وفات ۲۸ صفر ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء ہے[۱] ان کا روضۂ اقدس جونپور شہر کے محلہ ارزن میں ہے[۲]۔ ان کے خاندان کے لوگ غالباً اب تک وہاں آباد ہیں۔

شیخ بہاء الدین نتھو جونپوریؒ

شیخ بہاء الدین نتھوؒ کا تعلق شیخ حمید الدین ناگوریؒ کے خاندان سے ہے[۳]۔ وہ شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ کے خاص مریدوں میں سے تھے لیکن خرقۂ خلافت انھوں نے سید راجی حامد شاہ مانکپوریؒ سے حاصل کیا تھا[۴]۔ ان کو بچپن ہی سے صوفیانہ مشارب کا بے حد شوق تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ جن دنوں وہ حضرت شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ کی شاگردی میں تھے۔ ان دنوں ایک صاحب حسین دولقہ واقع گجرات سے شیخ محمد عیسیٰؒ کی شہرت سن کر جونپور پہنچے۔ وہ بڑے صاحبِ باطن درویش تھے۔ یہاں ان کی اور شیخ بہاء الدینؒ کی آپس میں بڑی گہری دوستی ہو گئی اور وہ اپنا بیشتر وقت ان کی صحبت میں گزارنے لگے۔ شیخ حسین علمِ کیمیا بھی جانتے تھے۔ چنانچہ ایک روز وہ ان کو قریب کے صحرا میں لے گئے اور عملِ کیمیا سے تھوڑا سا سونا تیار کر کے انھیں پیش کیا تاکہ وہ اپنی ضروریات پوری کر لیں اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر مزید ضرورت پیش آئے تو دوبارہ مجھ سے کہیں۔ شیخ بہاء الدینؒ ان کی اس پیش کش سے ناخوش ہوئے اور کہا کہ آپ سے تو مجھے کسی دوسرے کیمیا کی ضرورت تھی۔ یہ سونا تو میرے کام کی چیز نہیں۔ شیخ حسین ان کے اس جواب سے بڑے خوش ہوئے اور اس کے بعد ان کی توجہ ان کی طرف مزید بڑھ گئی اور وہ ان کی روحانی تربیت میں بڑی دلچسپی لینے لگے[۵]۔

جب شیخ حسین شیخ محمد عیسیٰؒ سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد واپس گجرات

---

[۱] تجلی نور جلد اوّل ص ۲۵ [۲] ایضاً ص ۲۵ [۳] ایضاً ص ۲۷
[۴] اخبار الاخیار ص ۱۹۲ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۴ ب
[۵] اخبار الاخیار ایضاً۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۱۸۔ ۴۱۹۔

جانے لگے تو آپ نے بھی اُن سے خرقۂ خلافت کی خواہش کی مگر انھوں نے فرمایا کہ تمھارے پیر تو اسی شہر میں ہیں۔ ہماری تو تم سے صرف اسی قدر دوستی تھی[۱]۔ اس کے بعد وہ شیخ محمد عیسیٰؒ کے مرید ہو گئے اور اُن سے بڑا رُوحانی فیض حاصل کیا لیکن ابھی وہ خرقۂ خلافت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے کہ ان کا وقت وصال قریب آپہنچا۔ اس صورتِ حال سے وہ بڑے مغموم ہوتے اور دِل ہی دل میں خرقۂ خلافت سے محرومی کا احساس کرنے لگے۔ تب شیخ محمد عیسیٰؒ نے ان کو پاس بلایا اور فرمایا کہ تمھارا خرقۂ خلافت ایک سیّد صاحب کے پاس ہے جو یہاں آئیں گے اور تمھیں پہنائیں گے چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ کچھ عرصہ بعد حضرت سیّد راجی حامد شاہ مانکپوریؒ جونپور تشریف لائے اور انھوں نے آپ کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا[۲]۔ شیخ محمد عیسیٰؒ کے وصال کے بعد انھوں نے سیّد راجی حامد شاہ مانکپوریؒ سے بڑا روحانی فیض حاصل کیا۔ وہ ترک و تجرید و صدق و ورع میں بے مثال تھے اور اُن کے خلفائے کبار میں شمار ہوتے ہیں[۳]۔

وہ علومِ ظاہری و باطنی کے متبحّر عالم تھے۔ عربی و فارسی کے علاوہ وہ ہندی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے۔ جس کا ثبوت ان کے مجموعۂ خطوط "صحائف الطریقہ" سے بھی ہوتا ہے ان خطوط میں انھوں نے آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی، عربی کے مقولے، فارسی کے اشعار اور ہندی کے دوہوں کا بکثرت استعمال کیا ہے[۴]۔ یہ خطوط فارسی زبان میں تصوّف کے موضوعات پر پاک و ہند کے دورِ وسطیٰ کا ایک نایاب سرمایہ ہیں اور اس دور کی مذہبی زندگی اور تصوّف کے طور طریقوں کے علاوہ اخلاقی و سماجی قدروں کے بھی بہترین آئینہ دار ہیں

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۹۲ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۱۹
[۲] اخبار الاخیار ایضاً، خزینۃ الاصفیاء ایضاً
[۳] اخبار الاخیار ایضاً
[۴] صحائف الطریقہ مرتبہ حقیر فقیر میاں محمد سعید

ان کی کل تعداد ۸۹ ہے اور چھتیس[۱] ہم عصر صوفیاء کو مخاطب کر کے لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط کی تحریر و تصنیف سے شیخ بہاءالدین کے ذوقِ تصوف، ذوقِ نظم و نثر اور ادبی کمال کا بھی عمدہ ثبوت ملتا ہے[۲]۔ ان کا اصل اور واحد مسودہ تو انگلستان کی برٹش میوزیم کی لائبریری میں ہے مگر راقم الحروف نے اس کی فوٹو کاپی لے کر اس کو تحشیہ و تصحیح کے بعد اہتمام کے ساتھ از سرِ نو مرتب کر کے چھپوایا ہے۔

وہ صوفیانہ مشاغل کے ساتھ درس و تدریس کا کام بھی کرتے رہے اور اُن کے خرمنِ کمال سے سینکڑوں ہزاروں طلباء و مریدین نے استفادہ کیا ہے جنھوں نے اُن کے وصال کے بعد اس ملک میں درس و تدریس اور ارشاد و تلقین کا سلسلہ جاری رکھا[۲]۔ اُن کے اجل خلفاء میں سے سید علی قوام[۳]، شیخ سالار بدہ کڑوی[۴] اور شیخ مبارک بنارسی[۵] جیسے عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ ان کے فرزندِ ارجمند شاہ ادھن چشتی جونپوری بھی بڑے عالی مرتبت مشائخ میں سے تھے[۶]۔ اور جن کے بیٹے شیخ عبدالحیٔ چشتی بھی جونپور کے ذی مرتبت بزرگوں میں تھے[۷] ——— اُن کے خاندان کے بعض بزرگ اب تک جونپور میں ارشاد و تلقین میں مصروف ہیں[۸]۔ ان کی تاریخ وصال ۱۴ جمادی الاول ۹۴۷ھ / ۱۵۴۰ء ہے اور اُن کا روضۂ اقدس جونپور شہر کے محلہ مخدوم شاہ ادھن میں مرجع خلائق ہے[۹]۔

مخدوم شیخ ادھن چشتیؒ

مخدوم شیخ ادھنؒ مخدوم شیخ بہاءالدین تھو چشتی جونپوریؒ کے صاحبزادے تھے اور انھی

---

[۱] صحائف الطریقہ مرتبہ راقم الحروف میاں محمد سعید [۲] اخبار الاخیار ص ۱۹۲ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۴ ب، بحرِ ذخار (قلمی) ورق ۲۹۹ [۳] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۲۲
[۴] مرآۃ الاسرار (قلمی ایضاً) [۵] بحرِ ذخار (قلمی) ایضاً
[۶] اخبار الاخیار ص ۲۲۶ [۷] تجلّی نور جلد اوّل، ص ۳۰-۳۱
[۸] تجلّی نور ایضاً [۹] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۱۹ - تجلّی نور ایضاً ص ۲۸

کے مرید و خلیفہ تھے[1]۔ ان کے وصال کے بعد اُن کی جگہ سجادہ پر بیٹھے[2]۔ وہ تمام عمر علوم ظاہری و باطنی کا مطالعہ کرتے رہے اور اپنے زمانہ کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے تاہم انھوں نے کبھی درس و تدریس کا کام نہ کیا[3]۔ وہ چشتیہ مشائخ مخدوم بندگی جلال الحق قاضی خاں ناصحی ظفرآبادیؒ، مخدوم سید درویش ابی محمد محمود ظفرآبادیؒ اور مخدوم سید علی عاشقاں سرائے میریؒ کے ہم عصر تھے اور وہ سب آپس میں بڑے گہرے دوست تھے مگر مخدوم ان سب سے زیادہ معروف و مقبول ہوئے۔ ان کی شہرت سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی اور وہ اپنے زمانہ کے شیخ الشیوخ مانے جاتے تھے[4]۔ انھوں نے سو سال سے زائد عمر پائی۔ ان کے بیٹے بھی ان کی حیات میں ستر اور اسی سال تک عمر کو پہنچ گئے تھے۔ اور اسی طرح اُن کے پوتوں کی بھی بڑی لمبی عمریں ہوئیں۔ جب وہ اور ان کے سفید ریش بیٹے مجلس میں ایک ساتھ بیٹھتے تو یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا کہ کون باپ ہے اور کون بیٹا[5]۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ ضعیف العمری کی وجہ سے اُن کی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ ان کو دو آدمی سہارا دے کر کھڑا کرتے مگر جب مجلسِ سماع منعقد ہوتی تو اُن پر اس قدر وجد طاری ہو جاتا کہ ان کو دس آدمی بھی نہ سنبھال سکتے۔ تاہم وہ اس کمزوری کے باوجود ہر نماز کے فرض کھڑے ہو کر ادا کرتے اور قیام و رکوع بھی بغیر کسی کی مدد کے کر لیا کرتے مگر سنتیں و نوافل وہ بیٹھ کر ہی ادا کر لیا کرتے تھے[6]۔

شیخ عبدالحق محدثؒ لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں ان کے والدِ بزرگوار شیخ بہاء الدینؒ اپنے پیر و مرشد شیخ محمد عیسٰی جونپوریؒ کی صحبت میں رہا کرتے تھے تو وہ اُن کے ساتھ

---

۱ اخبار الاخیار ص ۲۲۶ ۲ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۴ ب

۳ منتخب التواریخ حصہ سوم ص ۱۴، ۴ سفینۃ الاولیاء (قلمی) ورق ۱۷۴

۵ تجلی نور جلد اوّل ص ۲۹ ۶ ایضاً، بحر ذخار (قلمی) ورق ۲۹۹ ب

۷ اخبار الاخیار ص ۲۲۶، خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۳۱

ہر نماز باجماعت ادا کیا کرتے اور تکبیرِ اولیٰ ہی میں اُن کے ساتھ شامل ہو جایا کرتے۔ لیکن ایک روز انھیں ایک صاحبزادے کی وفات کا حادثہ پیش آگیا اور وہ اس کی تجہیز و تکفین کی وجہ سے نماز میں بر وقت نہ پہنچ سکے اور صرف آخری رکعت میں تشہد کے وقت پہنچے۔ ان کے پیر و مرشد جب نماز سے فارغ ہوتے تو اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا اِنشاء اللہ تعالےٰ آج کے بعد تمھاری حیات میں تمھارا کوئی بیٹا فوت نہیں ہوگا۔ چنانچہ اسی سال شیخ ادھنؒ پیدا ہوئے اور اللہ تعالےٰ کی رحمت سے ان کی اور اُن کی اولاد کی عمریں بڑی لمبی ہوئیں[1]

ان کی تاریخِ وصال کے متعلق اختلافِ رائے ہے۔ اخبار الاخیار، بحرِ ذخار اور خزینۃ الاصفیاء کے مصنفین ان کا سالِ وفات ۹۷۶ھ/۱۵۶۸ء لکھتے ہیں اور تجلّیِ نور کے مصنّف ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء لکھتے ہیں[2]۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ان کا روضۂ اقدس جونپور شہر کے محلّہ مخدوم شاہ ادھن میں مرجع خلائق ہے[3]۔ اس روضے کی عمارت منعم خاں خانخاناں نے اپنے معتمد خاص مرزا بدو بیگ کی سرکردگی میں بنوائی تھی[4]۔

ان کے خرمنِ کمال سے ہزاروں نے رُوحانی فیض حاصل کیا اور اُن کے مریدوں اور خلفاء نے چشتیہ سلسلہ کی اِشاعت میں نمایاں حصّہ لیا۔ اُن کے ایک اجلّ خلیفہ شیخ محمد ماہ پیرپوریؒ تھے جنھوں نے گجرات میں ارشاد و تلقین کا سلسلہ جاری کیا تھا[5]۔ شیخ ادھنؒ کے صاحبزادے و خلیفہ شیخ قطب الدین چشتی جونپوریؒ (المتوفی ۱۰۷۶ھ) ان کے نبیرہ و خلیفہ شیخ قیام الدین چشتیؒ جونپوری (المتوفی ۱۰۹۳ھ) و شیخ عبدالحی چشتی جونپوریؒ (المتوفی ۱۰۸۱ھ) بھی اپنے دَور کے عظیم المرتبت مشائخ میں سے تھے[6]۔ انھوں نے جونپور اور اس کے گرد و نواح میں چشتیہ سلسلہ سلوک کی بڑی خدمات انجام دیں اور اُن کے جانشین اب تک جونپور میں اس سلسلہ کی تبلیغ و

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۲۶ - خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۳۱

[2] ایضاً بحرِ ذخار (قلمی) ورق ۳۰۰ ا - خزینۃ الاصفیاء ایضاً ص ۴۳۲

[3] تجلّیِ نور جلد اوّل ص ۳۱ [4] ایضاً

[5] بحرِ ذخار (قلمی) ورق ۳۰۰ ب [6] تجلّیِ نور جلد اوّل ص ۳۱

اشاعت میں مصروف ہیں۔[1] ان کے خاندان کے بعض لوگ قصبہ سلون میں بھی رہا کرتے تھے۔[2]

شیخ وجیہہ الدین اشرفؒ المعروف شیخ فرید جونپوریؒ

شیخ وجیہہ الدین اشرفؒ حضرت عمر فاروقؓ کے خاندان سے تھے۔[3] اُن کے دادا حضرت بندگی خلیل عرب سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور جھنجھوارہ میں سکونت اختیار کی۔ وہ وہاں کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔[4] ان کے والد بزرگوار بندگی شیخ قطب اور چچا شیخ نورؒ کی تعلیم بنارس میں ہوئی اور وہ دونوں بھی بڑے عالم اور صاحب باطن بزرگ تھے۔[5] شیخ وجیہہ الدینؒ نے علومِ ظاہری کی تعلیم بنارس میں حاصل کی۔[6] اس کے بعد وہ حضرت شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ کے خلیفہ خواجہ مبارک بنارسیؒ کے مرید ہو گئے۔[7] جو ان کی طرف بڑا التفات فرماتے تھے۔ انھوں نے اُن کو علومِ باطنی کی مکمل تعلیم دی۔ بڑی عبادات و ریاضات کے بعد انھوں نے ان سے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا۔ شیخ مبارکؒ کے بھائی شیخ شمس الحق بدہ حقانی بھی بڑے صاحب باطن بزرگ تھے لیکن انھوں نے شیخ وجیہہ الدین اشرفؒ ہی کو اپنا جانشین مقرر کیا چنانچہ خواجہ مبارک بنارسیؒ کا سلسلہ بعد میں اُن ہی سے قائم ہوا اور انھوں نے اس سلسلہ کی بے حد خدمات کیں۔[8]

انھوں نے چند بار حرمین شریفین کی بھی زیارت کی تھی۔ ابتدائی زندگی میں وہ اپنا تمام تر وقت مجاہدات و ریاضات میں گزارتے۔ بعد میں وہ شادی کر کے جونپور میں آباد ہو گئے اور پھر تادمِ مرگ وہیں اپنے سلسلہ کی اشاعت و تبلیغ میں لگے رہے۔[9] جونپور میں وہ شیخ الاسلام کے

---

1. تجلی نور جلد اول ص ۳۰ — 2. ایضاً
3. بحر ذخار (قلمی) ورق ۲۵۷ ا — 4. ایضاً تجلی نور جلد اول ص ۲۵
5. بحر ذخار ایضاً — 6. ایضاً
7. ایضاً تجلی نور ایضاً — 8. بحر ذخار ایضاً ورق ۲۵۶ ب
9. بحر ذخار ایضاً ورق ۲۵۷ ا۔ تجلی نور ایضاً ص ۲۵-۲۶۔

لقب سے یاد کیے جاتے تھے[۱] ان کا معمول تھا کہ خلوت میں اپنے مریدوں و شاگردوں کو کتب حقائق کا درس دیا کرتے مگر جلوت میں ان باتوں سے بالکل کنارہ کشی اختیار کیے رہتے اور انھوں نے سینکڑوں طالبانِ حق کو صاحبِ ولایت کیا تھا[۲]

ان کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑے شیخ محی الدینؒ تھے جو اس دور کے متبحر علما میں شمار ہوتے تھے۔ دوسرے بیٹے شیخ حبیب اللہؒ تھے جو بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے اور ان کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ ان کے تیسرے بیٹے شیخ ابوالليث تھے جو ہر وقت حالتِ جذب میں پائے جاتے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ دیتے پورا ہو جاتا۔ ان کو مجلسِ سماع کا بے حد شوق تھا۔ چنانچہ ان کا وصال بھی وجد کی حالت ہی میں ہوا۔ ان کا روضۂ اقدس بنارس میں ہے۔ شیخ حبیب اللہ کے بیٹے بندگی شیخ حافظؒ بھی علومِ ظاہری و باطنی کے بہت بڑے عالم تھے اور اپنے والد کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ بڑے صاحبِ کرامات بزرگ تھے اور انھوں نے سینکڑوں کو روحانی فیوض بخشے تھے[۳]

حضرت شیخ فریدؒ کا مزار جونپور شہر کے محلہ شاہ گنج میں ہے[۴]

سیّد علاء الدّین لاجوریؒ

سیّد علاء الدینؒ اس دور کے بڑے صاحبِ کرامات اور شہرہ آفاق بزرگ تھے۔ وہ بڑے عالی نسب سیّد گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت سیّد محمّد گیسو درازؒ کے مرید و خلیفہ تھے[۵] وہ علومِ ظاہری و باطنی کے متبحر عالم تھے اور ان کی باقاعدہ تدریس و تعلیم

---

[۱] بحر ذخار (قلمی) ورق ۲۵۶ ب

[۲] ایضاً ورق ۲۵۷ ا

[۳] ایضاً ورق ۲۵۷ ب - ۲۵۸ ا

[۴] تجلّی نور جلد اوّل ص ۲۶

[۵] ایضاً ص ۴۸

بھی کرتے رہے۔ ان کا اندازِ زندگی کبھی مجذوبانہ اور کبھی سالکانہ پایا جاتا تھا۔ وہ بڑے صاحب ذوق درویش تھے۔ ان کو ہندوستانی موسیقی اور فنِ شعرگوئی میں بھی کامل مہارت تھی [1] شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اخبارالاخیار میں اُن کے مندرجہ ذیل اشعار لطور حوالہ لکھے ہیں :-

ندانم آں گل خنداں چہ رنگ و بو دارد
که مرغ ہر چمن گفتگوئے او دارد
بہ جستجو نیاید کسی مرادِ دلی
کسی مراد بیاید که جستجو دارد
حدیثِ عشق تو تنہا نہ من ہمی گویم
که ہر که ہست ازیں گونہ گفتگو دارد
متاعِ دل بکفِ دلبری بده تو علا
که ایں متاع گرانمایہ رانکو دارد [2]

وہ سوائے یاداللہ اور درس و تدریس کے کوئی دوسرا کام نہ کرتے اور انھوں نے تمام زندگی گوشہ نشینی میں گزار دی۔ انھوں نے سوسال سے زائد عمر پائی اور ۸۷۷ھ/۱۴۷۲ء میں وصال کیا [3] کہا جاتا ہے کہ ان کو تِل بہت پسند تھے اور اب تک جونپور کے لوگ اپنے بچوں کی سالگرہ پر تبرکاً تِلوں پر فاتحہ پڑھ کر لطورِ خیرات دیتے ہیں تاکہ اُن کی طرح ان کے بچوں کی بھی عمر دراز ہو [4]۔ ان کا روضۂ اقدس جونپور شہر کے محلہ بلوا گھاٹ میں ہے [5]

---

[1] تجلّیٔ نور جلد اوّل ص ۴۸-۴۹
[2] اخبارالاخیار ص ۲۲۵، تجلّیٔ نور ایضاً ص ۴۸-۴۹
[3] تجلّیٔ نور ایضاً ص ۴۹
[4] ایضاً
[5] ایضاً

مخدوم شیخ حسن طاہر چشتیؒ

مخدوم شیخ حسن طاہرؒ کے والد بزرگوار کا نام شیخ طاہرؒ تھا اور وہ ملتان کے رہنے والے تھے۔ وہ شوقِ علم میں پہلے دہلی اور پھر جونپور پہنچے جہاں انھوں نے علومِ ظاہری کی تعلیم شیخ بدہ حقانیؒ سے مکمل کی۔ قاضی بہار کی بیٹی ان کی بیوی تھی اس لیے انھوں نے کچھ عرصہ بہار میں بھی قیام کیا۔ بالآخر جونپور چلے آئے اور وہیں اُن کا انتقال ہوا۔[1]

شیخ حسن طاہرؒ کی تعلیم و تربیت جونپور میں ہوئی جہاں انھوں نے نو سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور اٹھارہ برس کی عمر میں تمام علومِ متداولہ کی تعلیم مکمل کر لی۔[2] لیکن ان کو شروع سے ہی طلبِ حق اور درویشوں کی صحبت کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ جب انھوں نے "فصوص الحکم" ایک درویش سے پڑھنی شروع کی تو ان کے والدِ بزرگوار نے انھیں اس کے پڑھنے سے منع کیا کیونکہ وہ اس کے فلسفہ سے اختلاف رکھتے تھے۔ مگر جب والد صاحب نے ان کو مسئلہ توحید کے بارے میں چند سوالات کیے تو انھوں نے بڑے اچھے جوابات دیے اور اس مسئلہ کو اس قدر عمدہ دلائل سے پیش کیا کہ وہ اپنے بیٹے کے گرویدہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد پھر انھوں نے ان کو فصوص الحکم کے مطالعہ سے کبھی نہ روکا۔[3]

اس زمانہ میں حضرت سید راجی حامد شاہ مانکپوریؒ کی دنیائے تصوف میں بڑی شہرت تھی۔ ایک بار جب وہ اپنے تبلیغی دورہ پر جونپور تشریف لائے تو وہ ان کی زیارت کے لیے پہنچے اور چند ہی لمحوں کی ملاقات میں اُن کے ایسے گرویدہ و معتقد ہوئے کہ خود ان کے

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۹۰۔ ذکر جمیع الاولیاء (قلمی) ورق ۶۵۔ بحرِ ذخار (قلمی) ورق ۳۸۶ ب۔ خزینۃ الاصفیا جلد اوّل ص ۴۰۹۔ تجلی نور جلد اوّل ص ۴۱۔ ذکر جمیع الاولیاء اور بحرِ ذخار کے مصنفین لکھتے ہیں کہ وہ ملتان سے بہار پہنچے اور وہاں شیخ بدہ حقانیؒ سے تحصیلِ علم کی۔ لیکن خزینۃ الاصفیاء کے مصنف لکھتے ہیں کہ وہ ملتان سے پہلے دہلی اور پھر بہار پہنچے۔ تجلی نور کے مصنف لکھتے ہیں کہ وہ ملتان سے جونپور پہنچے جہاں انھوں نے شیخ بدہ حقانی سے تحصیلِ علم کی۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے واقعی تحصیلِ علم جونپور میں کی کیونکہ شیخ بدہ حقانی ان دنوں وہیں تھے [2] بحرِ ذخار (قلمی) ورق ۳۸۶ ب [3] ایضاً، اخبار الاخیار، ایضاً۔

حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔[1] پھر اس کے بعد انھوں نے ایک عرصہ تک مجاہدات و ریاضات کیں اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔[2] حضرت سید راجی حامد شاہؒ نے اُن کو کمال الحق کا خطاب عطا فرمایا تھا۔[3] کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے جو عالم ان کے مرید و خلیفہ بنے وہ آپ ہی تھے۔ ایک بار راجی حامد شاہؒ نے اپنے مریدوں سے کہا کہ روزِ محشر اگر مجھ سے یہ پوچھا گیا کہ تم ہمارے لیے کیا تحفہ لائے ہو تو میں کہوں گا کہ ایک فرزند جو شیخ حسنؒ ہیں۔[4]

سلطان سکندر لودھی کو ان سے بڑی غائبانہ عقیدت تھی۔ اس کے بھائی باربک شاہ ان کے مریدوں میں تھے۔ جن دنوں وہ حاکمِ جونپور تھے۔ وہ ان کے پاس آتے اور عرض کیا کہ میرے لیے سلطنتِ دھلی کے حصول کی دُعائیں فرمائیں مگر انھوں نے جواب دیا کہ وہ اس خواہش خام سے باز رہیں۔ اس ملک گیری کی ہوس کو ذہن سے نکال دیں اور اپنے بھائی کے مطیع و فرمانبردار ہو جائیں۔[5] سلطان سکندر لودھی کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ ان کی فراست دیانت کے اور بھی گرویدہ ہو گئے اور جب جونپور کے علاقہ میں دوبارہ پہنچے تو ان سے کٹرہ میں ملاقات کی۔[6] سلطان نے ان کو اس موقعہ پر دھلی آنے کی دعوت دی۔ اور وہ چونکہ پہلے ہی سے مشائخ دھلی کی زیارت کے مشتاق تھے۔ اس لیے انھوں نے اس دعوت کو بخوشی قبول فرمایا۔ لیکن وہ پہلے آگرہ گئے اور پھر مع اہل و عیال کے دھلی پہنچے جہاں اُن کو رہائش کے لیے بدیع منزل عطا ہوئی۔[7] یہ جگہ سلطان محمد بن تغلق کے قلعہ کا ایک حصہ تھی اور بجی منڈل کے نام سے بھی مشہور تھی۔ اس کے بعد پھر وہ تادمِ وصال وہیں رہے۔ ان کا مزار بھی وہیں ہے۔[8] اُن کے بعد پھر ان کے خاندان کے افراد مستقل طور پر وہیں آباد رہے۔[9]

---

۱ بحرِ ذخار (قلمی) ورق ۳۸۶ ب۔ اخبار الاخیار ص ۱۹۰

۲ اخبار الاخیار ص ۱۹۰ ۔ ۳ بحرِ ذخار (قلمی) ورق ۳۸۷ ا ۔ ۴ ایضاً اخبار الاخیار ایضاً

۵ بحرِ ذخار ایضاً ۔ ۶ ایضاً ۔ ۷ ایضاً اخبار الاخیار ایضاً

بجی منڈل کا اصل نام غالباً ویجے منڈل تھا۔ ۸ ایضاً ۔ ۹ ایضاً

اُن کو مجلسِ سماع کا بے حد شوق تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ قوالوں نے ان کی مجلسِ سماع میں مندرجہ ذیل رُباعی گائی ؎

اے ساقی ازاں می کہ دِل و دین منست
پر کن قدحی کہ جانِ شیریں منست
گر ہست شراب خوردن آئین کسی
معشوقہ بجاں خوردن آئین منست[1]

یہ رباعی سُن کر ان پر وجد طاری ہوگیا اور وہ اسی حال میں تین روز تک وجد کرتے رہے یہاں تک کہ تیسرے روز اسی حالت میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ ان کی تاریخِ وصال بروز جمعہ ۲۴ ربیع الاوّل ۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء ہے[2]۔

ان کے خرمنِ کمال سے سینکڑوں ہزاروں نے رُوحانی فیوض حاصل کیے۔ ان کے اجلّ خلفاء میں سے ایک مخدوم بندگی جلال الحق قاضی خان ناصحیؒ ظفرآبادی تھے[3]۔ مخدوم حسن طاہرؒ صاحبِ تصنیف بھی تھے اور اُن کا ایک رسالہ حقائقِ سلوک و توحید پر مفتاح الفیض بڑی پایہ کی تصنیف ہے[4]۔

شیخ حسن طاہرؒ شیخ محمد عیسیٰ چشتی جونپوریؒ کے داماد تھے[5]۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ اُن میں سے سب سے بڑے شیخ محمد حسنؒ معروف بہ شاہ خیالیؒ تھے۔ جو ان ہی کے مرید و خلیفہ تھے اور بڑے صاحبِ کرامات بزرگ تھے، جن کے ایک مرید و خلیفہ، شیخ فضل اللہ دھلویؒ عرف شیخ منجھو بڑے بلند پایہ بزرگ ہوتے اور جنھوں نے ایک رسالہ "احوال آل شیخ حسن طاہر" بھی لکھا تھا۔ مخدوم حسن طاہرؒ کے دُوسرے بیٹے

---

[1] تجلّی نور جلد اوّل ص ۴۴
درق ۳۸۷ و ب
[3] اخبار الاخیار ص ۱۹۰-۱۹۱
[4] ایضاً ص ۴۲-۴۳
[2] ایضاً، بحر ذخار (قلمی) ورق ۳۸۷ ب
[3] ایضاً ورق ۳۸۷ ب
[5] تجلّی نور، ایضاً ص ۴۰

شیخ شاہ محمدؒ تھے جو شیخ امان پانی پتیؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کے تیسرے بیٹے شیخ عبدالعزیزؒ تھے جو مخدوم بندگی جلال الحق قاضی خان ناصحی ظفرآبادیؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے[1]۔ لیکن ان کے چوتھے بیٹے کا اسمِ گرامی معلوم نہیں۔ ان کے وصال کے بعد اُن کی اولاد نے بھی چشتیہ سلسلہ کی ترقی و ترویج کے لیے بڑا کام کیا۔

شیخ محمد حسن چشتیؒ

شیخ محمد حسن چشتیؒ شیخ حسن طاہر چشتیؒ کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے[2] اور شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ کے نواسے تھے[3]۔ پہلے وہ سلسلۂ چشتیہ ہی میں اپنے والدِ بزرگوار کے مرید ہوئے لیکن بعد میں ایک یمنی بزرگ کے مرید ہو گئے اور انھیں سے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا[4]۔ وہ کئی سال تک مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ میں مجاور بھی رہے لیکن جب شیخ عبدالوہاب بخاریؒ دوسری بار حرمین شریفین کی زیارت کے لیے گئے تو ان کو واپس وطن لے آئے[5]۔ اُن کی جائے ولادت اور اصل وطن جونپور تھا مگر وہ زیادہ عرصہ آگرہ ہی میں رہے[6]۔

وہ اس دور کی برگزیدہ ہستیوں میں شمار ہوتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدثؒ لکھتے ہیں کہ جب وہ حجرۂ عبادت سے باہر نکلتے تو ان کا چہرۂ مبارک پُر نور ہوتا اور جس کی ہندو یا مسلمان کی نظر ان پر پڑ جاتی وہ بے اختیار اللہ اکبر کہہ اُٹھتا۔ ان کا معمول تھا کہ وہ نمازِ عصر اور نمازِ مغرب کے درمیان آسمان کی طرف اس طرح منتظر نگاہوں سے دیکھتے رہتے کہ جیسے کسی کو اپنے محبوب کا انتظار ہو اور جونہی شام ہوتی وہ اپنے حجرۂ عبادت میں شمع جلا کر ہمہ تن عبادت میں مصروف

---

[1] بحرِ ذخار (قلمی) ورق ۳۸۷ ب - ۳۸۸ ا
[2] اخبار الاخیار ص ۲۰۸
[3] اخبار الاخیار ایضاً۔ تجلیِ نور جلد اوّل ص ۴۲
[4] ریاض الاولیاء (قلمی) ورق ۱۱۳ ا
[5] اخبار الاخیار ایضاً
[6] ایضاً

ہو جایا کرتے[1]

شیخ عبدالحق محدثؒ لکھتے ہیں کہ وہ علمی موضوعات پر اکثر لکھتے رہتے اور جب کوئی تحریر مکمل ہو جاتی تو اس کو جلا دیتے یا پھاڑ کر پھینک دیتے۔ مگر پھر بھی انھوں نے کئی مذہبی رسالے یادگار چھوڑے[2] ان کے مریدوں نے اُن کے بعض مکتوبات کو بھی جمع کیا[3]۔ وہ شعر بھی کہتے[4]۔ اور اُن کے بعض مرید اُن کو شاہ خیالیؒ کے لقب سے یاد کرتے[5]۔ ان کے دامنِ کمال سے بے شمار لوگوں نے رُوحانی فیوض حاصل کیے۔ اُن کے اجلّ خلفاء میں سے ایک شخص فضل اللہ دہلوی عرف شیخ منجھوؒ بڑے ذی مرتبہ بزرگ تھے[6]۔ وہ شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کے منجھلے ماموں تھے اور وہ اُن سے والہانہ محبّت کرتے تھے[7]۔

اُن کے ایک اور نامور مرید و خلیفہ شیخ امان پانی پتیؒ تھے اور جن کے مرید و خلیفہ شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کے والدِ بزرگوار شیخ سیف الدینؒ تھے[8]۔

ان کا وصال ۹۴۴ھ/ ۱۵۳۷ء میں ہوا اور وہ دہلی میں اپنے والدِ بزرگوار کے مزار کے پہلو میں دفن ہوئے[9]۔

شیخ عبدالعزیز چشتیؒ

شیخ عبدالعزیزؒ بن شیخ حسن طاہرؒ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اور مخدوم بندگی جلال الحق قاضی خاں ناصحیؒ ظفرآبادی کے اجل خلفاء میں سے تھے[10]۔ ان کو علوم شریعت و

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۲۸
[2] ایضاً
[3] ایضاً
[4] ایضاً
[5] ایضاً
[6] ایضاً
[7] ایضاً
[8] خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل ص ۴۲۴ - ۴۲۵
[9] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۱۶ تجلّی نور جلد اوّل ص ۴۲
[10] تجلّی نور جلد اوّل ص ۴۳ - ۴۴

طریقت پر مکمل عبور حاصل تھا[1] اور وہ سلسلہ چشتیہ کے اپنے زمانہ کے بڑے عظیم المرتبت مشائخ میں سے تھے۔

ان کی ولادت جونپور میں ہوئی (۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء) لیکن ابھی وہ ڈیڑھ سال ہی کے تھے کہ اپنے والدِ بزرگوار کے ساتھ دھلی چلے گئے اور پھر تا دمِ وصال وہیں رہے[2]۔ دھلی میں وہ اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ مشہور و معروف اور ھر دل عزیز صوفی تھے۔ وہاں ہر کوئی ان کے علم و تقدس اور تواضع کا گرویدہ تھا[3]۔ شیخ عبدالحق محدثؒ اُن کے متعلق لکھتے ہیں:

"در زمان خود یادگار مشائخ چشت بود و در دھلی وجود او سلسلۂ ارشاد و مشیخت برپا بود[4]۔"

اُن کو بچپن ہی سے عبادت و ریاضت کا بے حد شوق تھا اور عالی مراتب پر پہنچنے کے بعد بھی اُن کا وہی معمول رہا۔ کہا جاتا ہے کہ عالمِ جوانی میں ان پر جس کسی کی نظر پڑ جاتی وہ اُن کا متوالا ہو جاتا[5]۔ اُن کو مجلسِ سماع کا بے حد شوق تھا چنانچہ اُن کا وصال بھی وجد کی حالت ہی میں ہوا اور انھوں نے مندرجہ ذیل آیت سنتے سنتے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی:

فَسُبْحَانَ الَّذِی بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ -

ان کا وصال ۱۶ رجمادی الاوّل ۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء کو ہوا[6]۔

اُن کا مزارِ اقدس دھلی میں اُن کی خانقاہ کے صحن میں ہے[7]۔

وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مثلاً انھوں نے شیخ امان پانی پتی کے رسالہ غیریہ کے

---

[1] تجلی نور جلد اوّل ص ۴۳-۴۴ اخبار الاخیار ص ۲۷۴ [2] ایضاً ص ۲۷۵
[3] ایضاً ص ۲۷۴-۲۷۵ [4] ایضاً ص ۲۷۵
[5] ایضاً ص ۲۷۵
[6] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۲۸
[7] تجلی نور جلد اوّل ص ۴۴

جواب میں رسالہ عینیہ لکھا، اور علم سلوک کے متعلق آداب وسلوک بھی تصنیف کی[1]

ان کے بیٹے شیخ قطب عالمؒ بھی بڑی خوبیوں کے مالک اور عالم و فاضل درویش تھے وہ ان کے وصال کے بعد سجادہ نشین ہوئے تھے[2] ان کے اجل خلفاء میں سے ایک شیخ جاندؒ بھی تھے جو بڑے ذی مرتبہ بزرگ تھے اور جن کو لوگ صحیح معنوں میں اُن کا رُوحانی جانشین سمجھتے تھے[3] ان کے ایک اور خلیفہ شیخ عبدالغنی بدایونیؒ تھے جو علم و عمل اور ریاضت و فقر میں بڑی شہرت کے مالک تھے[4] شیخ عبدالحق محدثؒ بھی ان کے بے حد معترف تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان کی شان میں یہ قطعہ لکھا تھا۔

شیخ کامل عارف دوران خود عبدالعزیز
آنکہ می داد اہل دل را مجلس یاد از بہشت
ہرچہ از اوصاف اہل اللہ در عالم بود
حق تعالیٰ ز اوّل فطرت بذات او سرشت
یادگار اہل چشت او بود در دوران خود
گشت ازاں تاریخ نوتش یادگار اہل چشت[5]

تجلی نور کے مؤلف لکھتے ہیں کہ قصبہ بلگرام کے سادات کا تعلق ان سے ان کے داماد سید حسین بلگرامیؒ کے واسطہ و تعلق سے ہے[6]

---

[1] ردِ کوثر ص ۷۰
[2] اخبار الاخبار ص ۲۷۵۔ شیخ قطب عالمؒ کی پوتی حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کی دادی تھیں۔ ردِ کوثر ص ۱
[3] اخبار الاخیار ایضاً
[4] ایضاً [5] ایضاً
[6] تجلی نور ایضاً ص ۴۴

مخدوم بندگی شیخ معروفؒ

مخدوم بندگی شیخ معروفؒ کی ولادت جونپور میں ہوئی[1]۔ ان کے والد بزرگوار شیخ عارفؒ شیر سوار شیخ جلال بخاریؒ کی اولاد میں سے تھے، وہ اپنے وطن سے ہجرت کر کے جونپور چلے آئے اور پھر تمام زندگی وہیں رہے۔ وہ بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے ان کا مزار جونپور کے قریب موضع بکھریا پور میں الہ آباد روڈ پر واقع ہے[2]۔

شیخ معروفؒ نے علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل مولانا الہ داد جونپوریؒ سے کی اور انہی کے مرید و خلیفہ بھی تھے[3]۔ وہ ہر وقت ریاضت و عبادت میں مصروف رہتے انھوں نے تیس سال تک گوشہ نشینی اختیار کیے رکھی[4]۔ وہ اس دور کے عالی مرتبت بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا روضۂ اقدس شہر جونپور کے محلہ خالص پور میں ہے۔ اور محلہ چارسو کے شیوخ ان ہی کی اولاد ہیں[5]۔

ان کے بے شمار خلفاء تھے جن میں سے شیخ نظام الدین امیٹھویؒ[6] اور شیخ احمد زین جونپوریؒ[7] بڑے بلند مرتبت بزرگ تھے۔

ان کے نبیرہ خواجہ شیخ قطب الدینؒ بھی عالی مرتبت بزرگ تھے اور وہ بھی ان ہی کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کے بھی سینکڑوں مرید تھے۔ ان کا مزار بھی شیخ معروفؒ کے مزار کے پائین میں ہے[8]۔ ان کے بیٹے خواجہ شیخ ابو سعید چشتیؒ بھی بڑے بلند پایہ عالم و صوفی تھے اور وہ بھی اپنے والد بزرگوار ہی کے مرید و خلیفہ تھے[9]۔ وہ علوم ظاہری

۱۔ تجلی نور جلد اول ص ۵۱
۲۔ اخبار الاخبار ص ۱۹۲
۳۔ ایضاً
۴۔ ایضاً ص ۱۹۲ و ۲۷۷ ہے لیکن سال وفات معلوم نہیں۔
۵۔ ایضاً
۶۔ ایضاً
۷۔ اخبار الاخبار ص ۲۷۷
۸۔ تجلی نور ایضاً ان کی تاریخ وصال ۴ صفر المظفر
۹۔ تجلی نور جلد اول ص ۵۲

کی تدریس بھی کرتے رہے لیکن زیادہ تر وقت گوشہ نشینی ہی میں گزارتے۔ ان کا وصال ۱۴ صفر المظفر کو ہوا لیکن سالِ وفات معلوم نہیں ہو سکا۔ ان کا مزار بھی اپنے والدِ بزرگوار کے مزار کے پاس ہے[۱]

مخدوم شاہ سیّد اسماعیلؒ

مخدوم شاہ سیّد اسماعیلؒ سیّد محمد جونپوریؒ کے بھائی سیّد احمد خضریؒ کی اولاد میں سے تھے۔ انھوں نے علومِ باطنی کی تعلیم بھی سیّد احمد خضریؒ ہی سے حاصل کی تھی[۲] وہ اپنے دور کے ممتاز بزرگوں میں شمار ہوتے تھے اور صاحبِ رضا و تسلیم مانے جاتے تھے[۳] اپنا تمام تر وقت ریاضات و مجاہدات میں گزارتے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس قدر مجاہدات کیے کہ اسی حالت میں جان بحق ہوتے۔ جس جگہ پر اُن کا انتقال ہوا۔ ازراہِ عقیدت وہیں دفن کر دیے گئے تھے[۴] ان کا سالِ وصال معلوم نہیں ہو سکا۔ ان کے خاندان کے لوگ جونپور کے محلّہ دریبہ اور کج گاؤں میں رہا کرتے تھے[۵]

سیّد عثمان شیرازیؒ

سیّد عثمان شیرازیؒ کا اصل وطن شیراز (ایران) تھا[۶] جہاں سے وہ ہجرت کر کے پہلے دھلی پہنچے اور پھر دھلی سے امیر تیمور کے حملہ کی وجہ سے سُلطان ابراھیم شرقی کے عہد میں جونپور چلے آتے[۷] وہ علومِ ظاہری و باطنی کے متبحر عالم تھے اور بڑے عالی مرتبہ بزرگ اور بے نظیر صوفی و درویش تھے[۸] سلطنتِ شرقی کے دو اُمراء ملک

---

۱ تجلی نور جلد اوّل ص ۵۲
۲ ایضاً ص ۴۹
۳ ایضاً ص ۴۹
۴ ایضاً ص ۴۹
۵ ایضاً ص ۴۹-۵۰
۶ ایضاً ص ۴۵
۷ ایضاً
۸ ایضاً

خالص و ملک مخلص اُن کے خاص مریدوں میں سے تھے جنھوں نے ان کی عقیدت میں ایک مسجد بھی تعمیر کروائی تھی جو جونپور کے محلہ دریبہ میں اب تک موجود ہے اور مسجد خالص مخلص کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسجد شرقی فنِ تعمیر کا ایک شاہکار مانی جاتی ہے[1]۔ ان کا مزار بھی اسی مسجد کے صحن میں ہے[2]۔ ان کا سالِ وصال معلوم نہیں ہو سکا۔ ان کے خاندان کے لوگ بھی محلہ دریبہ میں رہا کرتے تھے[3]۔

مخدوم سیّد علی داؤدؒ

مخدوم سیّد علی داؤدؒ کا شجرۂ نسب حضرت سیّد حسین اصغر بن حضرت امام زین العابدینؓ سے ملتا ہے[4]۔ وہ علومِ ظاہری و باطنی کے متبحر عالم تھے اور رموزِ صوری و معنوی سے پوری طرح واقف تھے[5]۔ بڑے حق پرست صوفی تھے اور اس دور کے عظیم المرتبت بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔ سلطان محمود شاہ شرقی کی ملکہ بی بی راجی ان کے خاص مریدوں میں سے تھیں اور اُن سے والہانہ عقیدت رکھتی تھیں[6]۔ اس نے ان کے آرام و آسائش کے لیے ایک عالی شان مسجد بھی تعمیر کروائی جو لال دروازہ مسجد کے نام سے مشہور ہے اور شرقی فنِ تعمیر کی عمدہ مثال مانی جاتی ہے[7]۔ ملکہ نے ان کے لیے ایک خانقاہ بھی تعمیر کروائی تھی جس میں اُن کی رہائش بھی تھی اور جہاں وہ اپنے مریدوں کو ارشاد و تلقین کیا کرتے تھے[8]۔ ملکہ بی بی راجی نے اُن کے نام کا ایک گاؤں بھی آباد کیا تھا جو اب تک موجود ہے اور سیّد علی پور کے نام سے مشہور ہے[9]۔ ان کے صاحبزادے مخدوم شاہ جنیدؒ اور شاہ عبد القادرؒ بھی بڑے ذی مرتبت بزرگ

---

[1] تجلی نور جلد اوّل ص ۴۵۔
[2] ایضاً
[3] ایضاً ص ۴۶
[4] ایضاً
[5] ایضاً ص ۴۶
[6] ایضاً
[7] ایضاً ص ۴۵
[8] ایضاً ص ۴۵ - ۴۶
[9] ایضاً ص ۴۶

تھے اور وہ دونوں بھی ان ہی کے مرید و خلیفہ تھے[1] مخدوم شاہ جبیرؒ نے اپنے نام کا ایک گاؤں بھی آباد کیا تھا جو شاہ جبیر پور کے نام سے مشہور ہے اور اب تک موجود ہے[2] اسی گاؤں میں اُن کے خاندان کے لوگ اب بھی آباد ہیں[3] مخدوم شاہ عبدالقادرؒ محلہ لال دروازہ میں رہا کرتے تھے اور لال دروازہ کے سادات انہی کی اولاد میں سے ہیں[4]

حضرت سید علی داؤدؒ کا روضۂ اقدس موضع سید علی پور میں ہے[5] لیکن ان کا سالِ وصال معلوم نہیں ہو سکا۔

مخدوم بندگی شاہ لُطف اللہؒ

مخدوم بندگی شاہ لُطف اللہؒ میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے اجلّ خلفا میں سے تھے[6] اور خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد جونپور میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ تمام عُمر وعظ و تلقین میں مصروف رہے[7] علومِ شریعت کے وہ بڑے متبحر عالم تھے اور رموزِ طریقت اور اسرارِ حقیقت سے بھی پُوری طرح واقف تھے[8] ان کو مجلسِ سماع کا بے حد شوق تھا اور جب ان پر وجد طاری ہو جاتا تو ان کی کیفیت بڑی پُر اضطراب ہو جاتی۔ کہا جاتا ہے کہ اس حالت میں جس کسی پر ان کی نظر پڑتی وہ مست و بے خود ہو جاتا[9] ان کے سینکڑوں ہزاروں مرید تھے جنھوں نے ان کے خرمنِ کمال سے رُوحانی فیوض حاصل کیے[10] ان کی تاریخِ وصال معلوم نہیں لیکن ان کا مزار جونپور شہر کے محلہ حمام دروازہ میں ہے[11] ان کے خاندان کے لوگ بھی پہلے وہیں رہا کرتے تھے لیکن اب اُن میں سے وہاں کوئی باقی نہیں رہا[12]

---

[1] تجلی نور جلد اوّل ص ۴۶ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً
[7] ایضاً [8] ایضاً [9] ایضاً [10] ایضاً [11] ایضاً [12] ایضاً

مخدوم سیّد صدر الدّین شاہ زاہدؒ

مخدوم سید صدر الدین شاہ سیدو کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ وہ پہلے کسی بادشاہ کی ملازمت میں تھے اور بڑے دولت مند تھے[1] لیکن جب عشقِ حقیقی نے کشش کی تو تمام دولت اللہ کی راہ میں لٹا کر شیخ حسام الدین مانکپوریؒ کے مرید و خلیفہ ہو گئے۔ ان سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد وہ جونپور چلے آئے اور باقی تمام زندگی ارشاد و تلقین میں گزار دی[2]۔ ان کو سلسلۂ زاہدی سے بھی رُوحانی فیض حاصل تھا اور اُنھوں نے خُود بھی سینکڑوں کو روحانی فیض بخشا تھا[3]۔ وہ مجلسِ سماع کے بے حد شوقین تھے اور بڑے پُرگو شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری کا موضوع عشق و محبّت تھا اور اُن کا مندرجہ ذیل شعر اُن کے فکرِ لطیف کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے ؎

دل گویدم سیدو بگو احوال خُود یکیک باد
آندم کہ خود می آید او سیدو کجا گفتار گو[4]

شیخ محدثؒ لکھتے ہیں کہ صوفیانہ مشرب اختیار کرنے سے پیشتر وہ ایک عورت پر فدا تھے اور جب اُنھوں نے جامۂ فقر اوڑھ لیا تو پھر ایک بار اُن کی ملاقات اس عورت سے ہُوئی۔ اس عورت نے ان کی حالت دیکھ کر پھبتی کسی اور کہا سیدو تم تو الٰہیہ ہو گئے اس دور میں فقیر حال آدمی کو الٰہیہ کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ لیکن اس ملاقات کے بعد وہ ان کی ایسی گرویدہ ہُوئی کہ اس نے بھی فقیری اختیار کر لی[5]۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۸۹
[2] ایضاً
[3] ایضاً
[4] ایضاً
[5] ایضاً

سید راجی حامد شاہؒ اُن کے پیر بھائی تھے اور اُن کی طرح انھیں بھی مجلس سماع کا بے حد شوق تھا۔ اُن کے ایک بھائی سیّد بدرالدین بدر عالم زاہدیؒ بھی بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ اُن کا مزار بہار شریف میں ہے[1] مخدوم سیّد صدرالدین (شاہ زاہدیؒ) کا وصال ۵ رمضان المبارک ۹۳۳ھ/۱۵۲۶ء میں ہوا اور ان کا روضۂ اقدس جونپور شہر کے محلہ ملاٹولہ کے قریب ہے[2] ان کے خاندان کے لوگ پہلے جونپور ہی میں رہا کرتے تھے لیکن اب وہاں نہیں رہے۔

شاہ اجمیری چشتیؒ

شاہ اجمیری چشتیؒ شرقی عہد میں دہلی سے ہجرت کر کے جونپور آئے اور شہر کے جس محلہ میں آباد ہوئے وہ اُن کے نام پر مشہور ہو گیا۔ وہ تمام عمر اسی محلّہ میں آباد رہے اور وصال بھی وہیں فرمایا[3]۔

وہ بڑے عالی مرتبہ بزرگ تھے۔ ان کے حالات کی مزید تفصیلات دستیاب نہیں ہو سکیں لیکن ان کے خاندان کے لوگ اب تک جونپور میں آباد ہیں[4]۔

مخدوم سیّد شاہ محمدؒ

مخدوم سیّد شاہ محمدؒ کا اصل وطن عرب تھا[5]۔ ان کے جدِ اعلیٰ سلطان غیاث الدین تغلق کے عہدِ حکومت میں دہلی آئے اور دہیں مقیم ہو گئے[6]۔ انھوں نے اپنے بڑے بھائی سیّد اسماعیل کے ساتھ کتب درسیہ اور علومِ ظاہری کی تکمیل دہلی کے مشہور اساتذہ

---

[1] تجلی نور جلد اوّل ص ۵۲
[2] ایضاً لیکن اخبار الاخیار کے مؤلف اُن کا مزار فتح پور ہنسورہ میں لکھتے ہیں۔ جو کڑہ مانکپور کے قریب ہے۔
[3] تجلی نور جلد اوّل ص ۵۰
[4] ایضاً ص ۵۰-۵۱
[5] فیوض الابرار (قلمی)
[6] ایضاً

سے کی[1]۔ اس کے بعد علم باطن کی تکمیل حضرت مولانا خواجگیؒ سے کی اور حضرت مخدوم جہانیاںؒ سے بھی بہت رُوحانی فیض حاصل کیا[2]۔ امیر تیمور کے حملہ کے وقت وہ بھی اپنے بڑے بھائی سیّد اسماعیلؒ کے ہمراہ جون پور چلے آئے[3]۔ مخدوم شاہ محمدؒ عظیم المرتبت اولیائے کرام میں سے تھے اور سلطان ابراہیم شرقیؒ ان کی بے حد قدر و منزلت کرتے تھے[4]۔ ان کے خرمن کمال سے سینکڑوں نے رُوحانی فیوض حاصل کیے۔ وہ بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے[5]۔ اُن کے بھائی سیّد اسماعیلؒ بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ ان کا مزار جونپور میں گڈھی پر سڑک کے کنارے ایک وسیع چبوترے پر بنا ہوا ہے[6]۔ مخدوم شاہ محمدؒ کا مزار اٹالہ مسجد اٹالہ کے پورب میں لب سڑک واقع ہے[7]۔

کہا جاتا ہے کہ ان کے بزرگوں کے تعلقات سلاطین تغلق کے ساتھ بہت اچھے رہے اور غالباً ان کے جدِ امجد یا والد بزرگوار مولانا ظہیرالدین سلطان محمد تغلق شاہ کے استاد تھے[8]۔

سیّد علی قوام چشتی جونپوریؒ

سیّد علی قوام چشتیؒ کا تعلق سوانہ کے سادات سے تھا لیکن جب وہ تلاش حق میں جونپور پہنچے تو شیخ بہاءالدین جونپوریؒ کے مرید ہو گئے اور ان سے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا[9]۔ وہ بڑے عظیم المرتبت مشائخ میں سے تھے لیکن ہمیشہ ایک ہی حالت میں نہ رہتے۔ کبھی خرقۂ خلافت پہن لیتے اور کبھی سپاہیانہ لباس زیب تن کر لیتے۔

[1] فیوض الابرار (قلمی)
[2] ایضاً
[3] ایضاً
[4] ایضاً
[5] ایضاً
[6] ایضاً
[7] ایضاً
[8] ایضاً
[9] اخبار الاخیار ص ۲۲۵۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۲۲، گلزار ابرار ص ۲۰۸
[10] اخبار الاخیار ایضاً۔ گلزار ابرار ص ۲۰۸۔ ۲۰۹

ان کی چار بیویاں اور بہت سے عزیز و اقارب تھے اور انھوں نے سب کا باقاعدہ وظیفہ مقرر کر رکھا تھا۔ ان کے ہاں ہر روز فتوح جمع ہوتے تھے، جن میں سے آدھے وہ اپنی ازواج کو اور آدھے اپنے وظیفہ خواروں کو بانٹ دیا کرتے تھے[1]

کہا جاتا ہے کہ انھوں نے چالیس سال تک اپنے کسی خادم کو کبھی کسی قسم کا حکم نہ دیا۔ ایک رات وہ سوئے ہوئے تھے کہ شدید پیاس سے تڑپ اٹھے۔ انھوں نے اِدھر اُدھر ہاتھ مارا لیکن پانی کا پیالہ جو حسبِ معمول ان کے پاس رکھا جاتا تھا نہ ملا کیونکہ خادم اس کو اس رات رکھنا بھول گیا تھا۔ بالآخر وہ تشنگی اور کمزوری سے دم توڑنے لگے۔ لیکن پھر بھی کسی کو پانی پینے کے لیے آواز نہ دی۔ ایک بار پھر بیہوشی میں جب انھوں نے پانی کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس دفعہ رحمتِ ایزدی سے پانی کا پیالہ ہاتھ میں آگیا۔ انھوں نے اس کو پیا اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا[2]۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ رسولِ خدا مجھے اکثر خواب میں تلقین و ہدایت فرمایا کرتے ہیں[3]۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ میرے والد بزرگوار بھی ان سے ملے تھے اور انھوں نے ان سے باتیں بھی کیں لیکن وہ فرماتے تھے کہ ان کی طبیعت میں بڑا ذوق و عرفان تھا اور گفتگو بڑی محبت و خلوص سے کیا کرتے تھے[4]۔ ان کا وصال ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء میں ہوا اور ان کا روضۂ اقدس جونپور میں ہے[5]۔

شیخ حمزہ چشتیؒ

شیخ حمزہؒ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ ملتانی کے خاندان سے تھے[6]۔ ڈبہائے تصوف

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۲۵ - خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۴۲۲

[2] اخبار الاخیار ص ۲۲۵-۲۲۶ - خزینۃ الاصفیاء ایضاً ص ۴۲۳-۴۲۴

[3] اخبار الاخیار ایضاً

[4] اخبار الاخیار ایضاً

[5] تجلی نور جلد اول ص ۵۲

ہیں وہ سیّد محمدؒ گیسو دراز بندہ نوازؒ کے مرید و خلیفہ تھے اور بڑے صاحب کرامات اور عظیم المرتبت بزرگ تھے[1]۔ وہ اپنا تمام تر وقت عبادت و ریاضت میں گزارتے۔ پہلے وہ کسی بادشاہ کے ہاں ملازم تھے اور رات کو کسی سرائے کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ ایک روز اچانک دِل میں خیال آیا کہ کسی ایسی ھستی کی خِدمت کیوں نہ کی جائے جو حقیقت میں اس کی اہل ہو[2]۔ چنانچہ پہلے وہ اجمیر شریف پہنچے اور آستانہ اجمیری سے روحانی فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد شیخ احمد مجدّد شیبانیؒ کی صحبت میں وقت گزرا اور بالآخر سیّد محمد گیسو دراز بندہ نوازؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو کر منزلِ مقصود کو پہنچے[3]۔

وہ جونپور میں اس زمانہ میں تھے جن دِنوں سلطان حسین شاہ شرقی اپنی کھوئی سلطنت کو حاصل کرنے کی کوشش میں تھا اور باربک شاہ جونپور کا حاکم تھا[4]۔ ان کا وصال ۵ ربیع الاوّل ۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء کو ہوا۔ ان کا روضہ اقدس جونپور کے محلہ پھپٹیا میں ہے[5]۔

مخدوم شیخ دانیال خضریؒ

مخدوم شیخ دانیال خضریؒ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہٗ کے خاندان سے تھے[6]۔ ان کے والدِ بزرگوار کا اسم گرامی شیخ حسن ابن حسام الدین بلخی تھا[7]۔ اُن کے ملفوظات مقالاتِ خضرویہ کے نام سے پائے جاتے ہیں جو اُن کے ایک خلیفہ شیخ میر سیّد احمد بن عبداللہ چشتیؒ نے جمع کیے تھے۔ اِس کتاب میں لکھا ہے کہ وہ بلخ میں پیدا ہوئے اور بہت خوشحال تھے لیکن بعد میں نامساعد حالات کی بنا پر ہجرت کر کے دہلی چلے آئے اور کئی سال تک شاہی ملازمت میں رہے[8]۔ مگر جب عشقِ حقیقی نے غلبہ پایا تو گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ پھر

---

١ تجلّیٔ نور جلد اوّل ص ۵۲
٢ ایضاً ٣ ایضاً
٦ تجلّیٔ نور ایضاً ص ۵۵

٤ ایضاً
۵ ایضاً ص ۵۴
۷ ایضاً ٨ ایضاً ص ۵۵-۵۶

کچھ عرصہ بعد بنارس چلے گئے اور وہاں پر ہر روز سورۂ مزّمل کا ۴۰ مرتبہ وظیفہ فرماتے رہے تا کہ اللہ تعالےٰ غیب سے کوئی ھادی و رہبر ملا دے[1]۔ چنانچہ ایک روز جبکہ وہ وظیفہ فرما رہے تھے۔ اُن کے پاس ایک بزرگ ظاھر ہوئے جنھوں نے ان کو بعض اذکارِ باطنی سکھائے۔ پھر کچھ عرصہ بعد انھوں نے ان کو خرقہ خلافت بھی عطا فرمایا۔ اس موقعہ پر اس بزرگ نے انھیں بتایا کہ میں خضرؑ ہوں اور تمھاری رُوحانی تربیت کے لیے آتا رہا ہوں۔ تا کہ تم کو خدا تک رسائی حاصل ہو[2]۔ اس کے بعد وہ جونپور چلے آئے اور پھر تا دمِ وصال وہیں رہے[3]۔ لیکن مفتی غلام سرور لاہوری مؤلف خزینۃ الاصفیاء لکھتے ہیں کہ وہ سید راجی حامد شاہؒ کے مرید و خلیفہ تھے[4]۔ اُن کو حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجریؒ سے بھی بڑا روحانی فیض حاصل ہوا تھا اور خواجہ صاحب ہی نے ان کو خواجہ خضر علیہ السّلام کے متعلق روحانی اشارہ فرمایا تھا[5]۔ مخدوم دانیالؒ کے مندرجہ ذیل ہندی اشعار بھی اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں ؎

جُگ جُگ عمر حضرت جی خواجیؒ
حضرت بنیؐ رسول نوا جی
دانیال جیو پر گھٹ کینا
حضرت خواجہ خضرؑ ہنستہ د بنا[6]

ان کا شمار اپنے دور کے عظیم المرتبت مشائخ میں ہوتا تھا۔ وہ بڑے صاحبِ حال اور صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے۔ وہ علومِ ظاہری کے بڑے متبحر عالم تھے اور ان کی درس و تدریس بھی کرتے رہے[7]۔ ان کے بعض شاگرد نامور زمانہ ہوئے جن میں سے ایک سید

---

[1] تجلّیٔ نور جلد اوّل ص ۵۵-۵۶ [2] ایضاً ص ۵۶ [3] ایضاً ص ۵۶ [4] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۴۲۔
[5] تجلّیٔ نور جلد اوّل ص ۵۶ [6] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۴۳
[7] تجلّیٔ نور جلد اوّل ص ۵۶

محمد جونپوریؒ تھے اور دوسرے ان کے بھائی سید احمد خضریؒ تھے۔ دونوں بھائیوں نے علومِ ظاہری کے علاوہ علومِ باطنی کی تعلیم بھی ان ہی سے حاصل کی تھی اور وہ ان ہی کے مرید و خلیفہ بھی تھے[۱]۔ وہ تمام عمر مجرّد رہے۔ سید احمد خضریؒ ان کی وفات کے بعد ان کی جگہ سجّادہ نشین ہوئے[۲]۔ سید احمد خضریؒ بڑے بلند پایہ عالم و صوفی تھے۔ ان کی وفات کے بعد اُن کی اولاد بھی اپنے نام کے ساتھ خضری لکھتی رہی۔ ان کے خاندان کے لوگ اب تک جونپور میں آباد ہیں[۳]۔

مخدوم دانیالؒ سلطان حسین شاہ شرقی کے زمانہ میں جونپور پہنچے۔ وہ اس عہد کے بڑے مقبول و معروف بزرگ تھے۔ ان کے خرمنِ کمال سے ہزاروں نے روحانی فیوض حاصل کیے[۴]۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی وفات سے پہلے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ میں ۱۳ ربیع الاوّل کو انتقال کروں گا اور مجھے میری خانقاہ کے صحن میں حجرۂ عبادت میں دفن کیا جائے۔ یہ بھی وصیت کی کہ میں جو کفنی بطورِ گلوبند استعمال کرتا ہوں اسے بطورِ کفن کے استعمال کیا جائے اور جو چادر مجھے پیر و مرشد حضرت خضرؑ نے عنایت فرمائی تھی اسے اوپر بچھا کر لحد میں اتارا جائے۔ چنانچہ ان کا وصال تاریخ مذکورہ ۱۳ ربیع الاوّل ۹۹۱ھ / ۱۵۸۵ء کو ہی ہوا اور وہ حسبِ وصیت اسی حجرۂ عبادت میں سپردِ خاک کیے گئے[۵]۔ ان کا روضۂ اقدس جونپور میں حوضِ خاص کے ٹیلہ کے قریب ہے[۶]۔

۱۔ تجلّی نور جلد اوّل ص ۵۷۔ سید محمد جونپوری کے تفصیلی حالات آئندہ صفحات پر ملاحظہ ہوں۔
۲۔ ایضاً ص ۵۷۔ شیخ احمد خضریؒ کا مزار جونپور کے محلہ دریبہ میں امام باڑہ حکیم محمد باقر کے پاس ہے۔
۳۔ ایضاً ص ۵۷
۴۔ ایضاً ص ۵۷
۵۔ ایضاً ص ۵۶ - ۵۷

باب ۳ سوم

چشتیہ مشائخ مانکپور

شیخ حسام الدین مانکپوریؒ

شیخ حسام الدینؒ کا شمار ہند و پاکستان کے عظیم المرتبت مشائخ میں ہوتا ہے۔ ان کے والد بزرگوار مولانا خواجہ مانکپوریؒ اور اُن کے دادا بزرگوار مولانا جلال الدین مانکپوریؒ بھی بڑے عالم و فاضل اور متقی بزرگ تھے[۱] موخر الذکر حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ شیخ محمدؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ ساری ساری رات عبادت و ریاضت میں منہمک رہتے۔ ہر روز اکتالیس بار سورۂ یٰسین کا وظیفہ کرتے۔ اور نماز فجر کے بعد درس و تدریس کا کام بھی کرتے۔ وہ اپنی روزی قرآن مجید کی کتابت سے کماتے اور قلم کبھی بغیر وضو کے نہ اٹھاتے۔ قرآن مجید لکھ کر وہ دہلی بھیج دیتے۔ جس کا ہدیہ انھیں پانچ سونگہ مل جاتا اور اس رقم سے ان کی گزر اوقات ہوتی[۲]

شیخ حسام الدینؒ نے جب علوم ظاہری و باطنی کی تعلیم مکمل کر لی تو وہ پنڈوہ جا کر حضرت نور قطب عالمؒ کے مرید ہو گئے اور بالآخر ان کے اجل خلفا میں سے ہوئے حضرت نور قطب عالمؒ ان کی اس قدر تعظیم و توقیر کرتے کہ جب اُن کے فرزند ارجمند مسند خلافت پر بیٹھے تو اس کو آپ ہی کے دست مبارک سے خرقہ خلافت پہنوایا۔ اس کے بعد پھر حضرت نور قطب عالمؒ کے خاندان کا بھی یہی معمول رہا اور ان کے بیٹے اور

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۷۳

[۲] ایضاً ص ۱۷۱ و ۱۷۳، مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۲ ب، ریاض الاولیاء (قلمی) ورق ۱۱۱ ب
اخبار الاصفیاؒ (قلمی) ورق ۲۴-۲۵

جانشین ہمیشہ شیخ حسام الدینؒ کے جانشینوں کے ہاتھوں سے خرقۂ خلافت پہنتے رہے[۱]۔

شیخ حسام الدین نے جب پنڈوہ سے مانکپور آکر اپنے سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت شروع کی تو بے شمار لوگ اُن کے رُوحانی فیوض سے شاد کام ہوتے۔ ان کے کثیر التعداد خلفاء تھے، جن میں سے مخدوم راجی سید حامد شاہؒ، شیخ کمال الدینؒ عرف شیخ کالوؒ اور شاہ سیدؒ خاص طور پر بڑے برگزیدہ درویش تھے[۲]۔

شیخ حسام الدینؒ کو مجلسِ سماع کا بے حد شوق تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ وہ مخدوم راجی سید حامد شاہؒ اور شاہ سیدؒ کے ساتھ مجلسِ سماع سے محظوظ ہو رہے تھے چنانچہ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ سب کچھ انھوں نے قوالوں پر لٹا دیا۔ یہاں تک کہ اپنے کپڑے بھی اتار کر ان کی نذر کر دیے۔ صرف روئی کی ایک قبا بچی لیکن اُس کو بھی انھوں نے پھاڑ کر تین حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کو اس کا ابرہ دے دیا دُوسرے کو استر اور خود اس کی روئی رکھ لی جسے اپنے جسم پر لپیٹ لیا۔ اس کے بعد وہ تینوں جامع مسجد کی طرف چل دیے۔ راستے میں ان کو ایک شخص ملا جس نے ان کو پتّوں پر حلوہ پیش کیا۔ اُن سب نے حلوہ تو کھا لیا لیکن پتّوں کو بطور کلاہ کے سر پر رکھ لیا[۳]۔

ان کے مریدوں نے ان کے ملفوظات رفیق العارفین کے نام سے جمع کیے ہیں جن میں ان کے حالات کے علاوہ اس دَور کی سماجی و ثقافتی اقدار کا بھی پتہ چلتا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے بھی رفیق العارفین کی تعلیمات کا اپنی اخبار الاخیار میں ذکر کیا ہے[۴]۔ اُن کا وصال ۸۸۲ھ/۱۴۷۷ء میں ہوا[۵]۔ مگر وصال سے پہلے انھوں نے

---

[۱] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۲ ب۔ ۵۰۳ ل [۲] ایضاً اوراق ۵۰۲۔ ۵۰۵۔ ۵۰۵۔ اخبار الاخیار ص ۱۷۴۔ ۱۸۹ شیخ کالوؒ کا روضۂ اقدس کڑہ میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے ایک سو بیس خلفاء تھے (گلزار ابرار ص ۱۰۶)

[۳] اخبار الاخیار ص ۱۸۹ [۴] ایضاً ص ۱۷۱۔ ۱۷۲

مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۲ ب۔ ریاض الاولیاء (قلمی) ورق ۱۱۱ ب، اخبار الاصفیاء (قلمی) ورق ۲۴۔ ۲۵

[۵] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۰۱

اپنے بیٹے قاضی شہ رح کو اپنے ہاتھوں سے خرقۂ خلافت پہنا کر مسند نشین کیا[1]۔ ان کا روضہ اقدس مانکپور میں مرجعِ خلائق ہے۔

مخدوم راجی سیّد حامد شاہ مانکپوریؒ

مخدوم راجی سیّد حامد شاہؒ اپنے زمانہ کے بڑے عظیم المرتبت مشائخ میں سے تھے۔ ان کے آباء و اجداد میں سے دو سیّد بھائی میر سیّد شمس الدّین اور میر سیّد شہاب الدّین سلطان شمس الدّین التمش کے عہدِ حکومت میں گردیز سے ہجرت کر کے دہلی آئے۔ اُن میں سے سیّد شمس الدّین نے بعد میں دہلی چھوڑ کر میوات میں رہائش کر لی اور ان کے بعد اُن کی اولاد وہیں آباد رہی۔ دُوسرے بھائی سیّد شہاب الدّینؒ جو سلسلہ سہروردیہ کے بڑے ذی مرتبت بزرگ تھے، پہلے کچھ عرصہ دہلی میں رہے لیکن بعد میں کسی روحانی اشارہ کے تحت مانکپور منتقل ہو گئے۔ یہاں انھوں نے اور اُن کی اولاد نے اپنے صُوفیانہ مشارب کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی[2]۔

شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ لکھتے ہیں کہ جب حضرت مخدوم جہانیاں سیّد جلال الدّین بخاریؒ حضرت علاء الحقؒ (پنڈوہ) کی نمازِ جنازہ کے بعد وطن لوٹے تو مانکپور سے گزرے جہاں اس قصبہ کے تمام سادات اُن کی زیارت و استقبال کے لیے آئے۔ اُن میں سے بعض درویشانہ لباس میں تھے اور بعض سپاہیانہ لباس پہنے ہوئے تھے، مگر ہر کوئی اپنے ساتھ اسلحہ و آلاتِ جنگ اُٹھائے ہوئے تھا۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے اُن سے پوچھا کہ آپ لوگوں کے مشاغلِ فقر سے اس سپاہیانہ لباس اور اسلحہ کی کیا نسبت ہے؟ اس پر

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۵ ا۔

[2] اخبار الاخیار ص ۱۸۹، مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۵۔ ریاض الاولیاء ورق ۱۱۲ ب
خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۰۹

اُن کے دادا بزرگوار میر سید عزالدینؒ جو اس وقت وہاں کے صاحب سجادہ تھے آگے بڑھے اور عرض کیا کہ اِس علاقہ کے ہندو راجہ اور ہندو لوگ اکثر مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھاتے اور لوٹ مار کرتے رہتے ہیں اِس لیے حفاظت کی غرض سے ہمارا اسلحہ رہنا ضروری ہے۔ اس پر حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے اِرشاد فرمایا کہ اِنشاءاللہ تعالےٰ آئندہ آپ پر کوئی ہاتھ نہیں اُٹھائے گا۔ چنانچہ اس روز سے میر سید عزالدینؒ کا خطاب راجی ہوگیا۔ اِس علاقہ میں راجی کے معنی بھائی کے لیے جاتے تھے اور بعد میں یہ خطاب اُن کے جانشین بھی اپنے نام کے ساتھ اِستعمال کرتے رہے[1]۔ سید راجی حامد شاہؒ کے والدِ بزرگوار کا نام سید راجہ شاہ مانکپوریؒ تھا[2]۔ اور راجی حامد شاہؒ بھی اپنے بزرگوں کی طرح سپاہیانہ لباس ہی پہنا کرتے تھے[3]۔ وہ شیخ حسام الدین مانکپوریؒ کے خلفاء کبار میں تھے۔ جن کے ہاتھ پر ان کے بعیت ہونے کا واقعہ مرآۃ الاسرار میں اِس طرح لکھا ہے کہ ایک روز جب شیخ حسام الدینؒ نماز جمعہ کے بعد اپنی خانقاہ کی طرف جارہے تھے تو اچانک اُن کی نظر راجی سید حامد شاہؒ پر پڑی۔ اس وقت وہ اپنے گھر کے دروازہ میں کھڑے تھے اور ان کی عمر صرف سات برس تھی۔ شیخ حسام الدینؒ ان کے حسن و جمال سے اِس قدر متاثر ہوئے کہ مدہوش ہوگئے اور اسی حالت میں اپنی خانقاہ پہنچے۔ جب یہ خبر اُن کے والدِ بزرگوار کو ہوئی تو وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر شیخ حسام الدینؒ کے پاس لے گئے اور عرض کیا کہ میں اس بیٹے کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے اسی روز سے ان کی رُوحانی تربیت شروع کردی اور بڑی تھوڑی ہی مُدّت میں ان کو مرتبۂ تکمیل و ارشاد کو پہنچا کر خرقۂ خلافت سے سرفراز کیا[4]۔ اس کے بعد ان کو اپنے

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۵ ب

[2] تاریخ مشائخ چشت ص ۲۰۳

[3] اخبار الاخیار ص ۱۸۹

[4] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۴ ا - ۵۰۵ ب - شیخ عبدالرحمٰن چشتی لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے وہ سلسلہ سہروردیہ میں بعیت ہوئے تھے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

صوفیانہ مشارب کی بدولت بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور انھوں نے سلسلۂ چشتیہ کی ترقی و ترویج کے لیے بڑا کام کیا۔ بلکہ ان کے بعد ان کے جانشینوں نے بھی ان کی روایات کو بڑے ذوق و شوق سے جاری رکھا۔[۱]

مخدوم راجی سیّد حامد شاہؒ کا معمول تھا کہ وہ اکثر تبلیغی دوروں پر جایا کرتے اور جہاں بھی پہنچتے، سینکڑوں کو رُوحانی فیوض و برکات سے مستفیض فرماتے۔ پہلی بار جب وہ تبلیغی دورہ پر جونپور گئے تو شہر میں ان کی آمد کا غلغلہ مچ گیا اور گرد و نواح کے لوگ بھی ان کی زیارت کے لیے پہنچ گئے جن میں سے لاتعداد لوگ ان کے رُوحانی فیض سے مستفیض ہوئے۔[۲] اس موقعہ پر بہت سے لوگ ان کے بیعت بھی ہوئے۔ ان میں سے شیخ الہداد جونپوریؒ، شیخ حسن طاہر چشتیؒ اور شیخ بہاءالدین بنھو جونپوریؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو بعد میں ان کے اجل خلفاء میں ہوئے۔[۳]

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ ان کو علومِ ظاہری پر نسبتاً کم دسترس حاصل تھی مگر اس کے باوجود دانشمندانِ دہر اور علمائے عصر ان کے حلقہ بگوش تھے۔ ان کا دستور تھا کہ جب انھیں کسی کو کوئی معرفت و کشف کی بات سمجھانی ہوتی تو وہ اپنے ذاتی احوال سے متعلقہ کوئی کہانی بیان کرنا شروع کر دیتے اور اس سے طالب اپنا مطلب خود بخود اخذ کر لیتے۔[۴] ان کو مجلسِ سماع کا بے حد شوق تھا۔ ان کے صاحبزادے راجی سیّد نورؒ بھی صاحب کرامات بزرگ تھے۔[۵] ان کا وصال ۹۰۱ھ/۱۴۹۵ء کو ہوا۔[۶] اور ان کا روضۂ اقدس مانکپور میں مرجعِ خلائق ہے۔

---

۱ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۴ الف - ۵۰۵ ب
۲ ایضاً ورق ۵۰۴ ب
۳ ایضاً
۴ اخبار الاخیار ص ۱۸۹
۵ ایضاً
۶ خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل ص ۴۰۹

مخدوم راجی سیّد نورؒ

مخدوم راجی سیّد نورؒ مخدوم راجی سیّد حامد شاہؒ کے فرزند ارجمند تھے اور وہ بھی ان ہی کی طرح سپاہیانہ لباس پہنا کرتے تھے[۱] وہ شیخ حسام الدینؒ کے بیٹے قاضی شہؒ کے مرید و خلیفہ تھے[۲] شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ مرآۃ الاسرار میں لکھتے ہیں کہ جب شیخ حسام الدینؒ کا وقتِ وصال قریب آیا تو انھوں نے قاضی شہؒ کو بلایا اور خرقۂ خلافت خود ان کو اپنے ہاتھوں سے پہنا کر سجادہ نشین کیا اور اس وقت یہ بھی فرمایا کہ جو شخص سب سے پہلے تمھارا مرید ہوگا وہ قطب کے درجہ کو پہنچے گا۔ اس وقت راجی سیّد حامد شاہؒ وہاں موجود تھے چنانچہ وہ بھاگے بھاگے گھر گئے اور فوراً اپنے چھ ماہ کے بچے سیّد نورؒ کو اٹھا لائے اور اسی وقت اس کو ان کا مرید بنا دیا۔ جب یہ خبر شیخ حسام الدینؒ کو ملی تو وہ ان کے حسنِ اعتقاد پر بڑے خوش ہوتے اور فرمایا کہ جو نعمتیں اللہ تعالےٰ نے مجھے عطا کی تھیں وہ تم نے حاصل کر لیں اور جو نعمتیں اللہ تعالےٰ نے میرے بچے کو عطا کیں وہ تمھارے بچے کے نصیب میں ہوئیں[۳]

وہ اپنے والدِ بزرگوار کی طرح بڑے ذی مرتبت اور صاحبِ کرامات بزرگ تھے اور انھوں نے بے شمار لوگوں کو روحانی فیوض بخشے[۴]۔ ان کے مریدوں میں سے ایک معروف ہستی شیخ نظام الدین امیٹھویؒ تھے جنھوں نے خرقۂ خلافت شیخ معروف جونپوریؒ سے حاصل کیا تھا مگر انھیں ان سے بھی بڑا روحانی فیض حاصل تھا[۵]۔ مخدوم راجی سیّد نورؒ اپنے وقت کے قطب تھے اور بڑے صاحبِ کمالات و کرامات بزرگ تھے۔ اُن کے صاحبزادے، خلیفہ اور مسند نشین مخدوم راجی سیّد مبارک بھی بڑے عالی مرتبہ بزرگ تھے[۶]

ان کا وصال ۲ رمضان ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء کو ہوا۔ اُن کا روضۂ اقدس بھی مانکپور میں ہے[۷]

---

۱ اخبار الاخیار ص ۱۸۹

۲ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۵ ا

۳ ایضاً

۴ ایضاً۔ اخبار الاخیار ایضاً

۵ مرآۃ الاسرار ایضاً

۶ بحر ذخار ورق ۲۹۳ ا

۷ اخبار الاخیار ایضاً۔ بحر ذخار ورق ۲۹۲ ب

مولانا شیخن مانکپوریؒ

مولانا شیخن اور شیخ حسام الدین مانکپوریؒ ہم عصر تھے[1]۔ وہ حافظِ قرآن تھے[2]۔ زہد و ورع میں بے مثال تھے اور خلوت کی زندگی بسر کیا کرتے تھے[3]۔ بے شمار لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ اُن کا معمول تھا کہ اگر کوئی شخص ان کو کھانا پیش کرتا تو وہ اس میں سے صرف ایک لقمہ اُٹھاتے اور باقی واپس کر دیتے[4]۔ اگر کوئی زمیندار اُن کی زیارت کے لیے آتا تو اس سے پوچھتے کہ تمھاری کھیتی باڑی کا کیا حال ہے۔ تمھارے مویشی کیسے ہیں اور تم کیسے ہو[5]؟ شیخ عبدالحق محدثؒ لکھتے ہیں کہ ایک بار اس سلسلہ میں شیخ حسام الدینؒ نے ان سے پوچھا کہ وہ اپنے ملنے والوں سے ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ان سادہ لوح انسانوں کو سلوک و معرفت کی باتوں کی کیا سمجھ اور علم کی باتوں سے کیا واسطہ؟ ان کو تو صرف ایسی ہی چیزوں کے متعلق پوچھنا چاہیے جن سے وہ خوش ہوں۔ اور جب وہ گھر واپس جائیں تو فخر کریں کہ مخدوم نے ہمارا حال پوچھا ہے، ہم سے فلاں بات کہی اور فلاں چیز کے متعلق اس طرح دریافت کیا[6]۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۴ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً

باب چہارم

چشتیہ مشائخ ایرج

ایرج کا علاقہ ریاست محمود آباد / کالپی کا ایک حصہ تھا۔ یہ ریاست ایک طویل عرصہ تک سلاطینِ شرقیہ کی باجگزار رہی تھی۔ وہاں کے علماء و صوفیاء نے بھی اس عہد میں علمی و ادبی کاموں میں بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیا اور اسلام کی اشاعت و ترقی کے لیے بیش بہا خدمات سرانجام دیں۔ آئندہ سطور میں صرف شرقی عہد کے چند نامور علماء و صوفیاء کا ذکر کیا جاتا ہے۔

قاضی محمد سادی ایرجیؒ

قاضی محمد سادیؒ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے عظیم المرتبت خلفاء میں سے تھے اور اس دور کے متبحر علماء اور عالی مرتبہ مشائخ میں شمار ہوتے تھے[1]۔ ان کے خرمنِ کمال سے سینکڑوں نے روحانی فیوض حاصل کیے[2]۔ ان کے خلفاء کے کبار میں سے ایک خواجہ اختیار الدین عمر ایرجیؒ بھی تھے[3]۔ قاضی سادیؒ کا وصال ۸۰۱ھ/۱۳۹۸-۱۳۹۹ء میں ہوا[4]۔ ان کا روضہ اقدس ایرج میں ہے۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۸۱
[2] اخبار الاخیار ایضاً
[3] خزینۃ الاصفیاء۔ جلد اول ص ۳۷۱
[4] خزینۃ الاصفیا ایضاً۔ مگر اس کے مصنف لکھتے ہیں کہ معارج الولایت میں اُن کا سال وصال ۸۰۹ھ لکھا ہے۔

خواجہ اختیار الدین عمر ایرجیؒ

خواجہ اختیار الدین عمرؒ کے آباء و اجداد علاقہ ایرج (ریاست کالپی) کے بڑے ذی وقار اُمرا میں سے تھے[1] وہ خود بھی پہلے اس ریاست کے کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے[2] لیکن جب عشق حقیقی کی کشش ہوئی تو تمام مال و دولت اور دنیاوی ساز و سامان سے قطع تعلق کر کے پہلے علوم ظاہری کا اکتساب کیا اور پھر علوم باطنی کی تکمیل کی[3] بالآخر قاضی سادی ایرجیؒ کے مرید ہو گئے اور سالہا سال تک ان کی صحبت و خدمت میں رہے۔ انھوں نے خرقہ خلافت حاصل کرنے کے بعد ایرج ہی میں ارشاد و تلقین کا سلسلہ شروع کیا[4] ان کے بے شمار خلفا تھے جن میں سے ایک شیخ یوسف بدہ ایرجیؒ بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے[5] مرآۃ الاسرار کے مصنف لکھتے ہیں کہ خواجہ اختیار الدینؒ اپنے مریدوں کی تربیت بڑے عمدہ طریق سے کرنے میں خاص شہرت رکھتے تھے[6]

ان کا وصال ۱۴ محرم ۸۰۹ھ/۱۴۰۶ء میں ہوا اور ان کا روضۂ اقدس ایرج میں زیارت گاہ عوام و خواص ہے[7]

شیخ یوسف بدہ ایرجیؒ

شیخ یوسف بدہؒ کے آبائے کرام کا اصل وطن خوارزم تھا۔ جہاں سے وہ حوادثِ روزگار کی وجہ سے ہجرت کر کے ہندوستان پہنچے اور قصبہ ایرج میں آباد ہوئے[8] شیخ یوسف بدہؒ خواجہ اختیار الدین عمر ایرجیؒ کے شاگرد اور خلیفہ تھے[9] علاوہ ازیں انھوں نے سلسلہ

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۵۱ — [2] ایضاً — [3] ایضاً — [4] ایضاً
[5] ایضاً مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۶ ب — [6] ایضاً ورق ۴۵۷ ل
[7] ایضاً اخبار الاخیار ایضاً۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۳۷۸
[8،9] اخبار الاخیار ص ۱۵۱

سہروردیہ میں حضرت مخدوم جہانیاں سید جلال بخاریؒ اور ان کے بھائی شیخ راجو قتالؒ سے بھی رُوحانی فیض حاصل کیا اور خرقۂ خلافت پایا تھا۔[1]

وہ اپنے زمانہ کے بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے اور شیخ الشیوخ مانے جاتے تھے[2] اپنے مریدوں کی روحانی تربیت بڑے عمدہ طریق سے کیا کرتے تھے اور اس بنا پر ملک کے گوشہ گوشہ میں شہرت رکھتے تھے۔[3] انھوں نے لکھنؤ کے مشہور بزرگ شیخ سارنگؒ سے رسالہ مکیہ پڑھا اور خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔[4] تاریخِ محمدی کے مصنف محمد بہامد خانی ان کے خاص مریدوں میں سے تھے[5] جن کی تصنیف میں کئی جگہ ان کی خوارق عادات کا ذکر ہُوا ہے[6]۔ ان کو مجلسِ سماع کا بے حد شوق تھا۔ ایک روز اُن کی خانقاہ میں مجلسِ سماع منعقد ہُوئی جس سے ان پر اس قدر وجد طاری ہوا کہ وہ اسی حالت میں جان بحق ہو گئے۔ انھیں ان کی خانقاہ کے صحن ہی میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔[7] بعد میں ان کے مزار پر سلطان علاءالدین مالوی نے بڑا اونچا گنبد اور روضہ تعمیر کروا دیا تھا۔[8]

شیخ یوسفؒ بڑے پایہ کے عالم و مصنف تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں لکھیں اور امام غزالیؒ کی منہاج العابدین کا بھی فارسی میں بڑا عمدہ ترجمہ کیا۔[9] علاوہ ازیں وہ بڑے اچھے شاعر بھی تھے۔[10] ان کا وصال ۸۳۴ھ/۱۴۳۰-۱۴۳۱ء میں ہوا تھا۔[11]

میر سیّد ابراہیم ایرجیؒ

میر سیّد ابراہیمؒ کے والدِ بزرگوار کا نام معین عبدالقادر الحسنی القادریؒ تھا اور

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۵۱-۱۵۲، مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۶ ب
[2] ایضاً ورق ۴۵۷ ا [3] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۸۳ [4] اخبار الاخیار ص ۱۵۲
[5] ایضاً مرآۃ الاسرار ایضاً [6] ایضاً [7] اخبار الاخیار ص ۱۵۲ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۷ ا [8] ایضاً [9] اخبار الاخیار ایضاً [10] ایضاً
[11] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۷۴ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۶

وہ ایرج کی بزرگ ہستیوں میں شمار ہوتے تھے[1]۔ وہ بڑے دانشمند انسان، بلند پایہ عالم اور عظیم المرتبت بزرگ تھے[2]۔ اُن کو تمام علومِ عقلی و نقلی اور رسمی و حقیقی پر پورا عبور حاصل تھا، اور انھوں نے ہر علم کی بے شمار کتابوں کا مطالعہ کر رکھا تھا[3]۔ ان کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی کتاب کو سمجھنے کے لیے استاد کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ ہر کتاب کی افادیت کو ایک نظر میں بھانپ لیتے اور خاص طور پر کتابوں کی تصحیح کرنے میں حد درجہ کمال رکھتے تھے[4]۔ انھوں نے درس و تدریس کا کام بہت کم کیا جس کے نتیجے میں اکثر لوگ ان کے علم و فضل سے خاطر خواہ استفادہ نہ کر سکے۔ اسی طرح وہ اپنی کتابیں بھی دوسروں کو پڑھنے کے لیے بہت کم دیتے تھے ماسوائے ایسے شخص کے کہ جس کو واقعتاً مخلص پاتے[5]۔

میر سید ابراہیم شیخ بہاء الدین قادری شطاریؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے[6]۔ "رسالہ شطاریہ" انھوں نے میر صاحب ہی کے لیے تصنیف کیا تھا[7]۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے بھی بے واسطہ خرقہ خلافت حاصل ہوا تھا[7]۔ شیخ عبدالعزیز چشتیؒ اور ایسے بہت سے اور نامور علماء نے بھی ان سے زانوئے تلمذ طے کیا اور بہت سے مشائخِ وقت نے ان سے رُوحانی فیوض حاصل کیے تھے[8]۔

اپنی عمر کے آخری دور میں وہ دہلی چلے گئے[9]۔ (۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء) اور وہاں انھوں نے شیخ عبداللہ دہلوی، میاں لاڈن، مولانا عبدالقادر صابون گر اور اس طرح کے کتنی اور بزرگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس طرح ان کو دہلی میں بڑی عزت اور مقبولیت حاصل ہوئی[10]۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں وہ دہلی میں تھے اُن کے ہم عصروں میں کوئی دوسرا اُن کے پایہ کا دانشمند بزرگ نہ تھا[11]۔ وہ مزید لکھتے

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۴۳

[2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً

[7] ایضاً۔ مگر سلسلہ قادریہ کی طرف آپ کو زیادہ رغبت تھی۔ [8] اخبار الاخیار ایضاً

[9] اخبار الاخیار ایضاً — [10] تذکرہ علمائے ہند ص ۷، آئین اکبری حصہ سوم

[11] اخبار الاخیار۔ ایضاً

ہیں کہ ایک بار شیخ رکن الدینؒ بن شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ آج حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا عرس مبارک ہے آپ بھی چلیں اور اس میں شرکت فرمائیں۔ انھوں نے جواباً فرمایا نہیں آپ جائیں اور اُن کی قبر کی زیارت فرمائیں چنانچہ وہ اکیلے ہی چلے گئے اور خواجہ صاحب کی قبر مبارک پر جاکر مراقبہ میں بیٹھ گئے۔ جب وہاں مجلسِ سماع منعقد ہوئی تو قوالوں اور اہلِ مجلس نے خوب جوش و خروش دکھایا مگر دریں اثنا خواجہ صاحبؒ نے رُوحانی طور پر ان کو فرمایا کہ ان بدبختوں نے ہمارا دماغ چاٹ لیا ہے اور ہمارا وقت ضائع کر دیا ہے۔ چنانچہ شیخ رکن الدینؒ جب واپس اُن کے پاس آئے تو آپ مسکرائے اور فرمایا کہ اب تو آپ ہماری معذوری کو سمجھ گئے ہوں گے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں آپ واقعی حق بجانب ہیں۔ واللہ اعلم قدوم[1]۔

ان کا وصال سلطان اسلام شاہ سوریؔ کے عہد میں ۹۵۳ھ/۱۵۴۶-۴۷ء میں ہوا[2]۔ ان کا مزار مبارک سلطان المشائخؒ کے روضہ کے احاطہ میں حضرت امیر خسرو دہلویؒ کے مزار کے پاس ہے[3]۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۴۳

[2] ایضاً تذکرہ علمائے ہند ص ۷

[3] ایضاً، اخبار الاخیار ایضاً

باب پنجم

چشتیہ مشائخ لکھنؤ

شیخ قوام الدّین چشتی وسہروردیؒ

شیخ قوام الدین چشتیؒ حضرت شیخ نصیر الدّین محمود چراغ دہلیؒ کے خاص مریدوں میں سے تھے[1] مگر جب وہ وصال فرما گئے تو آپ حضرت سیّد جلال الدّین بخاریؒ مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے پاس چلے گئے۔ سالہا سال تک اُن کی صحبت میں رہے اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے[2]۔ وہ حرمین شریفین کی زیارت کی سعادت بھی حاصل کر چکے تھے اور زہد و ورع اور حُسنِ اخلاق میں بےمثال تھے[3]۔ اپنے مریدوں کی رُوحانی تربیت بڑی توجہ اور عمدہ طریق سے کیا کرتے اور اُن کے بے شمار مرید بلند پایہ بزرگ ہوتے[4]۔ ملفوظات شیخ مینا لکھنویؒ میں لکھا ہے کہ ایک روز وہ مجلس سماع میں بیٹھے ہوتے تھے لیکن انھیں سماع کا کوئی لطف نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ وہ وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے اور فرمایا کہ شاید آج سماع میں بے لُطفی اس وجہ سے ہوئی کہ ہمارے گھر میں کوئی دنیا دی چیز موجود ہے۔ جب گھر والوں سے پوچھا گیا تو انھوں نے بتایا کہ گھر میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے۔ اس کے بعد دوبارہ گھر میں اِدھر اُدھر تلاش ہوئی اور بالآخر گڑ کا ایک ٹکڑا پایا گیا جو اُن کی حاملہ بیوی نے اپنے کھانے کے لیے رکھا ہوا تھا چنانچہ اس کو

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۵ ب [2] ایضاً۔ اخبار الاخیار ص ۱۵۲
[3] مرآۃ الاسرار ایضاً خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۸۸
[4] اخبار الاخیار ایضاً

انھوں نے فوراً راہِ خدا میں دے دیا اور پھر جب مجلسِ سماع میں بیٹھے تو خاطر خواہ محظوظ ہوتے[1]۔

شیخ عبدالرحمن چشتی لکھتے ہیں کہ جب حضرت مخدوم جہانیاںؒ کا وقتِ وصال قریب آیا تو انھوں نے اِن سے پوچھا کہ میں اپنے بزرگوں کی امانتیں کس کے سپرد کر کے جاؤں اور اپنا سجادہ نشین کس کو بناؤں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میری حقیر رائے میں آپ کے بھائی سید صدر الدین شیخ راجو قتالؒ ان چیزوں کے اصل اور مستحق ہیں چنانچہ وہ سید صدر الدین شیخ راجو قتالؒ کو اپنا سجادہ نشین بنا کر وصال کر گئے مگر ایک خرقہ تبرکاً اپنے صاحبزادے سید ناصر الدین کو بھی دے گئے[2]۔ اس معاملہ کا علم جب سید ناصر الدین کی والدۂ محترمہ کو ہوا تو انھوں نے شیخ قوام الدینؒ سے کہا کہ میرا بیٹا تمھارے مشورہ کی وجہ سے خلافت و سجادہ نشینی سے محروم ہوا۔ اب میں یہ دعا کرتی ہوں کہ تمھارے بیٹے بھی اسی طرح ان نعمتوں سے محروم رہیں۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ بی بی صاحبہ الحمدللہ کہ آپ نے میرے حق میں کوئی بُری دعا نہیں فرمائی۔ اگرچہ میرے بیٹے اِس نعمت سے محروم رہیں گے مگر میرے مرید جو میری معنوی اولاد ہیں۔ اِس نعمت کو حاصل کرتے رہیں گے۔ چنانچہ بعد میں ایسے ہی ہوا کہ ان کے بعد خلافت و سجادہ نشینی کی نعمت ان کے مرید و خلیفہ شیخ مینا لکھنویؒ کو ملی اور ان کے صلبی بیٹے نظام الدین دنیاوی دولت و ہوس کے چکر میں اس نعمت سے محروم ہو گئے[3]۔

شیخ قوام الدین بڑے رحم دل درویش تھے۔ مرآۃ الاسرار کے مؤلف لکھتے ہیں کہ ایک بار انھوں نے اپنے گھر کے باہر ایک بھوکا کتا پڑا ہوا پایا جس کی حالت دیکھتے ہی انھوں

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۴ ب۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۸۰

[2] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۵ و۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۱۹۔ مرآۃ الاسرار کے مصنف لکھتے ہیں کہ گو بعد میں خانقاہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے صاحبزادوں کو مل گئی تھی لیکن وہ سجادہ نشینی سے محروم ہی رہے۔

[3] مرآۃ الاسرار ایضاً خزینۃ الاصفیاء ایضاً

نے صدا لگائی کہ کوئی ہے جو سات حج کا ثواب دونانوں کے بدلے میں خریدنے کے لیے تیار ہو۔ یہ سنتے ہی ایک شخص چند نان لے کر پہنچا اور اس نے اس کتے کو کھلائے وہ بڑے خوش ہوئے اور اُن کے حق میں دُعا دے خیر کی۔[۱] شیخ صاحبؒ کا قیام پہلے دہلی میں تھا مگر ان میں اور شیخ مبارک بجلوریؒ میں اس قدر مہر و محبت بڑھ گئی کہ آپ لکھنؤ اٹھ آئے اور باقی عمر وہیں گزار دی۔[۲] ان کا سالِ وصال ۸۴۰ھ/۱۴۳۶-۱۴۳۷ء ہے اور اُن کا روضۂ اقدس لکھنؤ میں مرجع خلائق ہے۔[۳]

شیخ سارنگ چشتی و سہروردیؒ

شیخ سارنگؒ نومسلم تھے۔ وہ ہندو سے مسلمان ہوئے تھے اور بڑے متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔[۴] اُن کی ایک ہمشیرہ سلطان فیروز شاہ (المتوفی ۷۸۸ھ) کے بیٹے سلطان محمد کی بیوی تھیں۔[۵] اس بناء پر ان کو تقرّب سلطانی بھی حاصل رہا۔ وہ سلطان فیروز شاہ کے بلند مرتبہ اُمراء میں سے تھے اور ملک سارنگ کے خطاب سے یاد کیے جاتے تھے۔[۶] شہر سارنگپور ان ہی کا بسایا ہوا ہے۔[۵]

شیخ سارنگؒ بڑے خوبصورت جوان تھے۔ ایک مرتبہ جب حضرت سیّد مخدوم جہانیاںؒ اور شیخ راجو قتالؒ دہلی تشریف لائے تو سلطان فیروز نے انھیں ان کو کھانا کھلانے کے لیے منتخب کیا۔ ایک دن شیخ راجو قتالؒ نے اُن سے کہا کہ اگر آپ پانچ وقت نماز پابندی کے ساتھ ادا کرنا شروع کر دیں تو میں آپ کو حضرت سیّد مخدوم جہانیاںؒ کا بچا ہوا کھانا کھانے

۱۔ مرآۃ الاسرار ایضاً ورق ۴۲۵ ب
۲۔ خزینۃ الاصفیاء ایضاً
۳۔ ایضاً
۴۔ اخبار الاخیار ص ۱۵۲
۵۔ ایضاً ورق ۴۵۵ ا
۶۔ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۵ ب
۵۔ ایضاً

کے لیے دیا کر دوں گا۔ چونکہ ان کے ہدایت پانے کا وقت آپہنچا تھا اس لیے وہ بلا تامل راضی ہوگئے اور حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے بچے ہوئے کھانے سے مشرف ہوتے رہے۔ اس کے بعد پھر ایک روز شیخ راجو قتالؒ نے ان سے کہا کہ اگر آپ نمازِ چاشت و اشراق کے بھی پابند ہو جائیں تو ہم اور آپ اکٹھے مل کر کھانا کھایا کریں۔ چنانچہ وہ اس بات پر بھی راضی ہوگئے اور پھر وہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ اور شیخ راجو قتالؒ ایک ہی طبق میں کھانا تناول فرمایا کرتے اور اسی دوران میں وہ ان کے نورِ باطن سے منور و مستفیض ہوتے رہے[1]۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ شیخ قوام الدینؒ کے مرید ہوگئے اور سلوکِ چشتیہ کے مطابق عبادت و ریاضت کرنے لگے[2]۔

جب سلطان محمود شاہ تغلق (۱۳۹۴-۱۴۱۲ء) کا دورِ حکومت شروع ہوا تو وہ اپنی دولت و حشمت سے کنارہ کش ہوکر بال بچوں سمیت پاپیادہ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور وہاں پہنچ کر ایک عرصہ تک مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں مجاور بنے رہے[3]۔ جب وہ واپس آئے تو شیخ یوسف بدہ ایرجیؒ کے مرید ہوگئے اور ان سے خرقہ خلافت پایا[4]۔ اسی دوران میں وہ اپنے سابق پیر و مرشد شیخ قوام الدینؒ کی زیارت کے لیے اکثر لکھنؤ بھی جاتے اور ان کی صحبت سے مستفیض ہوتے رہے لیکن جب شیخ قوام الدینؒ کا وقتِ وصال قریب پہنچا تو وہ وہاں نہیں تھے۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ چونکہ شیخ سارنگؒ آج یہاں موجود نہیں ہیں، اس لیے میں اپنے پیر و مرشد کا خرقہ ان کے لیے بطور امانت رکھے جاتا ہوں۔ اُن کے وصال کے تین دن بعد وہ لکھنؤ پہنچے اور اپنے پیر و مرشد کی امانت وصول کی[5]۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ راجو قتالؒ نے بھی اپنے بزرگوں کے تبرکات ان ہی کو بھیجے تھے جن کے لینے سے پہلے تو انھوں نے انکار

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۵ ب

[2] مرآۃ الاسرار ایضاً۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۸۹ - ۳۹۰

[3] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۵ ب۔ ریاض الاولیاء ورق ۱۲۴ و۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۹۰

[4] اخبار الاخیار ص ۱۵۲، مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۶ ل

[5] ایضاً۔ خزینۃ الاصفیاء ایضاً۔

دیا لیکن بعد میں شیخ حسام الدینؒ کے مشورہ سے قبول کرلیے[1]۔ سلاطین شرقیہ نے ان کو خانقاہ کے اخراجات کے لیے کئی ہزار بیگھہ زمین کی پیشکش کی تھی لیکن انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا اور ہمیشہ غربت ہی میں زندگی گذارتے رہے[2]۔

شیخ سارنگؒ بڑے عظیم المرتبت اور صاحب کرامات بزرگ تھے[3]۔ ان کے خرمن کمال سے سینکڑوں ہزاروں نے روحانی فیوض حاصل کیے اور بے شمار لوگوں نے اُن سے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا۔ شیخ مینا لکھنوئیؒ جیسی بزرگ ہستی کی اُنھوں ہی نے تربیت کی تھی[4]۔ ان کا وصال ۸۵۵ھ/۱۴۵۱-۱۴۵۲ء میں ہوا[5]۔ ان کا روضۂ اقدس لکھنؤ میں مرجع خلائق ہے۔

شیخ مینا چشتی وسہروردیؒ

شیخ میناؒ لکھنؤ کے صاحب ولایت اور اپنے زمانے کے بڑے عظیم المرتبت بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ بچپن ہی سے شیخ قوام الدینؒ کے سایۂ عاطفت میں رہے اور انھوں نے سب سے پہلے خرقۂ خلافت بھی انہی سے حاصل کیا[6]۔ بعد میں وہ شیخ سارنگؒ کے مرید و خلیفہ ہوگئے[7]۔

ان کا حقیقی نام شیخ محمد میناؒ تھا لیکن وہ شیخ میناؒ ہی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا یہ نام[8] رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ شیخ قوام الدینؒ کے بھی ایک بیٹے کا نام نظام الدین محمد مینا تھا جو دنیاوی خواہشات کے شوق میں سلطان محمد بن سلطان فیروز شاہ کی سرکار میں ملازم ہوگیا تھا اور بڑے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوا تھا۔ شیخ قوام الدینؒ اس سے بہت خفا رہتے تھے۔ اگرچہ

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۵۲ — [2] مرآۃ الاسرار ایضاً ورق ۴۵۶ ا
[3] اخبار الاخیار ص ۱۵۲ — [4] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۹۰ [5] ایضاً
[6] اخبار الاخیار ص ۱۵۲ — [7] ایضاً
[8] ایضاً ص ۱۵۲۔ شیخ عبدالحق محدثؒ لکھتے ہیں کہ اس علاقہ میں "مینا" کا لفظ تعظیم و محبت کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔

اس نے ان کو خوش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ان کی ناراضگی دُور نہ ہوئی۔ بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ واپس وطن پہنچ کر ان کے قدموں میں گر کر معافی مانگے۔ چنانچہ جب وہ لکھنؤ پہنچا تو گھوڑے پر سوار ہی اپنے والدِ بزرگوار کی خانقاہ میں چلا آیا۔ جب ان کی نظر اس پر پڑی تو غصے میں آ گئے اور بولے، بدتمیز تجھے ایک درویش کی خانقاہ میں گھوڑے پر سوار ہو کر داخل ہونے کی کیسے جرأت ہوئی۔ یہ سنتے ہی اُس نے گھوڑے کی باگ کو موڑا تا کہ اس کو خانقاہ سے باہر چھوڑ آئے اور پیدل چل کر باپ کی خدمت میں حاضر ہو لیکن جونہی اس نے گھوڑے کو موڑا اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ وہیں گر کر مر گیا۔[1] اس موقعہ پر شیخ قوام الدینؒ کے مریدوں میں سے ایک صاحب قطب الدین وہاں موجود تھے۔ شیخ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ انھیں ایک بیٹا عطا کرے اس کا نام تم شیخ محمد میناؒ رکھنا اور وہ میرے بیٹے کا نعم البدل ہوگا۔ چنانچہ جب اُن کے گھر شیخ مینا پیدا ہوئے تو اس کی پرورش شیخ قوام الدینؒ نے اپنے بیٹوں کی طرح بڑے ناز و نعم سے کی اور مکمل روحانی تربیت کے بعد اُسے خرقۂ خلافت کی نعمت سے بھی سرفراز کیا۔[2]

مفتی غلام سرور لاہوریؒ ان کے بارے میں یہ حیرت انگیز واقعہ لکھتے ہیں کہ جب ان کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو انھوں نے استاد کے پاس پڑھنے کے لیے بھیجا گیا جب استاد نے اُن سے سبق دیتے ہوئے کہا کہ کہو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" تو انھوں نے اسے بڑی اچھی طرح ادا کیا لیکن جب انھوں نے کہا "ب" تو انھوں نے اس کے پڑھنے سے انکار کر دیا اور جواب میں کہا کہ میری صرف الف الٰہی کے ساتھ ہی محبت کافی ہے۔ اس کے

---

[1] خزینۃ الاصفیا۔ جلد اول ص ۴۰۹۔ لیکن اخبار الاخیار کے مؤلف (ص ۱۵۲-۱۵۳) لکھتے ہیں کہ وہ اس کے بعد کسی مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہوئے۔

[2] اخبار الاخیار ص ۱۵۲

بعد اس موقعہ پر انھوں نے الف کے معنی اور حقائق بھی بیان کیے[۱]

شیخ مینا تمام عمر مجرد رہے اور زندگی ریاضت و عبادت میں گزار دی[۲] کہا جاتا ہے کہ وہ رات کو دیوار پر بیٹھ کر ریاضت کیا کرتے تھے تاکہ اگر نیند کا غلبہ ہو تو زمین پر گر پڑیں اور پھر بیدار ہو کر عبادت میں مصروف ہو جائیں۔ اگر وہ زمین پر بیٹھ کر عبادت کرتے تو اپنے گرد چاروں طرف کانٹے بکھیر لیتے تاکہ اگر نیند غلبہ کرے تو کانٹے انھیں بیدار کر دیں۔ اس طرح سردیوں کے دنوں میں وہ لباس پانی میں بھگو کر اپنے پیر و مرشد کی خانقاہ کے صحن میں بیٹھ کر عبادت و ریاضت کیا کرتے تھے[۳]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ وہ اپنے مرشد شیخ سارنگ کے روضہ اقدس کی زیارت کے لیے بیس کوس پیدل چل کر جایا کرتے تھے۔ ان کے پاؤں میں کبھی لکڑی کی نعلیں ہوتیں اور کبھی ننگے پاؤں ہی ہوتے جبکہ راستے میں انھیں ناہموار راستوں، ریگستان اور خاردار جھاڑیوں میں سے گزرنا پڑتا[۴]

شیخ مینا نے سینکڑوں ہزاروں کو روحانی فیض بخشا۔ ان کو مجلس سماع کا بے حد شوق تھا۔ وہ لکھنؤ کے بڑے معروف و مقبول درویش ہوتے ہیں۔ اپنے وقت کے قطب تھے اور انھیں بڑی لمبی عمر نصیب ہوئی۔ ان کا وصال ۲۳ صفر ۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء میں ہوا[۵]۔ ان کا روضہ اقدس لکھنؤ میں مرجع خلائق ہے۔

شیخ سعد اللہ کندوری فراز چشتی و سہروردیؒ

شیخ سعد اللہؒ شیخ سماء الدین لکھنوئیؒ کے فرزند ارجمند تھے[۶] ان کو تمام علوم نقلی و عقلی

۱؎ خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۳۹۸، اخبار الاخیار ص ۱۵۲

۲؎ ایضاً ص ۱۵۳ ۳؎ ایضاً ص ۱۵۳، خزینۃ الاصفیاء ایضاً

۴؎ اخبار الاخیار ص ۱۵۳، مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۶ و

۵؎ ایضاً۔ لیکن خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۳۹۹۔ آپ کا سال وفات ۸۷۰ھ لکھتے ہیں۔

۶؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۷۲

پر عبور حاصل تھا اور وہ بڑی سطوت و شوکت کے مالک تھے[1]۔ چشتیہ سلسلہ میں وہ اپنے والد بزرگوار ہی کے مرید و خلیفہ تھے اور سہروردیہ سلسلہ میں انھوں نے سید اجمل جونپوریؒ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا[2]۔ وہ دل کے بڑے غنی اور شاکر تھے اور ایثار و قربانی میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ اگر وہ گھر میں کھانا یا کوئی چیز بھی وافر دیکھ لیتے تو فوراً اٹھا کر محتاجوں کو دے دیتے[3]۔ اس بنا پر وہ کندوری فراز کے نام سے بھی مشہور تھے۔ اور یہ خطاب ان کو شیخ الاسلام مخدوم قیام الدینؒ نے عطا کیا تھا[4]۔

شیخ سعد اللہؒ شیخ اعظم ثانی لکھنویؒ کے ہم عصر تھے اور دونوں کے آپس میں بڑے گہرے مراسم تھے[5]۔ ان کے آٹھ بیٹے تھے جو تمام بڑے صاحب باطن اور ذی مرتبہ بزرگ تھے۔ ان کے نام یہ ہیں: شیخ بدیع الدینؒ، شیخ فرید الدینؒ، شیخ بڈھیؒ، شیخ جہانگیرؒ، شیخ امین الدینؒ، شیخ سعد الدینؒ، شیخ فخر الدینؒ اور شیخ رکن الدینؒ[6]۔ شیخ سعد اللہؒ نے سینکڑوں ہزاروں کو روحانی فیوض بخشے۔ ان کے بے شمار خلفاء تھے[7]۔

ان کا وصال ۲۳ ربیع الثانی ۸۲۹ھ/۱۴۲۶ء میں ہوا۔ اور وہ لکھنؤ میں اپنے والد بزرگوار کے مزار کے پائیں میں دفن ہوئے[8]۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۷۲ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً
[5] ایضاً ص ۷۳ [6] ایضاً [7] ایضاً [8] ایضاً

باب ششم

چشتیہ مشائخ کنتور

شیخ محمد متوکل کنتوریؒ

شیخ محمد متوکل خواجہ اعز الدین بن خواجہ افتخار الدین بن آدزون حسن ترک کے صاحبزادے تھے جو ہرات سے ہجرت کر کے ہندوستان پہنچے اور انچولی میں آباد ہوئے تھے۔ وہ بڑے صاحب کرامات اور ذی مرتبت بزرگ تھے۔ ان کا روضۂ اقدس انچولی میں زیارت گاہِ خلائق ہے[1]

شیخ محمد متوکل علوم ظاہری کی تعلیم کے بعد حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلویؒ سے بیعت ہوئے اور کئی سال تک ان کے زیر تربیت رہے۔ جب انھیں خرقۂ خلافت حاصل ہوا تو کنتور چلے آئے اور وہاں ارشاد و تلقین کا سلسلہ شروع کیا[2]۔ وہ بہت سے انسانی کمالات سے آراستہ تھے اور بڑے معروف و مقبول بزرگ تھے۔ بے شمار لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ ان کے فرزندِ ارجمند شیخ سعد اللہ کیسہ دارؒ کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ ایک رات بھرائچ میں وہ اپنے حجرۂ عبادت میں ریاضت میں منہمک تھے کہ اچانک ان کی آنکھ کھلی تو انھوں نے دیکھا کہ کوئی جوگی جسم پر راکھ ملے حجرہ کے کونے میں بیٹھا ہے مگر انھوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور دوبارہ اپنی عبادت میں مصروف ہو گئے۔ بالآخر وہ جوگی خود اٹھا اور اس نے آکر سلام کیا[3]۔ انھوں نے اس کا جواب دیا پھر وہ آگے بڑھا اور اُن سے ہاتھ ملا کر باتیں کرنے

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۱۴۱۶ و
[2] ایضاً۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۸۲
[3] مرآۃ الاسرار ایضاً۔ خزینۃ الاصفیاء ایضاً ص ۳۸۳

لگا۔ دریں اثناء انھوں نے دیکھا کہ تمام حجرہ مع در و دیوار کے سونے سے پٹا پڑا ہے۔ مگر انھوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ جس سے جوگی سمجھ گیا کہ وہ بڑے مستغنی و شاکر انسان ہیں۔ چنانچہ وہ اسی وقت ان کے قدموں میں گر پڑا اور مشرف بہ اسلام ہو کر ان کا مرید ہو گیا[1]۔ اسی طرح ان کے ملفوظات میں ایک اور جگہ لکھا ہوا ہے کہ ایک بار ایک عبدالعزیز نام کا شخص ان کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میں علم کیمیا کا ماہر ہوں۔ آپ جو بھی حکم فرمائیں میں وہ آپ کے لیے کرنے کے لیے تیار ہوں۔ انھوں نے اسے جواب دیا کہ میرے پاس ایک ایسی اکسیر ہے جس کا ایک ہی ذرہ من بھر تانبے کو سونا بنا سکتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے بھانجے شیخ علاء الدین کو بلا کر کہا کہ اس شخص کو فوراً یہاں سے بھگا دو[2]۔

شیخ متوکلؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہر مرید اپنے پیر سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ مرید کو چاہیے کہ وہ خود کو ہرگز خلافت کے قابل نہ سمجھے تاوقتیکہ پیر اسے خود خرقۂ خلافت نہ عطا کرے۔ وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ مرید کو انوار الٰہی حاصل کرنے کے لیے بڑا حوصلہ مند ہونا چاہیے۔ اسے اپنے دوست کے راز رکھنے کا شعور اور طاقت ہونی چاہیے اور جو بھی تجلی اس پر ظاہر ہو اس کا ہرگز چرچا نہ کرے ورنہ دوبارہ وہ چیز اسے نصیب نہ ہو گی[3]۔

وہ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلویؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ ان کی زیارت کے لیے وہ اکثر دہلی جایا کرتے اور ان سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے[4]۔ ان کے خرمن کمال سے سینکڑوں ہزاروں نے روحانی فیض حاصل کیا تھا۔ ان کے میر سید امیر ماہ بہرائچیؒ سے بڑے گہرے مراسم تھے اور انھیں ملنے اکثر بہرائچ جایا کرتے تھے[5]۔ ان کے فرزند ارجمند شیخ سعد اللہ کیسہ دارؒ بھی بڑے عظیم المرتبہ بزرگ تھے۔ انھوں نے سو سال سے زائد عمر پائی اور

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۱۶ ا۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۳۸۳

[2] مرآۃ الاسرار ایضاً ورق ۴۱۶ ب

[3] ایضاً

[4] ایضاً ورق ۴۱۶ ا

[5] ایضاً ورق ۴۱۷ ا

اُن کا وصال ۸۲۷ھ/۱۴۲۴ء میں ہوا۔[1]

شیخ سعد اللہ کیسہ دار کنتوریؒ

شیخ سعد اللہؒ شیخ محمد متوکل کنتوریؒ کے صاحبزادے تھے۔ ان کے والدِ بزرگوار نے ایک بار میر سیّد امیر ماہ بہرائچیؒ سے درخواست کی کہ وہ اس کو اپنا مرید بنا لیں لیکن انھوں نے انکار فرمایا اور کہا کہ یہ تو نہیں البتہ ان کا ایک بیٹا میرا مرید ہوگا۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ بعد میں ان کا ایک بیٹا شیخ عین الدین ان کا مرید ہوا جو ان کے عظیم المرتبت خلفاء میں سے تھا۔[2] شیخ سعد اللہؒ اپنے والدِ بزرگوار ہی کے مرید و خلیفہ تھے۔[3] ایک بار جب وہ اپنے والدِ بزرگوار کے ساتھ دہلی گئے تو وہاں شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلویؒ سے ملے اور ان سے بھی بیعت ہو گئے۔[4] لیکن ابھی ان کو مرید ہوتے چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ لوگ ان کے پاس اظہارِ عقیدت کے لیے پہنچنے شروع ہوئے۔ وہ فتوح پیش کرتے اور متابعت کی درخواست کرتے مگر وہ ہمیشہ چشتیہ صوفیاء کے طور طریقوں پر بڑی سختی سے عامل رہے اور کسی سے کوئی چیز قبول نہ فرماتے۔ اس کے بعد ان کو بڑے تھوڑے ہی عرصے میں بڑی مقبولیت و شہرت حاصل ہو گئی۔[5] ایک دفعہ وہ پھر اپنے والدِ بزرگوار کے ساتھ دہلی گئے تو اس دفعہ پھر شیخ نصیر الدینؒ نے اُن پر بڑی نظرِ کرم فرمائی اور ان کے والدِ بزرگوار سے کہا آپ کا یہ بیٹا بڑا صاحبِ فتوح اور خوشحال ہوگا۔[6] شیخ عبد الرحمٰن چشتیؒ لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد حضرت خضر علیہ السلام نے اُن کو کیسہ عطا کیا جو ہر وقت رقم سے پُر رہتا اور جو کچھ بھی وہ چاہتے اس کیسہ سے نکال کر خرچ کر لیا کرتے اور وہ کبھی خالی نہ ہونے پاتا۔ اسی وجہ

---

[1] خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل ص ۳۶۲

[2] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۱۴۱۷ ا۔

[3] ایضاً

[4] ایضاً

[5] ایضاً

[6] ایضاً ورق ۱۴۱۷ ا۔ ب

سے وہ کبیسہ دار کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔[1] انھوں نے میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ سے بھی خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ اُن سے ان کی حد درجہ محبت و یگانگت تھی جس کا ثبوت ان دونوں کی باہمی خط و کتابت سے بھی ملتا ہے۔[2] مکتوباتِ اشرفی میں ہے کہ ان کو چودہ خانوادوں سے روحانی فیض حاصل تھا۔ ان خانوادوں میں سے شاہ بدیع الدین مدارؒ کا سلسلۂ اویسی بھی شامل ہے، اس کا ذکر شاہ مدارؒ کے ایک خط میں بھی ہوا ہے جو کہ انھوں نے ان کو لکھا تھا۔[3]

شیخ سعد اللہ بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے اور اُن کے سینکڑوں مرید و خلفاء تھے۔ اُن میں سے ایک شیخ بابو شیر سوار تھے جو ان کی ملاقات سے پیشتر اپنے ہاتھ میں سانپ، بغل میں تختہ و سنگ لیے اور شیر پر سوار ہو کر گھوما کرتے تھے، مگر ان کی نگاہِ بابرکت سے اسی کام سے باز آئے اور ان کے مرید ہو کر مرتبۂ ارشاد کو پہنچے تھے۔[4] ان کے بیٹے شیخ عین الدین قتالؒ بھی بڑے بلند مرتبہ درویش تھے۔[5]

ان کا سالِ وصال ۸۶۰ھ/۱۴۵۶ء ہے۔[6] اور وہ اپنے والدِ بزرگوار کے روضۂ اقدس کی چار دیواری میں مدفون ہیں۔[7]

شیخ عین الدین قتال کنتوریؒ

شیخ عین الدین قتالؒ اپنے والدِ بزرگوار شیخ سعد اللہ کبیسہؒ دار کے ہی مرید و خلیفہ تھے۔[8] علاوہ ازیں سید امیر ماہ بہرائچیؒ کے بھی مرید تھے۔ وہ ان کے پاس ایک مدت تک ریاضاتِ شاقہ اور مجاہدات کرتے رہے اور جب کمالاتِ ظاہری و باطنی سے سرفراز ہو گئے

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۱۷۔ شیخ عبد الرحمن چشتیؒ لکھتے ہیں کہ بعد میں یہ کبیسہ انھوں نے اپنی حیات ہی میں میر سید ابراہیمؒ درویش کو دے دیا تھا۔ وہ بھی بڑے ذی مرتبہ درویش تھے۔ ان کا مزار شیخ محمد متوکلؒ کے روضہ کے ساتھ مغرب کی طرف واقع ہے۔

[2] ایضاً ورق ۴۱۷ ب ۴۱۸ او بحر ذخار (قلمی) ورق ۳۴۸ او۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۳۷۸

[3] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۱۸ او [4] ایضاً ورق ۴۱۸ ا۔ ب [5] ایضاً ورق ۴۱۸ ب۔ ۴۱۹ ا خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۳۸۰۔ ۳۸۱ [6] بحر ذخار ایضاً۔ [7] مرآۃ الاسرار ایضاً [8] مرآۃ الاسرار ایضاً بحر ذخار ایضاً ورق ۱۸۴ب۔ خزینۃ الاصفیاء ایضاً

تو واپس کنتور چلے آئے اور دوبارہ اپنے والدِ بزرگوار کے ساتھ مستقل طور پر رہنے لگے۔[1]

بعض مصنفین لکھتے ہیں کہ انھوں نے کچھ عرصہ بعد فرقہ ملامتیہ کا شعار اختیار کر لیا تھا، اور ہر وقت شراب میں دھت نظر آیا کرتے تھے۔ اس کی شکایت جب علمائے وقت نے ان کو والدِ بزرگوار سے کی تو انھوں نے ان کو بہت سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے۔[2]

جب اُن کے والدِ بزرگوار کا وقتِ وصال قریب آیا تو اس وقت ان کے بڑے صاحبزادے شیخ معین الدین وہاں موجود نہ تھے اور وہ ان دنوں سلطان ابراہیم شاہ شرقی والیٔ جونپور کے پاس فتوح کی غرض سے گئے ہوئے تھے۔[3] اسی لیے اس موقعہ پر انھوں نے انہی کو بلوایا لیکن وہ بھی گھر میں موجود نہ تھے اور شراب خانہ میں مدہوش پڑے تھے۔[4] چنانچہ قاصد وہیں پہنچ گیا۔ جب انھوں نے قاصد کو آتے دیکھا تو پہلے آسمان کی طرف نگاہ کی اور پھر ساقی سے کہا کہ ایک پیالہ جو میری قسمت میں باقی ہے وہ بھی دے دو۔ ساقی نے ان کو پیالہ بھر کے دیا جس کو وہ فوراً پی گئے۔ مگر اس کے بعد جام و سبو کو توڑ دیا۔[5] اور پھر والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اب ان کا آخری وقت تھا۔ چنانچہ انھوں نے ان کو خرقۂ خلافت عطا کیا، خواجگانِ چشت کی تمام امانتیں بھی ان کے سپرد کیں اور خود اللہ کو پیارے ہو گئے۔[6]

اس واقعہ کے بعد وہ سجادہ نشین ہوئے اور پھر حد درجہ متقی و پرہیزگار اور شریعت و طریقت کے پابند ہو گئے۔[7] انھوں نے بے شمار لوگوں کو روحانی فیض بخشا اور اپنے زمانہ کے عظیم المرتبت بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔[8] ان کے بیٹے بھی بڑے صاحبِ حال و ذی مرتبہ

---

۱ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۱۸ ب۔ بحر ذخار (قلمی) ورق ۲۴۸ ب۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۸۰

۲ ایضاً مرآۃ الاسرار ایضاً بحر ذخار ایضاً

۳ مرآۃ الاسرار ایضاً

۴ ایضاً خزینۃ الاصفیاء ایضاً ص ۳۸۱

۵ مرآۃ الاسرار ایضاً خزینۃ الاصفیا ایضاً ص ۳۸۱

۶ ایضاً

۷ ایضاً

۸ ایضاً

بزرگ تھے۔ ان کی اولاد میں سے ایک مشہور بزرگ شیخ مصطفیٰؒ مغل شہنشاہ شاہجہان کے دورِ حکومت کی بڑی مشہور ہستی تھے۔ مرآۃ الاسرار کے مؤلف شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ بارہا ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور روحانی فیض سے شادکام ہوتے[1]

ان کا وصال ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء میں ہوا[2]۔ ان کا روضۂ اقدس کنتور میں مرجع خلائق ہے۔

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۱۹۳ ا

[2] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۸۱

بابِ ہفتم

چشتیہ مشائخ اودھ[1]

شیخ فتح اللہ اودھیؒ

شیخ فتح اللہ اودھیؒ علومِ ظاہری کے بڑے جیّد عالم تھے۔ پہلے وہ دھلی میں رہا کرتے تھے اور وہاں میناریؔ کے قریب جامع مسجد میں درس دیا کرتے تھے[2] لیکن جب عشقِ حقیقی نے کشش کی تو ہر چیز سے کنارہ کش ہوکر شیخ صدرالدین حکیمؒ کے مرید ہوگئے[3] اس کے بعد انھوں نے چند سال بڑی ریاضت اور فقر و فاقہ میں گزارے مگر خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوتی جس کی شکایت انھوں نے اپنے پیر و مرشد سے کی تو انھوں نے مشورہ دیا کہ تدریس کا شغل ترک کردیں اور کتابوں سے کنارہ کشی کرلیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا لیکن پھر بھی مراد بر نہ آئی۔ بالآخر وہ باقی ماندہ کتابوں سے بھی کنارہ کش ہوگئے اور دن رات عبادت و ریاضت کرنے لگے[4]

شیخ عبدالحق محدث دھلویؒ لکھتے ہیں کہ ایک روز لوگوں نے ان کو دیکھا کہ وہ دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے کتابیں دھو رہے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔ وہ اس قدر روتے کہ ان کا دل و ضمیر پاک صاف ہوگیا اور ان کے صفحۂ باطن پر حرفِ مقصود رب المعبود نقش ہوگیا۔

شیخ فتح اللہؒ اس دور کے کامل بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے ہزاروں

---

[1] اودھ (اجودھیا)
[2] اخبارالاخیار ص ۱۶۳
[3] ایضاً
[4] ایضاً

طالبانِ حق کو راہِ حق دکھائی تھی[۱]۔ ان کے اجل خلفاء میں سے شیخ قاسم اودھی دہلویؒ اور شیخ محمد عیسیٰ تاج جونپوریؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے شاہ موسیٰ عاشقاںؒ اور شیخ جمال گوجریؒ کے ساتھ بڑے گہرے مراسم تھے[۲]۔ انھوں نے تصوف پر ایک رسالہ آداب السالکین کے نام سے لکھا جس میں انھوں نے مصلاّ، تسبیح، شانہ، آفتابہ، عصا، مقراض، سوزن، کوزہ، کاسہ، نمکدان، طشت، کفش اور نعلین جیسی چیزوں کی تشریح کی اور لکھا کہ ایسی چیزیں جو پیر و مرشد اپنے مریدوں کو عطا کیا کرتے ہیں کسی نہ کسی حقیقت کی طرف دلالت کرتی ہیں[۳]۔ مثلاً ان میں سے مصلاّ، استقامت، طاعت اور عبادت پر دلالت کرتا ہے۔

ان کا وصال ۸۲۱ھ/ ۱۴۱۸۔۱۴۱۹ء میں ہوا[۴] اور ان کا روضۂ اقدس اودھ میں ہے[۵]۔

شیخ جمال گوجری اودھیؒ

شیخ جمال گوجریؒ شیخ مظفر بلخیؒ کے مرید و خلیفہ تھے[۶]۔ انھوں نے اپنے پیر و مرشد کی ہدایت کے مطابق اودھ میں سکونت اختیار کی[۷]۔ جہاں وہ کھچڑی کی ایک دیگ سر پر رکھ کر گھوما کرتے تھے اور جو کوئی بھوکا ملتا اسے کھلاتے۔ ایک بار اتفاقاً وہ دیگ اٹھائے شاہ موسیٰ عاشقاںؒ کے پاس چلے گئے۔ انھوں نے انھیں دیکھ کر کہا، اے شیخ اگرچہ تم یہ دیگ گوجروں کی طرح اٹھاتے پھرتے ہو مگر درحقیقت بھاتے عشق بیچتے پھرتے ہو۔ چنانچہ اسی روز سے ان کا لقب گوجری پڑ گیا[۸]۔

---

۱ اخبار الاخیار ص ۱۶۳

۲ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۸۰

۳ اخبار الاخیار ص ۱۶۳

۴ خزینۃ الاصفیاء ایضاً

۵ ایضاً

۶ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۹ ل۔ وہ شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے خلیفہ تھے اور جنھوں نے سلسلۂ فردوسیہ کی روایات کو بہار میں قائم کیا تھا۔

۷ ایضاً

۸ ایضاً

شیخ جمالؒ بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ ان کو سلسلۂ فردوسیہ کے علاوہ سلسلۂ چشتیہ صابریہ سے بھی بڑا روحانی فیض حاصل تھا[1]۔ ایک دفعہ شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ اودھ تشریف لائے تو شیخ جمالؒ کے دامنِ محبّت میں گرفتار ہو گئے۔ پھر اکثر و بیشتر اپنا وقت انہی کی صحبت میں گزارا کرتے[2]۔ ایک بار انھوں نے آپ کے متعلق کہا کہ میں نے بھکہ سے پنڈوہ تک سفر کیا مگر میری کسی مسلمان سے ملاقات نہ ہوئی لیکن صرف اودھ میں ایک ایسا بچہ ملا جس کا میں متلاشی تھا۔ اس سے ان کی مراد آپ ہی تھے[3]۔ انھوں نے ان کی مصاحبت میں رہ کر بڑا روحانی فیض حاصل کیا اور مرتبۂ ارشاد کو پہنچے تھے[4]۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ جن دنوں شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ اودھ میں تھے اُن کے پاس ایک کتیا تھی۔ اس کتیا نے ایک دفعہ بچے جنے تو انھوں نے اس کی خوشی میں شہر کے تمام لوگوں کو اور اُمراء کی دعوت دی۔ دوسرے روز جب شیخ جمالؒ کو خبر ملی تو انھوں نے ان سے گلہ کیا اور عرض کیا کہ حضرت آپ نے تمام لوگوں کو مدعو کیا لیکن مجھے اطلاع تک نہ کی۔ شیخ عبدالحقؒ نے جواب دیا۔ شیخ جمالؒ وہ تو ایک کتیا کی دعوت تھی جس میں ہم نے شہر کے تمام کتّوں کو بلایا تھا کیونکہ یہ دُنیا ایک مُردار ہے اور اس کے طالب کتے ہیں۔ تم تو انسان ہو تمھارا ان لوگوں سے کیا تعلق[5]؟

شیخ جمالؒ بڑے صاحبِ کرامات درویش تھے[6] اور انھوں نے سینکڑوں ہزاروں کو روحانی فیض بخشا تھا۔ ان کے خلفائے اجلّ میں سے ایک مخدوم شیخ بھیکہؒ بڑے کامل درویش تھے جن کا روضۂ اقدس شہر اودھ سے چار کوس دُور موضع بلہری میں ہے[7]۔ شیخ جمال کا روضۂ اقدس شہر اودھ میں ہے اور زیارت گاہِ خلائق ہے[8]۔

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۹ ا [2] ایضاً۔ اخبار الاصفیا (قلمی) ورق ۴۳ ب [3] اخبار الاخیار ص ۱۸۵۔ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۹ ا۔ب [4] ایضاً [5] اخبار الاخیار ص ۱۸۵ خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۳۲۰-۳۲۱ [6] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۹ ب [7] ایضاً [8] ایضاً

باب ہشتم

چشتیہ سلسلہ کے دوسرے مشائخ

شیخ حسام الدین فتح پوریؒ

شیخ حسام الدین فتح پوریؒ قاضی عبدالمقتدرؒ کے خلفائے اجل میں سے تھے اور بڑے متبحّر عالم اور عظیم المرتبت بزرگ تھے[1] قاضی عبدالمقتدرؒ کی وفات کے بعد ان کے اور قاضی عبدالمقتدرؒ کے نبیرہ شیخ ابوالفتح جونپوریؒ کے بڑے گہرے مراسم قائم ہو گئے تھے یہاں تک کہ یہ انھیں اپنے پیر و مرشد کی جگہ اور وہ ان کو اپنے جدِ امجد کی جگہ خیال کرتے اور دونوں ایک دوسرے کی حد درجہ تعظیم کرتے تھے[2] امیر تیمور نے جب دھلی پر حملہ کیا تو وہ دونوں دھلی سے ہجرت کر کے جونپور کی طرف چل دیے لیکن راستے میں جب قصبہ فتح پور پہنچے تو شیخ ابوالفتحؒ نے ان سے کہا کہ یہ جگہ صاحب ولایت سے خالی ہے۔ اس لیے آپ یہاں آباد ہو جائیں، اور خود وہ جونپور چلے گئے۔ ان دونوں میں بڑی گہری الفت تھی اس لیے وہ ایک دوسرے کو اکثر ملنے جاتے اور اکثر مجلسِ سماع کا بھی شوق فرماتے[3]

شیخ حسام الدینؒ اور مخدوم شیخ اخی سراج راجگیریؒ کے بھی آپس میں بڑے عمدہ مراسم تھے۔ دونوں کے درمیان مراسلت بھی رہتی جس میں وہ مذہب و معرفت کے مسائل پر بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے[4] شیخ عبدالرحمٰن چشتی نے ان کا اس طرح کا ایک

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۶۰ ا

[2] ایضاً

[3] ایضاً ورق ۱۶ا ۴ ا۔

[4] ایضاً ورق ۴۶۰ ب

خط مرآۃ الاسرار میں بھی درج کیا ہے[1] جس سے اُن کی عظمت و بزرگی کا پتہ چلتا ہے۔

شیخ حسام الدینؒ بڑے صاحبِ کرامات بزرگ تھے اور اُن کی شہرت ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے بے شمار خلفاء تھے۔ ان میں سے ایک شیخ بڈھن بڑے معروف تھے[2]۔ ان کے بیٹے بھی بڑے صاحبِ مرتبہ بزرگ تھے[3]۔ خزینۃ الاصفیاء کے مؤلف معارج الولایت کے حوالہ سے ان کا سالِ وصال ۸۰۰ھ/۱۳۹۷-۱۳۹۸ء لکھتے ہیں[4]۔ مگر مرآۃ الاسرار کے مؤلف لکھتے ہیں کہ انھوں نے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہدِ حکومت میں ۸۴۴ھ/۱۴۴۰ء میں وصال کیا[5]۔ ان کا روضۂ اقدس فتح پور[6] میں مرجعِ خلائق ہے۔

شیخ بڈھن انچولویؒ

شیخ بڈھنؒ شیخ حسام الدین فتح پوریؒ کے خلفائے کبار میں سے تھے۔ انھوں نے بچپن سے انہی کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی تھی اور تمام کمالاتِ ظاہری و باطنی بھی حاصل کیے تھے[7]۔

شیخ عبد الرحمٰن چشتیؒ لکھتے ہیں کہ ایک بار جب شیخ حسام الدین فتح پوریؒ شیخ ابوالفتح جونپوریؒ سے ملنے جونپور جا رہے تھے تو راستے میں انچولی ٹھہرے۔ شیخ بڈھن اس وقت چھ ماہ کے تھے۔ اُن کے والد چونکہ شیخ حسام الدینؒ کی شہرت سے پہلے ہی سے واقف تھے اس لیے اُن کو اٹھا کر ان کے پاس لے گئے اور عرض کیا کہ میرے چند معصوم

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۶۱ الف۔ یہ خط ورق ۴۶۱ الف-ب پر درج ہے۔ [2] ایضاً ورق ۴۶۰

[3] ایضاً ورق ۴۶۳ الف۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۷۰ [4] خزینۃ الاصفیاء ایضاً

[5] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۶۱ ب، ۴۶۲ الف

[6] فتحپور ضلع بارہ بنکی کی ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔

[7] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۶۰ ب۔ خزینۃ الاصفیاء ایضاً۔ ان کا نام بدھن کی بجائے بڈھنؒ لکھتے ہیں۔

بچے پہلے فوت ہو چکے ہیں۔ اب میری یہ آرزو ہے کہ میرے اس بیٹے کو آپ کی دعا سے لمبی عمر نصیب ہو۔ انھوں نے فرمایا اِنشاءاللہ تعالےٰ یہ پیر کبیر ہوگا۔ اس نے پھر عرض کیا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی قسمت میں علم بھی ہو۔ انھوں نے فرمایا اِنشاءاللہ تعالےٰ یہ عالم ہوگا۔ انھوں نے پھر عرض کیا کہ اسے جو بھی علم نصیب ہو وہ بغیر معرفت کے نہ ہو۔ انھوں نے فرمایا یہ عارفِ ربّانی ہوگا اور اس کی بڑی لمبی عمر ہوگی۔ چنانچہ انھوں نے جو کچھ بھی کہا وہ بعد میں ہو بہو سچ ثابت ہوا[1] اور وہ بڑے صاحب کرامات بزرگ ہوئے۔[2]

شیخ کمال الدینؒ المعروف شیخ کالو کڑویؒ

شیخ کمال الدینؒ بھی شیخ حسام الدین مانکپوریؒ کے خلفاء کبار میں سے تھے اور بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے۔[3] اُن کو مجلس سماع کا بے حد شوق تھا۔[4] ان کا روضۂ اقدس کڑہ میں ہے۔[5]

شاہ عبدالرزاق جھنجانویؒ

شاہ عبدالرزاقؒ شیخ محمد حسنؒ ولد شیخ حسن طاھر چشتیؒ کے عالی مرتبت خلفاء میں تھے اور بڑے صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔[6] انھوں نے اوائل عمر ہی میں علوم ظاہری کی تعلیم مکمل کر کے پھر صوفیانہ مشارب اختیار کر لیے تھے۔ انھوں نے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے بڑی ریاضاتِ شاقہ اور مجاہدات کیے تھے۔[7] ان کو حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۰ ب، خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۷۰۔ خزینۃ الاصفیاء کے مؤلف آپ کی عمر اس وقت چھ ماہ کی بجائے چھ سال لکھتے ہیں۔

[2] ایضاً ورق ۴۹۱ ا

[3] اخبار الاخیار ص ۱۷۴، مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۵۰۴ ب۔ ۵۰۵ ا

[4] اخبار الاخیار ص ۱۷۴

[5] ایضاً

[6] ایضاً ص ۲۳۰۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۲۳

[7] ایضاً

کے ساتھ بے حد عقیدت تھی اور اس واسطہ سے اُن کو بلند مرتبہ قادریہ مشائخ میں بھی شمار کیا جاتا ہے[۱]۔

شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ ایک بار ایک سیّد کو کسی امیر نے کسی پاداش میں جیل میں بند کر دیا۔ وہ اس کے ضامن بن گئے اور اسے کہا کہ تم شہر سے چلے جاؤ اور پھر خود اُن کی جگہ جیل میں چلے گئے۔ جیل خانہ میں ان کو بڑے مصائب و تکالیف کا شکار ہونا پڑا مگر انھوں نے صبر و تحمّل کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا اور سب کچھ برداشت کرتے چلے گئے[۲]۔

شاہ عبدالرزاقؒ شیخ امان پانی پتیؒ کے ہم عصر تھے اور ان دونوں میں مسئلہ توحید اور اس کے اطلاق پر اکثر بحث و مباحثہ ہوتا رہتا تھا۔ شیخ امانؒ نے اس سلسلہ میں ایک رسالہ بھی لکھا جس کا نام اثبات الاحدیہ تھا[۳]۔ ان کے بے شمار خلفاء تھے۔ ان میں سے ایک سیّد علی بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے۔ وہ لدھیانہ (پنجاب) میں دفن ہیں[۴]۔ شاہ رزاقؒ بڑے ذاکر و عبادت گزار درویش تھے[۵]۔ انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی اور اُن کا وصال ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء میں ہوا[۶]۔ شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ نے ان کا ایک خط اخبار الاخیار میں درج کیا ہے جس میں انھوں نے حقیقتِ حق تعالےٰ پر بڑی مفصّل روشنی ڈالی ہے[۷]۔

سیّد سلطان بہرائچیؒ

سیّد سلطان بہرائچیؒ بڑے صاحبِ دل اور صاحبِ ہمّت بزرگ تھے[۸]۔ وہ علاءالدین

۱۔ اخبار الاخیار ص ۲۳۰، خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۲۳ ۲۔ اخبار الاخیار ص ۲۲۰، گلزارِ ابرار ص ۲۴۸-۲۴۹

۳۔ اخبار الاخیار ص ۲۳۰۔ ۴۔ ایضاً

۵۔ خزینۃ الاصفیاء ایضاً ۶۔ اخبار الاخیار ایضاً لیکن خزینۃ الاصفیاء کے مصنّف آپ کا سالِ وصال ۹۵۰ھ لکھتے ہیں۔

۷۔ اخبار الاخیار ص ۲۲۰-۲۳۳

۸۔ ایضاً ص ۲۲۴

اجودھنیؒ کے مرید تھے اور انھیں ان کے سلسلۂ تشطاریہ سے بھی رُوحانی فیض حاصل تھا۔[1] وہ عورتوں کا لباس پہنتے اور اکثر اوقات ننگے سر رہتے۔ کبھی وہ فقراء کے ساتھ رہتے اور کبھی تنہا زندگی بسر کرتے۔[2] ان کو ذکرِ جہری کا بے حد شوق تھا اور اس کو بڑے زور شور سے کیا کرتے تھے۔[3]

شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ میرے والدِ بزرگوار نے جب دنیائے تصوف میں قدم رکھا تو ایک بار وہ ان کی زیارت کے لیے گئے۔ اس وقت وہ کوئی چیز لکھ رہے تھے۔ میرے والد خاموشی سے سر جھکا کر ذکر میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے ان کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور جب دونوں کی نظریں ملیں تو وہ اسی وقت مسکرا دیے اور پھر آگے بڑھ کر ان کو گود میں لے لیا اور بڑی شفقت و محبّت سے حال احوال پوچھا۔ اس کے بعد میرے والد چلے آتے۔ بعدازاں انھوں نے کسی سے سنا کہ سیّد سلطانؒ اہلِ مجلس سے فرما رہے تھے کہ آج میرے پاس ایک نوجوان آیا، اس کا دل ذکر کر رہا تھا۔ اس وقت مجھے بڑی غیرت آئی اور میں نے چاہا کہ اپنے دل پر زور سے طمانچہ ماروں لیکن مجھے بڑھاپے نے احساس دلایا کہ یہ وقتِ رحم ہے۔[4]

کہا جاتا ہے کہ ان کو ایک ہندو عورت سے محبت تھی جو بعد میں مسلمان ہو کر ان کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ اس کے خاندان کے لوگوں کو جب یہ خبر ملی تو وہ ایک شخص محمّد زمان کے پاس گئے۔ جو بابر بادشاہ کے اقارب میں سے تھا اور اس سے اس معاملہ میں دادرسی کی درخواست کی چنانچہ اُس نے ان کے گھر اپنا ایک ملازم بھیجا اور کہلوا بھیجا کہ ان کی بہتری اس میں ہے کہ وہ اس عورت کو فوراً گھر سے نکال دیں۔ انھوں نے یہ الفاظ سنتے ہی اپنی تلوار نکال لی اور گھر کے دروازہ سے باہر آ کر جواب دیا کہ اب یہ عورت مسلمان ہے

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۲۴
[2] ایضاً
[3] ایضاً ص ۲۲۴ ۔ ۲۲۵
[4] ایضاً

اور اس کو کافروں کے سپرد کرنا ناجائز ہے تاہم اگر تم لوگوں نے جنگ کی ٹھانی ہے تو آپ ہی اس کا فیصلہ خدا اسی وقت کر دے گا۔ ان الفاظ کا اس ملازم کے دل پر اِس قدر اثر ہوا کہ وہ پشیمان ہو کر فوراً واپس چلا آیا[1]۔

سید سلطانؒ کے بے شمار مرید اور خلفاء تھے۔ ان میں سے ایک شیخ علاء الدینؒ بڑے ذی مرتبت بزرگ تھے[2]۔

مخدوم بندگی جلال الحق قاضی خاں ناصحی ظفرآبادیؒ

مخدوم بندگی جلال الحق قاضی خاں ناصحیؒ فاروقی خاندان سے تھے۔ ان کا شجرۂ نسب حضرت سلطان التارکین ابراہیم ادھم بلخیؒ سے ملتا ہے[3]۔ اُن کے جدِ امجد قاضی تاج الدین ناصحیؒ بلخ سے ہجرت کر کے پہلے دہلی پہنچے اور پھر ظفر آباد جا کر آباد ہو گئے تھے[4]۔

مخدوم کا اصل نام یوسف تھا[5]۔ وہ ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء میں ظفر آباد میں پیدا ہوئے[6]۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت سلطنتِ شرقی کے وزیر ملک عماد الملک کے زیرِ سایہ ہوئی۔ جو اُن کی والدہ کے جدِ امجد تھے[7]۔ انھوں نے سترہ سال کی عمر میں تمام علومِ ظاہری کی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ جب اٹھارہ سال کے ہوئے تو شیخ حسن طاہر چشتی جونپوریؒ کے مرید و خلیفہ ہو گئے[8]۔ وہ زہد و ورع میں بے مثال تھے اور اپنا تمام تر وقت عبادت و ریاضت میں صرف کیا کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تیس سال کی ریاضات اور مجاہدات کے بعد اپنے نفس پر قابو پایا[9]۔ ان کے پیر و مرشد ان کے بڑے مدّاح اور قدر دان تھے۔ انھوں نے اپنے

۱۔ اخبار الاخیار ص ۲۲۵ — ۲۔ ایضاً

۳۔ تجلّی نور جلد اوّل ص ۱۵ — ۴۔ ایضاً

۵۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۶ — ۶۔ تجلّی نور ایضاً

۷۔ ایضاً — ۸۔ اخبار الاخیار ص ۲۲۶

۹۔ تجلّی نور ایضاً ص ۱۶ - خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۲۸

بیٹے عبدالعزیز کی روحانی تعلیم و پرورش اِن ہی کی زیرِ نگرانی کروائی تھی۔[1]

جب مخدوم بندگیؒ منزلِ مقصود کو پہنچے تو انھوں نے اپنے پیر و مرشد کی ہدایت کے مطابق شادی کر لی مگر ازدواجی زندگی میں تنگدستی اور پریشانی سے سابقہ رہا۔ اس کی شکایت انھوں نے اپنے پیر و مرشد سے کی۔ انھوں نے ان کو ایک تسلّی بخش خط لکھا اور کہا کہ جب تمھیں اپنے بیوی بچوں کی پریشانی کا زیادہ احساس ہو تو اس شعر کے مضمون کو اپنے دل میں تصوّر کر لیا کرو۔[2]

از خدا خواہم وز غیر نخواہم بخدا
کہ نیم بندہ غیر و نخدای دیگر است

فرزند بندہ است خدا را تو غم مخور
تو بندہ ہستی نہ خداوند پروری

اور یہ بھی لکھا کہ اگر تو مفلس ہے تو توکّل کا خزانہ اپنے لیے کافی سمجھ اور ناحق و ناروا غم مت کر۔ چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی اپنے حجرۂ عبادت و خانقاہ سے باہر نہ آئے اور نہ کبھی کسی کی نذر و نیاز قبول فرمائی بس راضی برضا رہے اور تمام عمر توکل اللہ ہی پر گزار دی۔[3]

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ بادشاہ ہمایوں کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ ایک بار جب وہ ظفرآباد اور جونپور آیا تو یکے بعد دیگرے چھ بار اُن کی زیارت کی خواہش کی لیکن ہر بار محرومی ہوئی۔ بالآخر انھوں نے بادشاہ کو پیغام بھیجا کہ میرا حجرہ ایک قبر کی مانند ہے جہاں لوگ فاتحہ خوانی کر کے چلے جاتے ہیں لہٰذا وہ بھی آئیں اور فاتحہ خوانی کر کے چلے جائیں۔ ہمایوں نے جب ساتویں بار زیارت کی درخواست کی تو آپ سمجھ گئے کہ اب وہ

---

[1] تجلّیٔ نور جلد اوّل ص ۱۶
[2] ایضاً
[3] ایضاً ص ۱۶ - ۱۷

ملاقات کیے بغیر نہیں جائیں گے اس لیے انھیں اندر بلالیا۔ ہمایوں حاضر ہوتے ہی قدم بوس ہوئے اور چند گاؤں معہ لگان معافی کے خانقاہ کے اخراجات کے لیے بھی پیش کیے لیکن انھوں نے جواب دیا کہ میں نے اپنے پیر و مرشد سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ[1]

از خدا خواہم و ز غیر نخواہم بخدا

کہ نیم بندۂ غیر و نخدای دیگر است

اس کے بعد جب ان کے بیٹے شیخ عبداللہؒ کو وہی فرمان معہ چند گاؤں لگان معافی کے پیش کیا گیا تو اس نے بھی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔[2]

مخدوم جلال الحقؒ کی میر علی عاشقاں سرائے میریؒ، مخدوم ادھن جونپوریؒ اور سید غیاث الدین درویشؒ سے بڑی گہری دوستی تھی۔ ایک روز وہ چاروں اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے کہ آپس میں موت کے بعد کے حالات پر بحث چل نکلی۔ چنانچہ سب نے ایک دوسرے کو وعدہ دیا کہ جو پہلے وصال کر جائے وہ خبر دے کہ خدا کے ہاں قبولیت کا موجب کیا چیز ہے۔ مگر ان سب سے پہلے وہی وصال کر گئے چنانچہ ان کے وصال کے تیسرے روز باقی تمام دوست اُن کے مزار پر گئے اور فرمایا اَلْکَرِیْمُ اِذَا وَعَدَ وَفٰی۔ دریں اثنا ہوا میں کاغذ کا ایک پُرزہ اڑتا ہوا آیا جس پر حافظ شیرازیؒ کا یہ شعر لکھا ہوا تھا۔[3]

اینجا فنون شیخ بیزد بہ نیم خس

راحت بدل رساں کہ ہمیں میخرند و بس

وہ بڑے عظیم المرتبت درویش تھے اور ان کے فیضانِ صحبت سے ہزاروں

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۲۷۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۴۲۸، تجلی نور ایضاً ص ۱۷

[2] اخبار الاخیار ایضاً

[3] تجلی نور جلد اول ص ۱۷

نے رُوحانی فیض حاصل کیا تھا[1]۔ اُن کا وصال ۱۵ صفر ۹۴۴ھ/۱۵۳۷ع کو ہُوا[2]۔ اُن کا روضۂ اقدس ظفرآباد میں مرجعِ خلائق ہے۔ جہاں اُن کا عرس ہر سال بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا ہے[3]۔

اُن کے خاندان کے بعض دُوسرے لوگ بھی بڑے صاحبِ باطن اور عالی مرتبت بزرگ ہوتے۔

---

[1] تجلّیِ نور جلد اوّل ص ۱۷
[2] ایضاً لیکن اخبار الاخیار اور خزینۃ الاصفیاء کے مصنّفین آپکے سالِ وصال ۹۷۰ھ لکھتے ہیں۔
[3] تجلّیِ نور ایضاً

حصہ پنجم

باب اوّل

اشرفیہ سلسلہ

اِس سلسلہ کے بانی میر سید اشرف سمنانی رحؒ تھے۔ وہ دراصل چشتیہ سلسلہ سے ہی منسلک تھے اور ان کی تعلیمات وُہی تھیں جو بزرگانِ چشت کی تھیں۔ لیکن انھوں نے بعض مذہبی معاملات یعنی مسائل توحید، وحدت الوجود، ارکانِ اسلام، ولایت، ولایت کے شرائط، ارادت کے شرائط، شیخ کے آداب، مرید کے آداب، شیخ کے اوصاف، کھانے پینے کے آداب، مہمان داری، مرید کی تعلیم، توکّل، تسلیم و رضا اور جُود و ایثار وغیرہ کی تشریح و وضاحت اپنی علمی اور روحانی تعلیم اور تجربہ کے مطابق کی ہے۔ علاوہ ازیں اُن کے اشاعت و تبلیغ کے طریقے بھی چشتیہ سلسلہ کے مشائخ سے قدرے مختلف تھے۔ وُہ اکابرِ چشت کی روایات کے برخلاف اُمراء و وزراء اور بادشاہوں کو رُشد وہدایت کے لیے کھلم کھلا ملنے میں کوئی حرج نہ سمجھتے تھے۔ وہ اکثر اس ملک کے اور عالمِ اسلام کے مختلف ممالک کے مذہبی دورے بھی کیا کرتے۔ جب وہ ان دوروں پر جاتے تو اپنے خلفاء، مریدین، عقیدتمندوں، فقراء اور قلندروں کے علاوہ باربرداری کے گھوڑوں اور اونٹوں کا ایک جمِ غفیر اپنے ساتھ رکھتے۔ وہ علماء و صلحاء کے علاوہ ہندوؤں کے ساتھ بھی بحث و مناظرات کرتے رہے اور انھوں نے لاتعداد افراد کو مشرف بہ اسلام بھی کیا۔ چونکہ ان کا اندازِ زندگی اور رُشد وہدایت کے طریقے چشتیہ صابریہ سلسلہ یا چشتیہ نظامیہ سلسلہ سے قدرے مختلف تھے اِس لیے ہم نے پیشِ نظر کتاب میں ان کے سلسلہ اور ان کے جانشینوں اور خلفاء کے تذکرہ کے

لیے ایک نئے باب "اشرفیہ سلسلہ" کا اضافہ کیا ہے۔ تاکہ ہماری اس ترتیب سے ان کے حالات سمجھنے میں خاطر خواہ مدد مل سکے۔

میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ سمنان سے ایک روحانی اشارہ کے تحت پنڈوہ پہنچے اور شیخ علاء الحقؒ کے مرید و خلیفہ ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے کچھوچھہ[1] سے اپنے سلسلہ کا اجراء کیا اور وہیں سے پھر ان کے منہ بولے بیٹے سید عبدالرزاقؒ اور اُن کے جانشینوں اور خلفا نے اشرفیہ روایات کو جاری رکھا۔ میر سید اشرفؒ کے بے شمار خلفا، انہونہ، جائس، بسوڑھی، بھنڈدڈ، اجودھیا، ردولی، آسوسنو، سدھور، لکھنو، کنتور، محمد آباد گہنہ (اعظم گڑھ)، ظفر آباد، جونپور، اور بنارس وغیرہ میں پھیلے ہوتے تھے اُن کے بعض خلفا عالم اسلام کے مختلف شہروں اور قصبوں میں اور خاص طور پر ماوراء النہر کے شہروں میں بھی آباد تھے اور وہاں انھوں نے اس سلسلہ کی نشر و اشاعت کے لیے بڑا کام کیا۔

میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ، ان کے جانشینوں اور خلفاء اور اس سلسلہ کے عہد شرقی کے بزرگوں کے حالات آئندہ صفحات میں ملاحظہ ہوں۔

---

[1] کچھوچھہ شریف (اشرف پور) ضلع فیض آباد (یوپی) تحصیل ٹانڈہ میں ہے۔ مخدوم اشرف کا روضہ اس کے بالکل ہمسایہ میں ایک گاؤں رسول پور میں ہے۔

باب دوم

میر سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ

میر سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا شمار ہند و پاکستان کے عظیم المرتبت مشائخ میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ہند و پاکستان کے مختلف علاقوں میں اور عالمِ اسلام کے مختلف ممالک میں اپنے مذہبی دورروں، تقریروں اور تحریروں سے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا جس قدر کام کیا اس کی دوسری مثال ملنی مشکل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ہزاروں غیر مسلموں کو مشرّف بہ اسلام کیا تھا اور خود مسلمانوں کے اندر دین کا شغف پیدا کر کے انھیں سچا مسلمان بنا دیا تھا۔

سیّد صاحبؒ کا اصل وطن سمنان تھا۔ ان کے والدِ بزرگوار سیّد محمد ابراہیم سمنان کے سلطان تھے اور نور بخشی سادات سے تعلّق رکھتے تھے[۱]۔ اُن کی والدہ ماجدہ خدیجہ بیگم خواجہ احمد یسویؒ کی لختِ جگر تھیں[۲]۔ وہ تہجّد کی نماز کبھی قضا نہ ہونے دیتی تھیں اور پوری پوری رات عبادت و ریاضت میں گزار دیتیں[۳]۔

ان کی ولادتِ باسعادت غالباً ۷۰۹ھ/۱۳۰۹-۱۳۱۰ء میں ہوئی[۴]۔ وہ بچپن ہی سے بڑے ہونہار اور ذہین تھے۔ انھوں نے سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ چودہ برس کی عمر میں معقولات و منقولات کی تعلیم مکمّل کی اور خاص طور پر علمِ حدیث اور علمِ

۱۔ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۳۳ ا

۲۔ بحرِ ذخّار (قلمی) ورق ۲۵۵ ب

۳۔ لطائفِ اشرفی جلد دوم ص ۸

۴۔ بزمِ صوفیہ ص ۵۳۷

تفسیر پر عبور حاصل کر لیا۔ علاوہ ازیں انھیں صحابہ کرامؓ کے اقوال بھی زبانی یاد تھے[۱]۔ وہ اپنے والدِ بزرگوار کی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے اور انھوں نے کئی سال تک حکومت کی[۲]۔ ان کے عہدِ حکومت کے عدل و انصاف کے بڑے قصے مشہور ہیں۔ اپنے دورِ حکمرانی میں کبھی ان کے مذہبی معمولات میں فرق نہ آیا۔ وہ فرائض و سنن اور نوافل و واجبات کے پوری طرح پابند رہے۔ وہ حکومت کے معاملات میں زیادہ مصروف ہونے کی بجائے اپنا زیادہ تر وقت شیخ رکن الدین علاءالدولہ سمنانیؒ اور دوسرے صوفیا کی صحبت میں گزارتے[۳]۔ خزینۃ الاصفیا کے مؤلف لکھتے ہیں کہ اس عہد میں کئی بزرگانِ دین ان سے خواب میں ملتے رہے اور اُن کی روحانی تربیت کا سامان کرتے رہے۔ اِن بزرگوں میں سے حضرت خضرؑ اور خواجہ اویس قرنیؓ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[۴]۔ ایک بار حضرت خضرؑ رمضان المبارک کی ستائیسویں شب کو اُن سے خواب میں ملے اور اُن سے فرمایا کہ اگر تمھیں سلطنتِ الٰہی چاہیے تو دنیاوی سلطنت چھوڑ کر ہندوستان چلے جاؤ، وہاں اس سلسلہ میں شیخ علاءالدین علاءالحقؒ (بنگالی) تمھاری مدد فرمائیں گے۔ جب انھوں نے اِس واقعہ کا ذکر اپنی والدۂ محترمہ سے کیا تو انھوں نے فرمایا کہ بیٹے میرے والدِ بزرگوار نے تمھاری ولادت سے پہلے ہی مجھے یہ بشارت دی تھی کہ تمھارے گھر ایک ایسا فرزند پیدا ہوگا جس کے نُورِ ولایت سے تمام عالم منور ہوگا۔ اللہ تعالےٰ کا شکر ہے کہ اب وہ وقت آ پہنچا ہے۔ تمھیں یہ سفر مبارک ہو۔ میں تمھیں اپنے تمام حقوق بھی بخشتی ہوں[۵]۔

اس وقت سید اشرفؒ کی عمر ۲۳ سال تھی۔ چنانچہ انھوں نے تخت و سلطنت کو

---

[۱] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۳۳ ل　　[۲] ایضاً

[۳] ایضاً

[۴] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۷۲۔ مرآۃ الاسرار ایضاً۔ ایک بار خواجہ اویس قرنیؓ بھی ان کو خواب میں ملے اور انھوں نے اذکارِ اویسیہ کی ہدایت کی جن کو وہ سات سال تک کرتے رہے۔

[۵] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۳۳ ل۔ ب بحرِ ذخار (قلمی) ورق ۲۵۵ ب ۲۵۶ ل

اپنے بھائی سلطان محمدؒ کے سپرد کیا اور خود سفرِ ہندوستان کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔[1] مرآۃ الاسرار کے مؤلف لکھتے ہیں کہ جب وہ سمنان سے اسی سفرِ مبارک پر روانہ ہوئے تو شیخ علاء الدولہ سمنانیؒ کئی ہزار فوجی اور دُوسرے لوگ بھی انھیں تین منزل تک الوداع کرنے کے لیے گئے۔[2] سب سے پہلے وہ ماوراء النہر ہوتے ہوئے بخارا اور پھر سمرقند پہنچے۔ وہاں انھوں نے سواری کے باقی گھوڑے بھی فقراء میں بانٹ دیے۔ اس کے بعد وہ سرزمینِ ہندو پاکستان میں سب سے پہلے اوچ شریف پہنچ کر حضرت مخدوم سیّد جلال الدین جہانیاں جہاں گشتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے رُوحانی فیض سے مستفیض ہوئے۔[3] اس کے بعد وہ دہلی گئے جہاں انھوں نے بزرگانِ چشت کے مزارات کی زیارت کی اور بہت سے دُوسرے مشائخ وقت سے ملے۔ اس کے بعد پھر انھوں نے پنڈوہ کا سفر اختیار کیا۔[4]

لطائفِ اشرفی میں ہے کہ ان کے آنے سے پہلے ہی شیخ علاء الدین علاء الحقؒ نے اپنے مریدوں کو بشارت دے دی تھی کہ "آں کسے کہ از دو سال انتظار او می کشیدہ ام و طریقِ مواصلت او می دیدہ ایم امروز و فردا می رسد۔"[5] اور جب سیّد اشرف پنڈوہ کے قریب پہنچے تو اس وقت شیخ قیلولہ فرما رہے تھے اور بیک بار بولے "بوئے یار می آید"۔[6] چنانچہ وہ اسی وقت ان کے استقبال کے لیے تیار ہو گئے اور اسی محافہ میں بیٹھ کر باہر نکلے جو انھیں اپنے پیرِ مُرشد شیخ سراج الدین المعروف بہ اخی سراجؒ سے ملا تھا۔ انھیں باہر جاتے دیکھ کر مریدوں اور معتقدوں کا ایک ہجوم بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ اُن میں سے بعض تو پیادہ تھے اور بعض گھوڑوں پر سوار تھے۔ یہ جلوس ان کے استقبال کے لیے شہر سے ایک کوس باہر

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۳۴۳ ب　[2] ایضاً

[3] ایضاً لطائف اشرفی جلد دوم ص ۹۴۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے آپ کو دیکھتے ہی فرمایا: "بعد از مدتے بوئے طالب صادق بد ماغ رسیدہ و بعد از روزگار نسیم از گلزار سیادت درزیدہ۔"

[4] مرآۃ الاسرار ایضاً۔ لطائفِ اشرفی ایضاً جلد دوم ص ۹۴-۹۵

[5] ایضاً ص ۹۵　[6] ایضاً

آیا۔ سید اشرفؒ نے شیخ علاء الدینؒ کو دور سے دیکھا تو دوڑتے ہوئے آئے اور ان کے قدموں میں گر پڑے۔[1] انھوں نے بھی ان کو بڑے والہانہ انداز سے اٹھا کر گلے لگایا اور فرمایا ؎

چہ خوش باشد کہ بعد از انتظارے
باامیدے رسد امیدوارے[2]

پھر شیخ علاء الدینؒ نے ان کو اپنے ساتھ ہی محافہ میں بٹھالیا اور خانقاہ میں لے آئے۔ جہاں اُن کی بڑی تعظیم وتکریم کی گئی۔ اس کے بعد انھیں اپنے حجرۂ عبادت میں لے جا کر بیعت سے مشرف فرمایا۔[3]

سید اشرفؒ چار سال اپنے مرشد کی خدمت میں رہے اور بڑی ریاضت کے بعد خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ شیخ نے ان کو وہی خرقہ عطا فرمایا جو خود انھیں اپنے پیرومرشد شیخ اخی سراجؒ سے ملا تھا۔ علاوہ ازیں ان کو جہانگیر کے لقب سے ملقب فرمایا اور بزرگانِ چشت کی دوسری امانتیں بھی دیں۔[4] اس کے بعد ان کو صاحبِ ولایت جونپور مقرر کیا لیکن ان کی رہائش کے لیے کچھوچھہ متعین کیا۔[5]

سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے کچھوچھہ میں آباد ہوتے ہی وعظ وتلقین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ اکثر مذہبی دوروں پر جایا کرتے تھے اور اپنے ساتھ گھوڑے، اونٹ، خدمتگار خیمے، حاجت مند، صوفی، قلندر، جوگی، جوالق اور فقراء کا ایک جم غفیر رکھتے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات ان لوگوں کی تعداد پانچ سو تک بھی پہنچ جاتی تھی۔[6] چنانچہ سب سے پہلے دورے پر وہ منیر پہنچے تو شیخ شمس الدین اودھیؒ ان کے شاہانہ وملوکانہ انداز کو دیکھتے ہی

---

[1] لطائفِ اشرفی جلد دوم ص ۹۸-۹۹ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۳۲ ب
[2] لطائفِ اشرفی ایضاً
[3] ایضاً مرآۃ الاسرار ایضاً
[4] ایضاً ورق ۴۳۴ د
[5] ایضاً
[6] ایضاً

کہنے لگے "درویشاں را با ایں ہمہ چہ نسبت"۔ انھوں نے جواباً فرمایا "میخ طویلہ در گل زدہ ام نہ در دل"۔ اس کے بعد وہ محمد آباد گہنہ (اعظم گڑھ) پہنچے۔ وہاں کے تمام علماء ان کی ملاقات کے لیے آئے مگر انھوں نے مختلف مسائلِ مذہب پر سوالات و جوابات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسی دوران میں خلفائے راشدین کی مدح و توصیف میں گفتگو ہونے لگی چونکہ انھوں نے حضرت علیؓ کی مدح میں ایک رسالہ بھی تصنیف کیا تھا جس میں انھوں نے حضرت علیؓ کی مدح دوسرے خلفاء کی بہ نسبت زیادہ کی تھی لہٰذا اس موضوع پر بحث و مباحثہ ہونے لگا۔ بالآخر علماء نے ان پر رفض کا الزام عائد کر دیا۔ اس کے دوسرے روز نمازِ جمعہ کے بعد علماء کی طرف سے ایک محضر پیش ہوا جس میں ان کے خلاف فتویٰ دیا گیا تھا لیکن اس قصبہ کے مفتی اور صدر علماء مولانا سیّد خان نے ان علماء سے اختلاف کیا اور سیّد اشرف کی کھلم کھلا حمایت کی۔ مولانا کا موقف یہ تھا کہ چونکہ وہ سیّد ہیں اس لیے انھوں نے اپنے جدِ امجد کی شان میں جو کچھ لکھا ہے اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے بعد تمام مخالف علماء خاموش ہو گئے۔ سیّد اشرف مفتی سیّد خان سے بہت خوش ہوئے اور ان کے حق میں انھوں نے بڑی دعائیں فرمائیں بالآخر دوسرے تمام علماء بھی اُن کی بزرگی کے قائل ہو گئے۔[۲]

اس کے بعد وہ ظفر آباد گئے۔ پہلے تو وہاں کے لوگوں نے ان کے ساتھ سرد مہری برتی اور خاص طور پر مخدوم چراغ ہندؒ ان کے مویشیوں اور مریدوں و معتقدوں کے گرد

---

[۱] لطائفِ اشرفی جلد دوم ص ۱۰۱، مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۳۴ ا-ب

[۲] لطائفِ اشرفی جلد دوم۔ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۳۴ ب۔ خزینۃ الاصفیا (جلد اول ص ۳۷۳-۳۷۴) کے مؤلف لکھتے ہیں کہ سیّد خاں کو حضورؐ نے خواب میں اشارہ فرمایا کہ سیّد اشرفؒ ہمارے جگر گوشہ ہیں ان کے متعلق غیر مناسب الزام عائد کرنا غلط ہے۔ تم لوگوں کی بہتری اسی میں ہے کہ اس سے توبہ کرو اور اپنے کیے کی معافی مانگو۔ مرآۃ الاسرار کے مصنف لکھتے ہیں کہ سیّد خاں کی کوئی اولاد نہ تھی۔ انھوں نے ان کو چار عالم و فاضل بیٹوں کی بشارت دی اور ان کی دعا ان کے حق میں قبول ہوئی۔

کو دیکھ کر بڑے ناخوش ہوئے لیکن پھر ان کی بعض کرامات سے ان کی بزرگی کے قائل ہو گئے۔ اس موقعہ پر شیخ کبیر سرسرپوریؒ بھی ان کے مرید ہو گئے جو بڑے صاحبِ علم انسان تھے اور بعد میں ان کے نامور خلفاء میں سے ہوئے[1]۔

ظفرآباد کے بعد آپ جونپور پہنچے اور وہاں کے تمام علماء، صلحاء اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی بھی ان کے فیوض و برکات سے مستفیض ہوئے[2]۔ علمائے جونپور میں سے قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ کا نام سرفہرست آتا ہے۔ جنھوں نے ان کی شفقت و محبت سے بڑا علمی و روحانی استفادہ کیا اور خرقۂ خلافت اور ملک العلماء کا خطاب بھی پایا۔ قاضی صاحب نے اپنی تصنیفات بھی ان کو دکھائیں اور اُن کی اصلاح بھی کروائی[3]۔ وہ ان کی قابلیت کے بڑے معترف تھے۔ ایک بار انھوں نے ان کے متعلق فرمایا کہ ہندوستان میں جتنی فضیلت انھوں نے ان میں دیکھی ہے کسی اور میں کم دیکھی ہے۔ ان کی علمِ نحو کی کتابِ ارشاد کے متعلق انھوں نے فرمایا کہ "اینکہ می گویند کہ سحر از ہندوستان راست آمد غالباً ایں ز راست سحر بودہ"[4]۔

قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ کی وساطت سے سلطان ابراہیم شرقی بھی اپنے خوانین و امراء کے ساتھ کئی بار ان کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوتے۔ ایک موقعہ پر آپ نے انھیں ایک مندیل عطا فرمائی جس سے وہ بہت خوش ہوتے اور جب گھر پہنچے تو کہا "چہ سید لیست عالی جناب و مقاصد مآب الحمد للہ کہ در ہندوستان چنیں مردم در آمدہ اند"[5]
جونپور میں ان کا قیام دو ماہ سے زیادہ رہا۔ ان دنوں سلطان ابراہیم نے قلعہ جنادہ کو سر

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۳۵ ا
[2] ایضاً ورق ۴۳۵ و۔ب
[3] ایضاً ورق ۴۳۵ ب
[4] لطائف اشرفی جلد دوم ۱۰۶ و جلد اول ص ۴۱۰
اخبار الاخیار میں ۱۶۱-۱۶۲ میں ہے کہ قاضی صاحب نے آپ سے فرعون کے ایمان پر تحقیق و بحث کی جس کا اشارہ نصوص الحکم میں بھی ملتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جو خط انھوں نے آپ کو لکھا وہ اخبار الاخیار میں درج ہے۔
[5] لطائف اشرفی جلد دوم ص ۱۰۵-۱۰۶

کرنے کے لیے ایک بہت بڑا لشکر بھیجا ہوا تھا اور اس کی فتح کے لیے وہ بڑا متردّد تھا چنانچہ انھوں نے اس کی فتح کے لیے دعا فرمائی اور وہ قلعہ فتح ہو گیا۔[1] اس کے بعد سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی اُن سے عقیدت اور بھی بڑھ گئی۔ ایک روز وہ چند آدمیوں اور شہزادوں کے ساتھ اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے ساتھ روٹی کا ایک ٹکڑا اور شربت بھی لایا اور عرض کیا کہ بندہ تو حضور کے ہاتھ پر بیعت ہو چکا۔ اب یہ لوگ بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کی آرزو رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس روز متعدد دوسرے لوگوں کے علاوہ تین شہزادے بھی ان کی بیعت ہوئے۔[2] سلطان ابراہیم شرقی نے آپ سے جونپور میں مستقل قیام کرنے کی درخواست کی لیکن انھوں نے جواب میں فرمایا کہ تمھاری سلطنت کی حدود سے باہر نہیں جاؤں گا۔ ان کے اس جواب سے وہ بہت خوش ہوا۔ سیّد اشرفؒ وہاں دو ماہ سے زیادہ عرصہ مزید مقیم رہے۔[3] پھر کہمینی اور بھڈونڈ ہوتے ہوتے کچھوچھہ واپس چلے گئے جس کا نام انھوں نے اب رُوح آباد رکھا۔[4]

سیّد اشرف اس ملک کے علاوہ بلادِ اسلامیہ میں بھی اکثر مذہبی دوروں پر اور مقاماتِ مقدّسہ کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے۔ ان کے مذہبی دوروں اور مختلف سفروں کی تفصیل یہاں بیان کرنا مشکل ہے۔ امیر احمد علویؒ صاحب نے سیرۃ الاشرف مرتب کی ہے اور اس کو کچھوچھہ شریف کی درگاہ سے شائع کیا ہے۔ اس میں انھوں نے سیّد اشرفؒ کے تبلیغی دوروں اور سیاحت کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ اور لطائفِ اشرفی کا خلاصہ بھی

---

[1] لطائفِ اشرفی جلد دوم ص ۱۰۵-۱۰۶

[2] ایضاً

[3] ایضاً

[4] بزمِ صوفیہ ص ۵۲۹

دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سید اشرف جہانگیرؒ ظفر آباد سے جونپور جانے کی بجائے سیدھے عراق چلے گئے تھے اور اس سفر میں انھوں نے جیلان، بغداد، نجف اشرف اور بصرہ کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کی تھی پھر یمن سے ہوتے ہوئے واپس ہندوستان پہنچے اور سب سے پہلے پنڈوہ میں اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔[1] اس کے بعد پھر جونپور آئے اور اس کے بعد بھڈوڈ ہوتے ہوئے کچھوچھہ پہنچے جس کا نام انھوں نے رُوح آباد رکھا تھا۔ وہاں انھوں نے جو خانقاہ آباد کی تھی اس کا نام کثرت آباد رکھا اور اپنے حجرۂ عبادت کا نام وحدت آباد رکھا۔[2]

سید اشرفؒ تبلیغی دورے پر اجودھیا، سدھور، جائس، لکھنؤ، کنتور اور ردولی وغیرہ بھی جایا کرتے تھے۔ اسی طرح وہ دکن بھی گئے اور واپسی پر پھر اپنے پیر و مرشد کی زیارت کے لیے پنڈوہ گئے۔ اس سفر کے دوران میں وہ بہار شریف اس وقت پہنچے جبکہ حضرت مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیریؒ وفات پا چکے تھے اور لوگ ان کی نماز جنازہ کے لیے منتظر تھے۔ مخدوم یحییٰ منیریؒ نے وصیت فرمائی تھی کہ میری نمازِ جنازہ وہی شخص پڑھائے جو صحیح النسب ہو۔ تارکِ مملکت ہو اور سات قرأت کا قاری ہو۔ یہ تمام شرطیں حضرت سید اشرف جہانگیرؒ میں موجود تھیں اس لیے نمازِ جنازہ پڑھانے کی سعادت آپ ہی کو حاصل ہوئی۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ مزید وہاں ٹھہرے رہے اور ان کے مزارِ اقدس پر مراقبات کر کے ان سے روحانی فیوض و برکات حاصل کیے۔[3] پھر وہ پنڈوہ گئے۔ واپس پر بنارس قیام فرمایا اور پھر کچھوچھہ آ گئے۔[4] پھر وہ دوبارہ بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کے لیے گئے اور اس مرتبہ دمشق ہوتے

---

[1] لطائفِ اشرفی جلد دوم ص ۹۴۳
[2] ایضاً
[3] ایضاً
[4] بزمِ صوفیہ ص ۵۲۲

ہوتے فلسطین اور پھر قسطنطنیہ پہنچے پھر واپسی پر گلبرگہ ہوتے ہوئے کچھوچھہ آئے[1]۔ اس کے بعد انھوں نے فارس و شام اور ماوراء النہر کا سفر اختیار کیا اور واپسی پر اوچ شریف ہوتے ہوئے پنڈوہ پہنچے۔ اپنے پیر و مرشد کے وصال (۸۰۰ھ) اور اُن کے جانشین مخدوم زادہ محمد نورؒ کی سجادہ نشینی کے موقع پر وہ پنڈوہ میں موجود تھے۔ اس کے بعد وہ جونپور ہوتے ہوئے کچھوچھہ آئے[2]۔ یہ اُن کا آخری سفر تھا۔ اس کے بعد انھوں نے باقی تمام زندگی کچھوچھہ ہی میں گزار دی۔

سید اشرفؒ نے جن مقامات، جزیروں اور پہاڑی علاقوں کی سیاحت کی، اُن کی تفصیلات لطائفِ اشرفی میں درج ہیں۔ اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں: جزیرۂ صھف سیلان، ایلاق، جبل القاف، حضلان، جبل الابواب، ولایت جھنگر، جبل الفتح، بیت المقدس، جبل لبنان، جبل النہاوند، جبل الطور، جبل القدم، گاذرون، ولایت خفخاق، جبل القرون، جبل الیسر[3]۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ میر سید علی ہمدانیؒ بھی ایک بار سفر میں اُن کے ساتھ تھے[4]۔ شیخ عبدالرحمن چشتیؒ صاحبِ تصنیف مرآۃ الاسرار اور مفتی غلام سرور لاہوریؒ صاحبِ تصنیف خزینۃ الاصفیاء لکھتے ہیں کہ ایک بار جب وہ حج پر گئے تو شیخ بدیع الدین مدارؒ بھی ان کے ساتھ تھے۔ حج کے بعد شاہ مدار تو واپس ہندوستان چلے آئے لیکن وہ مدینہ منورہ چلے گئے جہاں سے وہ روم پہنچے اور مولانا جلال الدین رومیؒ کے فرزندِ ارجمند اور سجادہ نشین سلطان ولدؒ اور دوسرے مشائخ سے ملے۔ وہاں سے شام آئے اور دمشق میں شیخ قمرالدین عراقیؒ کی زیارت کی۔ پھر مکہ معظمہ چلے گئے اور حج کے

---

[1] بزمِ صوفیہ ص ۵۲۲ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۵۲۳

[4] اخبارالاخیار ص ۱۶۱

بعد بغداد پہنچے اور وہاں سیّد عبدالقادر جیلانیؒ اور امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مزارات کی زیارتیں کیں۔ پھر وہ کاشان گئے اور شیخ عبدالرزاق کاشانی سے ملاقات کی۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن سمنان پہنچے[۱]۔ اور اپنی ہمشیرہ سے ملے۔ وہاں سے پھر وہ حضرت امام رضاؒ کے روضۂ اقدس مشہد گئے اور وہاں اعتکاف بھی کیا۔ وہاں ان دنوں امیر تیمور بھی حضرت امام رضاؒ کے روضہ کی زیارت کے لیے پہنچا ہوا تھا اور وہ اُن سے بڑی عقیدت سے ملا۔ مشہد سے پھر وہ ہرات اور وہاں سے ماوراء النہر گئے۔ بخارا میں انھوں نے حضرت شیخ بہاءالدین نقشبندیؒ کی صحبت میں کچھ وقت گزارا اور خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا۔ وہاں سے پھر وہ ترکستان گئے اور اپنے نانا خواجہ احمد یسویؒ کی اولاد سے ملے۔ پھر وہ بخارا، کابل، غزنی اور قندھار ہوتے ہُوتے ملتان پہنچے۔ وہاں سے وہ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کے روضۂ اقدس کی زیارت کے لیے پاکپتن گئے۔ وہاں سے دہلی اور پھر اجمیر پہنچے اور خواجہ معین الدین چشتیؒ کے روضۂ اقدس کی زیارت کی۔ وہاں سے گلبرگہ گئے اور حضرت خواجہ سیّد محمد گیسودراز بندہ نوازؒ سے ملے۔ گلبرگہ سے وہ سراندیپ چلے گئے اور واپسی پر گجرات ہوتے ہوتے پھر کچھوچھہ آئے[۲]۔

بعض تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ انھوں نے ایک سو نوّے اولیاء کرام سے روحانی فیوض و برکات حاصل کی تھیں۔ بیت المقدس میں انبیاء علیہم السلام کے مزارات کی زیارتیں کیں اور خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ کے مزارِ مقدس کی زیارت سے بڑے مستفیض ہوئے۔ علاوہ ازیں انھوں نے کربلا معلیٰ، نجف اشرف، بغداد میں کاظمین، شیخ معروف کرخیؒ، حضرت غوث الثقلینؒ اور دُوسرے بزرگوں کے مزارات پر بھی حاضری دی تھی۔ اسی طرح

---

[۱] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۳۵-۴۳۶۔ خزینۃ الاصفیاء۔ جلد اوّل ص ۳۷۵-۳۷۶

[۲] خزینۃ الاصفیاء۔ ایضاً

قونیہ میں بھی انھوں نے مولانا جلال الدین رومیؒ کی خانقاہ میں اقامت کی تھی۔ اس طرح جہاں جہاں بھی وہ گئے انھوں نے بزرگوں کے مزاروں پر مراقبات کیے تھے[1]

سید اشرفؒ تبلیغ اسلام کے لیے جہاں بھی جاتے وہاں نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ غیر مسلموں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیتے اور انھوں نے ہزاروں غیر مسلموں کو بھی مشرف بہ اسلام کیا تھا۔ لطائف اشرفی میں ہے کہ جب وہ بھڈونڈ گئے تو وہاں کے ملک الامراء محمود نے ان کا بڑا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ وہاں ایک ہندو جوگی اور اس کے بے شمار چیلے تھے۔ وہ جوگی ہوا میں اُڑنے کا دعوی کرتا تھا۔ جب سید اشرفؒ سے اس کا سامنا ہوا تو وہ ان کی رُوحانیت سے ایسا مرعوب و مغلوب ہوا کہ اپنے تمام باطل دعووں سے باز آگیا۔ پھر اس نے اپنی ساری مذہبی کتابیں جلا ڈالیں اور اپنے پانچ ہزار چیلوں سمیت مسلمان ہوگیا۔ اس جوگی نے بعد میں بابا کمال پنڈت کے نام سے شہرت پائی۔ اسی موقعہ پر ملک الامراء محمود اور ان کے ساتھ اور بہت سے دوسرے لوگ بھی ان کے ہاتھ پر بیعت ہوتے تھے[2]

اسی طرح ایک بار جب وہ تبلیغی دورہ پر اجودھیا گئے تو وہاں کا حاکم نواب سیف خاںؒ اس کے امراء اور بہت سے دُوسرے لوگ بھی ان کے مرید ہو گئے[3]۔ ایک بار پھر جب وہ اودھ/اجودھیا گئے تو حضرت شمس الدین صدیق اودھیؒ ان کے رُوحانی فیض سے مستفیض ہوتے۔ وہ اپنے زمانہ کے علمائے نامدار اور فصحائے روزگار میں سے تھے۔ وہ بعد میں ان کے اجلّ خلفاء میں سے ہوتے۔ ان کو اس پر بڑا ناز تھا۔ ایک بار انھوں نے فرمایا:
"اشرف شمس و شمس اشرف از ہم جدا نہ اند"[4] ایک بار وہ ردولی پہنچے تو شیخ صفی الدین صیفیؒ اور شیخ سماء الدینؒ ان کی صحبت سے فیض یاب ہوتے۔ شیخ صیفیؒ علوم ظاہری کے

---

[1] بزم صوفیہ ص ۵۲۴
[2] ایضاً جلد اوّل ص ۱۱۴
[3] لطائف اشرفی جلد دوم ص ۱۰۶ - ۱۰۸
[4] ایضاً جلد اوّل ص ۴۰۲

بڑے متبحر عالم تھے۔ اُن کے متعلق انھوں نے ایک بار فرمایا کہ " در بلادِ ہند کسے را
کہ بفنون درخشندہ غرایب وشئون عجائب پیراستہ دیدم وی بودہ[۱]" بعد میں وہ اُن
کے بڑے ممتاز خلفاء میں سے ہوئے۔ اسی طرح جب سید اشرفؒ کا ورود مسعود اسمو
(آسوسو) میں ہوا تو وہاں ایک ہزار آدمی ان کے مرید ہو گئے[۲] پھر وہ جائس گئے اور وہاں
کے ایک متبحر عالم وفقیہہ مولانا علاء الدینؒ اور ایک دوسرے بزرگ شیخ کمالؒ بھی ان کے
مرید وخلیفہ ہو گئے۔ جائس میں بھی دو تین ہزار آدمی ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے
تھے[۳]۔ اسی طرح جب وہ قصبہ انہونہ گئے تو وہاں کے تمام سادات اُن کے مرید ہو گئے[۴]
جب وہ قصبہ سدھور پہنچے تو وہاں شیخ خیر الدینؒ اور قاضی محمد صدیقی سدھوریؒ ان کے ہاتھ
پر مشرف بہ بیعت ہوتے۔ وہ دونوں اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ بعد میں وہ ان کے
اجل خلفاء میں سے ہوئے۔ قاضی سدھوریؒ کے متعلق لطائف اشرفی میں ہے کہ " قاضی
محمد سدھوریؒ بفنون علوم غریبہ وشئون معلوم عجیبہ پیراستہ بودند خصوصاً در علوم
اصول مشار الیہ بودہ اند"[۵] ایک بار جب وہ بنارس گئے تو وہاں کے بت خانوں کے
پردہتوں سے مناظرے کیے۔ بالآخر وہاں بھی ایک ہزار ہندو حلقہ بگوش اسلام ہوئے[۶]
اس طرح انھوں نے نہ صرف ہزارہا ہندوؤں کو مسلمان بنایا بلکہ لاکھوں مسلمانوں کے ظاہری
وباطنی اخلاق سنوارے۔ انھوں نے لاتعداد ہم عصر علماء وفضلاء اور امراء بلکہ حکمرانوں
کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

میر سید اشرف جہانگیر سمنانی صوفیائے کرام میں امام السالکین، برہان العاشقین،
قطب ربانی، غوث الانام، محی الاسلام، قدوۃ الکبریٰ، عظمائے اولیاء وکبرائے اتقیائے

---

[۱] لطائف اشرفی جلد اول ص ۴۰۴
[۲] ایضاً جلد اول ص ۴۰۷
[۳] ایضاً جلد دوم ص ۳۸۵
[۴] ایضاً جلد اول ص ۴۱۴
[۵] ایضاً جلد دوم ص ۳۸۲
[۶] ایضاً جلد دوم ص ۴۸
[۷] ایضاً جلد اول ص ۴۰۹

خطۂ ہندوستان، سلطان مملکت الدنیا والدین، سر حلقۂ عارفان، ارباب علم ویقین،
غوث الوقت، محبّ ومحبوب خاص ربّانی وغیرہ القابات سے یاد کیے جاتے ہیں۔ وہ
بڑے عظیم المرتبت عالم تھے اور معقولات ومنقولات پر ان کو مکمل عبور حاصل تھا۔[1] وہ
جب بھی علماء وفضلاء کے ساتھ علمی مباحث کرتے تو بڑے جامع اور ہمہ پہلو علمی دلائل
پیش کرتے اور خاص طور پر ان کو صوفیانہ رموز ونکات کے بیان کرنے میں بڑا ملکہ حاصل
تھا۔ وہ تمام علوم وفنون میں علمِ شریعت کو زیادہ اہمیت دیتے اور کسی حال میں بھی شریعت
سے تجاوز کرنا پسند نہ کرتے۔ ایک بار انھوں نے فرمایا کہ کوئی شخص اُس وقت تک
ولی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ظاہراً، باطناً، قولاً، فعلاً، اعتقاداً اور حالاً شریعت کا
پابند نہ ہو۔[2] ان کی تعلیمات بشارت المریدین، مکتوباتِ اشرفی اور لطائفِ اشرفی میں
تفصیل سے درج ہیں۔ وہ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ لطائفِ اشرفی میں اس
موضوع پر انھوں نے ایک مکمل باب لکھا ہے، جس میں انھوں نے اس مسئلہ کی تمام
تفصیلات بیان کی ہیں۔[3] ان کا کہنا ہے کہ خدا کے سوا کوئی اور چیز دنیا میں موجود نہیں
ہے۔ (ھمہ اوست) ان کے نزدیک حقیقی توحید یہی ہے اور اس کو انھوں نے آیاتِ
قرآنی، احادیثِ نبویؐ اور دُوسرے دلائل سے ثابت کیا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے
مرید کے آداب، شیخ کے اوصاف، مرید کی تعلیم، ارکانِ اسلام، توکل، تسلیم ورضا، جود،
ایثار، مہمان داری اور کھانے پینے کے آداب پر بھی تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔[4]

انھوں نے ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ کر پوری دِلسوزی اور تندھی کے
ساتھ اشاعتِ اسلام کے لیے کام کیا اور ہزاروں انسانوں کو رُوحانی فیض بخشا۔ ان

---

[1] بزم صوفیہ ص ۵۳۹
[2] لطائفِ اشرفی جلد اوّل ص ۲۵-۲۶- جلد دوم ص ۱۲۹-۱۳۰-۱۳۵
[3] بزم صوفیہ ص ۵۴۴-۵۴۵
[4] بزم صوفیہ ص ۵۵۰-۵۵۷

کے لاتعداد خلفاء تھے جن میں خاصی تعداد علماء و فضلاء کی تھی۔ ان کے عظیم المرتبت خلفا میں سے ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ، شیخ شمس الدین صدیق اودھیؒ، شیخ صفی الدین صیفی ردولویؒ، شیخ سماء الدین ردولویؒ، مولانا علم الدین جائسیؒ، شیخ خیر الدین سدھوریؒ، قاضی محمد سدھوریؒ، شیخ سلیمانؒ، شیخ معروف الدہویؒ، شیخ الاسلام گجراتی شیخ مبارک اور سید عبدالوہابؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[1]۔ ان کے بہت سے مریدین و خلفاء بلادِ اسلامیہ میں بھی تھے جن کو انھوں نے اپنے سفر و سیاحت کے دوران میں مرید کیا تھا۔ ان میں سے امیر شیخ ابو المکارمؒ اور امیر شیخ جمشید بیگؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ وہ دونوں امیر تیمور کے امراء میں سے تھے[2]۔ شیخ ابو المکارمؒ نے اپنی خانقاہ سمرقند میں آباد کی تھی اور اپنے مریدوں کا ایک وسیع حلقہ پیدا کیا تھا[3]۔ اسی طرح جب وہ اپنی سیاحت کے دوران میں یاغستان گئے تو وہاں بھی ہزاروں کی تعداد میں ازبک، برنک، خفچاق، لاچین اور توچین قبیلوں کے عوام و خواص ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے تھے[4]۔ ہندوستان میں ان کے دوسرے نامور خلفاء، سید عثمانؒ، شیخ رکن الدینؒ اور شیخ قیام الدینؒ تھے۔ متوخر الذکر دونوں لاچینی ترک تھے اور عراق سے یہاں آئے تھے۔ اسی طرح شیخ اصیل الدینؒ، شیخ جمیل الدینؒ، مولانا ابو المظفر لکھنویؒ، شیخ فخر الدینؒ، قاضی شیخ رکن الدینؒ، شیخ آدم عثمانؒ، شیخ تاج الدینؒ، شیخ محمود کنتوریؒ، شیخ عبداللہ بنارسیؒ، شیخ کمال جائسیؒ، شیخ ابو محمد عرف معین سخن سدھوریؒ بھی ان کے نامی و گرامی خلفاء تھے[5]۔

انھوں نے سو سال سے زائد عمر پائی۔ مارچ ۱۹۶۶ء کے رسالہ معارف میں اُن

---

[1] لطائف اشرفی جلد اوّل ص ۴۰۲
[2] ایضاً جلد اوّل ص ۴۰۴
[3] ایضاً جلد اوّل ص ۴۰۹ - ۴۱۰
[4] ایضاً جلد اوّل ص ۴۰۱ - ۴۱۲
[5] ایضاً جلد اوّل ص ۴۰۴ و ص ۴۰۹ - ۴۱۰

کی تاریخِ پیدائش اور وفات پر ایک مضمون چھپا تھا جس میں اُن کی تاریخِ پیدائش ٧٠٩ھ / ١٣٠٩ - ١٣١٠ء اور تاریخِ وصال ٨٢٥ھ / ١٤٢١ - ١٤٢٢ء کے لگ بھگ لکھی گئی ہے[1]

بزمِ صوفیہ کے مصنّف لکھتے ہیں کہ وفات سے کچھ روز پہلے ان پر سکر کا عالم طاری رہا۔ نماز کے وقت عالمِ صحو میں آجاتے مگر مرض الموت کے دوران میں بھی رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ وفات کے روز انھوں نے اپنی دینی فرزند سید عبدالرزاق الملقب نور العین شیخ نجم الدین اصفہانیؒ، شیخ محمد درینیمؒ، خواجہ ابوالمکارمؒ، شیخ ابوالوفا خوارزمیؒ، شیخ عبدالسلام ہرویؒ، شیخ ابوالواصلؒ، شیخ معروف الدیمویؒ، شیخ عبدالرحمٰن خجندیؒ، شیخ ابوسعید خزرجیؒ، ملک محمودؒ، شیخ شمس الدین اودھیؒ اور دوسرے اکابر کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور ان کے مراتب و مدارج کے مطابق نصیحتیں کیں اور تبرکات دیے[2]۔ انھوں نے میر سیّد عبدالرزاقؒ الملقب بہ نور العین کو وصال کے وقت اپنا جانشین اور سجادہ نشین مقرر فرمایا اور انھیں وہ خرقے عطا کیے جو ان کو حضرت شیخ علاء الدین لاہوریؒ، شیخ الاسلام شامؒ اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے ملے تھے۔ علاوہ ازیں بزرگانِ چشت کے تبرکات بھی دیے جو ان کو اپنے پیر و مرشد سے دستیاب ہوتے تھے[3]۔ اس کے بعد میر سیّد عبدالرزاق کے لڑکوں کو بلا کر اُن کے لیے دعائیں فرمائیں۔ اسی طرح اپنے خلفاء کو بھی نصیحتیں کیں اور خاص خاص ہدایتیں دیں اور تبرکات بھی دیے[4]۔ اس کے بعد انھوں نے نمازِ ظہر ادا کی اور پھر قوالوں کو طلب کر کے محفلِ سماع کی خواہش کی۔ قوالوں نے شیخ سعدیؒ کی غزل شروع کی اور جب انھوں نے یہ شعر گایا ؎

گر بدستِ تو آمدہ است اجلم ‏ ‏ ‏ ‏ قد رضینا بما جری القلم

---

[1] بزمِ صوفیہ ص ٥٣٧ - مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ٣٣٨ ب میں مصنف آپکی تاریخِ وصال ٢٨ محرم ٨٠٨ھ لکھتے ہیں اور خزینۃ الاصفیا (جلد اوّل ص ٣٧٧) کے مصنف ٢٧ محرم ٨٠٨ھ لکھتے ہیں۔

[2] لطائفِ اشرفی جلد دوم ص ٤٠٦ - ٤١٢ ‏ ‏ [3] ایضاً

[4] ایضاً

تو آپ پر وجد طاری ہو گیا اور جب قوالوں نے یہ اشعار پڑھے ؎

خوب تر زیں نباشد کار
یار خنداں رود بجانب یار
سیر بیند جمالِ جاناں را
جاں سپارد نگار خنداں را

تو وہ مرغِ نیم بسمل کی طرح تڑپنے لگے اور اسی حالت میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی[1]۔ وصال کے وقت ان کی عمر ۱۲۰ سال کے لگ بھگ تھی۔

ان کے روضۂ اقدس کی تعمیر ان کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی اور وہ اسی میں مدفون ہیں۔ اُن کے روضہ کے بارے میں مشہور ہے کہ جو کوئی آسیب زدہ وہاں جا کر کچھ روز قیام کرے اس کا آسیب جاتا رہتا ہے۔ چنانچہ ملک کے گوشے گوشے سے وہاں آج بھی آسیب زدوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے[2]۔

---

[1] لطائفِ اشرفی جلد دوم ص ۴۰۶ - ۴۱۲

[2] اخبار الاخیار ص ۱۶۳ - خزینۃ الاصفیا، جلد اول ص ۳۷۷ - تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲
مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۳۷ ۴۳ ب
حضرت جمشید قلندر جو سرحلقۂ قلندراں تھے اور ۱۲ سال تک آپ کی خدمت میں رہے تھے۔ انھوں نے ان کا روضہ اور باغ کئی سال کی محنت کے بعد تعمیر کیا تھا۔

باب ۳ سوم

میر سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے خلفا

میر سیّد حاجی عبدالرزّاقؒ

میر سید حاجی عبدالرزاقؒ میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے دینی فرزند تھے اور اُن کے وصال کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ لطائفِ اشرفی میں ہے کہ سید اشرفؒ جب حضرت شیخ علاءالحقؒ سے بیعت ہوئے تو ان کی عمر اس وقت ۲۷ سال تھی۔ حضرت شیخ علاءالحقؒ نے انھیں عبادت و ریاضت کے لیے اپنی قیام گاہ کے قریب ہی ایک حجرہ دیا ہوا تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ سید اشرفؒ اس حجرے میں کھڑے اپنی کمر پر فوطہ باندھ رہے تھے کہ اُن کے پیر و مرشد اچانک آموجود ہوئے۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا کر رہے ہو۔ سیّد اشرفؒ نے جواب دیا کہ خدمتِ (خلق) کے لیے کمر باندھ رہا ہوں۔ ان کی زبانِ مبارک سے بے اختیار نکلا کہ "کمر مضبوطی سے باندھنا ایسی کہ شادی کی ضرورت نہ رہے۔" سیّد اشرفؒ پر ان الفاظ کا بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ بعد میں وہ اکثر سوچا کرتے کہ میرا کوئی بیٹا نہ ہوگا جو میرے بعد میرا جانشین ہو سکے۔ بالآخر شیخ علاءالحق بھی ان کی اس تشویش سے آگاہ ہو گئے اور ایک روز مراقبہ میں بیٹھ گئے جب ایک گھنٹہ کے بعد مراقبہ سے سر اُٹھایا تو سید اشرفؒ کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایک دینی بیٹا عطا کیا ہے جو تمھارے بعد تمھارا جانشین ہوگا اور اس سے تمھارا سلسلہ ارشاد جاری رہے گا۔[1] چنانچہ اس روز سے وہ اس بیٹے کی تلاش میں رہے۔

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۰ ا

اِس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد وہ عراق اور خراسان کے سفر پر گئے اور وہاں اپنی خالہ زاد بہن کے خاوند سید حسین عبدالغفور سے ملے۔ وہ حضرت سید محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کے خاندان سے تھے۔ اور سید عبدالرزاقؒ انہی کے فرزند تھے جو اس وقت بارہ سال کے تھے۔ سید اشرفؒ نے ان کے والدین سے عرض کیا کہ میں آپ کے اس بیٹے کو اپنا مُنہ بولا بیٹا بنانا چاہتا ہوں۔ اُن کے والدین اس پر نہ صرف راضی ہو گئے بلکہ انھوں نے اِس خبر کی خوشی بھی سنائی۔ اس کے بعد سید اشرفؒ اُن کو اپنے ساتھ لے آئے اور ان کی پرورش بڑی شفقت و محبت سے کی اور ان کو تمام علومِ ظاہری و باطنی کی مکمل تعلیم بھی دی۔[1]

سید اشرفؒ ان کو والہانہ چاہتے تھے۔ ایک موقعہ پر انھوں نے فرمایا ؎

چہ نورِ دیدہ ام از نورِ دیدہ
کہ نورِ دیدہ باشد نورِ دیدہ[2]

چنانچہ اس روز سے اُن کا خطاب نورالعین ہو گیا۔ سید اشرفؒ ہمیشہ ان کے حق میں دعائیں فرمایا کرتے۔ ایک بار انھوں نے فرمایا کہ سید عبدالرزاقؒ کے بیٹے اگر قانع ہوں گے تو ہرگز کسی کے محتاج نہ ہوں گے۔ وہ بڑی تھوڑی مدت میں اور تھوڑی محنت سے اعلیٰ مراتب تک پہنچ جائیں گے اور جب تک میں زندہ ہوں میں اُن کے ساتھ ہوں۔ چنانچہ انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ بعد میں حرف بحرف پورا ہوا۔ اسی طرح ایک بار اُن کی نظر سید عبدالرزاقؒ پر پڑی اور فرمایا میں نے تم پر ہر چیز نثار کر دی ہے اور کسی بھی چیز کا تم سے دریغ نہیں کیا، اور میں خدا سے تمھارے لیے ایسے بیٹوں کی دعا کرتا ہوں جو ہمیشہ مقبول و معروف رہیں گے۔

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۰ ب

[2] ایضاً

تمھاری اولاد سے ہر طبقہ میں ایک رجال الغیب اور مجذوب ہوگا اور کوئی ایسا بھی ہوگا جو میری حالت اور مقام کو پہنچے گا۔ چنانچہ انھوں نے جو فرمایا وہ ان کی اولاد کے حق میں بالکل صحیح ثابت ہوا اور صدیوں تک ان کی اولاد سے سلسلۂ فیض جاری رہا۔[1]

سیّد عبدالرزاقؒ نے ۱۲۰ سال عمر پائی۔ وہ اس وقت بارہ سال کے تھے جب سید اشرفؒ سے وابستہ ہوئے۔ اس کے بعد ۶۸ سال تک اُن کے ساتھ سفر و حضر میں رہے۔ پھر اُن کے وصال کے بعد ۴۰ سال تک حیات رہے اور اپنے سلسلۂ ارشاد کو جاری رکھا۔ وہ بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے اور ان کے دامن کمال سے ہزاروں نے روحانی فیض حاصل کیا۔ جب اُن کا وصال ہوا تو سید اشرفؒ کے روضۂ اقدس میں ان کے مزار کے بالمقابل دفن ہوئے۔[2]

سیّد عبدالرزاقؒ کے چار بیٹے تھے۔ سیّد شمس الدینؒ، سیّد حسنؒ، سیّد حسینؒ اور سیّد فریدؒ۔ سیّد اشرفؒ نے ان چاروں بیٹوں کو اپنے وصال کے وقت پاس بلا کر روحانی فیض سے مالامال کیا تھا۔ سیّد شمس الدینؒ اس وقت ۱۸ سال کے تھے اور بڑے دانشمند تھے۔ سیّد اشرفؒ نے ان کو ایک سبز جامہ بطور تبرک کے دیا اور فرمایا یہ برخوردار بڑا صاحب علم و دانش ہوگا۔ مگر اس کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ اس دنیائے فانی سے لاولد ہی رخصت ہوگیا۔[3] اس کے بعد سیّد حسن کو ایک جامہ بطور تبرک عنایت کیا اور اسے فرمایا خدا تمھیں زندگی میں احسن و اکبر رکھے۔ بعد میں انھیں واقعی بڑی خوشحال زندگی نصیب ہوئی اور ان کے وصال کے بعد ان کے بیٹے بھی بڑے صاحب حشمت و دولت ہوئے۔ لیکن بعد میں انھوں نے بھی درویشی اختیار کر لی اور ان کے جانشینوں نے بھی صدیوں تک سلسلۂ رشد و ہدایت جاری رکھا۔ تیسرے بیٹے سید حسینؒ کو سید اشرفؒ نے فرمایا کہ "ہمارا حسینؒ ثانی حسینؓ ہوگا۔

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۸۰۴ ب
[2] ایضاً ورق ۸۰۴ ب ۸۱۴ ا
[3] ایضاً ورق ۸۱۴ ا

اور اس کے جانشین بڑے کامل و عارف بزرگ ہوں گے۔ ان میں سے بعض سالک، اور بعض مجذوب ہوں گے۔ ان میں سے ایک میر سید جعفر عرف شاہ لاڈلےؒ بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے۔ جن کے روحانی کمالات ہر خاص و عام پر روشن تھے۔ چوتھے بیٹے فریدؒ کو انھوں نے فرمایا اے فرید ثانی تجھ سے محبت الٰہی کی خوشبو آتی ہے۔ اس کو بھی انھوں نے ایک جامہ ملبوس تبرک عنایت فرمایا تھا۔ ان کے جانشین بھی بڑے صاحب کمال اور صاحب کرامات بزرگ تھے۔ ان کے پانچویں بیٹے سید احمدؒ تھے لیکن وہ سید اشرفؒ کے وصال کے بعد پیدا ہوتے تھے۔ وہ بھی بڑے عظیم المرتبت درویش ہوئے۔ فی الحقیقت ان تمام بیٹوں کی روحانی اصلاح و تربیت سید عبدالرزاقؒ نے خود فرمائی تھی۔ اور سب کو خرقۂ خلافت سے سرفراز کیا تھا۔ وہ تمام علوم ظاہری و باطنی کے عالم اور عظیم المرتبت بزرگ تھے۔[1] ان بیٹوں میں سے سید حسینؒ ان کے وصال کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ ان کے جانشین بھی بعد ہا بعد صدیوں تک صاحب سجادہ ہوتے۔ مرآۃ الاسرار کے مؤلف شیخ عبدالرحمان چشتیؒ لکھتے ہیں کہ ایک بار وہ ماہ محرم ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴-۱۶۲۵ء میں حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے روضۂ اقدس پر اعتکاف میں بیٹھے تھے۔ ان دنوں وہاں حضرت سید حسین شریفؒ صاحب سجادہ تھے۔ انھوں نے انھیں ایک خرقہ عطا کیا جو ان کو حضرت مخدوم جہانیاںؒ سے وراثت میں ملا تھا۔ وہ ان کی محبت و تواضع، دلجوئی اور مہمان نوازی کی بڑی تعریف لکھتے ہیں۔[2]

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۱۰۰۲ب، ۱۰۸۱ا
[2] ایضاً، ورق ۱۰۸۱

شیخ صفی الدین سیفی حنفی رح

شیخ صفی الدین سیفی رح کے والدِ بزرگوار کا نام شیخ نصیر الدین رح اور دادا بزرگوار کا نام شیخ نظام الدین رح تھا۔[1] ان کا شجرۂ نسب حضرت امام ابو حنیفہ رح تک پہنچتا ہے۔ موخر الذکر شاہ عجم نوشیروانِ عادل کی اولاد میں سے تھے۔[2] پہلے شیخ صفی الدین رح کے دادا غزنی میں رہا کرتے تھے لیکن منگولوں کے حملوں سے تنگ آکر ہندوستان چلے آئے اور دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔[3] انہی دنوں وہاں قاضی شہاب الدین دولت آبادی رح بھی قاضی عبد المقتدر رح کی شاگردی میں تھے لہٰذا شیخ نظام الدین رح اور قاضی شہاب الدین رح کی دوستی ہوگئی اور جب امیر تیمور نے دہلی پر حملہ کیا تو وہ دونوں جونپور ہجرت کر آئے جہاں شیخ نصیر الدین رح کی شادی قاضی صاحب کی صاحبزادی سے ہوگئی۔[4] ان کے تین بیٹے تھے؛ صفی الدین، فخر الدین اور رضی الدین۔ ان تینوں نے اپنے نانا بزرگوار ہی سے علومِ ظاہری کی تحصیل کی تھی اور اپنے زمانہ کے متبحر علما میں شمار ہوتے تھے۔[5]

شیخ صفی الدین رح جونپور ہی میں درس و تدریس کا کام کرتے تھے اور جب درس سے فارغ ہو جاتے تو علومِ متعارفہ پر خامہ فرسائی فرماتے تھے۔[6] انھوں نے عربی اور فارسی میں بھی بہت سی کتابیں لکھیں۔ اُن میں سے دستور المبتدی،[7] حل الترکیب کافیہ اور غایۃ التحقیق شرح کافیہ بڑی مشہور ہوئیں۔[8] وہ اپنے علم و دانش کی وجہ سے ابو حنیفہ ثانی رح کے لقب سے بھی مشہور تھے۔[9] حضرت میر سید اشرف جہانگیر رح نے ایک موقع پر اُن کے متعلق فرمایا" در

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۶ [2] ایضاً

[3] ایضاً، مولوی رحمان علی لکھتے ہیں کہ وہ ہلاکو خاں کے حملوں سے تنگ آکر عہدِ خلجی (۱۲۹۰-۱۳۲۰) میں دہلی آئے تھے۔ چونکہ ہلاکو خاں کی وفات ۱۲۶۰-۱۲۶۵ء کے درمیان واقع ہوئی تھی اس لیے وہ عہدِ خلجی کے بہت بعد یہاں آئے ہوں گے [4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً [7] ایضاً۔ یہ کتاب آپ نے اپنے بیٹے شیخ اسماعیل رح کی تعلیم کے لیے لکھی تھی [8] ایضاً [9] ایضاً

بلادِ ہندوستان کسی را کہ بفنونِ غرائب وشیوۂ عجائب پیراستہ دیدہ ام برادرم شیخ صفی الدین حنفی است۔"[1]

ان کے حضرت سید اشرف جہانگیرؒ سے بیعت ہونے کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک رات انھوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ میں اصولِ فقہ کی کتاب پکڑے ہوئے ہیں اور حضرت خضرؑ اس کتاب کی طرف اشارہ فرما کر کہہ رہے ہیں کہ "تم نے بہت زیادہ صفحے سیاہ کر ڈالے۔ اب وقت ہے کہ اُن کو صاف کر دو اور اپنے صفحۂ دل کو انوارِ جاویدسے روشن کر دو۔" اس بات کا اُن کے دل پر بڑا اثر ہوا اور انھوں نے بیتاب ہو کر ان سے ارادت کی درخواست کی۔ لیکن حضرت خضرؑ نے فرمایا "ان دنوں قصبۂ رودولی میں ایک صاحبِ باطن بزرگ آنے والے ہیں تم ان کی طرف رجوع کرو۔"[2] ان کے بھائی رضی الدین ان دنوں رودولی میں عہدۂ قضا پر مامور تھا[3] چنانچہ وہ ان کے پاس چلے گئے۔[4] ان کے پہنچنے کے چند روز بعد حضرت میر سید اشرفؒ بھی رودولی پہنچے اور جامع مسجد میں ورود فرمایا۔ شیخ صفی فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سید اشرفؒ نے ان کو دیکھتے ہی پاس بلایا اور اسی وقت مرید کر لیا۔[5] انھوں نے اُن کے حق میں بڑی دعائیں کیں اور یہ بھی فرمایا کہ تیرا علم تیری اولاد سے جدا نہ ہوگا۔ سید اشرفؒ اس کے بعد وہاں چالیس روز تک رہے اور ان کی روحانی تربیت میں بڑی دلچسپی لیتے رہے۔ بالآخر وہ خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔[6] اس وقت ان کے بیٹے شیخ اسماعیل صرف چالیس روز کے تھے۔ وہ انھیں بھی اٹھا لائے اور ان کے مبارک قدموں میں لا کر رکھ دیا۔ حضرت سید اشرفؒ نے فرمایا انھیں بھی ہم نے قبول کیا اور اپنا مرید بنایا۔[7] اس کے بعد حضرت

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۳ و [2] ایضاً

[3] ایضاً تذکرہ علمائے ہند ص ۹۶۔ لیکن مرآۃ الاسرار کے مصنف لکھتے ہیں کہ وہ رہتے ہی رودولی میں تھے۔

[4] مرآۃ الاسرار ایضاً ورق ۴۸۳ و ب، تذکرہ علمائے ہند ایضاً

[5] ایضاً [6] مرآۃ الاسرار ایضاً ورق ۴۸۳ ب

سید اشرفؒ اودھ کی طرف چلے گئے۔ اس وقت ان کے ہمراہ قصبۂ مذکور کے ایک شیخ سماءالدینؒ بھی تھے جنھیں بڑی ریاضت و عبادت کے بعد خرقۂ خلافت ملا تھا۔[1] وہ بھی بڑے صاحب باطن بزرگ تھے۔ اس کے بعد شیخ صفی الدینؒ نے مستقل طور پر ردولی ہی میں سکونت اختیار کر لی اور وہاں اپنے سلسلہ کی وعظ و تلقین کو جاری رکھا۔ وہ بڑے صاحب کمال اور ذی مرتبت بزرگ تھے اور ان کے خرمن کمال سے ہزاروں نے علم معرفت و تصوف کے موتی چنے تھے۔[2]

ان کا وصال ۱۲ ذی قعدہ ۸۹۰ھ/۱۴۸۴ء میں ہوا اور ردولی ہی میں سپرد خاک ہوئے۔[3]

اُن کے قائم مقام اُن کے بیٹے شیخ اسمٰعیلؒ ہوئے۔ جو شیخ ابوالمکارم اسماعیلؒ کے نام سے بھی مشہور ہیں اور جن کی تعلیم کے لیے انھوں نے رسالہ دستور المبتدی لکھا تھا۔[4] یہی وہ شیخ اسماعیلؒ ہیں جن کے فرزند ارجمند شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ دنیائے علم و تصوف کے ایک درخشندہ ستارے تھے۔

شیخ ابوالمکارم اسمٰعیل ردولویؒ

شیخ ابوالمکارم اسمٰعیلؒ شیخ صفی الدین صیفی حنفیؒ کے فرزند ارجمند تھے۔[5] ان کی پیدائش ۱۲ ربیع الثانی ۸۹۷ھ میں ہوئی۔[6] وہ صرف چالیس روز ہی کے تھے کہ ان کے والد بزرگوار نے انھیں حضرت سید اشرفؒ کے قدموں میں لا کر رکھ دیا تھا اور انھوں نے فرمایا تھا "ایں ہم مرید من است"[7] لیکن ان کی تمام تر روحانی تربیت ان کے والد بزرگوار ہی نے کی اور انہی سے انھوں نے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا۔[8]

۱؎ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۳ ب

۲؎ ایضاً

۳؎ مرآۃ الاسرار ایضاً تذکرہ علمائے ہند ص ۷، ۹۶

۴؎ ایضاً ص ۷

۵؎ ایضاً۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۹۶

۶؎ مرآۃ الاسرار ایضاً تذکرہ علمائے ہند ص ۹۶

۷؎ ایضاً ص ۷

۸؎ ایضاً ص ۷

انھوں نے ۱۶ سال کی عمر میں تمام علوم ظاہری کی تعلیم مکمل کر کے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ جب تک ان کے والد بزرگوار حیات رہے وہ درس و تدریس میں مصروف رہے[1] لیکن جب ان کا وقتِ وصال قریب آیا تو انھوں نے ان کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ چنانچہ اُن کے وصال کے بعد وہ سجادہ نشین ہوتے اور انھوں نے وعظ و تلقین کا سلسلہ جاری کیا۔ انھوں نے سینکڑوں ہزاروں کو رُوحانی فیض بخشا تھا[2]۔

شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ لکھتے ہیں کہ جب حضرت شیخ احمد عبدالحقؒ ردولی تشریف لائے تو اس وقت آپ حیات تھے۔ چنانچہ اُن سے بھی آپ نے نظرِ کرم کے لیے التجا کی مگر انھوں نے جواب میں فرمایا کہ آپ کے لیے آپ کے والد بزرگوار ہی کی تربیت کافی ہے البتہ آپ کی پشت سے ایک فرزند سعید ہوگا جس کو ہماری نعمت پہنچے گی[3]، اور وہ ان کے جلیل القدر بیٹے شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ تھے جو شیخ احمد عبدالحقؒ کے پوتے شیخ محمد بن عارفؒ کے خلفائے اجل میں سے تھے[4]۔ اور جن کے علم و ادب اور روحانی کمالات سے ہند و پاکستان کی تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔

شیخ ابوالمکارمؒ کے روحانی فیوض سے ہزاروں لوگ مستفیض ہوتے۔ اُن کے چار بیٹے تھے جو سبھی عالم و فاضل اور صالح تھے[5]۔ ان میں سے شیخ عبدالصمدؒ، شیخ عزیز اللہؒ اور شیخ حبیب اللہ عرف مخدوم مٹھنؒ کی روحانی تربیت انھوں نے خود ہی کی اور سب کو خرقۂ خلافت بھی عطا کیا تھا[6]۔ وہ تمام سلسلۂ نظامیہ کے ذی مرتبت بزرگ تھے۔ البتہ ان کے چوتھے بیٹے شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا تعلق سلسلۂ چشتیہ صابریہ سے تھا اور وہ اس سلسلہ کے بڑے عظیم المرتبت مشائخ میں سے تھے[7]۔

۱؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۷

۲؎ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۱۶۱/۲ الف

۳؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۷

۴؎ ایضاً

۵؎ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۱۸۳/۲ ب

۶؎ ایضاً

۷؎ ایضاً

شیخ اسمٰعیلؒ کا وصال چہار شنبہ ۱۳ ربیع الاوّل ۸۶۰ھ/۱۴۵۵ء کے روز بوقت عصر ہوا۔[۱] ان کا روضۂ اقدس رودولی میں ہے۔

شیخ کبیر سرہرپوریؒ

شیخ کبیرؒ قصبۂ سرہرپور کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے علوم ظاہری و باطنی کا اکتساب مخدوم صدرالدّین چراغ ہندؒ سے کیا تھا۔ وہ ان کے بڑے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ مخدوم ان کو اپنا مرید و خلیفہ بھی بنانے کے خواہشمند تھے[۲] لیکن ایک روز شیخ کبیرؒ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی روشن اور نورانی چہرہ والے بزرگ اُن کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں اور اپنا مرید بنا رہے ہیں۔ صبح جب وہ اٹھے تو ان کو بڑی تشویش ہوئی اور سوچا کہ یہاں کے صاحب ولایت تو مخدوم چراغِ ہندؒ ہیں مگر میرے خواب میں یہ کون بزرگ آئے تھے چنانچہ وہ فوراً مخدوم چراغ ہندؒ کے پاس گئے مگر جو چہرہ انھوں نے خواب میں دیکھا تھا وہ کوئی اور تھا۔[۳]

انہی دنوں حضرت میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ ظفرآباد تشریف لائے۔ جب شیخ کبیر کو اُن کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ اُن کی زیارت کے لیے پہنچے اور اُن کی دیکھتے ہی فوراً پہچان گئے کہ یہ تو وہی بزرگ ہیں جن کو انھوں نے خواب میں دیکھا تھا۔ چنانچہ وہ فوراً ان کے قدموں میں گر پڑے اور اسی وقت اُن سے بیعت ہو گئے۔[۴] اس پر میر سید اشرف جہانگیرؒ نے اپنے دوسرے مریدوں کو مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہی وہ شیر بچہ ہے جس کی بشارت مجھے حضرت شیخ علاء الحقؒ نے دی تھی اور ان سے ملاقات کی مجھے انتظار تھی۔[۵]

---

[۱] تذکرۂ علمائے ہند ص ۷ [۲] ایضاً مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۳۵ ا ورق ۴۸۲ ا
[۳] ایضاً ورق ۴۳۵ ا [۴] ایضاً [۵] ایضاً جب حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کو حضرت شیخ علاء الحقؒ نے خرقۂ خلافت دے کر صاحب ولایت جونپور مقرر کیا تو انھوں نے عرض کیا تھا کہ "دراں دیار شیری ہست مارا بوی چگونہ صحبت برآید" اس سے ان کی مراد حضرت مخدوم چراغ ہند تھے لیکن حضرت شیخ علاء الحقؒ نے
(جاری ہے)

جب مخدوم چراغ ہندؒ کو ان کے میر سید اشرف جہانگیرؒ کے مرید ہو جانے کی خبر ملی تو انھوں نے بہت محسوس کیا اور جلال میں آکر فرمایا "کبیر جوان میر شود کہ ازیں جا رفتہ آنجا مرید شد"[1] جب اس واقعہ کی خبر میر سید اشرف جہانگیرؒ کو ہوئی تو انھوں نے آپ سے کہا کہ تم غم مت کرو، جو تمھارا مرشد چاہے گا ان شاء اللہ تعالیٰ وہی ہوگا اور فرمایا "اول حاجی بمیرد بعد از اں سخنی مردود بجائے خود آمد"[2] شیخ عبدالرحمن چشتیؒ لکھتے ہیں کہ ان پر ۲۵ سال کی ہی عمر میں بڑھاپے کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے اور وہ بڑی چھوٹی ہی عمر میں وصال کر گئے تھے لیکن ان کا وصال مخدوم چراغ ہندؒ کے پانچ سال بعد ہی ہوا تھا۔[3] ان کا شمار میر سید اشرف جہانگیرؒ کے عظیم المرتبت خلفاء میں کیا جاتا ہے۔

شیخ شمس الدین صدیق اودھیؒ المعروف شیخ شمس فریادرسؒ

شیخ شمس الدین صدیقیؒ اودھ کے رہنے والے تھے اور شیخ شمس فریادرسؒ کے نام سے مشہور تھے۔[4] وہ علوم ظاہری و باطنی کے بڑے متبحر عالم تھے اور اپنے عہد کے علمائے نامدار اور فضلائے روزگار میں شمار کیے جاتے تھے۔[5] وہ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے محبوب ترین خلفاء میں سے تھے۔ انھوں نے ایک بار ان کے متعلق فرمایا تھا کہ

"اشرف شمس و شمس اشرف از هم جدا نہ اند"[6]

شیخ شمس الدینؒ بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹوں اور عزیزوں کی بھی روحانی تربیت کر کے انھیں عالی مراتب پر پہنچایا اور وہ سبھی بڑے ذی مرتبت

(گزشتہ سے پیوستہ) جواب میں فرمایا تھا کہ "شیر شیرزہ را چہ کند و نزا آنجا یک بچہ بہم رسد کہ کار او کفایت کند" وہ شیر بچہ بھی شیخ کبیرؒ تھے۔ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۳۴ ل

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۲۵ ل
[2] ایضاً
[3] ایضاً
[4] ایضاً ورق ۴۸۲ ل
[5] ایضاً
[6] ایضاً، لطائف اشرفی جلد اول ص ۴۰۲

بزرگ ہوتے[۱] ان کے خرمنِ کمال سے ہزاروں نے رُوحانی فیض حاصل کیا۔ ان کے اجل خلفاء میں سے ایک شیخ سدھا جونپوری بڑے صاحبِ کمال بزرگ تھے[۲] جن کا روضۂ اقدس اودھ میں ہے[۳]

شیخ شمس الدین کا ایک حجرۂ عبادت قصبہ بسودھی میں بھی تھا جو زیارت گاہِ خلق رہا[۴]

شیخ معروف الدمویؒ

شیخ معروفؒ قصبہ الدمو کے رہنے والے تھے اور حضرت سیّد اشرف جہانگیرؒ کے اجل خلفاء میں تھے[۵] ان کے متعلق انھوں نے ایک بار فرمایا تھا "اشرف معروف است و معروف اشرف است"[۶]

وہ حضرت خواجہ جنید بغدادیؒ کی اولاد میں سے تھے[۷] ان کو ہر قسم کے علوم و فنون پر عبور حاصل تھا اور اپنے زہد و ورع، علم و فضل اور عبادت و ریاضت کی وجہ سے اپنے وقت کے جنید و شبلیؒ مانے جاتے تھے[۸] ان کے بیٹے بھی بڑے صاحبِ مرتبہ بزرگ تھے جنھوں نے اُن کے وصال کے بعد رُشد و ہدایت کا سلسلہ باقاعدہ جاری رکھا[۹] ان کا روضۂ اقدس الدمو میں زیارت گاہِ خلق ہے[۱۰]

شیخ محمد سہرپوریؒ

شیخ محمدؒ کے والدِ بزرگوار شیخ کبیر سہرپوریؒ حضرت شیخ اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے خلفائے اجل میں سے تھے مگر وہ بڑی چھوٹی عمر میں وصال کر گئے تھے[۱۱] ان کے بعد حضرت

---

۱ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۸۲ و ۴۸۳ ۲ ایضاً ۳ ایضاً ۴ ایضاً ۵ ایضاً ۶ ایضاً ۷ ایضاً
۸ ایضاً لطائفِ اشرفی جلد اوّل ص ۴۰۲ ۸ لطائفِ اشرفی ایضاً
۹ مرآۃ الاسرار ایضاً ۱۰ ایضاً
۱۱ ایضاً

سید اشرف جہانگیرؒ نے شیخ محمدؒ کی رُوحانی تربیت کی اور مرتبۂ ارشاد تک پہنچایا۔ انھوں نے ان کو "دُرِّ یتیم" کا خطاب دیا تھا[1]۔ وہ بڑے باکمال اور صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ جب حضرت سید اشرف جہانگیرؒ وصال کے وقت عالمِ صحو میں تھے تو ان کو بھی دُوسرے خلفاء کی طرح بلا کر پاس بٹھایا اور انھیں ان کے مرتبہ کے مطابق نصیحتیں کیں اور تبرکات بھی عنایت کیے تھے[2]۔

شیخ خیر الدّین انصاری سدھوریؒ

شیخ خیر الدین انصاریؒ شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبداللہ انصاریؒ کے خاندان سے تھے[3]۔ اُن کے دادا خواجہ نظام الدینؒ ہرات کے رہنے والے تھے لیکن حوادثِ زمانہ کی وجہ سے ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے اور قصبہ سدھور میں آکر آباد ہو گئے تھے[4]۔

شیخ خیر الدینؒ اس دور کے علمائے فحول میں سے تھے[5]۔ مگر اصول و فقہ کے بعض مسائل کو سمجھنے میں دقت محسوس کرتے۔ چنانچہ جب وہ حضرت سید اشرف جہانگیرؒ سے شیخ شمس الدین اودھیؒ کی خانقاہ میں ملے تو اُن سے بھی ان مسائل کے بارے میں پُوچھا۔ حضرت سید اشرفؒ نے اُن مسائل کی ایسی عمدہ تشریح کی کہ وہ اسی وقت ان کے علم و فضل کے قائل ہو گئے اور دُوسرے روز ہی جا کر اُن کے مرید ہو گئے[6]۔ ان کے ساتھ بارہ دیگر افراد بھی مرید ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک قاضی محمد صدیقی سدھوریؒ تھے جو حضرت سید اشرفؒ کے بعد میں خلفائے اجلّ میں سے ہوئے[7]۔

اس واقعہ کے بعد انھوں نے چار سال خوب ریاضت و عبادت کی اور پھر خرقۂ خلافت کی نعمت سے سرفراز ہوئے۔ جب سید اشرف جہانگیرؒ دوبارہ سدھور گئے تو بہت

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۲ د
[2] تا [5] مرآۃ الاسرار (قلمی) ایضاً
[3] ایضاً ورق ۴۸۲ ب
[6] بزمِ صوفیہ ص ۵۲۷ - ۵۲۸
[7] ایضاً ورق ۴۸۲ ا - ب

سے اور لوگ بھی اُن کے مرید ہو گئے[1]۔ کچھ روز بعد جب حضرت سید اشرفؒ جائس چلے گئے تو وہ اپنے نئے مریدوں کی رُوحانی تربیت شیخ خیرالدین کے سپرد کر گئے[2]۔ وہ بڑے باکمال اور صاحبِ کرامات بزرگ تھے اور ان کے دامنِ کمال سے سینکڑوں نے روحانی فیض حاصل کیا تھا۔ ان کا روضہ اقدس سدھور میں ہے[3]۔

ان کے وصال کے بعد ان کے فرزند و خلیفہ حضرت شیخ علیؒ سجادہ پر بیٹھے وہ شیخ علی بازوؒ کے نام سے بھی مشہور تھے اور بڑے صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ ان کا روضہ اقدس بھی سدھور میں ہے[4]۔

حضرت شیخ علیؒ کے فرزندِ ارجمند مخدوم شیخ خواجگی بھی علوم ظاہری و باطنی کے متبحر عالم تھے۔ جب شیخ علیؒ کا وصال ہوا تو وہ وہاں موجود نہیں تھے اور تحصیلِ علم کی خاطر باہر کسی دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ شیخ علیؒ اپنے بزرگوں کی تمام امانتیں انہی کے لیے بطورِ امانت کر گئے[5]۔ جب وہ واپس آئے تو انھوں نے ان امانتوں پر تکیہ نہ کیا بلکہ جونپور جا کر شیخ صدھنؒ کے مرید ہو گئے۔ ایک مدت تک وہ اُن کے زیرِ تربیت رہے اور جب خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے تو وطن واپس آ کر والدِ بزرگوار کی مسندِ ارشاد پر بیٹھے اور سلسلۂ ارشاد و تلقین جاری کیا[6]۔ شیخ خواجگیؒ بڑے صاحبِ کرامات بزرگ تھے اور بڑی شہرت کے مالک تھے۔ جب اُن کے وصال کا وقت آیا تو انھوں نے اپنے چاروں بیٹوں میں سے کسی کو بھی مسند نشین نہ کیا اور کسی روحانی اشارہ کے تحت خرقۂ خلافت اور پیرانِ چشت کی تمام امانتیں مخدوم شیخ خاصہؒ بن شیخ خضر صالحیؒ کو دے دیں[7]۔ مخدوم شیخ خواجگیؒ کے وصال کے بعد اُن کے بیٹے پھر قصبہ مانکپور جا کر حضرت راجی سید نورؒ کے مرید ہو

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۲ ب
[2] ایضاً
[3] ایضاً
[4] ایضاً
[5] ایضاً
[6] ایضاً
[7] ایضاً

گئے[1] اور انھوں نے اُن سے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا۔[۲] مخدوم شیخ خواجگیؒ کا روضۂ اقدس سدھور میں زیارت گاہِ خلائق ہے۔[۳]

مخدوم شیخ خاصہ امیٹھویؒ

وہ شیخ خضر صالحیؒ کے فرزند تھے[۳] اور ان کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ حلاج قریشی دھلویؒ سے ملتا ہے۔[۴] وہ مخدوم شیخ خواجگیؒ کے داماد اور خلیفہ تھے اور اُن کے وصال کے بعد سجادہ پر بیٹھے تھے۔[۵] وہ اصلاً قصبہ انچولی کے رہنے والے تھے لیکن انھوں نے انچولی یا سدھور کی بجائے امیٹھی میں وعظ و تلقین کا سلسلہ جاری کیا تھا۔[۶]

شیخ عبدالرحمن چشتیؒ لکھتے ہیں کہ جب وہ امیٹھی پہنچے تو وہاں ان کے پہنچنے کے بعد ایک عرصہ تک بارش نہ ہوئی چنانچہ قصبہ کے لوگ پریشان حال ان کے پاس پہنچے اور شکایت کی کہ جب سے آپ یہاں آئے ہیں بارش بالکل نہیں ہوئی۔ لہٰذا آپ ہمارے لیے منحوس ثابت ہو رہے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد ایک روز انھوں نے اپنا چہرہ سیاہ کیا اور قصبہ سے باہر چلے گئے۔ چنانچہ اسی وقت بے حد بارش ہوئی اور لوگ خوش و خرم ہو گئے۔[۷] وہ بڑے عالی مرتبت اور صاحب کرامات بزرگ تھے۔

شیخ عبدالرحمنؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ قصبہ امیٹھی کے معروف بزرگ شیخ نظام الدینؒ بن شیخ یاسین عثمانیؒ جب ابھی بچے ہی تھے تو شیخ خاصہؒ نے اپنی بیٹی کی منگنی ان سے کر دی مگر یہ بات گھر کے دوسرے لوگوں اور عزیزوں کو پسند نہ آئی۔ ان لوگوں نے جب اس

---

[۱] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۲۸۲ ب [۲] ایضاً

[۳] تا [۵] ایضاً مخدوم خواجگی شیخ خیرالدین سدھوریؒ کے پوتے تھے اور شیخ صدھا حضرت شمس الدین دہلیؒ کے خلیفہ تھے۔ چونکہ یہ تمام بزرگ سلسلۂ اشرفیہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کو بھی یہاں شامل کر لیا گیا ہے۔

[۶] ایضاً ورق ۲۸۴ ب ۲۸۳ ر

کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ یہ بچہ اپنے وقت کا قطب ہوگا[1] چنانچہ شیخ نظام الدین رح کو بعد میں اپنے کمالات کی وجہ سے ملک میں بڑی شہرت حاصل ہوئی[2]۔

شیخ عبدالرحمٰن چشتی رح لکھتے ہیں کہ ان کے جدِ کلاں شیخ شاہ بدہ رح بھی شیخ خاصہ رح کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کا وصال ۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء میں ہوا[3]۔ انھوں نے اپنے وصال سے کچھ وقت پہلے اپنے فرزند شیخ عبدالرزاق کو بلا کر خرقۂ خلافت اور خواجگانِ چشت کی تمام امانتیں سپرد کیں اور اپنا گدی نشین مقرر کیا[4]۔ ان کا روضۂ اقدس امیٹھی میں زیارت گاہِ خلق ہے[5]۔

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۲ ب ۴۸۳ ا
[2] ایضاً شیخ نظام الدین کے ایک شاگرد و مرید قاضی مبارک گوپاموی رح بڑے جید عالم تھے اور تہذیب و اخلاق کے اعتبار سے بڑے معزز انسان تھے ــــ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۴ ـ شیخ نظام الدین رح کے ایک ہم عصر شیخ احمد فیاض امیٹھوی رح بھی اپنے وقت کے جید علما میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا سالِ وصال ۹۸۱ھ ہے۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴-۱۵
[3] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۳ ا
[4] ایضاً
[5] ایضاً

حصہ ششم

باب اوّل

صابریہ سلسلہ

اِس سلسلہ کی بنیاد حضرت شیخ علاء الدین علی احمد صابرؒ نے رکھی۔ فی الحقیقت اس سلسلہ کے ابتدائی حالات لکھتے وقت تاریخ کے ایک طالب علم کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ شیخ صابرؒ کے ذاتی حالات بھی کسی معاصر تذکرہ و تاریخ میں نہیں ملتے سیر الاولیاء[1] میں جو چند سطریں ایک بزرگ علی احمدؒ کے بارے میں درج ہیں۔ وہ بھی شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی نظر میں مشکوک ہیں[2]۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی کے مذہبی تذکروں میں ان کے حالات بڑی تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تذکرہ نگاروں[3] نے یہ حالات کہاں سے فراہم کیے ہیں؟ اُن کے ماخذ کیا ہیں؟ اور ان کی تاریخی افادیت کس حد تک ہے؟ در اصل ان تذکروں کی بنیاد یا تو کشف پر ہے یا محض سنی سنائی روایات پر، اس لیے ان تذکروں پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال ہم نے ایسے تذکروں سے استفادہ کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔

حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے بے شمار عظیم المرتبت خلفاء تھے۔ انہی میں سے حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ[4] نے چشتیہ نظامیہ سلسلہ کی بنیاد رکھی اور حضرت شیخ علاء الدین علی احمد صابرؒ نے چشتیہ صابریہ سلسلہ کی بنیاد ڈالی[5]۔ موخر الذکر

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۸۵ [2] اخبار الاخیار ص ۶۹ [3] سیر الاقطاب شیخ اللہ دیا چشتی تالیف ۱۰۳۶ھ مرآۃ الاسرار شیخ عبدالرحمٰن چشتی تالیف ۱۰۶۵ھ [4] اخبار الاخیار ص ۵۴ [5] ایضاً ص ۶۹

اپنے پیر و مرشد کے اشارے سے کلیر میں آباد ہوئے[۱] اور وہاں تا دمِ وصال اپنے سلسلہ کی وعظ و تلقین کرتے رہے۔ وہ اپنے وقت کے اولیائے عظام میں سے تھے اور اُن کے دامنِ کمال سے ہزاروں نے روحانیت کے موتی چُنے[۲]۔ اُن کے خلفائے اجل میں سے شیخ شمس الدین ترک[۳] اُن کے سجادہ نشین ہوئے جو خواجہ احمد یسویؒ کی اولاد میں سے تھے اور ترکستان سے ہجرت کرکے دہلی آئے تھے۔ وہاں وہ کچھ عرصہ سلطان غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶-۱۲۸۶ء) کی فوج میں بھی ملازم رہے لیکن بعد میں شیخ علی احمد صابرؒ کے مرید و خلیفہ ہوگئے اور پھر ان کی ہدایت کے مطابق پانی پت میں آباد ہوکر تمام عمر تلقین و ارشاد میں گزار دی۔ اُن کا وصال ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء میں ہوا تھا[۴]۔

ان کے بعد شیخ جلال الدین پانی پتیؒ مسندِ ارشاد پر بیٹھے[۵]۔ انھیں بھی بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ لوگ اُن کے حلقۂ ارادت میں ملک کے گوشہ گوشہ سے آکر شامل ہوئے اور ان سے بے اندازہ فیوض حاصل کیے۔ ان کے چالیس خلفاء تھے جن میں سے شیخ احمد عبد الحقؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جن کی کوششوں سے اس سلسلہ کو صحیح معنوں میں شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی[۶]۔

صابریہ سلسلہ کا سب سے پہلا اور اہم مرکز جس کو ہم تاریخ کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ عہدِ سلطنت شرقی میں ردولی (ضلع بارہ بنکی) میں قائم ہوا اسے شیخ احمد عبد الحقؒ نے اس وقت قائم کیا جب کہ چشتیہ سلسلہ کا مرکزی نظام ختم ہوچکا تھا۔ دہلی اور اس کے گرد و نواح کا تمام علاقہ اس سلسلہ کے بزرگوں سے تقریباً خالی ہوچکا تھا۔ البتہ بنگال، دکن، گجرات اور مالوہ وغیرہ میں اس سلسلہ کی خانقاہیں قائم ہو رہی تھیں۔ انھوں نے اپنی سیاحت کے دوران

---

[۳] آپ کا مزار رڑکی ضلع سہارنپور کے قریب ہے۔ انگریزی دور میں یہاں عظیم الشان عُرس ہوا کرتا تھا۔

[۱] خزینۃ الاصفیا، جلد اوّل ص ۳۱۶ [۲] ایضاً [۳] ایضاً ص ۳۲۳

[۴] ایضاً ص ۳۲۱ - ۳۲۵ [۵] ایضاً ص ۳۶۲ [۶] ایضاً ص ۳۶۲

[۷] اخبار الاخیار ص ۱۸۱ - ۱۸۲

زند اسپہ سلسلہ کی بعض خانقاہوں کا بغور مطالعہ کیا اور تمام حالات کا جائزہ لے کر اپنی خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔[1] اس میں اُن کو بڑی کامیابی نصیب ہوئی اور یہ خانقاہ تھوڑے ہی عرصہ میں رُشد و ہدایت کا بہت بڑا مرکز بن گئی۔ شمالی ہندوستان کے لوگ کثرت سے اس میں جمع ہو گئے تھے۔ شیخ احمدؒ کا وصال سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہد میں ۸۳۶ھ/۱۴۳۲ء میں ہُوا۔[2]

ان کے بعد اُن کے بیٹے شیخ عارفؒ سجادہ نشین ہوئے۔[3] وہ بڑے محب و مشفق بزرگ تھے اور لوگ ان کے اخلاقِ حمیدہ کے بڑے گرویدہ تھے۔[4] شیخ عارفؒ کے بعد اُن کے بیٹے شیخ محمدؒ مسندِ ارشاد پر بیٹھے۔ وہ بھی بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے۔[5] ان کے ایک ممتاز خلیفہ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ[6] نے اِس سلسلہ کو شمالی ہندوستان میں بڑی ترقی دی اور اس کا دائرہ اثر دُور دُور تک پہنچا دیا۔ فی الحقیقت جو شہرت و عظمت ان کو حاصل ہوئی۔ وہ اس سے پہلے صابریہ سلسلہ کے کسی دُوسرے بزرگ کو نصیب نہ ہُوئی تھی۔ آغازِ کار میں وہ مشائخ چشت کے قدیم اصولوں کے مطابق سیاست و سلاطین سے الگ تھلگ رہے۔[7] اور اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت میں خاصی دلچسپی لیتے رہے لیکن بعد میں ملک کے سماجی خلفشار کی وجہ سے ملکی سیاست میں دلچسپی لینے پر مجبور ہُوئے۔ انھوں نے امراء و سلاطینِ وقت کی اصلاح کی کوشش کی جس کے نتیجے میں حکومتِ وقت سے ان کا رابطہ قائم ہو گیا۔[8] تاہم بعد میں اُن کی اولاد پر اس کا بہت برا اثر ہُوا۔ ان کے جانشینوں میں سے بعض نے دنیوی آرام و آسائش کی خاطر اپنی جبینوں کو شاہانِ مغلیہ کے آستانوں پر جھکا دیا۔ خاص طور پر شیخ عبدالنبی

---

[1] مثلاً ردولی گئے اور حضرت نور قطب عالمؒ سے ملے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو اخبار الاخیار ص ۱۸۲

[2] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۸۷

[3] اخبار الاخیار ص ۱۸۶

[4] ایضاً

[5] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۷۵ ب

[6] اخبار الاخیار ص ۲۱۵-۲۱۷

[7] لطائف قدوسی ص ۱۸-۱۹

[8] آئین اکبری ص ۲۱۴ مرتبہ سرسید احمد خاں

نے عہدِ اکبری میں اس سلسلہ کے اصولوں کا قطعاً احترام نہ کیا اور جاہ و زر کی محبت نے اُن کے دینی جذبے کو بالکل ختم کر دیا۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی اولاد اُن کے کام کو صحیح معنوں میں جاری نہ رکھ سکی تاہم اُن کے بعض خلفاء بڑے عالی حوصلہ اور عظیم المرتبت بزرگ ہوئے جنہوں نے اس سلسلہ کی اشاعت اور ترقی کے لیے پُورے انہماک کے ساتھ کام کیا۔ ان میں سے شیخ جلال الدین تھانیسریؒ،[2] شیخ عبدالغفور اعظم پوریؒ،[3] شیخ عبدالعزیز کیرانویؒ، شیخ عبدالستار سہارنپوریؒ اور شیخ عبدالاحدؒ والدِ بزرگوار حضرت مجدّد الف ثانیؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے ارشاد و تلقین کو اپنی زندگی کا اہم ترین مقصد قرار دیا اور اس سلسلہ کے دائرہ اثر کو دُور دُور تک پھیلا دیا۔[4]

---

[1] تذکرہ ص ۳۵-۳۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ شیخ عبدالقدوسؒ کے تین فرزند تھے۔ شیخ حمید الدینؒ۔ شیخ عبدالمجید اور شیخ رکن الدینؒ۔ شیخ رکن الدینؒ کے بیٹے شیخ احمدؒ اور ان کے بیٹے شیخ عبدالنبیؒ تھے جو اکبر کے صدر الصدور بھی رہے تھے۔ تاریخ مشائخ چشت ص ۲۲۲

[2] اخبار الاخیار ص ۲۷۷ - ۲۷۸

[3] ایضاً ص ۲۱۶ [4] تاریخِ مشائخ چشت ص ۲۲۳

باب دوم

شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ

شیخ احمد عبدالحقؒ کا نام احمد اور لقب عبدالحق تھا[1]۔ ان کے والد کا نام شیخ عمرؒ اور دادا کا نام شیخ داؤدؒ تھا[2]۔ شیخ داؤدؒ بلخ میں رہا کرتے تھے لیکن ہلاکو خاں کے حملوں کی وجہ سے ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے اور پہلے کچھ عرصہ دہلی میں رہے لیکن بعد میں جب سلطان علاءالدین خلجی نے ردولی کی جاگیر عطا کی تو وہاں مستقل طور پر آباد ہو گئے[3]۔ ان کا شجرۂ نسب حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ، تک پہنچتا ہے[4]۔

شیخ داؤدؒ نے حضرت شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلویؒ سے سلوک و معرفت کی تعلیم حاصل کی تھی اور انہی کے وہ مرید و خلیفہ بھی تھے[5]۔ ان کے بیٹے شیخ عمرؒ بھی بڑے زاہد متقی درویش تھے[6]۔ شیخ احمد عبدالحقؒ دو بھائی تھے۔ اُن کے بڑے بھائی شیخ تقی الدینؒ نے ردولی کی بجائے دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی[7] مگر وہ خود اپنی والدۂ محترمہ کے سایۂ عاطفت میں ردولی ہی میں پرورش پاتے رہے[8]۔

ان کو سات ہی برس کی عمر میں نماز و عبادت کا بڑا شوق پیدا ہو گیا تھا اور جب ان کی والدہ رات کو تہجد کے لیے اٹھتیں اور نماز میں مصروف ہو جاتیں تو وہ بھی چپکے سے اٹھ کر گھر کے ایک گوشہ میں نماز میں مشغول ہو جایا کرتے اور دیر تک نفل پڑھتے رہتے[9]۔ ان کی

---

۱ بزم صوفیہ ص ۵۹۹
۲ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۸۶
۳ ایضاً
۴ ایضاً
۵ ایضاً
۶ ایضاً ۷ ایضاً ۸ ایضاً
۹ اخبار الاخیار ص ۱۸۲

والدہ ان کو اس قدر عبادت کرنے سے منع فرمائیں اور کہتیں کہ ابھی تو تم پر نماز بھی فرض نہیں ہوتی اور تم نوافل میں اس قدر جان کھپاتے ہو۔ مگر وہ نماز و عبادت ترک نہ کرتے۔ ایک روز تنگ آکر ان سے کہنے لگے کہ آپ تو ماں نہیں رہزن ہیں۔ خود تو اپنا کام کر لیتی ہیں لیکن مجھے یاد اللہ سے روکتی ہیں[۱]۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد وہ تعلیم کے لیے بڑے بھائی شیخ تقی الدینؒ کے پاس دہلی بھیج دیے گئے[۲] جو بڑے متقی اور عالم تھے۔ انھوں نے پہلے تو خود انھیں پڑھانے کی کوشش کی لیکن جب کامیاب نہ ہوئے تو انھیں دوسرے اساتذہ کے پاس لے گئے اور ان سے عرض کیا کہ میرا یہ بھائی میرے پڑھانے سے تو پڑھتا نہیں آپ ہی اس کو پڑھانے کی کوشش کریں[۳]۔ چنانچہ اُن کو سب سے پہلے میزان الصرف پڑھانے کی کوشش کی گئی لیکن اُن کی طبیعت اس کی طرف راغب نہ ہوئی اور انھوں نے اپنے اُستاد سے صاف کہہ دیا کہ مجھے اس قسم کے علوم کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو وہ علم سکھایئے جس سے خدا کی معرفت حاصل ہو۔ میں اس کے علاوہ کوئی اور علم پڑھنا پسند نہیں کرتا۔ بالآخر ان کے استادوں نے اس صورتِ حال سے اُن کے بھائی کو مطلع کر دیا اور ان کو بتا دیا کہ یہ بچّہ تو علمِ الٰہی کی طلب میں ہے[۴]۔

تاہم یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ علومِ ظاہری سے بالکل بیگانہ تھے۔ بلکہ حقیقت اس سے مختلف ہے اور اس کا ثبوت اُن کی زندگی کے بعد کے واقعات سے ملتا ہے کہ وہ علومِ مروجہ سے بھی واقف تھے اور کلامِ مجید کی آیات، عربی کے مقولے اور فارسی و ہندی کے اشعار اسم مواقع پر پڑھا کرتے تھے۔ وہ فارسی کے شاعر بھی تھے اور احمد تخلّص کیا کرتے تھے[۵]۔ بہر کیف علمِ باطن کا شوق و ذوق انھیں بچپن ہی سے تھا اور اس کا غلبہ اس قدر تھا کہ

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۸۲
[۲] ایضاً
[۳] ایضاً
[۴] ایضاً مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۶۷ ب و ۴۶۸ الف
[۵] بزمِ صوفیہ ص ۶۰۲

اس کے سامنے علومِ ظاہری کے نقوش مدھم نظر آتے تھے۔

جب وہ جوان ہوئے تو ان کے بھائی کو اُن کی شادی کی فکر ہوئی اور ایک جگہ شادی کا پیغام بھی دیا لیکن انھوں نے لڑکی والوں سے جا کر کہہ دیا کہ میں تو شادی کے قابل ہی نہیں۔ چنانچہ یہ منگنی ٹوٹ گئی[1] مگر بعد میں انھوں نے ایک دُوسری جگہ شادی کی جس سے ان کے ہاں کئی اولادیں بھی ہوئیں۔

شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ سے بالآخر تلاشِ حق میں پانی پت پہنچے اور شیخ جلال الدین صابری پانی پتیؒ کے مرید ہو گئے[2]۔ وہ وہاں ایک عرصہ عبادت و ریاضت میں مشغول رہے۔ جب انھوں نے سلوک کے تمام مراحل طے کر لیے اور اُن کا قلب بھی انوارِ باطن سے منوّر ہو گیا تو پیرو مُرشد نے اُن کو خرقہ خلافت سے سرفراز کیا اور عبدالحق کا خطاب دیا[3]۔ اس موقعہ پر انھوں نے ان کو بڑی دعائیں دیں اور کہا کہ میں نے خداوند تعالیٰ سے یہ دعا کی ہے کہ میرا سلسلہ تم سے جاری ہو۔ تم سارے جہاں کو نورِ معرفت سے منوّر کرو اور اس کا اثر تا قیامت باقی رہے[4]۔

اس کے بعد ان کو سنام جا کر مزید مجاہدات کرنے کا حکم ملا۔ وہاں بھی وہ ایک عرصہ ہمہ تن ریاضت و عبادت میں مشغول رہے۔ لیکن جب امیر تیمور نے اس ملک پر حملہ کر کے لُوٹ مار کا بازار گرم کیا تو وہ سنام سے دوبارہ پانی پت چلے آئے[5] لیکن پیرو مُرشد مخدوم جلال الدینؒ نے پھر ان کو پانی پت سے باہر رہ کر عبادت و ریاضت کی تلقین کی۔ غالباً اس کے بعد وہ بکھر چلے گئے[6] گو وُہ پیرو مرشد کی بدولت دریائے وحدت سے سیراب ہو چکے تھے لیکن پھر بھی ان کی رُوحانی تشنگی باقی تھی جس کی تڑپ میں وہ پچاس سال تک جہاں گردی کرتے رہے[7]

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۸۲ [2] ایضاً
[3] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۶۸ م ۶، سیر الاقطاب ص ۲۱۸ [4] ایضاً، خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۸۵
[5] مرآۃ الاسرار ایضاً [6] ایضاً
[7] اخبار الاخیار ص ۱۸۳

اِس دوران میں وہ مختلف علماء و مشائخ سے ملے۔ پنجاب و سندھ کی سیاحت بھی کی۔ پھر پنڈوہ پہنچے اور وہاں حضرت نور قطب عالمؒ کے علاوہ دوسرے بہت سے علماء و صلحا سے بھی ملے[1]۔ وہاں سے پھر وہ بہار گئے اور اس کے بعد اجودھیا پہنچے جہاں انھوں نے ایک قبر کھود کر چھ ماہ چلہ کشی کی[2]۔ اِس موقعہ پر ان کے دل پر جو احوال و کوائف گزرے اُن سے اُن کو بڑا روحانی سکون حاصل ہوا اور جب تمام مراحل طے ہو گئے تو پھر ردولی آئے اور وہاں صابریہ سلسلہ کی خانقاہ قائم کر کے وعظ و تلقین میں منہمک ہو گئے[3]۔

ردولی میں اُن کے حلقہ عقیدت میں جوق در جوق لوگ شامل ہونے لگے۔ وہ اپنے مریدوں کو سب سے پہلے اصلاحِ نفس کی تعلیم دیا کرتے تھے[4]۔ خانقاہ میں اُن سے پانی بھرواتے، جاروب کشی کرواتے، لکڑیاں چرواتے، اور اس قسم کی دوسری خدمات لیا کرتے تھے[5]۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار انھوں نے اپنے ایک مرید میاں مخلصؒ کو پاس بلایا اور پانی میں مٹی ڈال کر کہا کہ اس مٹی کو پانی سے نکالو لیکن مٹی تو پانی میں مِل چکی تھی اِس لیے کچھ نہ ملا، اِس موقعہ پر انھوں نے فرمایا کہ اگر معبود کی درگاہ میں اپنے مقصود کو پہنچنا چاہتے ہو تو اس مٹی کی طرح اپنے نام و نشان کو گم کر کے اپنی ذات کو ذاتِ الٰہی میں فنا کر دو ورنہ میری خانقاہ سے چلے جاؤ[6]۔ چنانچہ میاں مخلصؒ نے ان کی ہدایات پر پوری طرح عمل کیا اور بعد میں وہ ان کے محبوب ترین خلفاء میں ہوئے[7]۔ ان کا معمول تھا کہ اگر کوئی شخص اُن کا مرید ہونے کی خواہش کرتا تو اس کو پہلے کسی امتحان میں ڈال دیتے اور اگر وہ اس امتحان میں پورا اترتا تو پھر اس کو مرید بناتے[8]۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۸۳
[2] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۶۹ ل
[3] ایضاً ورق ۴۷۳ ب
[4] ایضاً
[5] ایضاً
[6] ایضاً
[7] انوار العیون ص ۵۶-۵۷
[8] ایضاً ص ۶۸

شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ لکھتے ہیں کہ سلسلۂ چشتیہ میں حضرت خواجہ ابو محمد چشتیؒ اور حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے بعد دائرہ وجودِ مطلق اور نقطۂ ذاتِ حقیقت الحق کے مشاہدے کا جو دوامی استغراق و تحیر انھیں حاصل ہوا وہ اس سے زیادہ کسی اور ولی کو میّسر نہ ہوا[1]۔ وہ ہر وقت احوال کے دریا میں مستغرق رہتے یہاں تک کہ اگر کوئی قریبی دوست اور ہمسایہ بھی ان سے ملنے آتا تو وہ اس کو بھی نہ پہچان پاتے۔ اس سے پوچھتے تم کون ہو؟ اور جب وہ اپنی کئی پشتوں کی وضاحت کرتا تو پھر اس کو پہچانتے اور فرماتے کہ ہاں ہاں فلاں شخص تو ہمارا اپنا ہی ہے[2]۔ لیکن اس محویت و استغراق کے باوجود وہ پانچوں وقت کی نماز ردولی کی جامع مسجد ہی میں ادا کرتے[3]۔ ان کا دستور تھا کہ جب وہ گھر سے مسجد کے لیے نکلتے تو آگے آگے ایک خادم "حق حق" کی صدا لگاتا جاتا اور تمام رستہ اسی صدا کے ساتھ طے ہوتا۔ انھوں نے پینتالیس سال تک مسجد ہی میں نماز پڑھی لیکن راستے کا اندازہ پھر بھی نہ کر سکے[4]۔ مسجد کی صفائی وہ اپنے ہاتھوں سے کرتے[5]۔ ساری ساری رات عبادت و ریاضت میں گزارتے اور کہا جاتا ہے کہ تیس سال تک انھوں نے تکیہ پر سر نہیں رکھا[6]۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ ایک بار سفر کے دوران میں اُن کا قیام کسی مسجد میں ہوا۔ وہ جمعہ کی شب تھی اور جس گاؤں کی وہ مسجد تھی اس کے لوگ بار بار آتے اور سات اذانیں دے کر چلے جاتے۔ اُن میں سے ایک شخص نے ان سے کہا میاں تم بھی اذانیں دو کیونکہ آج جمعہ کی شب ہے۔ انھوں نے اس سے پوچھا۔ اس رات کو سات اذانیں دینے سے آپ کا مقصد کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اللہ تعالےٰ جمعہ کی مبارک رات کو سات اذانوں کی برکت سے ہفتہ بھر کی بلاؤں سے محفوظ رکھتے ہیں[7]۔ مگر انھوں نے

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۶۴۶ ب ۶۴۷ الف [2] بزم صوفیہ ص ۶۱۱
[3] اخبار الاخیار ص ۱۸۴ [4] ایضاً
[5] ایضاً [6] بزم صوفیہ ص ۶۱۲ [7] اخبار الاخیار ص ۱۸۳

اس کو جواب دیا کہ میرا دل اس بات کی گواہی نہیں دیتا کہ میں کسی غرض کے لیے اذانیں دوں کیونکہ جو انسان اپنی بھلائی یا مصیبتوں سے رستگاری کے لیے عبادت کرتا ہے وہ خدا کا خاص بندہ نہیں ہو سکتا[1]

وہ ہمیشہ اپنے مریدوں کو اتباعِ سنّت کی ہدایت فرمایا کرتے۔[2] ان کو سماع کا بھی بے حد شوق تھا[3] مجلسِ سماع کے بعد گھر میں جو کچھ بھی پاتے اسے اٹھا کر قوالوں کو دے دیا کرتے۔ ایک دفعہ مجلسِ سماع کے بعد گھر کی لونڈی کو کہا کہ جاؤ گھر سے کچھ لا کر قوالوں کی نذر کر دو۔ وہ لونڈی جب گھر کے اندر گئی تو ان کی اہلیہ بہت برہم ہوئیں اور کہا کہ جا کر کہہ دو، گھر میں کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے جب یہ جواب سنا تو قوالوں سے فرمایا کہ آپ اس لونڈی ہی کو لے جائیں لیکن بعد میں اُن کے مریدوں نے اُن قوالوں کو تین تنکہ دے کر لونڈی کو واپس لے لیا مگر جب انھوں نے اس لونڈی کو گھر ہی میں پایا تو کہا کہ جب تک یہ لونڈی گھر میں ہے میں یہاں نہیں رہوں گا اور پھر وہ کچھ دنوں کے لیے اجودھیا چلے گئے۔[4]

شیخ احمد عبدالحق اُمراء و سلاطین سے ہمیشہ بے تعلق رہے۔ بعض موقعوں پر ان کو جاگیریں بھی پیش ہوئیں لیکن انھوں نے ہمیشہ انکار فرمایا۔ البتہ کسی امیر و سلطان کی اصلاح کے لیے اس سے ملنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے۔[5] ایک بار سلطان ابراہیم شرقی نے بھی اپنی اصلاح کی غرض سے ان سے ملنا چاہا مگر قاضی رضی نے ان سے سلطان کی ملاقات کو مصالحِ حکومت کے خلاف سمجھا۔ ایک موقعہ پر جب قاضی رضی نے ان کو چار مواضعات اور دو ہزار بیگھہ اراضی کا فرمان اور اس کے ساتھ دوسرے تحفے تحائف بھی پیش کیے تو انھوں نے فرمایا :

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۸۳
[2] بزمِ صوفیہ ص ۶۱۳
[3] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۷۲ ا
[4] انوار العیون ص ۴۹
[5] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۷۲ ا

"قاضی کلمۂ حق پڑھو، تم تو کافر ہو گئے۔" قاضی صاحب نے تعجب سے پوچھا کہ حضور میری زبان سے کونسا ایسا کلمۂ کفر نکلا کہ میں کافر ہو گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ کیا یہ کفر نہیں ہے کہ تم اور ابراہیمؒ رازق ہونے کا دعویٰ کرنے لگے ہو۔ وہ خدا جس نے تمھیں اور ابراہیمؒ کو خدم و حشم، گھوڑے اور ہاتھی اور سب کچھ دیا ہے، اُسی کی درگاہ کا میں بھی ایک فقیر ہوں، کیا وہ میرے اور میرے فرزندوں کے لیے کافی نہیں ہے، کیا وہ ہمیں رزق نہ دے گا، ابراہیمؒ اور تم کیوں درمیان میں حائل ہوتے ہو؟ قاضی رضی نے ہر چند اصرار کیا مگر انھوں نے جاگیر قبول نہ کی اور فرمایا، اگر میں ایسی چیزیں قبول کرنے لگا تو میری اولاد کبھی فقر کی قدر نہ پہچان سکے گی۔[۲]

شیخ عبدالحق محدثؒ لکھتے ہیں کہ اجودھیا کے قیام کے دوران میں انھوں نے ایک کتیا پال رکھی تھی۔ جب اس نے بچے جنے تو انھوں نے اس کی خوشی میں شہر کے تمام معززین کو دعوت دی اور اجودھیا کے حاکم فیروز خاں کو بھی بلایا۔ اس طرح بہت سے عوام و خواص اس دعوت میں شریک ہوتے مگر انھوں نے مشائخ شہر میں سے کسی کو بھی اس دعوت پر نہ بلایا۔ کچھ دنوں کے بعد جب شیخ جمال گوجریؒ کو اس دعوت کی خبر معلوم ہوئی تو انھوں نے گلہ کیا کہ آپ نے اس تقریب میں سارے شہر کو مدعو کیا لیکن مجھے نہیں بلایا۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ یہ تو ایک کتیا کی تقریب تھی جس پر میں نے شہر کے تمام کتوں کو بلایا تھا۔ تم تو ایک آدمی ہو تمھارا اس دعوت سے کیا کام تھا۔[۳]

ان پر ذاتِ حق کا غلبہ اس قدر تھا کہ ہر کام میں "حق حق" کی آواز بلند کیا کرتے۔ سلام علیک کے وقت بھی "حق حق" کہا کرتے اور فرمایا کرتے کہ اللہ تعالےٰ کی ذات پر اس

---

[۱] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۷۲ ا۔ انوار العیون ص ۲۵-۲۶

[۲] انوار العیون ص ۲۵-۲۶

[۳] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۶۹ ا

کے ناموں میں سے اگر کسی نام کا کامل اطلاق ہوتا ہے تو وہ "حق" کا اسم پاک ہے[1]۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک تمام کمالات کے ساتھ متصف ہے اور تمام کمالات کی مستحق ہے اور یہ تمام کمالات اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں، اور یہی حق کے معنی بھی ہیں[2]۔ حق کا لفظ ان کے مریدوں، فرزندوں اور عقیدت مندوں پہ اس طرح حاوی تھا کہ وہ ہر سانس لیتے اور نکالتے وقت "حق حق" کا ذِکر کیا کرتے، یہاں تک کہ جب قدم زمین پر رکھتے تب بھی "حق حق" کہتے[3]۔

شیخ احمدؒ فرمایا کرتے کہ صوفی منصورؒ بچہ تھا اور اس میں قوتِ برداشت نہ تھی، اِس لیے اُس نے اسرارِ حق کو ظاہر کر دیا۔ بعض اللہ کے بندے معرفت کے دریا کے دریا چڑھا جاتے ہیں لیکن وہ ڈکار تک نہیں لیتے[4]۔

وہ چشتیہ صابریہ سلسلہ کے مجدّد تھے اور فی الحقیقت اس سلسلہ کو سب سے زیادہ فروغ انہی کی ذات سے ہوا۔ ان کے پیرومرشد شیخ جلال الدّین کبیرالاولیاؒ کے چالیس خلفاء تھے اور ان میں سے انہی کی بدولت یہ سلسلہ جاری اور مستحکم ہوا۔ ان سے لاکھوں بندگانِ خدا نے رُوحانی فیض حاصل کیا۔ صاحبِ تصنیف خزینۃ الاصفیاء لکھتے ہیں کہ ان کے خلفاء ہند و پاکستان کے علاوہ عرب و عجم تک پھیلے ہوتے تھے[5]۔ ہند و پاکستان میں ان کے سلسلہ کی بزرگ ترین ہستیوں میں سے اُن کے فرزند ارجمند حضرت شیخ محمد عارفؒ، اُن کے پوتے حضرت شیخ محمدؒ بن حضرت شیخ محمّد عارفؒ، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، حضرت شیخ جلال الدّین تھانیسریؒ، حضرت شیخ عبدالغفور اعظم پوریؒ اور حضرت شیخ

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۸۴، مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۶۶ ب۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۸۷

[2] اخبار الاخیار ایضاً، مرآۃ الاسرار ایضاً، خزینۃ الاصفیا ایضاً

[3] اخبار الاخیار ایضاً، مرآۃ الاسرار ایضاً

[4] اخبار الاخیار ایضاً، مرآۃ الاسرار ایضاً ورق ۴۶۷ ب

[5] خزینۃ الاصفیا جلد ایضاً

جان جونپوریؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ وہ تمام اپنے زمانہ کے اولیائے عظام میں سے تھے[1]
ان میں سے ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ سلسلہ جاری ہُوا اور اِس طرح انھوں نے سلسلہ چشتیہ صابریہ
کو بے حد و نہایت فروغ بخشا۔

حضرت شیخ عارفؒ کے علاوہ آپ کے ایک خلیفہ میاں قدّو کھی تھے جنھوں
نے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد پہلے برناوہ قیام کیا مگر برناوہ ان دنوں غیرآباد
تھا اِس لیے پھر وہ رانیڑی چلے گئے اور وہاں وعظ و تلقین کا سلسلہ جاری کیا[2]۔ شیخ عارفؒ
اور میاں قدّوؒ کے علاوہ اور کسی کو اُن کے خرقۂ خلافت دینے کا ثبوت نہیں ملتا۔ درحقیقت
وہ کسی کو بڑی مشکل ہی سے مرید کرتے اور فرمایا کرتے کہ پیری و مریدی بڑا کٹھن کام ہے
جس کو خود اپنی نجات کا یقین نہ ہو وہ دُوسروں کی مدد کس طرح کر سکتا ہے[3]۔ ان کے بعض مرید
بڑے اُونچے درجہ کے بزرگ تھے۔ اُن میں سے شیخ بختیارؒ اور میاں مخلصؒ بڑی ممتاز حیثیت
رکھتے ہیں۔

انھوں نے ۱۵ جمادی الثانی ۸۳۷ھ/۱۴۳۳-۳۴ء کو ایک سو آٹھ سال کی عمر
میں وصال فرمایا[4]۔ اور اپنی خانقاہ کے قریب ہی دفن ہُوئے۔ اُن کا روضۂ اقدس ردولی
میں مرجعِ خلائق ہے۔

---

[1] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۸۶   [2] انوار العیون ص ۶۶

[3] بزم صوفیہ ص ۶۲۸

[4] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۲۷۵ ب لیکن خزینۃ الاصفیاء (جلد اوّل ص ۳۸۷) کے مؤلف ان کا سالِ وفات ۸۳۶ھ/۱۴۳۲-۳۳ء لکھتے ہیں۔ سیر الاقطاب ص ۲۲۲ میں اُن کا سالِ وفات ۸۳۷ھ/۱۴۳۳-۱۴۳۴ء درج ہے۔

باب ۳ سوم

شیخ احمد عبدالحق رح کے خُلفاء

شیخ عارف ردولوی رح

شیخ احمد عبدالحق رح کے ہاں کئی بچے ہوتے لیکن سب بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ اس لیے ان کی اہلیہ بڑی مغموم رہتی تھیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح لکھتے ہیں کہ ایک بار اُن کی اہلیہ نے اُن سے کہا کہ آپ سے مجھے ایک بچہ بھی نصیب نہ ہُوا۔ جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے وہ "حق حق" کرتا ہوا پیدا ہوتا ہے لیکن پھر اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔ انھوں نے فرمایا۔ تم غم نہ کرو، انشاءاللہ ایک لڑکا ہوگا جسے میں اپنے ساتھ سفر میں لے جا کر پختہ کار بناؤں گا اور اس شرط کے ساتھ تمھارے حوالہ کروں گا کہ اس کی پرورش بڑے ناز و نعمت سے کرنا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اُن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہُوا جس کا نام انھوں نے عارف رح رکھا۔ شیخ احمد عبدالحق رح کی تمام اولاد میں سے صرف وہی زندہ رہا اور اسی سے ان کی نسل چلی[ل]۔

شیخ احمد عبدالحق رح عارف رح سے بے حد محبت فرمایا کرتے اور ان کی تربیت انھوں نے بڑے اہتمام سے کی۔ جب بچپن میں ان کو معلم کے سپرد کیا گیا تو اس کو ہدایت کی گئی کہ وہ انھیں صرف ادب کی تعلیم دیں اور باقی سب کچھ وہ خود انھیں پڑھائیں گے[۲]۔ چنانچہ ان کے استادوں نے ان کی اخلاقی تعلیم و تربیت بڑے عمدہ پیرایہ میں کی چنانچہ وہ سراپا حسنِ اخلاق کا پیکر بنے[۳]۔ وہ اپنے والدِ بزرگوار ہی کے مرید و خلیفہ تھے۔ اُن کے بعد

ل اخبار الاخیار ص ۱۸۶، خزینۃ الاصفیا، جلد اول ص ۳۹۶ - ۳۹۷ - مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۷۵ ل

۲ ایضاً ۳ مرآۃ الاسرار ایضاً

سجادہ نشین ہوئے۔ وہ بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے[1]۔ ان کے حسنِ کمال سے لاتعداد لوگوں نے روحانی فیض حاصل کیا۔ ان کے ایک خادمِ خاص شیخ پیارہؒ تھے جن کی روحانی تربیت بھی انھوں نے کی تھی اور وہ بھی بڑے صاحبِ مرتبہ بزرگ ہوئے[2]۔

شیخ عارفؒ شریعت و طریقت اور معرفت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے[3]۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ جیسے جلیل القدر بزرگ ان کے خلفاءِ اجل میں سے تھے جو ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ حقیقتاً عارفِ ربانی، محققِ سبحانی اور کاملِ وقت تھے۔ ان کی شفقت و محبّت خلقِ خدا کے ساتھ بڑی عام تھی اور ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ شیخ عارفؒ سب سے زیادہ اس سے محبّت کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ان کو بڑی محبوبیّت و مقبولیّت حاصل تھی اور کوئی شخص ایسا نہ تھا جو ان سے محبّت نہ کرتا ہو اور وہ اس پر شفقت نہ فرماتے ہوں[4]۔

انھوں نے صرف چالیس سال عمر پائی۔ ان کا وصال ۸۵۹ھ/۱۴۵۴ء-۱۴۵۵ء[5] میں ہوا۔ ان کا مزارِ اقدس اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں ہے۔ ان کے صاحبزادے شیخ محمدؒ بھی بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے جو ان کی وفات کے بعد سجادۂ مشیخت پر بیٹھے تھے[6]۔

شیخ محمد دولویؒ

شیخ محمدؒ، شیخ عارفؒ کے صاحبزادے تھے اور ان ہی کے مرید و خلیفہ تھے[7]۔ اُن کے وصال کے بعد سجادہ نشین ہوئے اور بڑے صاحبِ کمال اور یگانہ

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۷۵ ب
[2] ایضاً
[3] خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل ص ۳۹۷
[4] انوار العیون ص ۴۰
[5] خزینۃ الاصفیاء ایضاً مگر مرآۃ الاسرار کے مصنّف ان کی کل عمر ۵۰ سال لکھتے ہیں۔ (ورق ۴۷۵ ب)
[6] اخبار الاخیار ص ۱۸۶
[7] ایضاً، مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۷۵ ب

روز گار بزرگ تھے۔ ان کے محبوب ترین خلفا میں سے ایک شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ تھے جن کا شمار ہند و پاکستان کے بڑے عظیم المرتبت علماء و صوفیا میں ہوتا ہے اور جن پر انھیں اس قدر اعتماد تھا کہ انھوں نے اپنے صاحبزادے شیخ اولیاءؒ عرف شیخ بدہؒ کو روحانی تعلیم و تربیت کے لیے انھی کے پاس شاہ آباد بھیج رکھا تھا[1]۔ جب شیخ محمدؒ کا وقتِ وصال قریب آیا تو شیخ اولیاءؒ شاہ آباد ہی میں تھے لیکن حضرت شیخ احمد عبدالحقؒ کے روحانی اشارہ کے مطابق شیخ عبدالقدوسؒ ان کو ردولی لے آئے۔ اس وقت ان کا آخری وقت تھا اور ان پر بار بار بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی مگر جب ہوش میں آتے تو فرماتے "سبحان اللہ فہم کردم فہم کردم"۔ اس وقت شیخ عبدالقدوسؒ نے عرض کیا کہ آپ نے کیا سمجھا ہے؟ ارشاد فرمایا کہ توحیدِ مطلق! جب ان پر وقتِ نزع طاری ہوا تو شیخ عبدالقدوسؒ نے عرض کیا یہ مردوں کی ہوشمندی کا وقت ہے۔ انھوں نے جواب میں فرمایا۔ میری طرف سے بے فکر رہیں، اس وقت میرے دل میں سوائے خدا کے کسی اور کا گزر نہیں ہے[2]۔ شیخ عبدالقدوسؒ نے پھر عرض کیا کہ آپ ساری دولت لے کر سفر کر رہے ہیں، آپ کے بعد میرا کیا حال ہوگا۔ انھوں نے بڑی محبت سے فرمایا، تم کو کیا اندیشہ تم تو خدا کے ولیوں میں سے ہو[3]۔ پھر انھوں نے خرقۂ خلافت اور پیرانِ چشت کی تمام امانتوں کو شیخ اولیاءؒ کے سپرد کیا اور ان کو اپنا جانشین بنا کر اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی[4]۔ ان کا مزارِ اقدس ان کے جدِ امجد کے روضہ کے حظیرے کے باہر اس سے متصل مغرب کی جانب واقع ہے۔

شیخ محمدؒ کے بعد دو سلسلے چلے۔ ایک خاندانی اور نسبی سجادہ نشینی کا، جو اب تک قائم ہے اور دوسرا حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ سے، جو قدسیہ بھی کہلاتا ہے۔ موخرالذکر

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۷۵ ا۔ ب

[2] ایضاً ورق ۴۷۵ ب

[3] ایضاً ورق ۴۷۵ ب

[4] ایضاً ورق ۴۷۵ ب

کا سلسلہ چشتیہ صابریہ کی ترقی و ترویج میں بڑا ہاتھ ہے۔

حضرت شیخ محمدؒ کے بعد حضرت شیخ اولیاؒ عرف شیخ بڈہؒ سجادہ نشین ہوئے۔ وہ بڑے باکمال اور صاحب کرامات بزرگ تھے اور اُن کے حُسنِ کمال سے سینکڑوں فیض یاب ہوئے۔ اُن کے خاص مریدوں میں سے ایک شیخ عبدالرحمٰن قدوائیؒ تھے جنھوں نے سو سال کے لگ بھگ عمر پائی اور انھوں نے بھی لاتعداد لوگوں کو روحانی فیوض بخشے تھے۔[1]

شیخ الاولیاؒ کے وصال کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ پڑؒ سجادہ نشین ہوئے وہ بھی بڑے عالی مرتبہ بزرگ تھے اور جن کے صاحبزادے شیخ قطب الدینؒ بھی بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے جو اپنے والدِ بزرگوار ہی کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کے ایک مرید شیخ معروف مجذوبؒ قصبہ بھانی کے رہنے والے بھی بڑے ذی مرتبت درویش تھے۔ شیخ پڑؒ کے وصال کے بعد ان کے صاحبزادے اور مرید و خلیفہ شیخ حمیدؒ سجادہ مشیخیت پر بیٹھے جو بڑے صاحبِ مراتب بزرگ تھے اور جن کے ایک مرید و خلیفہ، مرآۃ الاسرار کے مصنف شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ بھی تھے اور جن کو اُن سے بڑا روحانی فیض حاصل تھا۔[2]

شیخ اولیاؒ کے ایک چھوٹے صاحبزادے شیخ منصورؒ بھی بڑے صاحبِ کمال بزرگ تھے۔ وہ اپنے والدِ بزرگوار ہی کے مرید و خلیفہ تھے۔ شیخ عبدالرحمٰن قدوائیؒ اگرچہ شیخ اولیاؒ کے مرید تھے لیکن ان کی رُوحانی تربیت انھوں ہی نے کی تھی اور انھی سے خرقۂ خلافت بھی ملا تھا۔ شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ صاحب تصنیف مرآۃ الاسرار لکھتے ہیں کہ وہ کئی بار شیخ عبدالرحمٰن قدوائیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کی زیارت و فیض سے مستفیض ہوتے رہتے شیخ منصورؒ نے شیخ عبدالقدوسؒ کے جلیل القدر خلیفہ شیخ جلال تھانیسریؒ کو بہت زیادہ

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۷۵ ب، ۴۷۶ ا

[2] ایضاً ورق ۴۷۶ ا - ب و ۴۷۷ ا

رُوحانی فیض بخشا تھا۔ شیخ منصور کے بیٹے اور سجادہ نشین شیخ عالم بھی بڑے عالی مرتبہ بزرگ تھے جن کی خدمت میں شیخ عبدالرحمٰن چشتی بھی کئی بار حاضر ہوئے اور رُوحانی فیوض سے مستفید ہوتے تھے[1]

شیخ بختیارؒ

شیخ بختیار صابریؒ شیخ احمد عبدالحقؒ کے محبوب ترین مریدوں میں سے تھے لیکن ان کی خلافت کی تصریح نہیں ملتی۔ وہ بڑے ذی مرتبت بزرگ تھے۔ اور انھوں نے کافی عرصہ شیخ احمد عبدالحقؒ کے ساتھ سفر و سیاحت میں گزارا تھا۔ فی الواقعہ ان کے مریدوں میں سے کسی اور کو وہ قربت و عنایات حاصل نہ ہوئیں جو اُن کو حاصل تھیں[2]

شیخ بختیارؒ پہلے کسی سوداگر کے غلام تھے جو جواہرات کی سوداگری کرتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ایک بار ردولی آئے اور جب وہ شیخ احمد عبدالحقؒ سے ملے تو اُن کے ایسے معتقد ہو گئے کہ پھر صبح و شام انہی کی خدمت میں رہنے لگے۔ اس طرح انھوں نے چھ ماہ گزار دیے مگر شیخ احمد عبدالحقؒ کی طرف سے اُن کی طرف کوئی نظرِ التفات نہ ہوئی؛ اور نہ انھوں نے یہی پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ بالآخر ایک روز شیخ نے ان کو ایسی نظرِ التفات سے دیکھا کہ وہ بے خود ہو گئے اور بے خودی میں پکارنے لگے کہ آپ اِس قدر رُوحانی نعمت کے مالک ہیں مگر بندگانِ خدا کو اس سے محروم رکھتے ہیں۔ انھوں نے ان کو اس طرح کہنے سے منع فرمایا لیکن وہ عالمِ جذب میں یہی پکارتے جاتے۔ آخر شیخ احمد عبدالحقؒ ان کو ہوش میں لائے اور فرمایا، بختیارؒ تم اپنے مالک کے پاس چلے جاؤ اور اسی کا کام کرو۔ چنانچہ وہ جونپور چلے گئے لیکن ان کے مالک نے جب ان کی یہ حالت دیکھی تو

---

[1] مراۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۷۶ ل

[2] اخبار الاخیار ص ۱۸۵

ان کو آزاد کر دیا اور پھر وہ ردولی واپس چلے آئے[1]۔

اس کے بعد وہ آتشِ عشق و محبت میں اس قدر بے قرار رہنے لگے کہ ایک لمحہ بھی چین نہ پاتے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ ایک روز عالمِ اسرار میں شیخ شرف الدین پانی پتیؒ نے شیخ احمد عبدالحقؒ سے ان کی سفارش کی اور فرمایا کہ آپ کو دُنیا میں کوئی دوسرا شخص اس قدر نہیں پہچانتا جس قدر کہ شیخ بختیارؒ۔ وہ جونپور چھوڑ کر ردولی میں ہمہ تن آپ کی خدمت میں مشغول رہتے ہیں، اور صدقِ دل سے اپنے فرائض بجا لاتے ہیں اس لیے ان کے حال پر رحم فرمائیں[2]۔ شیخ بختیارؒ، شیخ احمد عبدالحقؒ کے حد درجہ فرمانبردار تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز شیخ احمد عبدالحقؒ نے ان سے کہا کہ خانقاہ میں ایک کنواں کھود دو۔ وہ اسی وقت پھاوڑا لے کر کنواں کھودنے لگے اور جب پانی نکل آیا تو شیخ احمد عبدالحقؒ نے اس پر تکبیر پڑھ کر سب میں تقسیم کر دیا۔ پھر اُن کو دوبارہ حکم دیا کہ اب اس کنوئیں کو باہر کی مٹی سے بھر دو اور جو اس کنوئیں کی اصل مٹی ہے اس کا ایک چبوترا بنا دو۔ چنانچہ انھوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور جس طرح انھوں نے فرمایا تھا اسی طرح کر دیا۔ مگر یہ تک نہ پوچھا کہ یہ کنواں کیوں کھدوایا تھا اور اب کیوں پٹوا دیا ہے[3]۔

ایک روز شیخ احمد عبدالحقؒ اپنے حجرہ میں بیٹھے ہوئے تھے اور شیخ بختیارؒ ان کی خدمت میں کھڑے تھے۔ شیخ احمد عبدالحقؒ نے ان سے پوچھا بختیارؒ اس وقت تمھیں کچھ نظر آرہا ہے اس پر انھوں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو دیکھا کہ وہ حجرہ خالص سونے سے بھرا ہوا تھا۔ آپ نے ان کو کہا کہ اگر تمھاری کوئی ضرورت ہے تو اس میں سے پوری کر لو لیکن انھوں نے عرض کیا مجھے اس میں سے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے تو صرف آپ کی متابعت

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۸۵

[2] ایضاً ص ۱۸۶

[3] ایضاً ص ۱۸۵-۱۸۶

کی خواہش ہے۔ اس کے بعد پھر انھوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو حجرہ خالی تھا[1]۔

شیخ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ ایک روز وہ شیخ احمد عبدالحقؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں تجارت کا ارادہ کر رہا ہوں آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ انھوں نے فرمایا جاؤ تجارت کرو مگر دریائے مادرئی تک، اور اس سے پار نہ جاؤ کیونکہ وہاں تک اس فقیر کی حد ولایت ہے[2]۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کوئی رسمی تعلیم حاصل نہ کی تھی لیکن پیر و مرشد کے فیضانِ علم سے اس قدر بہرہ مند ہو چکے تھے کہ بعض علمائے وقت بھی اپنے مسائل ان سے حل کرواتے، اور وہ جو کچھ کہتے وہ کبھی کتاب اللہ اور سنّتِ رسولؐ کے سوا نہ ہوتا تھا[3]۔ انھوں نے سو سال سے زائد عمر پائی اور ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں انتقال فرمایا[4]۔

شیخ میاں مخلصؒ

شیخ میاں مخلصؒ شیخ احمد عبدالحقؒ کے ممتاز مریدوں میں سے تھے اور بڑے فنی مرتبت درویش تھے[5]۔ پہلے وہ فیروز شاہ کے ملازم تھے۔ پھر ایک عرصہ شیخ احمد عبدالحقؒ کی خدمت میں رہے۔ وہ ان کا دونوں وقت کا کھانا لایا کرتے لیکن انھوں نے کبھی یہ نہ پوچھا کہ تم کون ہو اور یہاں کسی مقصد سے آتے ہو۔ اس طرح چھ ماہ گزر گئے ایک روز انھیں خیال آیا کہ میں اتنا عرصہ ان کی خدمت کرتا رہا اور انھوں نے کبھی یہ تک نہ پوچھا کہ تم کون ہو اور تمھارا مُدعا کیا ہے؟ اگر اتنے روز میں کسی پتّھر کی بھی خدمت کرتا تو شاید میرا مقصد پُورا ہو گیا ہوتا۔ یہ خیال لے کر وہ گھر لوٹ آئے[6]۔ مگر شیخ احمد عبدالحقؒ بھی ان کے پیچھے اُن کے گھر پہنچ گئے اور دروازہ پر دستک دی۔ اندر سے ایک لونڈی آئی جس سے انھوں نے فرمایا کہ اپنے آقا

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۸۶
[2] ایضاً۔ انوار العیون ص ۴۷
[3] خزینۃ الاصفیا جلد اوّل ص ۴۱۱
[4] ایضاً
[5] انوار العیون ص ۵۶ - ۶۰
[6] ایضاً

سے کہو کہ احمد دروازہ پر کھڑا ہے۔ جب انھیں یہ اطلاع ملی تو فوراً دوڑے آئے اور انھیں دیکھتے ہی اُن کے قدموں پر گر پڑے۔ شیخ احمد عبدالحق نے ان سے پوچھا کہ تمھیں مجھ سے کیا گلہ ہے مگر وہ بالکل خاموش رہے اور کھانا لا کر پیش کیا۔ شیخ احمد کھانا تناول فرما کر اپنی خانقاہ واپس چلے گئے لیکن شیخ میاں مخلص بھی اُن کے ساتھ ساتھ خانقاہ پہنچ گئے[1]۔ انھوں نے پھر اُن سے پوچھا کہ کیا تمھاری کوئی اولاد ہے؟ انھوں نے جواب دیا۔ ہاں! ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ جاؤ پہلے اُن کی شادی کرو، پھر میرے پاس آنا[2]۔ جب وہ اس فرض سے فارغ ہو کر کچھ روز بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو پھر انھوں نے ان کو اپنا مرید بنا لیا۔ وہ تھوڑی ہی مدت میں ان کی توجہ باطنی سے مرتبۂ ولایت کو پہنچ گئے۔ شیخ احمد عبدالحق نے اُن کو ایک خرقہ بھی عنایت فرمایا تھا[3]۔ ان کا انتقال شیخ احمد عبدالحق کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ جب اُن کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے بہرام نے ان کا خرقۂ خلافت لا کر شیخ احمد عبدالحق کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ خرقہ انہی کے لائق تھا۔ اس لیے اس کو انہی کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ اسی طرح کیا گیا[4]۔

شیخ بہرام چشتی صابری

شیخ بہرام شیخ جلال الدین پانی پتی کے اجلّ خلفا میں سے تھے۔ انھوں نے آغازِ جوانی ہی میں خرقۂ خلافت حاصل کر لیا تھا اور اس کے بعد اپنے پیر و مرشد کے حکم کے مطابق برناوہ جا کر سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا تھا[5]۔ جب قصبہ بیدولی دریائے جمنا کے کنارے سیلاب کی زد میں آ گیا تو بعض مقامی لوگوں نے اپنے پیر و مرشد شیخ

---

[1] انوار العیون ص ۵۶ - ۶۰
[2] ایضاً
[3] ایضاً
[4] ایضاً
[5] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۲۹

جلال الدین پانی پتیؒ سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح اس قصبہ کو سیلاب کی زد سے بچائیں لہٰذا اِس موقعہ پر انھوں نے ان کو ایک خط لکھا کہ وہ فوراً بیدولی جاکر رہائش اختیار کر لیں چنانچہ وہ فوراً وہاں پہنچے اور دریا کے کنارے ڈیرے ڈال دیے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی ایسی رحمت ہوئی کہ وہ قصبہ سیلاب سے بچ گیا۔ بلکہ اس کے بعد دریا نے اپنا رُخ ہی بدل لیا اور وہاں سے دو کوس کے فاصلہ پر بہنے لگا۔ شیخ بہرامؒ پھر تادمِ حیات وہیں مقیم رہے[۱]۔

شیخ میاں بہرامؒ بڑے صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ انھوں نے سو سال سے زیادہ عرصہ رُشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا اور ۱۲۵ برس کی عمر میں ۸۵۴ھ/۱۴۵۰۔۱۴۵۱ء میں وصال کیا[۲]۔ ان کا روضۂ اقدس بیدولی میں دریائے جمنا کے کنارے مرجعِ خلائق ہے[۳]۔

---

[۱] خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل ص ۳۹۴، سیر الاقطاب ص ۲۲۳

[۲] خزینۃ الاصفیاء، ایضاً ص ۳۹۵

[۳] ایضاً

شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ

شیخ عبدالقدوسؒ کے والدِ بزرگوار کا اسمِ گرامی شیخ ابوالمکارم اسمٰعیل بن صفی الدین صیفی حنفیؒ تھا اور ان کا شجرۂ نسب حضرت امام ابوحنیفہؒ سے ملتا ہے[1]۔ شیخ ابوالمکارم اسماعیلؒ کے دُوسرے بیٹے بھی بڑے پایہ کے عالم تھے مگر علم و معرفت کی دُنیا میں جو مرتبہ و شہرت شیخ عبدالقدوسؒ کو حاصل ہوئی وہ کسی دُوسرے کے حصّہ میں نہ آئی[2]۔

شیخ گنگوہیؒ شیخ محمدؒ بن شیخ عارفؒ بن شیخ احمد عبدالحقؒ رُدولوی کے مرید و خلیفہ تھے[3]۔ علاوہ ازیں اُن کو شیخ احمد عبدالحقؒ سے بھی بے حد رُوحانی فیض حاصل تھا[4]۔ اس کے متعلق انھوں نے اپنی کتاب انوار العیون میں بھی لکھا ہے اور اس کا ذکر لطائف قدوسی میں اُن کے بیٹے شیخ رُکن الدینؒ نے بھی کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیخ احمد عبدالحقؒ کی زندگی میں ان سے مشرف بہ فیض تو نہ ہو سکے لیکن ان کی حیاتِ باطنی سے حد درجہ بہرہ مند و فیض یاب ہوتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں صحراؤں میں یا ویرانوں میں یا سفر میں جہاں کہیں بھی ہوتا وہ میری ہر طرح رہنمائی فرمایا کرتے اور جب نمازِ تہجد کا وقت آتا تو میرے کانوں میں "حق حق" کی آواز آنے لگتی جس سے میری غفلت دُور ہو جاتی اور یہ معاملہ میرے ساتھ ہمیشہ پیش آتا رہا۔ اُن کو شیخ احمد عبدالحقؒ سے غائبانہ طور پر انتہائی محبت تھی اور

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۳ ب، ۴۸۴ ا، تذکرہ علمائے ہند ص ۷ و ۹۶
[2] تذکرہ علمائے ہند ایضاً۔ ان کے دُوسرے بھائیوں کے نام شیخ عبدالصمدؒ، شیخ عزیز اللہ اور شیخ حبیب اللہ عرف مخدوم مختن تھے۔ وہ تمام اپنے والدِ بزرگوار ہی کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کا تعلق سلسلہ چشتیہ نظامیہ سے تھا۔ [3] مرآۃ الاسرار ایضاً ورق ۴۸۳ ب، خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۱۶
[4] ایضاً۔ مرآۃ الاسرار ایضاً

ردولی میں وہ اکثر اُن کے روضۂ اقدس پر جھاڑو دیا کرتے تھے۔ اُن سے رُوحانی تعلق کے علاوہ رِشتہ داری کا بھی تعلق تھا کیونکہ ان کی پوتی (جو شیخ عارفؒ کی صاحبزادی تھیں) ان کے ساتھ منسوب تھیں[1]۔

مفتی غلام سرور صاحبؒ تصنیف خزینۃ الاصفیاء لکھتے ہیں کہ وہ پیدائشی ولی تھے۔ ایامِ طفولیت میں اُن کی زبان سے جو بات نکل جاتی وہ پوری ہو جاتی تھی[2]۔ اوائلِ عمر میں جب وہ کھیتی باڑی کیا کرتے تھے تو جو غلّہ بھی آتا اُس میں سے سب سے پہلے درویشوں اور حاجتمندوں کی ضرورت پُوری کرتے اور باقی جو بچتا وہ اپنے لیے رکھ لیتے۔ اُن کی عبادت و ریاضت کا یہ عالم تھا کہ دن میں بھی چار سو رکعت اور رات کو بھی چار سو رکعت نفل ادا کرتے اور بہت سا وقت تلاوتِ قرآن مجید اور وظائف میں صرف کرتے۔ انھوں نے ہر طرح کی ریاضاتِ شاقّہ اور مجاہداتِ عالیہ کیے تھے۔ شیخ احمد عبدالحقؒ نے قبر میں بیٹھ کر چھ ماہ چِلّہ کشی کی تھی اور انھوں نے بھی ان کی متابعت میں املی کے درخت کی کھوڑ میں بیٹھ کر چھ ماہ چِلّہ کشی کی اور بالآخر سالہاسال کی ریاضات کے بعد شیخ محمدؒ سے خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ وہ دنیاوی شہرت اور روحانی مراتب کے باوجود اپنے پیر و مُرشد کے گھر میں ہر طرح کی خدمات بجالاتے۔ جھاڑو دیتے، پانی بھرتے۔ گھر کے سب لوگوں کے کپڑے دھوتے جنگل سے جلانے کی لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور اس طرح کے دُوسرے کام بھی کرتے تھے[3]۔

بالآخر شیخ احمد عبدالحقؒ نے اُن کو ایک دُوسری جگہ کے صاحبِ ولایت ہونے کا رُوحانی اشارہ کیا۔ اس واقعہ کے کچھ روز بعد ہی ان کو سلطان سکندر لودھی کے

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۱۵، مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۳ ب و ۴۸۴ ا
[2] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۱۷
[3] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۴ اب ۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۱۷

ایک امیر عمر خاں نے شاہ آباد مدعو کر لیا جہاں وہ بال بچوں سمیت چلے گئے اور وہاں ۳۵ سال تک وعظ و تلقین کرتے رہے۔ عمر خاں کو اُن کے ساتھ والہانہ عقیدت تھی۔ عمر خاں سلطان سکندر لودھیؒ کے بڑے عالی مرتبہ امراء میں سے تھے۔ اس نے شاہ آباد میں ان کو ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی اور وہاں انھیں بڑی عزت و شہرت حاصل ہوئی۔ سلطان سکندر لودھی اور سلطان ابراہیم لودھی کے دورِ حکومت میں وہ شاہ آباد ہی میں تھے لیکن جب مؤخر الذکر شہنشاہ بابر کے ہاتھوں پانی پت کے مقام پر سلطنتِ دہلی سے محروم ہو گئے تو شاہ آباد بھی زیرِ عتاب آیا کیونکہ وہاں بہت سے افغان گھرانے آباد تھے۔ چنانچہ ان حالات میں وہ گنگوہ (ضلع سہارنپور) چلے گئے اور وہاں بھی حسبِ معمول وعظ و تلقین کا سلسلہ جاری رکھا۔[1]

شیخ عبدالقدوسؒ کو شاہ آباد کی طرح گنگوہ میں بھی بڑی عزت و شہرت حاصل ہوئی اور وہ اپنے علمی و رُوحانی کمالات کی وجہ سے سارے ملک میں مشہور ہوئے۔ انھوں نے ہزاروں کو رُوحانی فیض بخشا۔ بعض شاہانِ وقت بھی اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ انھوں نے بعض سلاطینِ وقت کو تبلیغ و اصلاح کی غرض سے خطوط بھی لکھے۔ علامہ شیخ ابوالفضل تذکرۂ اولیائے ہند میں لکھتے ہیں کہ بادشاہ نصیر الدین ھمایوں بھی اُن کی خدمت میں علمی حقائق و معارف سمجھنے کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے۔[2]

وہ ۸۶۰ھ/۱۴۵۵-۱۴۵۶ء میں پیدا ہوئے۔[3] اور ۸۴ سال کی عمر میں ۹۴۵ھ/۱۵۳۸-۱۵۳۹ء میں وصال فرمایا۔ اس عرصۂ حیات میں سے وہ ۲۵ سال ردولی، ۳۵ سال شاہ آباد اور ۱۴ سال گنگوہ میں رہے تھے۔ ان کا روضۂ اقدس گنگوہ میں مرجعِ خلائق ہے۔[4]

شیخ عبدالقدوسؒ کو جن حالات میں صابریہ سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت کرنی پڑی وہ

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۴ ب - ۴۸۵ الف۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۴۱۷

[2] مرآۃ الاسرار ایضاً ورق ۴۸۵ الف

[3] اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۸

[4] مرآۃ الاسرار ایضاً ورق ۴۸۴ ب ۴۸۵ الف

بڑے کٹھن اور حوصلہ آزما تھے۔ سارے ملک کی سیاسی فضاء پر غیر یقینی مسلط تھی۔ سلطنت دھلی کی سیاسی اور سماجی حالت ابتر تھی۔ صوبوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہو چکی تھیں اور پایۂ تخت دھلی کے چاروں طرف ہنگامہ آرائی اور فتنہ و فساد برپا تھا۔ راجپوت بڑے منظم ہو چکے تھے اور اپنا اقتدار قائم کرنے کی فکر میں تھے۔ چندیری، ناگور، اجمیر اور ردولی جیسی جگہوں پر حالات ایسے نازک ہو چکے تھے کہ لوگ ان مقامات کو چھوڑ کر دوسری جگہ جا کر بسنے لگے تھے۔ چنانچہ ملک کے ایسے غیر متوازن سیاسی اور سماجی حالات کو دیکھ کر کسی بزرگ کا بھی سیاست سے علیحدہ رہنا ناممکن تھا۔ وہ شروع میں تو مشائخ چشت کے قدیم اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے سلاطین و سیاست سے علیحدہ رہے لیکن بعد میں اُن کو مجبوراً ملکی سیاسیات میں حصہ لینا پڑا اور اُمراء و سلاطین سے ربط پیدا کرنا پڑا، چنانچہ انھوں نے سُلطان سکندر لودھی اور بادشاہ بابر کو طویل خط لکھے اور انھیں بتایا کہ ایسے حالات کی بہت کچھ درستی آئمہ و علماء کے ذریعہ ممکن ہے۔[1]

شیخ عبد القدوسؒ اتباعِ سُنت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ہم عصر اُمراء کو جو خط لکھے اُن میں انھیں اتباعِ سُنت کی خاص طور پر تلقین فرمائی جو خط انھوں نے خواص خاں، ہیبت خاں شیروانی، تردی بیگ اور ابراھیم خاں شیروانی وغیرہ کو لکھے، وہ بڑے اھم ہیں اور اُن سے اس دور کے سیاسی و سماجی حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔[2]

شیخ گنگوھیؒ کو مجلسِ سماع کا بے حد شوق تھا۔ ایک مرتبہ تو انھوں نے حالتِ وجد میں گھر کا چھپر تک اُتار پھینکا تھا۔ سکندر لودھی کے محکمۂ احتساب کے نگران شیخ حسام الدین اودھیؒ کو جب ان کی مجلسِ سماع کا علم ہُوا تو وہ سرود و سماع کے احتساب کے لیے گنگوہ پہنچے لیکن وہاں پہنچ کر وہ ان کی صحبت سے اِس قدر متاثر ہوئے کہ اپنا تمام مال و اسباب لٹا کر ان کے مرید ہو گئے۔ اِس واقعہ کا علم جب سلطان سکندر لودھی کو ہوا تو وہ ان کے اور بھی زیادہ معتقد ہو گئے۔

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص ۲۱۸ - ۲۲۰

[2] ایضاً ص ۲۲۱ - ۲۲۲

شیخ اوجہرؒ اس دور کے متبحر علماء میں تھے اور سلطان سکندر لودھی ان کے علم سے بڑے متاثر اور ان کے کام سے بڑے خوش تھے۔[1]

شیخ عبدالقدوسؒ بڑے صاحبِ علم و فضل بزرگ تھے۔ اُن کی تصانیف سے اُن کی وسعتِ علمی اور نگاہ کی بلندی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے انھوں نے شیخ علیؒ کی طرح شیخ محی الدین عربیؒ کی مشہور تصنیف نصوص الحکم کی شرح لکھ کر وحدت الوجود کے تصورات کو عام کیا۔ انھوں نے عوارف المعارف کی شرح بھی لکھی تھی۔ ان کی دوسری تصانیف رشد نامہ، رسالہ قدسیہ، غرائب الفوائد مظہر العجائب اور مکتوبات قدسیہ وغیرہ تھیں۔ ان تمام کتابوں میں انھوں نے وحدت الوجود پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ انھوں نے خاص طور پر رشد نامہ میں تصوف اور وحدت الوجود کے نکات کو بڑے عمدہ طریق سے بیان کیا ہے۔[2] اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو ہندوی زبان پر بھی کامل عبور حاصل تھا۔ وہ ہندی کے شاعر تھے اور اپنا تخلص الکھ داس کیا کرتے تھے۔ ان کے رشد نامہ میں جگہ جگہ ان کے ہندی دوہرے ملتے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں۔

یہ جگ ناہیں باج پی بوجھ برہم گیان
سو پانی سو بلبلا سوتی سمدر جان[3]

انھوں نے صابریہ سلسلہ کے نظام کو ترتیب دینے اور اس سلسلہ کو پھیلانے میں بڑا کام کیا۔ وہ اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت کی طرف خاص توجہ فرماتے۔ اپنے مریدوں کے نام انھوں نے جو خطوط لکھے ہیں ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اُن کی روحانی تعلیم و تربیت کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔[4]

ان کے تین بیٹے تھے، شیخ حمید الدین، شیخ عبدالمجید اور شیخ رکن الدین وہ

---

[1] بحمد لطائف قدوسی ص ۱۰۷ - ۱۰۹
[2] گلزار ابرار ص ۲۳۹، تاریخ مشائخ چشت ص ۲۲۱ - اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۸
[3] تاریخ مشائخ چشت ایضاً ص ۲۲۱ - اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۸ - ۲۹
[4] تاریخ مشائخ چشت ص ۲۲۱ - ۲۲۲ -

تمام بڑے پایہ کے عالم اور ذی مرتبت بزرگ تھے۔ اُن میں سے شیخ رُکن الدینؒ خاص طور پر بڑی قابلِ قدر ہستی تھے۔ ان کے بیٹے شیخ احمدؒ کے فرزند شیخ عبدالنبی تھے جو شہنشاہ اکبر کے صدر الصدور رہے تھے[1] لیکن شیخ عبدالقدوسؒ کی اولاد شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اور شیخ رُکن الدین ملتانیؒ کی اولاد کی طرح اپنے سلسلہ کو مستحکم اور جاری نہ رکھ سکی۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اور شیخ رُکن الدین ملتانیؒ نے اگرچہ حکومتِ وقت سے وابستگی رکھی مگر انھوں نے اپنے رُوحانی معاملات کو نظر انداز نہیں کیا تاہم اُن کی اولاد نے اُن کی مثال سے غلط فائدہ اُٹھایا اور سہروردیہ سلسلہ کا سارا انظام درہم برہم کر دیا۔ یہی حال شیخ عبدالقدوسؒ کی اولاد نے کیا۔ انھوں نے خُود تو اُمراء وسلاطین سے رابطہ ان کی اصلاح و تربیت کی خاطر پیدا کیا مگر ان کی اولاد نے دُنیاوی جاہ و جلال کی خاطر اپنی جبینوں کو شاہانِ مغلیہ کے آستانوں پر جھکا دیا[2]۔ ان کے پوتے شیخ عبدالنبی کے حالات دورِ اکبری کی تاریخوں میں تفصیل سے درج ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی طلب نے ان کا دینی جذبہ بالکل ختم کر دیا تھا۔ فی الواقعہ شیخ عبدالقدوسؒ کی اولاد ان کے کام کو جاری نہ رکھ سکی[3] مگر ان کے کچھ خلفاء ایسے صاحبِ کمال، ذی مرتبہ اور عالی حوصلہ ہوئے کہ انھوں نے اس سلسلہ کی نشر و اشاعت کی طرف خاص طور پر توجہ دی، اُن میں سے شیخ جلال الدین تھانیسریؒ، شیخ بہورؒ، شیخ عمر دینؒ، شیخ عبدالغفور اعظم پوریؒ، شیخ عبدالعزیز کیرانویؒ، شیخ محمدؒ ترکؒ[5]، شیخ عبدالستار سہارنپوریؒ، اور شیخ عبدالاحدؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[6]۔

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص ۲۲۲

[2] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو منتخب التواریخ از عبدالقادر بدایونی اور تذکرہ (ص ۳۵-۳۷) از مولانا ابوالکلام آزاد

[3] ایضاً

[4] اخبار الاخیار ص ۲۱۵-۲۱۶ و ۲۲۷-۲۲۸- تاریخ مشائخ چشت ص ۲۲۳-

[5] وہ ردولی کے رہنے والے تھے اور تاریخ محمدی کے مصنف تھے جو کہ خلاصۃ التواریخ کے نام سے بھی مشہور (جاری ہے)

شیخ عبدالاحدؒ، حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے والدِ بزرگوار تھے اور انھوں نے اپنی تمام تر کوششوں سے اِس سلسلہ کے اثرات کو دُور دُور تک پھیلا دیا تھا۔[1]

(گزشتہ سے پیوستہ) ہے۔ اِس تصنیف میں انھوں نے سلاطینِ دہلی و علماء و مشائخ وغیرہ کے حالات حکایات کے ساتھ درج کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۳ ب

[1] اخبار الاخیار ص ۲۱۵-۲۱۶۔ تاریخِ مشائخ چشت ص ۲۲۳

[1] تاریخِ مشائخ چشت ص ۲۲۳

حصّہ ہفتم

بابِ اوّل

قلندریہ سلسلہ

قلندریہ سلسلہ کے بزرگوں کا اندازِ زندگی دُوسرے سلسلوں کے مشائخ سے بڑا مختلف ہوتا ہے۔ وہ حسبِ دستور اپنے سر کے بالوں، پلکوں، مونچھوں اور ڈاڑھی کو منڈوا دیتے ہیں[1]۔ عموماً کانوں میں بالیاں یا بالے پہنے ہوتے ہیں اور اکثر پاؤں سے ننگے رہتے ہیں۔ ان کا لباس عام طور پر ایک لمبا کرتا ہوتا ہے اور یا پھر جسم کو کمبل میں لپیٹے رکھتے ہیں، جو اکثر رنگدار ہوتا ہے۔ وہ پاجامے، شلوار یا تہبند کی جگہ کمبل کا ایک حصّہ یا کپڑے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لنگوٹی کے طور پر استعمال کر لیتے ہیں[2]۔ ان میں جو کمبل اپنے گرد لپیٹے رہتے ہیں وہ جوالق کہلاتے ہیں[3]۔

اِس سلسلہ کے بزرگ روحانی منازل کو طے کرنے کے لیے مجاہداتِ عالیہ و ریاضاتِ شاقہ کو بڑا ضروری سمجھتے ہیں لیکن وہ قوانینِ شرعیہ یا سوسائٹی کے اصولوں سے بے پروا ہوتے ہیں[4]۔ بعض اوقات وہ حالتِ جذب میں بھی پائے جاتے ہیں۔ فی الحقیقت قلندر کے لغوی معنی بھی ایک ایسے شخص کے ہیں جو تمام دُنیاوی و اُخروی معاملات سے بالکل آزاد ہو مگر صُوفیانہ مشرب میں قلندر کے ایک خاص معنی لیے جاتے ہیں اور بقول حضرت شاہ مجاز

---

[1] سیر العارفین ص ۱۰۸ [2] خیر المجالس ص ۱۳۱

[3] Some Aspects of Religion and Politics in India during the 13th Century, p. 295.

[4] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد سوم ص ۶۷۷۔ قلندر زیادہ تر چشتیہ سلسلہ کے لوگ ہوتے ہیں لیکن بعض ان میں سے سہروردیہ مشرب سے بھی بیعت ہوتے ہیں۔ سید اطہر عباس رضوی ص ۳۱ (جاری ہے)

قلندرؒ" قلندر کسی است کہ از حال وقال ومقامات وکرامات گزشتہ"۔ وہ لکھتے ہیں کہ "چوں شیخ عبدالعزیزؒ مکی بداں درجۂ رسید حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ویرا بخطاب قلندر ممتاز ساخت[۱]۔" صاحب تصنیف مطلوب الطالبین کے مؤلف لکھتے ہیں کہ "از ھمہ سلسلہ ھر کس کے مرتبہ ابدال رسید قلندر مشرب گردد[۲]۔" ان کی رائے میں شیخ شمس الدین تبریزیؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ، شیخ فخر الدین عراقیؒ، خواجہ حافظ شیرازیؒ اور خواجہ مسعود بکؒ وغیرہم ایسے ہی جلیل القدر بزرگ تھے[۳]۔ مرآۃ الاسرار کے مؤلف شیخ عبدالرحمن چشتی لکھتے ہیں کہ شاہ حیدر قلندرؒ، شاہ حسین قلندر بلخیؒ، شیخ شمس الدین تبریزیؒ، مولانا رومؒ، شیخ فخر الدین عراقیؒ، خواجہ اسحاق مغربیؒ، خواجہ حافظ شیرازیؒ، علیٰ ھٰذا القیاس "بسیاری از شاھبازان ہر خانوادہ قلندر مشرب بودہ اند[۴]" شیخ شرف الدین بو علی قلندرؒ پانی پتی جنھوں نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے رُوحانی تربیت حاصل کی تھی۔ یہی مشرب رکھتے تھے۔ حضرت شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے خلیفہ شیخ علاء الدین علی احمد صابرؒ اور ان کے مرید وخلیفہ شیخ شمس الدین ترک پانی پتیؒ کا بھی قلندرانہ مشرب تھا۔ میر سید محمد گیسو دراز بندہ نوازؒ میر سید محمد مکیؒ اور قطب وابدال شیخ احمد عبدالحقؒ ردولوی کا بھی یہی مشرب تھا[۵]۔ حضرت شاہ نعمت اللہ ولیؒ رسالہ قلندریہ میں لکھتے ہیں کہ صوفی جب اپنے مقصد کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو قلندر ہو جاتا ہے[۶]۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ "ذکر قلندر حق است کہ ھمہ عالم محقق است[۷]۔" مولانا جامیؒ نے ایک بار فرمایا "قلندر پرتو نور الٰہی است۔ قلندر مطلع انوار شاھی است قلندر را مقام کبریائیست۔ قلندر در بحر آشنائیست۔ قلندر نور شمع ذوالجلالی است۔ قلندر

تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, p. 31.

۱۔ بحوالہ اصول المقصود (قلمی) ورق ۲ ب
۲۔ ایضاً ورق ۶ و
۳۔ ایضاً
۴۔ ایضاً
۵۔ ایضاً ورق ۵ ب
۶۔ ایضاً
۷۔ ایضاً ورق ۹۶ و

ذرۂ صحرائے عشق است" اور" قلندر قطرۂ دریائے عشق است"[1]۔

مذہبی کتب ورسائل سے پتہ چلتا ہے کہ تیرھویں صدی میں برِصغیر ہندوپاکستان میں بہت سے قلندر اور جوالق موجود تھے۔ اس سلسلہ کے آغاز کے متعلق ایک روایت یہ ہے کہ اس کی بنیاد سب سے پہلے ہسپانیہ میں یوسف نامی ایک مصری عرب نے ڈالی تھی[2]۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ قلندریہ سلسلہ کو سب سے پہلے مفتی شیخ جمال الدین ساوائیؒ نے ایران میں شروع کیا تھا[3] جو بقول ابن بطوطہ بعد میں مصر کے شہر دمیاط میں آباد ہو گئے تھے اور ان کا انتقال بھی وہیں ہوا تھا۔ فی الحقیقت اس سلسلہ کے سال اجراء اور جگہ کے متعلق مختلف رائیں ہیں۔ فرانز بابنگر لکھتے ہیں کہ قلندر سب سے پہلے وسطِ ایشیا میں ہوئے اور اُن کے افکار و اطوار پر ہندوستانی اثرات بدرجہ اتم ہیں[4]، مگر مقریزی کی رائے یہ ہے کہ سب سے پہلا قلندر دمشق میں ۶۱۰ھ/۱۲۱۳ء میں ہوا تھا[5]۔

تاہم سب سے پہلے قلندر جو برصغیر ہندوپاکستان میں پہنچے وہ شاہ خضر رومیؒ تھے[6]۔ وہ شیخ عبداللہ مکیؒ المعروف عبدالعزیز مکیؒ کے خلیفہ تھے[7] اور اس سلسلہ کے اجراء کے لیے روم (ترکی) سے یہاں آتے تھے وہ بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے۔ جب وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ان کو کلاہ و خرقہ اور چشتیہ سلسلہ کی دُوسری نعمتوں سے بھی سرفراز کیا تھا[8]۔ اس ملک میں ان کا قیام صرف تین ماہ رہا اور اس کے بعد پھر وہ واپس روم چلے گئے تھے[9]۔ رسالہ غوثیہ میں ہے کہ شاہ خضر رومیؒ کے دُو خلفا تھے ایک سید نجم الدین قلندر غوث الدہرؒ جنھوں نے عرب و عجم، ہندو چین اور خراسان کے

---

[1] بحوالہ اصول المقصود (قلمی) ورق ۶ ب
[2] خیر المجالس ص ۱۳۱
[3] ایضاً
[4] اصول المقصود (قلمی) ورق ۱۱ ا
[5] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد سوم ص ۶۷۶
[6] انسائیکلوپیڈیا ایضاً ورق ۶۷۷
[7] اخبار الاخیار ص ۴۹
[8] ایضاً ورق ۱۲ ب، اخبار الاخیار ص ۴۹
[9] اصول المقصود ایضاً ورق ۱۳ ا

علاقوں کی سیاحت کی اور جہاں بھی وہ پہنچے وہاں بے شمار لوگ ان کے مرید ہوتے تھے۔ وہ بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے اور ان کو اپنے مقصد میں بڑی کامیابی ہوئی تھی۔[1] شاہ خضر رومیؒ کے دوسرے خلیفہ سید روح اللہؒ تھے۔ جنھوں نے ایک طویل عرصہ اُن کی صحبت میں گزارا تھا اور وہ بھی بڑے صاحب کرامات قلندر تھے۔[2] سید نجم الدین قلندرؒ حسینی سید تھے۔ اُن کے والد بزرگوار کا نام سید نظام الدین غزنویؒ اور جدِ امجد کا نام سید نور الدین مبارک غزنویؒ تھا۔ ان کی والدہ محترمہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی ہمشیرہ تھیں۔[3] سید نجم الدین حضرت شاہ خضر رومیؒ کے مرید ہونے سے پہلے حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے[4]۔ ان کا وصال مانڈو میں ۸۴۴ھ میں ہوا تھا۔[5]

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ خضر رومیؒ نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد جونپور کا رُخ کیا اور جب وہ جونپور کے گرد و نواح میں موضع سرہر پور پہنچے تو وہاں سب سے پہلے سید قطب الدین بنیائے دلؒ کو اپنا مرید بنایا تھا[6] اور پھر انہی کی ذاتِ اقدس سے اِس برصغیر ہند و پاکستان میں قلندریہ سلسلہ کا اجراء ہوا۔[7] مگر منبع الانساب، اصول المقصود اور تجلی نور کے مصنفین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ سید قطب الدین بنیائے دلؒ حضرت شاہ خضر رومیؒ نہیں بلکہ حضرت سید نجم الدین غوث الدھرؒ کے مرید و خلیفہ تھے[8]۔

قلندریہ سلسلہ کی نامور ہستیوں میں سے ایک شیخ حمید قلندرؒ تھے جو بہت بڑے عالم تھے۔ وہ پہلے حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، پھر مولانا

---

۱ اصول المقصود (قلمی) ورق ۱۸ ا — ۲ ایضاً ورق ۱۸ ا — ۳ ایضاً ورق ۲۰ ب

۴ A. Halim J.A.S.P. Vol. VIII, no. 2, Dec. 1963. p. 77.

۵ گلزار ابرار ص ۱۵۴ — ۶ اخبار الاخیار ص ۴۹-۵۰

۷ ایضاً ص ۵۰ — ۸ منبع الانساب (قلمی) ورق ۱۶۸ ا۔

اصول المقصود (قلمی) ورق ۲۸ ب - ۳۳ ب - تجلی نور جلد اوّل ص ۶۳

برہان الدّین غریبؒ کی خدمت میں رہے اور بالآخر حضرت شیخ نصیر الدّین چراغ دہلویؒ کے مرید وخلیفہ ہوئے۔ انھوں نے ان کے ملفوظات خیر المجالس کے نام سے جمع کیے[1]۔ اسی سلسلہ کے ایک اور نامور بزرگ شیخ شرف الدّین بوعلی قلندر پانی پتیؒ تھے (المتوفّٰی ۷۲۴ھ / ۱۳۲۳ء) اُن کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ وہ حضرت خواجہ قطب الدّین بختیار کاکیؒ کے مرید وخلیفہ تھے اور بعض کی رائے ہے کہ وہ حضرت شیخ نظام الدّین اولیاءؒ کے مرید وخلیفہ تھے[2]۔ وہ بہت بڑے عالم تھے اور انھوں نے اپنے مرید اختیار الدّین کے نام جو خطوط لکھے۔ وہ علمِ توحید پر بڑی عمدہ روشنی ڈالتے ہیں۔ ان خطوط میں انھوں نے "عشق ومحبت" "معارف وحقائق، توحید، ترکِ دُنیا وطلبِ آخرت اور محبتِ مولیٰ وغیرہ پر بحث کی ہے[3]۔ یہ خطوط اب ایک کتابی شکل میں محفوظ ودستیاب ہیں۔ اُن کا ایک رسالہ "حکم نامہ" بھی بڑا مقبول ہے[4]۔ انھوں نے رموزِ توحید ومعرفت پر ایک مثنوی بھی لکھی تھی[5]۔ علاوہ ازیں ان کی بہت سی غزلیات اور رباعیات بھی ہیں[6]۔ اور خاص طور پر اُن کے ہندی کے دوہے بڑے مشہور ہیں۔ اُن کا ایک دوہا جو انھوں نے مبارز خاں کے ارادۂ سفر کے موقعہ پر کہا تھا۔ اُس دَور کی زبان کا ایک عمدہ نمونہ ہے؎

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے رو ے
بدھنا ایسی رین کو بھور کدھی نہ ہوئے

اِس مضمون کو انھوں نے فارسی میں یوں ادا کیا ہے؎

من شنیدم یارِ من فردا رود راہِ شتاب
یا الٰہی تا قیامت بر نیاید آفتاب[7]

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۰۹-۱۱۲ [2] ایضاً ص ۱۲۷ [3] ایضاً [4] ایضاً

[5] جس کا آغاز مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتا ہے؎

مرحبا اے بلبلِ باغِ کہن — از گلِ رعنا بگو با ما سخن
مرحبا اے قاصدِ طیّارِ ما — می دہی ہر دم خبر از یارِ ما

[6] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۲۶-۳۲۸ [7] اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۱۴

اُن کے حلقۂ ارادت میں حضرت امیر خسرو دھلویؒ، سلطان جلال الدین خلجی اور سلطان علاءالدین بھی شامل تھے۔[1]

اس سلسلہ کے ایک بڑے اہم بزرگ شیخ ابوبکر طوسی حیدریؒ تھے۔ وہ شیخ نظام الدین اولیاؒ، شیخ جمال الدین ھانسویؒ اور مولانا حسام الدین اندپتیؒ کے ہم عصر تھے۔[2] مگر شیخ جمال الدین ھانسویؒ کے ساتھ ان کے بڑے عمدہ مراسم تھے۔ جب وہ ایک بار حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی زیارت کے لیے دھلی آئے تو وہ ان ہی کی خانقاہ میں ٹھہرے۔ یہ خانقاہ دریائے جمنا کے کنارے بنی ہوئی تھی۔ اس موقعہ پر مجلس سماع کا بھی اہتمام ہوا اور دونوں بزرگوں میں بڑی درویشانہ صحبت رہی اور جب شیخ نظام الدین اولیاؒ وہاں پہنچے تو اُن کی شان میں بھی ایک مجلس منعقد کی گئی تھی۔[3] شیخ ابوبکر طوسیؒ کے مرید حیدری قلندر کہلاتے تھے وہ سفید کپڑے پہنتے اور شاہباز سفید کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔[4] وہ لوہے کے ہار انگوٹھیاں اور کڑے بھی پہنا کرتے۔ وہ اپنے ساتھ تیز دھار کے ہتھیار اور اُسترے وغیرہ بھی رکھا کرتے تھے۔[5]

قلندریہ سلسلہ کے ایک اور اہم بزرگ حضرت لعل شہباز قلندرؒ تھے۔ ان کا اصلی نام میر سید عثمانؒ تھا۔[6] وہ شیخ الاسلام شیخ بہاءالدین زکریا ملتانیؒ کے خلفا میں سے تھے اور بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے۔ وہ لال لباس پہنا کرتے تھے۔ سینکڑوں ھزاروں لوگ ان کے مرید تھے۔ ان کا وصال ۶۷۳ھ میں ہوا اور اُن کا روضۂ اقدس سیہون صوبہ سندھ میں ہے جہاں اُن کا عُرس مبارک ہر سال بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔[7]

---

[1] اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۱۴۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۲۷

[2] اخبار الاخیار ص ۴۳ [3] ایضاً [4] سیر العارفین ص ۶۷

[5] Professor. M. Habib, Chishti Mystics Records of the Sultanate Period, Medieval India Quarterly, Vol. I, No. 2, October. 1950.

[6] خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۳۴۶ ۔ ۴۷ [7] ایضاً

مگر قلندریہ سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت کا کام صحیح معنوں میں قطب الدّین بینائے دلؒ اور اُن کے جانشینوں اور خلفاء کا مرہونِ منّت ہے[1] آئندہ صفحات میں ہم حضرت مخدوم قُطب الدّین بینائے دِلؒ، اُن کے صاحبزادوں اور اُن کے خلفاء کا ذِکر کریں گے جو شرقی عہد میں ہوئے اور جنھوں نے اِس سلسلہ کی بنیادوں کو نہ صرف مضبوط و استوار کیا بلکہ دُور دُور تک پھیلا دیا۔ فی الحقیقت قلندریہ سلسلہ کی داغ بیل بھی اس برصغیر ہند و پاکستان میں عہدِ شرقی کے جونپور ہی میں پڑی اور یہیں پھلی پھولی۔

---

[1] تجلّیِ نور جلد اوّل ص ۶۳-۶۵

باب ۲ دوم

شیخ قطب الدین بینائے دِل قلندرؒ

شیخ قطب الدین بینائے دِل قلندرؒ پیدائشی قلندر تھے[1] وہ مولانا رکن الدین بابک لکھیؒ کے خاندان سے تھے[2] اور اُن کا شجرۂ نسب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے مِلتا ہے[3]۔

وُہ نابینا پیدا ہوئے لیکن نُورِ باطن سے ہر چیز کو دیکھ اور سمجھ لیتے تھے۔ جب ان کا دِل نُورِ الٰہی سے منور ہو گیا تو آنکھوں کا کام دل سے لیا کرتے تھے اِس لیے بینائے دِل کے لقب سے مشہور ہوئے[4]۔ کہا جاتا ہے کہ ذکرِ جہر کی کثرت سے بعد میں اُن کی دونوں آنکھوں میں روشنی آگئی تھی۔

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ ان کو حضرت شاہ خضر رومیؒ کا مرید لکھتے ہیں[5] لیکن ملبع الانساب؛ اصول المقصود اور تجلّی نُور کے مصنفین ان کو حضرت سیّد نجم الدین غوث الدہر قلندرؒ کا مرید لکھتے ہیں[6]۔ شاہ عبد الرحمٰن لاہر پوری لکھتے ہیں کہ " شاہ خضر رومیؒ نے ہی سیّد نجم الدین غوث الدہرؒ کو اشارہ کیا تھا کہ فلاں جگہ ایک نابینا بچّہ ہے جو کون و مکان کی خبریں رکھتا ہے، اور قلندریہ سِلسلہ کا رواج اس ملک میں اُسی سے ہوگا۔ چنانچہ ایک بار وہ سیر کرتے ہوئے جونپور کی طرف آئے اور جب موضع سُرہرپور[7] پہنچے تو اُن کو گاؤں سے باہر بچّوں کے ساتھ

---

۱ اصول المقصود (قلمی) ورق ۱۳۱ ا

۲ اصول المقصود ایضاً ورق ۱۲۸ ا

۳ تجلّی نور جلد اوّل ص ۶۴

۴ تجلّی نور جلد اوّل ص ۶۳

۵ اخبار الاخیار ص ۴۹ - ۵۰

۶ ملبع الانساب (قلمی) ورق ۱۶۸ ا

۷ سُرہرپور ضلع فیض آباد میں ہے۔

کھیلتے ہوتے دیکھا۔ اُن کو دیکھتے ہی وہ مُسکرائے اور پھر کہا کہ میرا یہاں آنا اسی بچّے کی تربیت کے لیے ہُوا ہے۔ بالآخر انھوں نے اُن کو توجّہ باطنی سے سرفراز کیا، پھر اس کے بعد وہ کچھ عرصہ وہاں ٹھہرے رہے اور جب اُن کی تربیت مکمل ہو گئی تو قلندریہ سلسلہ کی تمام امانتیں اُن کے سپرد کر کے واپس چلے گئے[1]۔ اس کے بعد شیخ قطب الدین بینائے دلؒ اذکار و اوراد اور مراقبات و ریاضات میں منہمک رہے اور جب منزلِ مراد کو پہنچے تو جونپور چلے گئے اور اپنے سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت میں مشغول ہو گئے[2]۔

اُن کو شیخ عبداللہ شطاریؒ سے بھی بڑا رُوحانی فیض حاصل تھا[3]۔ وہ بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ مسندِ قُطبی اور مرتبۂ غوثیت سے سرفراز تھے[4]۔ اور اپنی کرامات کی وجہ سے بڑے ہردلعزیز تھے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ان کی مجلس میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ انھوں نے اپنے ایک خادم سے کہا کہ قصیدہ بُردہ پڑھو۔ خادم نے ابھی چند ہی اشعار پڑھے تھے کہ وجد میں آگئے۔ ان کے ساتھ اہلِ مجلس میں بھی جوش و خروش پیدا ہو گیا اور ان میں سے کئی ایک وجد و مستی میں نعرے لگانے لگے۔ چنانچہ اس روز ان کے فیضِ رُوحانی سے بے شمار لوگ مستفیض ہوئے[5]۔ اس مجلس میں ایک صاحب ایسے بھی تھے جو مرضِ برص میں مُبتلا تھے۔ وہ روتے ہوتے اُن کے پاس حاضر ہُوئے، چنانچہ اس پر انھوں نے ایسی نظرِ توجّہ ڈالی کہ وہ بالکل تندرست ہو گئے[6]۔ کہا جاتا ہے کہ اب بھی جونپور کے لوگ چاول پکا کر اس میں دہی شکر ملا کر ان کے نام کی فاتحہ دیا کرتے ہیں اور جو مریض بھی ان چاولوں کو کھاتا ہے وہ تندرست ہو جاتا ہے[7]۔

---

[1] اصُول المقصود ایضاً ورق ۲۸ ب، تجلّی نور جلد اول ص ۶۳-۶۴۔ لیکن تجلّی نور کے مصنف لکھتے ہیں کہ ان کی ملاقات جونپور میں ہوئی اور اصُول المقصود کے مصنّف لکھتے ہیں کہ ان کی ملاقات سُرہرپور میں ہوئی۔

[2] اصُول المقصود (ورق) ۳۰ و   [3] تجلّی نور جلد اوّل ص ۶۳

[4] ایضاً ص ۶۴   [5] ایضاً   [6] ایضاً   [7] ایضاً

شیخ بنیاتے دل کی تاریخ پیدائش ۷۷۶ھ/۱۳۷۴ - ۱۳۷۵ء اور تاریخ وصال ۹۲۵ھ/۱۵۱۹ - ۱۵۲۰ء ہے[۱]۔ انھوں نے ۱۴۹ سال کی لمبی عمر پائی۔ ان کا یومِ پیدائش بعض کے نزدیک ۲۴ شعبان اور بعض کے نزدیک ۲۵ شعبان ہے[۲]۔ ان کا مزارِ اقدس جونپور شہر کے محلّہ جوگیا میں ہے جو الن پورا اور شیخ پور کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ان کا مزار شریف جیل خانہ کی شمالی دیوار کے قریب واقع ہے جہاں اُن کا عُرس مبارک ہر سال ۲۵ شعبان کو بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا ہے[۳]۔ کہا جاتا ہے کہ وصال سے تین روز پہلے وہ بخار میں مبتلا رہے۔ تیسرے روز جب نمازِ مغرب کا وقت ہوا تو نماز کی نیت باندھی اور جب سجدہ میں گئے تو اللہ کو پیارے ہو گئے[۴]۔

اُن کے دونوں صاحبزادے شیخ محمّد قطب قلندرؒ اور شیخ محمود قطب قلندرؒ بھی بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ وہ دونوں ان ہی کے مرید و خلیفہ تھے[۵] اور ان کے خاندان کے لوگ اب تک محلّہ جوگیا میں آباد ہیں۔

شیخ بنیاتے دل قلندرؒ کے بے شمار خلفاء تھے، جن میں سے سیّد فضل اللہؒ المعروف سید گوشاہینؒ، قطب منیریؒ، شاہ داؤد سرمستؒ، شاہ نصیر قلندرؒ، شاہ عمادؒ اور شاہ نظام الدین قلندرؒ بہاری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[۶]۔ مؤخر الذکر ان کے بھانجے تھے اور بڑی ذی مرتبت بزرگ تھے۔ انھوں نے قصیدۂ کبریٰ کی شرح صراطِ مستقیم کے نام سے لکھی تھی جو بڑی عُمدہ تحریر تھی[۷]۔ ان کا زیادہ تر تعلق سلطان حسین شرقی کے

---

[۱] اصول المقصود (قلمی) ورق ۳۱ ب۔ مگر تجلیٔ نور کے مؤلف جلد اول ص ۶۵ پر ان کا سالِ وصال ۸۸۰ھ/۱۴۷۵ - ۱۴۷۶ء لکھتے ہیں۔

[۲] اصول المقصود ایضاً ورق ۳۱ ب

[۳] تجلیٔ نور جلد اول ص ۶۳

[۴] ایضاً

[۵] اصول المقصود (قلمی) ورق ۳۵ ب، تجلیٔ نور ایضاً ص ۶۵

[۶] اصول المقصود ایضاً ۳۳ ب تا ۳۵ ب

[۷] ایضاً ورق ۳۳ ب۔ اُن کا روضۂ اقدس عظیم آباد اور منیر کے درمیان ذخیرہ میں ہے۔

کے عہد سے رہا۔ اُن کے ایک اور خلیفہ سید وجیہ الدین چشتی قادریؒ تھے جو مدت دراز تک جوگیوں، سنیاسیوں اور بیراگیوں کے ساتھ پھرتے رہے لیکن جب وہ شیخ بینائے دل سے ملے تو اسرارِ قلندریہ سے سرفراز ہوتے اور پھر سمندرِ توحید لقب پایا۔ ان کا مزار شریف بہار شریف کے گرد و نواح میں ہے[1]۔ اُن کے ایک خلیفہ عبداللہ جونپوریؒ تھے جن کے ایک نامور خلیفہ وجیہ الدین قلندرؒ تھے۔ اسی طرح مؤخر الذکر کے ایک نامور خلیفہ حیدر قلندرؒ بڑے صاحبِ مراتب بزرگ گزرے ہیں[2]۔

---

[1] اصول المقصود (قلمی) ورق ۲۴ ب

[2] ایضاً ورق ۲۴ ب۔ اُن کے دُوسرے بے شمار خلفاء تھے۔ اُن کے حالات کے لیے اصول المقصود خاص طور پر ملاحظہ ہو۔

باب سوم

شیخ قطب الدین بینائے دل قلندرؒ کے خلفاء

شیخ محمد قطب قلندرؒ

شیخ محمد قطب قلندرؒ مخدوم شیخ قطب الدین بینائے دل قلندرؒ کے فرزند اور خلیفہ تھے۔[1] اُنھوں نے بچپن ہی سے علوم ظاہری و باطنی پر عبور حاصل کر لیا تھا اور بڑے عالم و فاضل تھے۔ قلندریہ سلسلہ کے علاوہ انھیں سلاسل علویہ، طیفوریہ، چشتیہ، قادریہ، فردوسیہ اور سہروردیہ کی بھی خلافت و اجازت حاصل تھی۔[2] وہ اپنے والد بزرگوار کے وصال کے بعد سجادہ نشین ہوئے اور انھوں نے جو کچھ بھی اُن سے پڑھا یا سیکھا اس پر باقاعدہ عمل پیرا رہے۔ وہ ان کے بڑے شانہ بردار تھے۔ ہمیشہ عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے، بعض اوقات حالتِ سکر میں بھی پائے جاتے۔ وہ بہت صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے[3] اور اس دَور کے جید علماء اور عظیم المرتبت صوفیاء میں شمار ہوتے تھے۔ وہ شیخ محی الدین ابن العربیؒ کے متبعین میں سے تھے۔ مسئلہ توحید کو بڑی اچھی طرح سمجھتے اور سمجھاتے تھے۔ اس کے بیان میں بڑی عمدہ تقریر فرماتے اور کہا کرتے تھے کہ مجھے ابتدائے حال میں صرف دو دلائل کی وجہ سے ہی اس مسئلہ پر یقین پیدا ہو گیا تھا اور اب میں اس کے حق میں سولہ دلائل پیش کر سکتا ہوں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہماری درویشی میں دو چیزیں بے حد لازمی ہیں۔ ایک تہذیبِ اخلاق اور دُوسرے اہلِ بیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت۔[4]

---

[1] اصول المقصود (قلمی) ورق ۲۵ ب تجلی نور جلد اول ص ۶۵ [2] اصول المقصود ایضاً
[3] ایضاً تجلی نور ایضاً [4] تجلی نور ایضاً

اُن کے خرمنِ کمال سے سینکڑوں نے روحانی فیض حاصل کیا۔ ان کا وصال نوّے سال کی عمر میں ۹ ذی القعد کو ہوا مگر سالِ وصال معلوم نہیں ہو سکا۔ ان کا مزار جونپور میں اُن کے والدِ بزرگوار کے مزارِ اقدس کے برابر ہے۔[۱]

شاہ نصیر قلندرؒ

شاہ نصیر قلندرؒ مخدوم قطب الدین بینا۔ دلؒ کے بھتیجے اور داماد تھے اور انہی کے مرید و خلیفہ تھے۔[۲] ان کا شمار جونپور کے عظیم المرتبت مشائخ میں ہوتا ہے۔ پہلے انھوں نے سلسلۂ قلندریہ میں خرقۂ خلافت حاصل کیا لیکن بعد میں طریقِ ملامتیہ اختیار کر لیا اور پھر اس میں بھی خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اِس قدر عبادت و ریاضت کی کہ اپنے دَور کے شیخ الشیوخ اور قطب الاقطاب مانے گئے۔[۳] پہلے وہ جونپور ہی میں رہ کر تش پذیر تھے لیکن بعد میں اپنے پیر کے حکم کے مطابق پرگنہ ماہل کے قصبہ ننگو چلے گئے اور وہیں ۲۵ جمادی الاوّل ۹۱۵ھ / ۱۵۰۹-۱۰ء کو وصال فرمایا۔ ان کا مزارِ اقدس بھی وہیں ہے۔[۴]

اُن کے بیٹے اور خلیفہ شاہ نور قلندرؒ بھی بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے۔[۵] مفتاح العاشقین میں ہے کہ جب اُن کے والدِ بزرگوار نے اُن کے مرتبہ کو سمجھا تو فرمایا "دو آفتاب ایک جگہ نہیں رہ سکتے اس لیے وہ قصبہ سرھر پور ضلع فیض آباد چلے گئے اور وہیں وصال کیا۔[۶]

۱؎ تجلیِ نور، جلد اوّل ص ۶۳ اصول المقصود (قلمی) ورق ۳۵ ب ۳۶ ا ۲؎ ایضاً ورق ۳۴ ب، تجلیِ نور جلد اوّل ص ۶۵-۶۶ ۳؎ تجلیِ نور ایضاً ص ۶۶ ۴؎ ایضاً ص ۶۶

۵؎ اصول المقصود ایضاً اخبار الاخیار (ص ۱۸۷) میں بھی ایک بزرگ شاہ نورؒ کا ذکر ہے وہ اُن سے مختلف ہیں، وہ شاہ داؤدؒ سرمست کے مرید و خلیفہ تھے جن کے ایک خلیفہ شیخ پیرکؒ تھے اور جن کا مزار شہر انبالہ میں ہے درحقیقت وہ شاہ نورؒ ثانی کہلاتے ہیں اور ان کا مزار ٹانڈہ میں ہے۔ ۶؎ اصول المقصود ایضاً

شاہ نصیر قلندرؒ کے خاندان کے لوگ اب تک جونپور کے محلہ چتر ساری مواضع نیگو، لُونر پور، حافظ پور اور کچھوچھہ میں آباد ہیں[1]۔ ان کا آبائی سلسلہ مولانا رکن الدین یک لکھی ظفرآبادیؒ سے وابستہ ہے[2]۔

شاہ عبدالسّلام قلندرؒ

شاہ عبدالسّلام قلندرؒ، شیخ الن قلندرؒ کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ وہ اپنے والدِ بزرگوار شیخ محمد قطب قلندرؒ ہی کے مرید و خلیفہ تھے اور علاوہ ازیں انھیں اپنے جدِّ امجد مخدوم قطب الدّین بینائے دل قلندرؒ سے بھی بڑا روحانی فیض حاصل تھا۔ سلسلۂ سہروردیہ میں انھوں نے شیخ اڈّھن ظفرآبادیؒ، صاحب سجادہ حضرتِ مخدوم چراغِ ہندؒ سے بھی خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا[3]۔

وہ اِس دَور کے مشہور دانش وَر اور جونپور کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے۔ عربی زبان میں ان کی ایک تصنیف "شرح مختصر الوقایہ" بڑی مشہور ہے[4]۔ اصُول المقصود کے مصنّف لکھتے ہیں کہ ایک بار شیخ محمد غوث گوالیاریؒ اُن کے پاس جونپور آئے اور عرض کیا کہ میں نے شیر شاہ سُوری کی ہلاکت کے لیے کچھ الفاظ کہے ہیں۔ ان کا اثر ان کے لشکر پر تو ہُوا ہے لیکن بادشاہ پر کوئی اثر نہیں ہُوا۔ انھوں نے فرمایا "فلاں وقت بادشاہ بھی ہلاک ہو جائے گا" چنانچہ بعد میں ایسے ہی ہُوا[5]۔ فی الواقعہ وہ بڑے صاحبِ کمالات و کرامات بزرگ تھے۔ اُن کا وصال ۴ر جمادی الثّانی کو ہوا مگر سالِ وصال معلوم نہیں ہو سکا[6]۔

ان کے بے شمار خلفاء تھے جن میں شاہ عبدالرحمٰن لاھدپوریؒ جد کلاں شاہ مجاز

---

[1] اصُول المقصود (قلمی) ورق ۲۴ ب تجلّیٔ نُور جلد اوّل ص ۶۶۔ چتر ساری جونپور شہر کا ایک محلہ ہے اور نیگو ضلع اعظم گڑھ میں حافظ پور ضلع میں اور کچھوچھہ ضلع فیض آباد میں ہیں۔ [2] تجلّیٔ نُور ایضاً

[3] تجلی نور ایضاً ص ۶۶۔۶۷ [4] ایضاً ص ۶۷

[5] اصول المقصود (قلمی) ورق ۳۶ ب۔ ۳۷ و [6] تجلّی نور ص ۶۷

قلندرؒ اور شاہ محمود قلندرؒ لکھنوی بڑے ذی مرتبت بزرگ تھے۔[۱] شاہ عبدالرحمٰنؒ نے چودہ سال کی ہی عمر میں تمام علومِ ظاہری و باطنی پر عبور حاصل کرلیا تھا۔[۲] وہ دہلی گئے اور چند کتابیں وہاں کے مشہور اساتذہ سے بھی پڑھیں۔ ان کی ملاقات سلطان سکندر لودھی سے بھی ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے واپس وطن آکر درس و تدریس اور وعظ و تلقین کا سلسلہ شروع کیا۔[۳] شاہ محمود قلندرؒ اگرچہ شاہ عبدالرحمٰن لاہرپوریؒ کے مریدوں اور دوستوں میں سے تھے مگر خرقۂ خلافت انھوں نے شاہ عبدالسلام قلندرؒ سے ہی حاصل کیا تھا۔ وہ علومِ ظاہری کے متبحر عالم تھے اور ریاضاتِ عالیہ اور مجاہداتِ شاقہ میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔[۴] شیخ نظام الدین امیٹھویؒ سالہا سال تک اُن کی خدمت میں رہے تھے۔[۵] شاہ عبدالرزاقؒ بن مخدوم خاصۂ خداؒ بھی شاہ عبدالسلام قلندرؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ جب وہ انھیں جونپور (۹۷۵ھ میں) میں ملنے گئے تو اس وقت ان کی عمر ۱۵۰ سال کے قریب تھی۔[۶] شیخ سلطان محمودؒ جو شیخ محمود جونپوریؒ کی والدہ کے دادا اور مخدوم سید علی عاشقاں کے علاوہ مخدوم ادھن جونپوریؒ کے خلیفہ تھے، وہ بھی قلندریہ سلسلہ میں شاہ عبدالسلام کے مرید و خلیفہ تھے۔[۷]

جونپور کے ایک مشہور قلندر شاہ عبدالقدوسؒ، جو شاہ قدنؒ کے نام سے بھی مشہور ہیں، اور جو حضرت شاہ عبدالسلام قلندر کے فرزند و خلیفہ اور مخدوم قطب الدین بینائے دلؒ کے نبیرہ تھے وہ بھی بڑے زاہد و متقی اور عالی مرتبت بزرگ تھے۔ وہ ذاتِ الٰہی کے والہانہ عاشق تھے اور سوائے یاد اللہ کے اور کوئی کام نہ کرتے تھے۔ رزقِ حلال کے سلسلہ میں بڑی احتیاط برتتے۔ روزانہ گھاس کھود کر بازار میں فروخت کرتے اور اس سے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ ان سے حضرت میر علی قوام نظام آبادیؒ اور حضرت دیوان عبدالرشیدؒ

---

۱ تجلی نور جلد اول ص ۶۷۔ اصول المقصود (قلمی) ورق ۳۷ ا۔ب ۲ ایضاً ورق ۳۷ و

۳ اصول المقصود ایضاً ورق ۳۷ ا۔ب اُن کا وصال ۱۲ ذی الحجہ ۹۷۶ھ کو ہوا اور روضۂ مبارک لاہرپور میں ہے۔

۴ ایضاً ورق ۳۷ ب

۵ ایضاً ورق ۳۶ ب

۶ ایضاً ورق ۳۶ ب

۷ ایضاً ورق ۳۷ ب ۳۸ و۔ اُن کا وصال ۱۵ شعبان ۹۹۷ھ کو ہوا تھا، وہ بھی جونپور میں دفن ہیں۔

کو بڑا رُوحانی فیض حاصل تھا۔ ان کا وصال ۱۲ شوال ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲-۱۶۴۳ء کو ہوا اور ان کا روضۂ اقدس جونپور کے محلہ جوگیا پور میں ہے[1]

مخدوم قطب الدین بینائے دل قلندرؒ کی اولاد میں سے ایک شاہ فتح قلندرؒ بھی بڑے صاحبِ مراتب بزرگ تھے[2]۔ وہ شیخ عبدالقدوس قلندرؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ تاہم ان کو شاہ عبدالرحمٰن لاھرپوریؒ سے بھی بڑا رُوحانی فیض حاصل تھا[3]۔ وہ اوائلِ عمر میں مجذوبانہ حالت میں بادیہ گردی کرتے رہے اور اسی شوریدہ حالت میں ایک دفعہ دھلی پہنچ گئے جہاں شہزادہ دارا شکوہ کے ساتھ ان کا علم سلوک و معرفت میں بحث و مباحثہ ہوگیا[4]۔ اس کے بعد پھر وہ جونپور گئے اور بالآخر اپنے پیرو مُرشد کے حکم کے مطابق جونپور میں پرگنہ انگلی کے موضع سونگر میں رہنے لگے لیکن بعد میں انھوں نے ضلع اعظم گڑھ کے پرگنہ نظام آباد میں قلندر پور نام کا ایک گاؤں بسایا اور پھر مستقل طور پر وہیں رہائش کرلی۔ قلندر پور اور اس کے گرد و نواح کے دیہات کے بے شمار لوگ اُن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ اُن کے خاندان کے لوگ اب تک وہاں آباد ہیں[5]۔ لیکن اُن کا سالِ وصال دریافت نہیں ہوسکا۔

شاہ داؤد سرمست سرہرپوریؒ

شاہ داؤد سرمستؒ مخدوم قطب الدین بینائے دلؒ کے مرید و خلیفہ تھے[6]۔ اور شہر جونپور کے قریب قصبہ سرہرپور میں رہا کرتے تھے۔ اُن کو شاہ عبداللہ شطاریؒ سے بھی

---

[1] تجلّیِ نور جلد اوّل ص ۶۷-۶۸۔ اصول المقصود (قلمی) ورق ۴۲ ا-۴۳ ب۔ اصُول المقصود کے مصنّف نے ان کی تاریخِ وصال ۲۹ ذی قعدہ ۱۰۹۱ھ لکھی ہے۔

[2] تجلّیِ نور جلد اوّل ص ۶۸

[3] ایضاً۔ لاہرپور خیرآباد کے قریب ضلع سیتاپور کا ایک قصبہ ہے۔

[4] ایضاً ص ۶۸-۶۹

[5] ایضاً ص ۶۹

[6] اخبار الاخیار ص ۱۸۶-۱۸۷

بڑا روحانی فیض حاصل تھا۔[1] شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ ایک بار شاہ عبداللہ شطاریؒ تبلیغی دورہ پر اس علاقہ میں گئے تو ہر طرف سے لوگ ان کی زیارت کے لیے جوق در جوق پہنچے۔ جب شاہ داؤدؒ کو اُن کی عظمت و شہرت کا علم ہوا تو وہ بھی ان کی زیارت کے لیے گئے۔ شاہ عبداللہؒ کا معمول تھا کہ وہ اپنی رہائش گاہ کے دروازہ پر ہمیشہ کسی دربان کو رکھتے تھے تاکہ کوئی شخص بغیر اجازت کے اندر نہ آئے۔ جب وہ اندر جانے لگے تو دربان نے اُن کو بھی منع کیا لیکن وہ دربان کو گرا کر پاؤں اُس کے سینے پر رکھتے ہوئے اندر گھس گئے اور شاہ عبداللہؒ کی کرسی پر جا بیٹھے۔ شاہ عبداللہؒ ان کے ساتھ بڑے احترام سے پیش آئے۔ بہرحال جب مجلس شروع ہوئی تو اس موقعہ پر شاہ عبداللہؒ کے ایک خادم نے اُن سے کہا کہ "کوئی بے ادب خدا تک نہیں پہنچ سکا"۔ شاہ داؤدؒ نے جواب دیا "بلکہ کوئی شخص ادب کے ساتھ خدا تک نہیں پہنچ سکتا"۔ اُن سے پوچھا گیا کہ ان کی اس بات کا مطلب کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ اگر میں ادب کرتا اور دربان کو راستے سے ہٹا کر نہ آتا تو آپ تک کیسے پہنچ پاتا اور پھر کس طرح خدا کا راستہ ڈھونڈتا۔ جب عشق وارد ہوتا ہے تو ادب چلا جاتا ہے۔ شاہ عبداللہ کو اُن کی یہ بات پسند آئی اور انھوں نے ان پر بڑی عنایات کیں۔[2]

وہ بڑے صاحبِ کمال و کرامات بزرگ تھے۔ اُن کا روضۂ اقدس شہر ہرپور میں مرجع خلائق ہے۔[3] ان کے ایک خلیفہ شاہ نورؒ بھی بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے۔ ان کا روضۂ مبارک بھی سرہرپور میں زیارت گاہِ خلائق ہے۔[4] انھی شاہ نورؒ کے بیٹے اپنے زمانہ

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۸۶، ۱۸۷ [2] ایضاً ص ۱۸۶ - ۱۸۷ مرآۃ الاسرار (قلمی)
ورق ۴۹۸ ب، اصول المقصود (قلمی) ورق ۳۴ اب
[3] مرآۃ الاسرار ایضاً ۴۹۸ ب
[4] مرآۃ الاسرار ایضاً

ہیں فقراء کی مہمان نوازی کے لیے بہت مشہور تھے[1]۔ شاہ داؤد سرمستؒ کے ایک اور خلیفہ شاہ نور ثانیؒ بھی بڑے پایہ کے درویش تھے[2]۔

شاہ نور ثانیؒ

شاہ نور ثانیؒ شاہ داؤد سرمستؒ کے مرید و خلیفہ تھے اور بڑے صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے۔ پہلے وہ کپڑا بُننے کا کام کیا کرتے تھے[3]۔ لیکن بعد میں سب کچھ چھوڑ کر دُنیا سے تصوّف میں گُم ہوگئے۔ ان کا روضۂ اقدس ٹانڈہ میں مرجعِ خلائق ہے[4]۔

شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ اُن کا شاہ داؤد سرمستؒ کے مرید ہونے کا واقعہ لکھتے ہیں کہ پہلے شاہ داؤدؒ کے ایک خلیفہ شاہ نور (اوّل) تھے۔ وہ اوائلِ عمر ہی سے عباداتِ عالیہ اور ریاضاتِ شاقہ کے بڑے شائق تھے اور ہمیشہ اُن کی خدمت میں رہا کرتے تھے لیکن بعد میں وہ اُن کی خدمت میں تساہل برتنے لگے۔ شاہ داؤدؒ کو اُن کا یہ انداز ناگوار گزرا اور اُن سے ایک روز کہا کہ اگر تم میری خدمت ٹھیک طرح نہیں کروگے تو میں کوئی اور شاہ نور ڈھونڈ لوں گا۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیے اور ٹانڈہ پہنچ گئے[5]۔ وہاں اس وقت شاہ نور ثانیؒ کپڑا بُن رہے تھے۔ وہ ان کے سر پر جا کھڑے ہوتے۔ وہ اپنی قوّتِ باطن سے ان کے جوہرِ استعداد کو سمجھ گئے اور کہا "بابا کب تک لکڑی پر لکڑی مارتے رہو گے اس سے بہتر کوئی اور کام کرو۔" چنانچہ وہ اسی وقت اُن کے مرید ہوگئے اور سب کچھ چھوڑ کر ان کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ پھر انھوں نے ایک عرصہ تک مجاہداتِ عالیہ اور ریاضاتِ شاقہ کیں اور بالآخر خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوتے اور اس کے

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۸ ب
[2] ایضاً ورق ۴۹۸ ب ۴۹۹ ا
[3] اخبار الاخیار ص ۱۸۷، مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۸ ب
[4] ایضاً ورق ۴۹۹ ا
[5] ایضاً ورق ۴۹۸ ب

بعد تا دمِ مرگ ٹانڈہ ہی میں وعظ و تلقین کرتے رہے[1]۔

اُن کے ایک بزرگ خلیفہ شیخ پیرکؒ تھے۔ وہ بڑے عظیم المرتبت درویش تھے۔ پہلے وہ شیخ یوسف قتالؒ کے مرید تھے لیکن بعد میں اُن کی رُوحانی تربیت انھوں نے کی اور خرقۂ خلافت بھی عنایت فرمایا تھا۔ وُہ بہلول لودھی کے زمانہ سے لے کر بادشاہ اکبر کے اِبتدائی دور تک زندہ رہے اُن کا روضۂ اقدس انبالہ میں ہے[2]۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۸۷

[2] ایضاً ص ۱۸۷-۱۸۸- مرآۃ الاسرار ایضاً ورق ۴۹۹ ا

حصہ ہشتم

باب اوّل

مداریہ سلسلہ

مداریہ سلسلہ کی بنیاد بھی برصغیر ہندو پاکستان میں دورِ شرقی ہی میں رکھی گئی۔ اس سلسلہ کے پیروکار شاہ مدارؒ کے چیلے کہلاتے ہیں جو اکثر گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کا ایک شغل یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ڈھول ڈھمکوں کی تھاپ پر "دم مدار" کا نعرہ لگاتے ہوئے جلتی آگ میں سے گزر کر ناظرین کو متاثر کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ مداری چیلے سُلطان الشہید سالار مسعود غازیؒ کے پیروکار ہوتے ہیں۔ جو ایک روایت کے مطابق اپنی شادی کے روز بڑے ہولناک طریقہ سے شہید کر دیے گئے[1]۔ ان کا مزار بہرائچ میں ہے لیکن حقیقتِ حال یہ ہے کہ مداری حضرت شاہ بدیع الدّین مدارؒ کے چیلے ہیں جو صوفیانہ مسلک کے مطابق شام سے ہندوستان آئے اور انھوں نے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہد میں اس سلسلہ کی سب سے پہلی خانقاہ مکن پور[2] میں آباد کی۔ یہیں سے وہ اکثر اپنے سلوک کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مذہبی دوروں پر ملک کے مختلف حصّوں میں جایا کرتے تھے[3]۔

---

[1] ان کو سلطان محمود غزنوی کا بھانجا یا بھتیجا منسوب کیا جاتا ہے ان کی پیدائش ۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء میں اجمیر شریف میں ہوئی اور ان کی شہادت ہندوؤں کے ساتھ جنگ و جدل میں بہرائچ میں ۴۲۴ھ/۱۰۳۳ء میں ہوئی جہاں اُن کا مزار مرجع خلائق ہے تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو:

C.A. Storey, Persian Literature-Vol. 1, Part. 2, pp. 1006-1007.

ان کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو "امام محمودی" از قاضی محمود کنتوریؒ "لطائفِ اشرفی" "گلزارِ ابرار" "اخبار الاخیار" "سفینۃ الاولیاء" "کلمۃ الصادقین" "آئینِ اکبری" "خزینۃ الاصفیاء" "غازی نامہ مسعود (اُردو) از عنایت حسین بلگرامی کانپور ۱۸۷۶ء وغیرہ وغیرہ

[2] مکن پور ضلع کانپور میں ہے

[3] مرآۃ مداریہ (قلمی)

بعض لوگوں کی رائے ہے کہ شاہ مدارؒ ایک روایتی شخصیت ہیں کیونکہ اُن کے بعض حقائقِ زندگی غیر یقینی معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کے حالاتِ زندگی صرف مرآۃ مداریہ میں ملتے ہیں[1]۔ جس کا مواد زیادہ تر "امامِ محمودی[2]" اور لطائفِ اشرفی سے لیا گیا ہے لیکن اس قلمی نُسخہ میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن کو زیادہ تاریخی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ ہم نے بڑی تحقیق کے بعد شاہ مدارؒ کی زندگی کے مختصر حالات اور عہدِ شرقی کے اِس سلسلہ کے چند بزرگوں کے حالات جمع کیے ہیں، جو آئندہ صفحات میں پیشِ خدمت ہیں۔

---

[1] مصنفہ شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ
[2] ان کی سوانح عمری جو ان کے خلیفہ قاضی محمود کنتوریؒ نے نکن پور میں ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۴ء میں لکھی تھی۔

شاہ بدیع الدین مدارؒ

شاہ مدارؒ ۷۱۵/۱۳۱۵-۱۳۱۶ء میں شام کے شہر حلب میں پیدا ہوئے[۱]۔ اُن کے والدِ بزرگوار شیخ علی حلبی یہودی النسل تھے[۲]۔ اُن کا طالب علمی کا زمانہ زیادہ تر مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور نجف اشرف میں گزرا۔ وہ علومِ ظاہری کے بہت زبردست عالم تھے[۳]۔ کہا جاتا ہے کہ وہ توریت اور انجیل کے حافظ تھے[۴]۔ شیخ محمد عارف طیفوریؒ کے مرید و خلیفہ تھے[۵]۔ اور ہند و پاکستان آنے سے پہلے بلادِ اسلامیہ کی بڑی سیاحت کر چکے تھے۔ بقول شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ انھوں نے ۲۵ سال شام میں، ۴۰ سال مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اور ۵۰ سال برصغیر ہند و پاکستان میں بسر کیے تھے[۶]۔

اِس برصغیر میں سب سے پہلے ان کا ورود گجرات میں ہوا۔ وہاں سے وہ اجمیر شریف پہنچے اور حضرت شیخ معین الدین چشتیؒ کے مزارِ اقدس کی زیارت سے مستفیض ہوئے[۷]۔

---

[۱] مرآۃ مداریہ (قلمی) ورق ۳ ا — [۲] ایضاً ورق ۳۶ ا

سفینۃ الاولیاء ص ۱۸۷۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہ یہودی النسل تھے اور اُن کے والد کا نام ابواسحاق تھا اور دُوسری روایت یہ ہے کہ وہ عرب تھے اور قبیلۂ قریش سے تھے۔ والد کی طرف سے اُن کا تعلق حضرت ابوہریرہؓ سے تھا اور والدہ کی طرف سے وُہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے رشتہ دار تھے جو دونوں صحابی تھے

A. Halim, J.A.S.P. Vol. VIII, No. 2, Dec. 1963, p. 76.

[۳] مرآۃ مداریہ ایضاً ورق ۴-۵-۶، اخبار الاصفیا (قلمی) ورق ۳۴ ب

[۴] آئینِ اکبری حصہ دوئم ص ۲۱۹ — [۵] آئینِ اکبری حصہ سوم ص ۳۱۲ Jarrett.

[۶] مرآۃ مداریہ (قلمی) ایضاً ورق ۳۲ ب — [۷] ایضاً ورق ۱۳ ا — [۸] خزینۃ الاصفیاء حصہ دوم ص ۳۱۱

پھر کالپی و قنوج گئے اور وہاں شیخ اخی راجگیریؒ سے ملے[1]۔ بالآخر مانکپور اور جونپور ہوتے ہُوئے مکن پور پہنچے جہاں انھوں نے سلسلۂ مداریہ کی سب سے پہلی خانقاہ آباد کی۔ اس خانقاہ کی تعمیر و ترقی میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے بھی خاطر خواہ مدد کی[2]۔

مکن پور میں جب انھوں نے مداریہ سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت شروع کی تو تھوڑے عرصہ میں لاتعداد لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد انھوں نے مذہبی دورے شروع کر دیے اور اس سلسلہ میں وہ جونپور، لکھنؤ، اودھ، کالپی، مانکپور اور صوبہ اودھ کے دُوسرے شہروں میں جاتے رہے جہاں ان کو اپنے مقصد میں بڑی کامیابی حاصل ہوتی اور ہزاروں لوگ اُن کے مرید ہو گئے۔ اُن میں سے بعض اسی دور کے جید علماء اور ذی مرتبت صوفیاء بھی شامل تھے۔ ایسے لوگوں میں قاضی شہاب الدین قدوائیؒ، شیخ قوام الدین لکھنویؒ، قاضی مظہرؒ، شیخ مینا لکھنویؒ اور قاضی محمود کنتوریؒ وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[3]۔ جونپور شہر کے جو لوگ ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہُوئے۔ وہ سید صدر جہاں اجملؒ، قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی تھے[4]۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ وہ بڑے عجیب و غریب اطوار و احوال کے مالک تھے اور اپنے دور کے بڑے عظیم المرتبت سالک تھے۔ انھوں نے بارہ سال تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ لباس بڑا سادہ رکھتے اور جو لباس ایک بار پہن لیتے وہ تب ہی اتارتے جب وہ پھٹ جاتا۔ ان کا چہرہ ہمیشہ روحانیت سے منوّر ہوتا اور اسے چھپانے

---

[1] مرآۃ مداریہ ایضاً ورق ۱۷ الف۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ان کا استقبال بڑے تزک و احتشام سے کیا اور بعد میں ان دونوں کی آپس میں خط و کتابت بھی رہی

[2] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۰ ب۔ مراۃ مداریہ ایضاً ورق ۱۷ الف۔ اخبار الاصفیاء (قلمی) ورق ۳۴ ب۔ آئینِ اکبری حصّہ دوم ص ۲۱۹

[3] مرآۃ مداریہ (قلمی) ورق ۱۴-۳۱، اخبار الاصفیاء (قلمی) ورق ۳۴ ب - ۳۵ الف۔ آئینِ اکبری حصّہ دوم ص ۲۱۹

[4] سیر الاولیاء ص ۲۱۷ ب۔ مرآۃ مداریہ (قلمی) ورق ۳۰ و ورق ۲۳-۲۴۔ خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۳۱۰

کے لیے وہ چہرے پر نقاب رکھتے۔ اگر کبھی کسی کی نظر اچانک ان پر پڑ جاتی تو وہ ان کے
حُسن و جمال سے ایسا متاثر ہوتا کہ فوراً خدا کے حضور سربسجود ہو جاتا۔[1]

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ بعض لوگ اُن کے سلسلہ کو پانچ چھ واسطوں سے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاتے ہیں۔ بعض مداری لوگ ان کا تعلق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ ملاتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ وُہ دائرہ شریعت و طریقت کے پابند نہ تھے۔[2] واللہ اعلم۔ شیخ عبدالرحمن چشتیؒ کے بقول ایک بار وہ اپنے سلسلہ کی تبلیغ کے لیے کالپی گئے تو بے شمار لوگ اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ جب ان کی شہرت و عظمت کی خبر قادر شاہ والیٔ کالپی کو ہوئی تو وہ بھی اُن کی زیارت کے لیے پہنچا۔ لیکن جب وہ اُن کی قیام گاہ کے دروازہ پر پہنچا تو خادموں نے اسے بتایا کہ شاہ مدارؒ سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اس وقت خلوت میں ایک جوگی کے ساتھ محوِ سخن ہیں۔ اور ان کا حکم ہے کہ کسی کو اندر آنے نہ دیا جائے۔ قادر شاہ بہت برہم ہوا اور کہا کہ ان سے کہہ دیں کہ وہ ہمارے شہر اور علاقے سے فوراً نکل جائیں۔ یہ حکم دے کر وہ چلا گیا۔ شاہ مدارؒ کو جب یہ پیغام ملا تو وہ بہت برگشتہ خاطر ہوئے مگر شہر کو چھوڑ کر دریا کے پار جا کر ڈیرے ڈال دیئے وہاں سے پھر انھوں نے قادر شاہ کے حق میں بد دعا کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے فوراً بعد قادر شاہ کے جسم پر چھالے نکل آئے اور وہ ان کی تپش اور جلن سے تڑپنے لگا۔ اسی حالت میں اس کو تین دن گزر گئے۔ جب وہ بالکل عاجز آ گیا تو شیخ سراج الدین حافظِ قرآنؒ کی خدمت میں پہنچا اور دُعا و علاج کی درخواست کی۔ شیخ سراجؒ نے انھیں اپنا پیراہن خاص مرحمت فرمایا جس کے پہننے سے اس کے جسم کے چھالے ٹھنڈے پڑ گئے اور وہ شفایاب ہو گیا۔ شاہ مدارؒ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس نے شیخ سراجؒ کی پناہ لے لی ہے تو وہ اور بھی

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۶۰، مراۃ مداریہ ایضاً ورق ۲۹ ا۔ سفینۃ العارفین (قلمی) ورق ۱۷۱

[2] اخبار الاخیار ص ۱۶۰

غصّے میں آگئے اور فرمایا "پس سراج چرا نہ سوخت۔" کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد شیخ سراجؒ کے جسم پر چھالے نکل آئے، جن کی حرارت سے ان کا بدن جلنے لگا یہاں تک کہ وہ جاں بحق ہو گئے اور اسی بنا پر وہ بعد میں سراج سوختہ کے لقب سے مشہور ہوئے[1]۔

اس کے بعد جب وہ جونپور پہنچے تو سلطان ابراہیم شاہ شرقی، قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ، سید صدر الدین اجملؒ اور بہت سے دوسرے لوگ اُن کے استقبال کے لیے آئے اور وہاں ان کی بڑی خاطر مدارات کی جونپور میں اُن کی قیام گاہ پر ہر وقت لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا اور وہاں بے شمار لوگ اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے[2]، اس کے بعد جب واپس مکن پور پہنچے تو ان میں اور قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ میں بعض مذہبی معاملات پر خط و کتابت اور بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ ان دونوں نے اپنے ایک خط میں شیخ سراج الدین سوختہؒ والے واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے[3]۔

شاہ مدارؒ جہاں بھی مذہبی دورہ پر جاتے وہاں لوگ ان سے بڑی عقیدت و محبت سے پیش آتے اور سینکڑوں اُن کے حلقۂ ارادت میں بھی شامل ہو جاتے حقیقت یہ ہے کہ انھیں اپنے مقصد میں بڑی کامیابی و شہرت نصیب ہوئی۔ اگرچہ وہ ہمیشہ لوگوں سے دُور رہنے کی کوشش کرتے مگر اس کے باوجود اُن کی خانقاہ میں لوگوں کا ایک جمگھٹا لگا رہتا۔ خاص طور پر سوموار کے روز بے شمار لوگ ان کی خانقاہ میں کھجوریں چکھنے کے لیے جمع ہو جایا کرتے۔ اس موقعہ پر اُن کا معمول ہوتا کہ اُن کو کوئی ایسی کہانی سناتے جس سے اُن میں سے ہر کوئی اپنے مطلب کے مطابق نصیحت اخذ کر لیتا[4]۔

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۰ ب۔ ۴۵۱ ا۔ خزینۃ الاصفیا جلد دوم ص ۶۸-۶۹
[2] سیر الاولیا۔ (قلمی) ورق ۲۱۷، مرآۃ مداریہ (قلمی) ورق ۳۰ او ۲۳-۲۴۔ خزینۃ الاصفیا، جلد دوم ص ۳۱۰
[3] اخبار الاخیار ص ۱۶۰
[4] مرآۃ مداریہ (قلمی) ورق ۳۵ ب۔ ۳۶ ا۔ سفینۃ العارفین ورق ۱۷ ا، آئین اکبری حصّہ دوم ص ۲۱۹

شاہ مدار نے بڑی لمبی عمر پائی اور ۱۲۵ سال کی عمر میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہد میں ۸۴۴ھ/۱۴۴۰-۱۴۴۱ء میں فوت ہوئے[1]۔ ان کا عالی شان روضہ مکن پور میں ہے جس کی عمارت کی تعمیر سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے ایک صاحبزادے نے کروائی۔ اس کا نام معلوم نہیں لیکن وہ سید صدر جہاں اجملؒ کے مریدوں میں سے تھا اور ان سے والہانہ عقیدت رکھتا تھا[2]۔ ان کا سالانہ عرس مکن پور میں ہر سال بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اور ہزاروں لوگ اس میں شریک ہوتے ہیں۔

شاہ مدارؒ نے ہزاروں کو روحانی فیض بخشا تھا۔ مرآۃ مداریہ کے مصنف لکھتے ہیں کہ ان کے ستر خلفاء تھے جنھوں نے سلسلۂ مداریہ کو برصغیر ہند و پاکستان میں دور دراز تک پھیلا دیا۔ ان کے چند مشہور خلفاء حسب ذیل ہیں: قاضی شہاب الدین قدوائیؒ، شاہ عالم مداریؒ، مسان شاہ مداریؒ، شاہ منا ماٹمہ دیؒ، قاضی محمود کنتوریؒ اور شیخ مینا لکھنویؒ۔[3] موخر الذکر کے حالات "صوفیائے لکھنو" کے ضمن میں بیان کر دیے گئے ہیں لیکن باقی خلفاء کے حالات کی تفصیلات دستیاب نہیں ہو سکیں۔ اس لیے ہم نے آئندہ صفحات میں صرف ان خلفاء کا ذکر کیا ہے جو صرف شہر جونپور میں اور عہدِ شرقی میں ہوئے۔

---

[1] مرآۃ مداریہ (قلمی) ص ۳۶ میں شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ ان کی تاریخ ولادت ۷۰۵ھ/۱۳۰۵-۱۳۰۶ء اور تاریخ وفات ۱۸ جمادی الاوّل ۸۴۴ھ/۱۴۴۰-۱۴۴۱ء لکھتے ہیں۔ خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۳۱۲ مفتی غلام سرور لاہوری ان کی تاریخ پیدائش ۷۱۶ھ/۱۳۱۶-۱۳۱۷ء اور سال وفات ۸۴۰ھ/۱۴۳۶-۱۴۳۷ء لکھتے ہیں۔

[2] مرآۃ مداریہ (قلمی) ورق ۳۵-۳۶۔ سفینۃ العارفین (قلمی) ورق ۱۷۱ ا۔ خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۳۱۲ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب

The Sharqi Sultanate of Jaunpur, A Political and Cultural History, p. 159.

[3] مرآۃ مداریہ (قلمی) ورق ۳۱۔ سیر الاولیاء (قلمی) ورق ۲۱۷ ب

باب سوم

شاہ بدیع الدین مدارؒ کے خلفا

شیخ صدرالدین ثابت مداریؒ

شیخ صدرالدین ثابت مداریؒ جونپور کے رہنے والے تھے اور حضرت شاہ مدارؒ کے مرید وخلیفہ تھے[1] علومِ ظاہری پر اُن کو مکمل عبور تھا اور بحیثیتِ عالم ان کو بڑی شہرت حاصل تھی۔[2] کہا جاتا ہے کہ حضرت شاہ مدارؒ جب پہلی بار تبلیغی دورے پر جونپور آئے تو سب سے پہلے شخص جو ان کے حلقہ عقیدت میں شامل ہوئے وہ آپ ہی تھے اور جب تک اُن کا قیام جونپور میں رہا وہ ان سے وابستہ رہے اور بے حد روحانی فیض سے مستفیض ہوئے[3]

حضرت شاہ مدارؒ جب جونپور سے رخصت ہونے لگے تو ان سے کہا کہ "ترا در مسلک ملامتی درآوردم و آئینہ حقیقت بتو دادم" اور یہ بھی کہا کہ تمھاری تمام زندگی دیوانہ دار کوچہ گردی میں گزرے گی اور تم خلقت سے ہمیشہ دور رہو گے[4] چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ وہ تمام عمر دشت پیمائی اور صحرانوردی ہی کرتے رہے[5] اپنی عمر کے آخری حصّہ میں وہ ایک بار دوبارہ جونپور آئے مگر پھر مکن پور چلے گئے اور وہیں حضرت شاہ مدارؒ کے مزارِ اقدس پر اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی[6]۔ اُن کا سالِ وصال معلوم نہیں لیکن ان کا مزار حضرت شاہ مدارؒ کے روضہ کے حظیرہ کے اندر ایک گوشہ میں واقع ہے[7]

---

[1] تجلی نور جلد اوّل ص ۶۱
[2] ایضاً
[3] ایضاً
[4] ایضاً ص ۶۱-۶۲
[5] ایضاً ص ۶۲
[6] ایضاً ص ۶۲
[7] ایضاً ص ۶۲

شیخ فخر الدّین مداریؒ

شیخ فخرالدّین شیخ صدرالدّین ثابت مداریؒ کے فرزند اور خلیفہ تھے۔[1] ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ان کے والدِ بزرگوار کسی آبادی کے باہر ایک مسجد میں اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے کہ فخرالدین کسی تقریب کے سلسلہ میں وہاں سے گزرے جب اُن کے والد کی نظر ان پر پڑی تو انھوں نے اُن کو بلایا اور ہدایت کی کہ "سر کے بال منڈوا دو حقیقت پسند ہو جاؤ اور صُوفیوں کا لباس پہن لو" چنانچہ انھوں نے اسی وقت سرِ تسلیم خم کر دیا اور پھر اس کے بعد عبادت و ریاضت میں ہمہ تن مصروف رہنے لگے۔ بالآخر انھوں نے اپنے والد سے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا۔[2]

شیخ فخرالدّین بڑے صاحبِ تسلیم و رضا لوگوں میں سے تھے۔ ہر تکلیف کو بخوشی برداشت کر لیتے لیکن دُنیا اور اہلِ دُنیا سے ہمیشہ دُور رہتے۔[3] ان کا وصال ۱ جمادی الاول ۹۴۲ھ/ ۱۵۳۶-۱۵۳۵ء کو ہُوا اور حضرت قطب المدار کے روضۂ اقدس کے گنبد کے قریب دفن ہُوئے۔[4] ان کا مزار اب تک وہاں موجود ہے۔

ان کے صاحبزادے شاہ فضل اللہ مداریؒ بھی بڑے صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔[5] جہاں جہاں انھوں نے عبادت و ریاضت کی یا اعتکاف میں بیٹھے وہاں وہاں لوگوں نے ازراہِ عقیدت حجرے تعمیر کروا دیے تھے جن کے نشان سید پور، بنارس، شیخ پور اور غازی پور وغیرہ میں مُدّت تک قائم رہے۔[6] ایک دفعہ سیّد جمن بہاریؒ سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ان سے فرمایا کہ میں تو ایک لنگی میں گزارہ کر لیتا ہوں اور تم ہمیشہ لباسِ فاخرہ پہنتے ہو؟ وہ مسکرائے اور فرمایا، صوفی خدا کے محبُوب لوگ ہوتے ہیں۔ وہ جس حال میں

---

[1] تجلّیٔ نور، جلد اوّل ص ۶۲ — [2] ایضاً

[3] ایضاً — [4] ایضاً — [5] ایضاً ص ۶۲-۶۳ — [6] ایضاً ص ۶۳

بھی رہیں مناسب ہے[1]۔ اُن کا وصال ۱۱ رجب ۹۷۶ھ/ ۱۵۶۸-۱۵۶۹ء میں ہوا اور حضرت شاہ مدارؒ کے گنبد کے قریب دفن ہوئے[2]۔

مُلّا نصیر الدّین مداریؒ

مُلّا نصیر الدّینؒ جونپور کے رہنے والے تھے اور حضرت شاہ بدیع الدّین مدارؒ کے مرید و خلیفہ تھے[3]۔ انھوں نے بڑے تھوڑے ہی عرصہ میں تمام علوم پر دسترس حاصل کر لی تھی اور بڑے صاحبِ فضل و ذی مرتبت بزرگ تھے[4]۔ ان کا معمول تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی خانقاہ ہی میں بیٹھے رہتے اور وہیں درس و تدریس کا کام بھی کرتے[5]۔ ان کے ایک فرزند مُلّا نور محمّد مداریؒ بھی بڑے صاحبِ مرتبہ بزرگ تھے[6]۔ تجلّیِ نور کے مؤلف ان کی تاریخِ ولادت ۱۶ جمادی الثانی ۹۷۵ھ/ ۱۵۶۷-۱۵۶۸ء اور تاریخِ وصال ۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۰-۱۶۴۱ء لکھتے ہیں[7]۔ جو صحیح معلوم نہیں ہوتی اور ان کے دُوسرے حالات سے میل نہیں کھاتی۔ ان کی قبر مبارک حضرت شاہ مدارؒ کی خانقاہ کے حظیرے میں ہے[8]۔

مُلّا نور محمّد مداریؒ کے فرزندِ ارجمند مُلّا نور الدّین مداریؒ بھی بڑے صاحبِ مرتبت بزرگ تھے۔ انھوں نے علّامہ دیوان عبد الرّشیدؒ کے سامنے زانوئے تلمّذ طے کیا تھا اور بڑے پایہ کے عالم و مصنّف تھے[9]۔

---

[1] تجلّیِ نور جلد اوّل ص ۶۲

[2] ایضاً ص ۶۳

[3] تجلّیِ نور حصّہ دوم ص ۶۰

[4] ایضاً

[5] ایضاً

[6] ایضاً

[7] ایضاً ص ۶۰-۶۱

[8] ایضاً ص ۶۰۔ تجلّیِ نور کے مصنّف اگرچہ اُن کو شاہ مدارؒ (المتوفی ۸۴۴ھ) کا مرید و خلیفہ لکھتے ہیں لیکن وہ اس تاریخِ وصال کے مطابق حضرت شاہ مدارؒ کے بعد دو سو سال تک زندہ نہیں رہے ہوں گے۔ اِس لیے یہ تاریخِ وصال یقیناً غلط ہے۔

[9] ایضاً ص ۶۱

حصّہ نہم

باب اوّل

شطاریہ سلسلہ

کئی دوسرے سلسلوں کی طرح شطاریہ سلسلہ کی بنیاد شاہ عبداللہ شطاریؒ نے عہدِ شرقی ہی میں جونپور میں رکھی۔ وہ شیخ محمد عارفؒ طیفوری کے مرید و خلیفہ تھے اور ایران سے یہاں پہنچے تھے[1]۔ دراصل یہ سلسلہ سلطان العارفین خواجہ بایزید بسطامیؒ نے شروع کیا تھا۔ انھوں نے اس شغل باطنیہ کو حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ سے سیکھا اور متوخر الذکر نے اس کو اپنے آباء و اجداد سے حاصل کیا تھا[2]۔ شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ مرآۃ الاسرار میں لکھتے ہیں کہ علم شطاریہ کو حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ نے حضرت رسالت پناہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے حاصل کیا اور صوفیاء پر ایثار فرمایا تھا۔ شیخ محمد عارف طیفوریؒ نے اس کو محمّد عاشقؒ بن شیخ خدا قلیؒ سے اور انھوں نے اس کو اپنے والد بزرگوار شیخ خدا قلی ماوراء النہریؒ سے سیکھا تھا۔ متوخر الذکر نے اس کو خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ سے اور انھوں نے اس کو خواجہ ابو المظفر مولانا ترک الطوسیؒ سے حاصل کیا تھا۔ مولانا ترک الطوسی نے اس کو خواجہ ابی یزید العشقیؒ سے اور انھوں نے اس کو خواجہ محمد مغربیؒ سے سیکھا تھا اور متوخر الذکر نے اس کو سلطان العارفین خواجہ بایزید بسطامیؒ سے حاصل کیا تھا[3]۔

شیخ محمّد عارف طیفوریؒ نے شاہ عبداللہ کو "شطار" کا لقب دے کر اس سلسلہ کی اشاعت و تبلیغ کے لیے اس برصغیر ہند و پاک میں بھیجا۔ ہند و پاکستان میں یہ سلسلہ لفظ

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۱ [2] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۶ ب [3] ایضاً

"شطار" کی نسبت سے "شطاریہ" کہلایا اور اس سلسلہ کے مشائخ "شطاری" کے لقب سے یاد کیے جانے لگے۔ لیکن ترکی میں یہ سلسلہ بسطامیہ کے نام سے اور ایران میں "عشقیہ" کے نام سے مشہور ہوا۔[1] علاوہ ازیں شیخ محمد عارف طیفوریؒ کی نسبت سے یہ سلسلہ "طیفوریہ" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا رہا۔[2]

لفظ شطاری عربی کے لفظ "شطر" سے ماخوذ ہے اور "تیز رَو" کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ سلوک شطاریہ میں شطاری سے مطلب ایک ایسا شخص ہے جو خدا تک بہت جلد رسائی چاہتا ہو۔ شاہ عبداللہ شطاریؒ فرمایا کرتے تھے کہ رُوحانی تربیت کے لیے تین طریق اختیار کیے جاتے ہیں۔ اُن میں سے پہلا "اخیار" دُوسرا "ابرار" اور تیسرا "شطر" ہے اور سلوک شطاریہ سب سے جلدی روحانی مقاصد حاصل کر لینے والا طریق ہے۔[3] شطاری صُوفیوں کا دعوٰے ہے کہ دُوسرے اشغالِ باطنیہ کے مقابلہ میں اس شغل کے ذریعہ صُوفی پہلی ہی منزل پر اس مقام و مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے جو دُوسرے سلسلہ کے صُوفیا کو آخری منزل پر جا کر نصیب ہوتا ہے۔[4]

شطاری صوفیا کا عقیدہ ہے کہ انسان کی حیثیت ایک غلام کی سی ہے اس لیے اُسے زیبا نہیں کہ وہ اپنی غربت کا گِلہ و شکوہ خدا تعالےٰ سے کرے اور جو کچھ بھی اسے میسّر آئے۔ وہ اسے یہ خیال کر کے کھا لے کہ ہر چیز کا عطا کرنے والا اللہ ہے۔ شطاری صوفی عقیدہ "توکل" کے برعکس زندہ رہنے کے لیے کسی نہ کسی ذریعۂ معاش کے حق میں ہیں۔ وہ وحدت الوجود کے مسئلہ پر پوری طرح یقین و عمل کرتے ہیں۔ مگر "فنا" اور "فی الفناء"

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۶ ب۔ ۴۹۷ و۔ گلزارِ ابرار (قلمی) ورق ۱۰۰ ب۔ لطائفِ اشرفی ورق ۲۱۶ ب

[2] آئینِ اکبری جلد سوم ص ۲۰۳

[3] K.A. Nizami, Medieval Indian Quaterly, Part I, No. 2, Oct. 1950.

[4] گلزارِ ابرار ایضاً

S. Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, p. 63.

ہیں یقین نہیں رکھتے کیونکہ "فنا" کے لیے دو شخصیتوں کی ضرورت ہے۔ ایک وہ جس کو فنا ہونا ہے۔ اور دوسری وہ جس میں کہ فنا ہونا ہے اور یہ چیز مسئلہ توحید کے خلاف ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ اپنے آپ کو پہچاننا گویا خدا کو پہچاننا ہے اور جو حدیثِ نبوی کے عین مطابق ہے۔ " من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ " اس سلسلہ کے مشائخ "غیر" میں بھی یقین نہیں رکھتے کیونکہ اُس کا کوئی وجود نہیں۔ ان کے قریب نفس کا مارنا بذاتِ خود زندگی حاصل کرنا ہے[1]۔ شطاری صوفی رُوحانی منازل حاصل کرنے کے لیے سالہا سال مجاہداتِ عالیہ اور ریاضاتِ شاقہ کو بہت ضروری سمجھتے ہیں۔

جیسا کہ اُوپر بیان ہوا شاہ عبداللہ شطاریؒ نے عہدِ شرقی میں شطاریہ سلسلہ کی بنیاد جونپور میں رکھی۔ اُن کے بعد اُن کے نامور خلفاء نے ان کی روایات کو جاری رکھا اور ان کی ترقی و ترویج کے لیے بڑا کام کیا۔ شاہ عبداللہ شطاریؒ اور اُن کے نامور خلفاء کے حالات آئندہ صفحات میں ملاحظہ ہوں۔

---

[1] A. Halim, J.A.S.P. Vol. VIII, No. 2, Dec. 1963, p. 74.

باب دوم

شاہ عبداللہ شطاریؒ

اس برصغیر ہند و پاکستان میں شطاریہ سلسلہ کا اجرا حضرت شاہ عبداللہؒ نے کیا۔ اُن کا شجرۂ نسب چند واسطوں سے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے ملتا ہے[1]۔ وہ حضرت شیخ محمدؐ عارف طیفوریؒ کے مرید و خلیفہ تھے[2]۔ وہ جب مجاہدات عالیہ اور ریاضاتِ شاقہ کے بعد منزلِ مقصود کو پہنچے تو انھوں نے ان کو خرقۂ خلافت کے ساتھ "شطار" کا لقب عطا فرمایا اور طبل و علم دے کے اس سلسلہ کی اشاعت و تبلیغ کے لیے ہندوستان بھیجا۔ انھوں نے اس موقعہ پر یہ بھی نصیحت کی کہ جہاں جاؤ یہ اعلان کرو کہ "جو کوئی بھی طالب حق ہو، وہ میرے پاس آئے تاکہ میں اُسے راستہ دکھاؤں[3]"۔

شاہ عبداللہ بڑے عظیم المرتبہ بزرگ تھے لیکن بڑے امیر طبع انسان تھے اور بڑی شان و شوکت کے ساتھ رہا کرتے تھے[4]۔ اس ملک میں پہنچنے سے پہلے انھوں نے آذربائیجان خراسان اور عراق کی بھی سیاحت کی تھی اور اس دَور کے بے شمار علماء اور صوفیاء سے ملے تھے[5]۔ وہ کسی بھی عالم و صُوفی سے ملتے تو اُسے کہتے " اگر آپ کے پاس کوئی چیز ہے تو مجھے عنایت کیجیے اور جو کچھ میں رکھتا ہوں وہ آپ پر نثار کیے دیتا ہوں[6]۔" ان کا معمول تھا کہ

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۱، مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۶ ب۔ اخبار الاصفیاء (قلمی) ورق ۴۰۔ ۴۱
[2] طبقاتِ شاہجہانی (قلمی) ورق ۱۲۷ ا۔ مرآۃ الاسرار ایضاً۔ اخبار الاخیار۔ ایضاً
[3] مرآۃ الاسرار ایضاً ورق ۴۹۶ ب۔ ۴۹۷ ا [4] اخبار الاخیار ایضاً
[5] Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, p. 63.
[6] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۷ ا

جب مریدوں کے ساتھ کسی قصبہ و شہر میں پہنچتے تو وہاں خیمے لگا دیتے اور اپنے پیر و مرشد کی وصیت کے مطابق ہر فرقہ و سلوک کے لوگوں سے ملتے۔[1]

ایران کے سفر کے بعد ہندوستان میں سب سے پہلے وہ مانکپور وارد ہوئے اور وہاں ایک باغ میں اپنے خیمے نصب کر دیے۔ اُن کی شہرت و عظمت کا حال سُن کر لوگ وہاں جوق در جوق پہنچے۔ جب اُن کی آمد کی خبر حضرت شیخ حسام الدین مانکپوریؒ، حضرت راجی سید حامد شاہؒ اور حضرت شاہ سیدؒ کو ہوئی تو وہ بھی ان سے ملنے کے لیے آئے شاہ عبداللہؒ ان کے استقبال کے لیے اپنے خیمہ سے باہر نکل آئے لیکن شیخ حسام الدینؒ سے ملتے ہی کہنے لگے "بھائی حسام الدینؒ میں آپ سے ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ کی آتشِ فقر سے میرا خیمہ و بساط نہ جل جائے۔ اِس لیے بہتر ہے کہ کسی اور جگہ بیٹھ جائیں۔" چنانچہ یہ سبھی حضرات ایک درخت کے سایہ تلے بیٹھ گئے۔ جب گفتگو شروع ہوئی تو آپ نے حسبِ معمول اُن سے عرض کیا کہ "میں نے اپنے بزرگوں سے جو کچھ سیکھا ہے وہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور جو کچھ آپ جانتے ہیں وہ آپ مجھے بتائیں۔"[2] شیخ حسام الدینؒ نے بڑے عجز و انکسار سے عرض کیا کہ میں ایسی کوئی چیز بھی نہیں رکھتا جو آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں اور جو کچھ میرے بزرگوں نے مجھے دیا ہے میں ابھی اس کے مطالعہ سے فارغ نہیں ہوا اِس لیے اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا کہ آپ کو کوئی چیز سکھا سکوں۔ وہ ان کے جواب سے بڑے خوش ہوتے اور اُن کی بلند ہمتی کی داد دیتے ہوئے فرمایا "الحمدللہ ہندوستان میں صرف ایک ایسے کامل عارف کو ملا ہوں جس کی ہمت کا ہما کونین سے گزر چکا ہے" اس واقعہ کے بعد وہ حسبِ دستور دوسرے علاقہ کے مذہبی دورہ پر روانہ ہو گئے۔[3]

شاہ عبداللہؒ کا طریقۂ تبلیغ دوسرے سلسلہ کے مشائخ سے بہت مختلف تھا اور

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۷ و
[2] ایضاً
[3] ایضاً ورق ۴۹۷ ا - ب

بجائے اس کے کہ لوگ ان کے پاس چل کر آتے وہ خود اُن کے پاس پہنچتے۔ شیخ عبدالحق محدث دھلویؒ لکھتے ہیں کہ جب کوئی طالب ان کے پاس مرید ہونے کے لیے آتا تو وہ اپنے ساتھ کھانے پر بٹھا لیتے اور اُسے شبہ تک نہ ہونے دیتے کہ اس کو ساتھ بٹھانے کا مقصد کیا ہے۔ پھر وہ اُسے دیکھتے اور پرکھتے کہ آیا وہ ان کے ساتھ پورا کھانا کھا رہا ہے یا آخر میں کچھ روٹی یا سالن وغیرہ چھوڑ دیتا ہے۔ اگر وہ ان کے ساتھ پُورا کھانا کھاتا تو اس کو عقلمند اور ہوشیار سمجھ کر مرید کر لیتے اور اپنا شغلِ باطن سکھاتے اور اگر وہ آدھی یا کچھ روٹی چھوڑ دیتا تو اُسے بے خبر خیال کرتے اور اپنا مرید نہ بناتے لیکن اس کے ساتھ اپنے ظاہری تعلقات باقاعدہ رکھتے تاکہ وہ وعظ و تلقین سننے کے لیے ضرور آتا رہے[1] جیسا کہ اُوپر بیان ہوا وہ شاھانہ لباس زیب تن کرتے اور اُن کے مرید اُن کے ساتھ ہمیشہ فوجی لباس میں ہوتے۔ ان کے ساتھ مریدوں کی یہ فوج ڈھول اور جھنڈے لیے ہُوتے جگہ جگہ پر یلغار کرتی پھرتی اور وہ اکثر شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کا دورہ اسی طرح کیا کرتے جہاں بھی وہ جاتے ڈھول ڈھمکوں کے ساتھ پکارتے "طالبی ہست کہ بیاید اور انبدار راہ نمایم"[2] بالآخر وہ جونپور پہنچے اور مستقل طور پر وہاں ڈیرے لگا دیے۔ جونپور میں ان کو بڑی کامیابی حاصل ہُوئی اور بے شمار لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوتے[3] اس کے بعد جونپور شطاریہ سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت کا بڑا اہم مرکز بن گیا۔ وہاں سے پھر اُن کے خلفا نے اس سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت کے لیے بہت جدّوجہد کی اور انھیں بڑی کامیابی نصیب ہُوئی۔ ان کے اجل خلفا میں سے شیخ حافظ جونپوریؒ

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۱
وہ یہ بھی اعلان کر کرتے کہ یہاں کوئی ایسا ہے جو کلمۂ توحید کے معنی مجھ سے بہتر جانتا ہو۔ اگر کوئی ہے تو یہاں آئے اور مجھے سکھائے ورنہ مجھ سے سیکھے۔ گلزارِ ابرار ورق ۱۰۱ ب

[2] اخبار الاخیار ص ۱۷۱۔ گلزارِ ابرار (قلمی) ورق ۱۰۶ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۷ ﻟ

[3] مرآۃ الاسرار ایضاً ۴۹۷ ب

اور شیخ فاضن منیریؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیںؒ۔ انہی کے خلفاء نے بعد میں اس سلسلہ کو سارے ملک میں پھیلایا۔

جب وہ جونپور پہنچے تو ان دنوں سلطنتِ شرقی میں سلطان ابراہیمؒ شاہ شرقی کا آفتابِ اقتدار پوری طرح جگمگا رہا تھا۔ وہ علماء و مشائخ کا تہ دل سے گرویدہ تھا لیکن جب اسے شاہ عبداللہؒ کے شاہانہ لباس، طرزِ تبلیغ اور مریدوں کی فوجی پریڈ اور ڈھول ڈھمکوں کا علم ہوا تو اس نے اظہارِ تعجب کیا اور ان کی امارت و فضیلت کے بارے میں اسے کئی طرح کے شبہات لاحق ہوتے۔ چنانچہ ایک روز وہ بھی ان کی مجلسِ وعظ میں حاضر ہو گیا اور عرض کیا "سنا ہے کہ آپ حق نمائی کا دعویٰ کرتے ہیں لہٰذا مجھ پر بھی کوئی چیز ظاہر کیجئے۔" شاہ عبداللہ نے جواب دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو کسی نہ کسی کام کے لیے پیدا کیا ہے اور آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ سلطنت کے کاموں میں مشغول رہیں کیونکہ آپ کے اس کام سے خلقت کے لیے نفع ہے۔ سلطان ابراہیمؒ نے عرض کیا۔ اس مجلس میں بے شمار لوگ جمع ہیں۔ ان میں سے کسی ایک پر توجہ فرمائیے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس کے لیے جوہرِ قابل کی ضرورت ہے۔ سلطان نے پھر عرض کیا کہ کیا ان ہزاروں آدمیوں میں سے کوئی ایک بھی اس جوہرِ قابل کا مالک نہیں۔ اس کا یہ جواب سن کر وہ جوش میں آگئے اور اپنی نظریں چاروں طرف گھمانے لگے۔ بالآخر دیکھا کہ ایک بڑا ہونہار اور صاحبِ جمال نوجوان سلطان ابراہیم شاہ کے سرہانے کھڑا مگس رانی کر رہا ہے۔ جب انھوں نے اس پر توجہِ باطنی فرمائی تو جو کچھ اس کے ہاتھوں میں تھا وہ نیچے گر گیا۔ پھر وہ خود بھی مست ہو کر گر پڑا۔ جب ہوش میں آیا تو ہر چیز کو خیرباد کہہ کر ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا۔[3]

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۷ ب [2] ایضاً
[3] ایضاً

سلطان اور اہلِ مجلس اس واقعہ سے بہت حیران ہوئے اور بہت سے لوگ اس روز ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔[1]

دراصل سلطان ابراہیم شاہ شرقی ان کے ایسے طرزِ تبلیغ سے خفا تھا۔ چنانچہ شاہ عبداللہ شطاریؒ اس سے ناخوش ہو کر جونپور سے ہجرت کر کے مالوہ کی طرف چلے گئے۔[2] سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے ان سے ناراض ہونے اور اُن کے جونپور سے ہجرت کر جانے کی تفصیلات ہمیں ہم عصر تذکرہ و تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتیں لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ سلطان ابراہیم کو اُن کے شاہانہ لباس اور ان کے مریدوں کے فوجی لباس سے شک گزرا ہوگا اور وہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ اُن کے دارالسلطنت میں فوجی طرز کا کوئی ایسا گروہ آباد ہو جائے جس سے کسی وقت بھی تخت و سلطنت کو کسی قسم کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہو۔

حضرت شاہ عبداللہ شطاریؒ جب چتوڑ پہنچے تو وہاں ان کی ملاقات سلطان غیاث الدین خلجی (۱۴۶۹-۱۵۰۱ء) والیٔ مالوہ سے ہوئی۔ وہ اس وقت اس قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے مگر انھوں نے ان کا استقبال بڑے شاندار طریقہ سے کیا اور قلعہ کی فتح کے لیے دعا کی خواہش کی۔ چنانچہ اُن کی دعا سے قلعہ فتح ہو گیا بلکہ قلعہ کی فتح تک وہ خود بھی وہیں رہے۔ سلطان غیاث الدین خلجی ان سے بے حد خوش ہوئے اور انھوں نے وہاں ان کی بڑی خاطر مدارات کی اور پھر انھیں اپنی افواجِ فاتح سے پہلے ہی دارالسلطنت مانڈو بھجوا دیا وہاں بھی اُن کا استقبال بڑی شان و شوکت سے کیا گیا۔ اس کے بعد پھر وہ مستقل طور پر مانڈو میں آباد ہو گئے۔ سلطان غیاث الدین خلجی نے وہاں ان کو ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں اور تادمِ حیات ان دونوں میں بڑے عمدہ تعلقات قائم رہے۔ شاہ عبداللہ شطاریؒ نے اپنی تصنیف لطائفِ غیبیہ بھی انھیں کے نام معنون کی۔

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۷ ب [2] ایضاً

مانڈو میں انھیں اپنے تبلیغی مقاصد میں بھی بڑی کامیابی حاصل ہوئی[1]

شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ لکھتے ہیں کہ جب ایک بار حضرت میر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ مالوہ تشریف لے گئے تو شاہ عبداللہؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے ان کے سلسلہ طریقت سے بھی استفادہ کیا[2]۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ شاہ عبداللہ نے ایک رسالہ بھی طریق شطاریہ پر لکھا جس میں انھوں نے اس سلسلہ کے اذکار واشغال اور مراقبات وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے[3]۔ ان کو بڑی لمبی عمر نصیب ہوئی اور ان کا انتقال ۱۴۸۵ء میں ہوا[4]۔ ان کا روضۂ اقدس مانڈو میں مرجع خلائق ہے۔ ان کے روضہ کی عمارت کو بعد میں شہنشاہ جہانگیر نے تعمیر کروایا تھا[5]۔

شاہ عبداللہؒ بڑے صاحب کمال بزرگ تھے۔ وہ اپنے سلسلہ کی اشاعت کے لیے جب اس ملک میں آئے تو اس وقت سلطنت دہلی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور سارا ملک مذہبی بحران سے گزر رہا تھا لہٰذا ایسے حالات میں ایک نئے سلسلہ کی داغ بیل ڈالنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ خاص طور پر جبکہ سہروردیہ اور چشتیہ جیسے عظیم سلسلوں کی عمارات تک ان حالات میں مسمار ہو چکی تھیں۔ ان حالات میں کسی بھی نئے سلسلہ کی ترویج و ترقی کے لیے شاہ عبداللہؒ جیسے تجربہ کار اور عظیم المرتبت بزرگ کی ضرورت تھی چنانچہ ان کو اپنے مقصد

---

[1] گلزار ابرار (قلمی) ورق ۱۰۱ ب۔ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۷ ب اخبار الاخیار ص ۱۷۱

[2] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۷ ب [3] اخبار الاخیار ص ۱۷۱

[4] گلزار ابرار (قلمی) ورق ۱۰۰ ب۔ ۱۰۳ ب۔ طبقات شاہجہانی (قلمی) ورق ۱۲۱ اب۔ ۱۲۲ ا۔ خزینۃ الاصفیا جلد دوم ص ۳۰۸۔ ان کے سال وصال کی تاریخ ۸۳۲ھ/۱۴۲۸ء لکھتے ہیں۔

[5] مرآۃ الاسرار ایضاً۔ اخبار الاخیار ص ۱۷۱ مگر سید اطہر عباس رضوی Muslim Revivalist Movements in Northern India in Sixteenth and Seventeenth Century, p. 63.

نہیں لکھتے ہیں کہ ان کا روضۂ اقدس قلعہ گوالیار میں ہے لیکن اخبار الاخیار (ص ۱۷۱) و مرآۃ الاسرار (ایضاً ورق ۴۹۷ ب) کے مصنفین ان کا روضۂ اقدس کی عمارت

میں بہت کامیابی حاصل ہوئی اور ان کے حلقۂ ارادت میں اُس دور کے لاتعداد علماء و صوفیاء بھی شامل ہو گئے جنھوں نے اس سلسلے کی نشو و نما اور ترقی میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔

مانڈو میں لکھتے ہیں مرآۃ الاسرار کے مصنف یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک بار شہنشاہ جہانگیر مانڈو کے روضۂ اقدس پر تشریف لے گئے۔ اس وقت اس کے ساتھ سلسلۂ شطاریہ کے ایک بزرگ شیخ پیر میر بھٹی بھی تھے جن کو شاہ عبداللہ سے بڑی عقیدت تھی۔ چنانچہ اس موقعہ پر ان کے روضہ کی تعمیر کا حکم دیا گیا تھا۔

باب ۳ سوم

شاہ عبداللہ شطاریؒ کے خلفا

اور

سلسلۂ شطاریہ کے بعد کی تاریخ

شاہ عبداللہؒ کے بے شمار خلفاء تھے جنھوں نے اِس سلسلہ کی ترقی و ترویج کے لیے باقاعدہ منظم ہو کر بڑا کام کیا اور اس کو شہرتِ دوام بخشی۔ ان کے ایک عظیم المرتبت خلیفہ شیخ محمد علا المعروف شیخ قاضن بنگالی نے اِس سلسلہ کی ایک شاخ کو بنگال میں قائم کیا اور اس کی اشاعت کے لیے وہاں بڑی کوشش کی[1]۔ ان کے دُوسرے عظیم المرتبت خلیفہ حافظ جونپوریؒ تھے جنھوں نے اِس سلسلے کی ترقی و ترویج کے لیے جونپور اور اس کے گرد و نواح میں بڑی محنت کی[2]۔ مؤخر الذکر کے ایک نامور خلیفہ شیخ بدھنؒ تھے جو سلطان حسین شاہ شرقی اور سلطان سکندر لودھی کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے بھی اِس سلسلے کی نشر و اشاعت میں بڑا حصہ لیا اور اس کو سارے ملک میں مقبول بنایا[3]۔ شیخ عبدالحق محدث دھلویؒ کے چچا شیخ رزق اللہ مشتاقیؒ انہی کے خاص مریدوں اور اجل خلفاء میں تھے اور فارسی و ہندی کے بڑے اعلیٰ پایہ کے عالم و شاعر تھے[4]۔ فارسی میں اپنا تخلص مشتاقی اور ہندی میں راجن کیا کرتے تھے[5]۔ شیخ بدھنؒ کے ایک اور قابل ترین خلیفہ شیخ ولیؒ تھے جو بیدولی کے رہنے

---

[1] گلزارِ ابرار (قلمی) ورق ۱۰۱ ب، مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۷ ب

[2] گلزارِ ابرار (قلمی) ورق ۱۰۰ ب - ۱۰۱ ب

[3] اخبار الاخیار ص ۱۶۹ - ۱۷۰ و ۱۹۴ - ۱۹۵

[4] ایضاً آپ کی تاریخِ ولادت ۸۹۷ھ/ ۱۴۹۱ - ۱۴۹۲ء وفات ۹۸۹ھ/ ۸۲ - ۱۵۸۱ء ہے۔

[5] اخبار الاخیار ص ۱۶۹ - ۱۷۰

والے تھے۔ انھوں نے اپنے خلفاء کو اس سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت کے لیے بڑے عمدہ طریقہ سے تیار کیا اور مختلف مقامات پر تقرر کیا۔[1] اُن کے نامور خلفاء میں سے شیخ فدنؒ، شیخ بہاء الدینؒ اور شیخ راجیؒ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔[2] شیخ بہاء الدینؒ نے طریقِ شطاریہ پر ایک بڑا عمدہ رسالہ بھی لکھا جس میں انھوں نے اس سلسلہ کے قاعدوں، طریقِ کار اور عملی معاملات کی تشریح کی۔ یہ رسالہ عہدِ مغلیہ میں بڑا مقبول رہا اور اسے عوام الناس بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔[3] شیخ بہاء الدینؒ کے مریدوں میں سے ایک بڑے ذی مرتبت بزرگ میر سیّد ابراہیم ایرجیؒ تھے جو اپنے دور کے دہلی کے متبحّر علماء میں سے تھے۔[4] شیخ عبدالحق محدّثؒ لکھتے ہیں کہ شیخ بہاء الدین نے رسالۂ شطاریہ دراصل انہی کی سہولت کے لیے لکھا تھا۔[5]

شطاریہ سلسلہ کی بنگال شاخ بھی شیخ قاضن بنگالیؒ کی سرکردگی میں خوب پھلی اور پھولی وہ اپنے مریدوں کی تربیت بڑے عمدہ طریقہ سے کیا کرتے تھے۔ اُن کے نامور خلفاء میں سے میر سیّد علی قوامؒ اور شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمستؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔[6] میر سیّد علی قوامؒ نے جونپور کے گردو نواح میں اس سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت کے لیے بڑا کام کیا اور ان کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔[7] ان کا روضۂ اقدس جونپور میں ہے۔[8] شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمستؒ شیخ قاضن کے فرزندِ ارجمند اور خلیفہ تھے اور اُن کے وصال کے بعد سجّادہ نشین ہوئے۔ وہ بھی بڑے صاحبِ کمال اور عظیم المرتبت بزرگ تھے۔

---

[1] Medieval India Quaterly, Vol. I, No. 2, Oct. 1950, p. 58.

[2] ایضاً

[3] ایضاً۔ اخبار الاخیار ص ۲۴۳

[4] ایضاً ص ۲۴۳

[5] ایضاً ص ۲۴۳

[6] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۷ ب۔ ۴۹۸ ا

[7] ایضاً

[8] اذکارِ ابرار (اُردو ترجمہ گلزارِ ابرار) مگر مرآۃ الاسرار (قلمی ورق ۴۹۷ ب) کے مصنف شیخ عبدالرحمٰن چشتی کہتے ہیں کہ اُن کا مزار جونپور کے قریب سرائے میر میں ہے جو اعظم گڑھ کا ایک قصبہ ہے۔

انھوں نے اپنے والدِ بزرگوار کی روایات کو بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے جاری رکھا اور اس سلسلہ کو عوام میں بڑا مقبول کیا[1]۔

شیخ ابوالفتح سرمستؒ کے ایک نامور خلیفہ شیخ حمید المعروف شیخ ظہور حاجیؒ بھی بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے[2]۔ جن کے دو عظیم المرتبت خلفاء شیخ بہلولؒ اور شیخ محمد غوث گوالیاریؒ تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے چنار کی پہاڑیوں پر سالہاسال ایک ساتھ عبادات[3] عالیہ اور ریاضاتِ شاقہ کی تھیں[4]۔ دونوں بڑے صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ ان کی خدمات سے اِس سلسلہ کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔

شیخ بہلولؒ کے مریدوں میں شہنشاہ ہمایوں بھی شامل تھے جن سے اُن کو بڑی محبت و عقیدت تھی اور جب تک وہ زندہ رہے اُن پر نظرِ التفات فرماتے رہے[5]۔ جب ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء میں مرزا ہندال نے بغاوت کی تو ہمایوں نے شیخ بہلولؒ کو اس کے پاس پند و نصیحت کے لیے بھیجا لیکن اس نے بعض اوباش ساتھیوں کے ورغلانے پر ان کو شہید کر ڈالا[6]۔ ہمایوں کو اُن کے وصال کا اِنتہائی صدمہ ہُوا اور وہ اس سے ایک عرصہ تک خود کو آزاد نہ کر سکے۔ شیخ بہلولؒ کا شمار اس دور کے متبحر علماء اور ذی مرتبت صوفیاء میں کیا جاتا ہے، وہ بڑے اعلیٰ پایہ کے مصنف بھی تھے۔

شیخ محمد غوث گوالیاریؒ شطاریہ سلسلہ کی بڑی اہم اور بزرگ ہستی ہیں۔ ان کے مرید و خلیفہ شیخ محمد غوثی شطاریؒ اپنی گلزارِ ابرار میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے شطاریہ سلسلہ کی ایک سنپتجے کی طرح پرورش کی اور اس کو سنِ بلوغت تک پہنچایا[7]۔ انھوں نے ۱۲ سال

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۰ ا۔ ان کا مزار حاجی پور (بہار) کے قریب ہے۔
[2] مرآۃ الاسرار ایضاً وہ بہار کے مقام رتن سرائے میں مدفون ہیں [3] ایضاً مرآۃ الاسرار کے مصنف لکھتے ہیں کہ انھوں نے چنار کی پہاڑیوں پر تیرہ سال اور سات ماہ ریاضاتِ شاقہ کی تھیں لیکن منتخب التواریخ (جلد سوم ص ۴۵) کے مصنف لکھتے ہیں کہ انھوں نے بارہ سال ریاضاتِ شاقہ کی تھیں [4] و [5] مرآۃ الاسرار ایضاً
[6] گلزارِ ابرار (قلمی) ورق ۱۸۷۔ ۱۹۲ ا۔ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۱ ا تاریخ بداؤنی جلد سوم ص ۶۴

تک چنار کی پہاڑیوں کے دامن میں ریاضاتِ شاقہ کیں، جہاں وہ غاروں میں رہتے اور درختوں کے پتے کھا کر گزارہ کیا کرتے تھے[1]۔ وہ بڑے صاحبِ تصرّف درویش تھے بادشاہ ہمایوں کو بھی ان پر بڑا اعتقاد تھا۔ جب ہمایوں گردشِ دوراں کے ہاتھوں ملک بدر ہوگئے تو شیر شاہ سوری اُن کے دَرپے آزار ہوگئے۔ اِس وجہ سے پھر وہ دکن چلے گئے[2]، جہاں سلاطینِ وقت کے علاوہ سینکڑوں لوگ اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ اُن میں سے شیخ وجیہہ الدین علوی گجراتیؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[3]۔ لیکن بعد میں جب سلطنت مغلیہ کا سورج دوبارہ طلوع ہوا اور بادشاہ اکبر تختِ آگرہ و دہلی پر متمکن ہوا تو ۹۶۶ھ/۱۵۵۸ء میں وہ آگرہ چلے آئے جہاں اکبر بادشاہ بھی اُن کا مرید ہوگیا۔ وہ اُن کی بیحد تعظیم و تکریم کیا کرتا تھا[4]۔ تاہم کچھ عرصہ بعد پھر وہ اُن سے منحرف ہوگیا۔ دوسرے ان کو وہاں بیرم خاں اور شیخ گدائیؒ کی صحبت بھی راس نہ آئی۔ اِس لیے وہ آگرہ چھوڑ کر گوالیار چلے گئے[5] اور وہاں رُشد و ہدایت کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس خانقاہ کا معاش ایک کروڑ تنکہ تھا[6]۔ وہ بڑے منکسر المزاج درویش تھے۔ جو کوئی بھی ان کے پاس آتا اس کی بے حد تعظیم فرمایا کرتے[7]۔ ایک عظیم المرتبت عالم و فاضل اور صوفی ہونے کے علاوہ بڑے پایہ کے مصنّف بھی تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں جنھیں بڑی مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی۔ اُن میں سے جواہرِ خمسہ، کلیدِ مخزن، معراج نامہ، اورادِ غوثیہ، کنز التوحید اور بحر الحیات یادگارِ زمانہ مانی جاتی ہیں[8]۔ معراج نامہ میں

---

[1] گلزارِ ابرار (قلمی) ورق ۱۸۷-۱۹۲؛ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۶، مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۸ الف تاریخ بداؤنی جلد سوم ص ۴۶ مرآۃ الاسرار میں ہے کہ انھوں نے ۱۳ سال اور ۷ ماہ ریاضاتِ شاقہ کیں۔
[2] تذکرہ علمائے ہند ایضاً [3] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۹ کے مصنّف لکھتے ہیں کہ جب شیخ محمد غوث گجرات پہنچے تو وہاں کے صدر علما شیخ علی متقی نے اُن کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا لیکن شیخ وجیہہ الدین گجراتی نے سلطان محمود گجراتی سے اس کے نفاذ کو موقوف کروا دیا اور کہا کہ جب تک ہم انھیں دیکھ نہ لیں اُن کے متعلق کسی قسم کا فتویٰ عائد نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب وہ اُن سے ملے تو بڑے متاثر ہوئے اور فوراً ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے۔ [4] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۶ [5] ایضاً [6] ایضاً [7] ایضاً (جاری ہے)

انھوں نے اپنا روحانی احوال لکھا اور اس کو بادشاہ ہمایوں کے نام معنون کیا۔[۱] بحرالحیات میں انھوں نے ہندو مذہبی فکر کو سمجھنے اور سمجھانے کے علاوہ اسلامی تصوف پر ہندو اثرات سے متعلق بحث کی ہے۔ اس طرح یہ کتاب دراصل شہزادہ دارا شکوہ کی کتاب مجمع البحرین کی پیش رو ہے۔[۲] انھوں نے جواہر خمسہ ۲۲ سال کی عمر میں لکھی تھی۔ یہ کتاب پہلے انھوں نے عربی میں لکھی تھی اور پھر اس کا ۱۵۴۹ء میں فارسی ایڈیشن تیار کیا تھا۔[۳] ان کا وصال ۹۷۰ھ/۱۵۶۳ء میں ہوا۔[۴] آپ کا روضۂ اقدس گوالیار میں ہے۔[۵]

شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کے لاتعداد خلفاء تھے اور ان کے خرمنِ کمال سے ہزاروں نے روحانی فیوض حاصل کیے۔ ان کے ایک خلیفہ شیخ وجیہ الدین گجراتیؒ تھے جو پہلے اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں کی طرح شیخ قاضن بنگالیؒ کے مرید ہوئے لیکن بعد میں انھوں نے صحیح معنوں میں انہی سے روحانی فیض حاصل کیا اور خرقۂ خلافت بھی پایا تھا۔[۶] شیخ وجیہ الدین بڑے پایہ کے عالم اور ذی مرتبت صوفی تھے۔ مولوی عبدالحقؒ "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں ملفوظاتِ سید ہاشم علویؒ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ انھوں نے ۲۲ سال کی عمر میں ۱۲۰ علوم حاصل کر لیے تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ اگر میں شیخ محمد غوثؒ سے ملاقات نہ کرتا تو مسلمان نہ ہوتا اور یہ بھی کہا کہ جو معرفتِ خداوندی مجھے ساری عمر نصیب نہ ہوتی وہ ان کی وجہ سے ایک شب بھر میں حاصل ہو گئی تھی۔[۷] ان کی ولادت ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں محمد آباد (جانپانیر) میں ہوئی تھی مگر وہ اپنی عمر کے آخری دور میں احمد آباد چلے گئے اور پھر وہاں درس و تدریس اور وعظ و تلقین کرتے رہے۔ ان کا وصال ۹۹۸ھ/۱۵۸۹ء میں

---

[۱] ایضاً گلزار ابرار (قلمی) ورق ۱۸۷ الف-۱۹۲ الف۔ تاریخ بدایونی جلد دوم ص ۶۲۔ خزینۃ الاصفیا جلد دوم ص ۳۲۳ ۳۲۴ [۲] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۴۵۱ [۳] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۶

Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, p. 64.

لکھتے ہیں کہ یہ سنسکرت کی ایک کتاب امرت کنڈ کا ترجمہ ہے۔ بحرالحیات ۱۸۹۰ء میں دہلی سے شائع ہوئی تھی اب نایاب ہے اس کا ایک نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری (عبدالسلام (Collection)) میں ہے۔

[۴] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۸ د [۵] مرآۃ الاسرار ایضاً۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۶ [۶] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۹ (جاری)

ہوا[۱]۔ انھوں نے شطاریہ سلسلہ کی ترویج و ترقی کے لیے بڑا کام کیا اور اس کو بڑا مقبول بنایا۔ اُن کے مریدوں نے اُن کے ملفوظات بحرالحقائق کے نام سے جمع کیے جن میں اُن کے ہندی اقوال بھی جگہ جگہ درج ہیں[۲]۔

شیخ محمد غوث گوالیاری کے ایک دُوسرے نامور خلیفہ شیخ منجھن تھے جنھوں نے اُن سے جواہر خمسہ کا درس لیا تھا۔ وہ ان کی بڑی قدر و منزلت فرمایا کرتے اور جب اُن کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا تو وہی خرقہ پہنایا جو وہ خود چنار کی پہاڑیوں میں مجاہدات و ریاضات کرتے وقت پہنا کرتے تھے[۳]۔ شیخ محمد غوثی شطاری لکھتے ہیں کہ میں نے اس خرقہ کو اُن کے بیٹے شیخ عثمان کے پاس دیکھا تھا۔ شیخ منجھن اس سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت کے لیے رائے سین اُسی سال پہنچے تھے جس سال شیر شاہ سوری نے اس کو فتح کیا تھا۔ شیر شاہ نے ان کو قلعہ کی خانقاہ داری پر مامور کیا تھا لیکن جب راجپوتوں نے قلعہ رائے سین کو دوبارہ فتح کرلیا تو وہ سارنگ پور (مالوہ) چلے گئے۔ وہاں بھی ان کو بڑی عزت و احترام ملا۔ شیخ محمد غوثی شطاری لکھتے ہیں کہ جب وہ سارنگ پور پہنچے تو اس کے گرد و نواح کے علماء کا ایک جم غفیر اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگیا اور پھر اُن کے درس و وعظ سے اس شہر کو علم و معرفت میں وہی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ جو کہ شیراز کو حاصل تھی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد وہ شہر کو چھوڑ کر اس سے کچھ فاصلہ پر مقیم ہو گئے اور تنہا زندگی بسر کرنے لگے۔ البتہ ایک بار پھر یکم ربیع الاوّل ۱۰۰۱ھ/ دسمبر جنوری ۱۵۹۲-۱۵۹۳ء کو اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو الوداع کہنے کے لیے سارنگ پور آتے اور اس کے بعد پھر دوبارہ اپنے خلوت خانہ سے کہیں باہر نہ گئے۔ اس وقت اُن کی عمر ۸۰ سال تھی اور اس سال انھوں نے ایک جماعت

(گزشتہ سے پیوستہ) اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۹-۳۰

[۱] ایضاً ص ۲۹-۳۰ [۲] ایضاً ص ۲۹-۳۰ [۳] ایضاً ص ۲۹-۳۰

[۴] اذکار ابرار اُردو ترجمہ گلزار ابرار ص ۳۴۱-۳۴۲ [۵] ایضاً

"ذکرِ جہر" نام کی بنائی تھی۔ بالآخر ذکرِ جہر کے وجد ہی میں انھوں نے وصال بھی فرمایا۔ وہ بڑے پایہ کے مصنف بھی تھے اور علومِ ظاہری پر انھوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں۔ ہندی زبان پر بھی اُن کو بڑا عبور حاصل تھا جس میں اُن کی تصنیف "مدھومالتی" کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی[1]۔ اس کتاب میں انھوں نے شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کا بھی کئی جگہ ذکرِ خیر کیا ہے[2]۔

شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کے سب سے زیادہ نامور خلیفہ گلزارِ ابرار کے مصنف مولانا غوثی شطاریؒ تھے جو شیخ وجیہ الدین گجراتیؒ کے تلامذہ میں سے تھے[3]۔ شیخ محمد غوثؒ کے ایک دوسرے اجلّ خلیفہ میر سید محمد محققؒ تھے جو میر سید علاء الدین کنتوریؒ کی اولاد میں سے تھے۔ وہ علومِ ظاہری و باطنی کے متبحر عالم تھے اور بڑے صاحبِ کرامات درویش تھے۔ ان کا وصال ۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء میں ہوا[4]۔ اُن کے ایک قابلِ قدر خلیفہ شیخ عبدالغفورؒ صدیقی احمد پوریؒ تھے جو ساٹھ سال کے مجاہدات کے بعد منزلِ مقصود کو پہنچے تھے۔ ان کا وصال ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۳ء میں ہوا[5]۔ شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ لکھتے ہیں کہ وہ مجھ پر بڑے مہربان تھے اور ہمیشہ عنایات فرماتے رہے[6]۔

شطاریہ صوفیاء یوگا اور ویدانتا کا مطالعہ بڑے شوق و سنجیدگی سے کرتے اور یوگیوں کی طرح ریاضاتِ شاقہ کیا کرتے تھے۔ وہ ہندی شعر و ادب کے بھی بڑے دلدادہ تھے اُن میں سے بعض نے ہندی میں شعر بھی کہے اور کتب و رسائل بھی لکھے۔ ایسے شطاریہ مشائخ میں سے شیخ رزق اللہ مشتاقیؒ، شیخ منجھنؒ، شیخ محمد غوثؒ گوالیاریؒ اور شیخ

---

[1] اذکارِ ابرار (اُردو ترجمہ گلزارِ ابرار) ص ۲۷۱-۲۷۲   [2] مدھومالتی الٰہ آباد ص ۱۴
[3] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ص ۲۵۱، وہ ۹۶۳ھ میں مالوہ میں پیدا ہوئے تھے۔ شیخ محمد غوثی گلزارِ ابرار (اذکارِ ابرار اُردو ترجمہ) میں لکھتے ہیں کہ شیخ محدث جب حجاز جاتے ہوئے مالوہ ٹھہرے تو اُن سے بہت سے فیوض حاصل کیے تھے۔
[4] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۸ ر   [5] ایضاً
[6] ایضاً

وجیہہ الدین گجراتیؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اِس سلسلہ کے مشائخ نے ہندوؤں کے ساتھ بڑے عمدہ مراسم قائم کیے اور اُن کے مذھبی افکار و نظریات کو ہمدردانہ سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کی بہترین مثال شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی بحرالحیات ہے۔ اُس میں ہندو مذہبی فکر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے[۱]۔ یہ کتاب شہزادہ دارا شکوہ کی مجمع البحرین کی پیش رو بھی جاتی ہے۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ شطاریہ سلسلہ عوام النّاس میں ہر دلعزیز نہ ہو سکا۔ اس کی طرف زیادہ تر علماء و اُمراء نے رغبت کی اور عوام النّاس اس کے پیرو نہ بن سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی ترتیب و تنظیم میں دو بنیادی کمزوریاں تھیں۔ ایک کمزوری تو اس کے مشائخ کا اپنا کردار تھا اور دوسری کمزوری شطاریہ سلسلہ کا فلسفۂ حیات تھا۔ اِس سلسلہ کے مشائخ وحدت الوجود پر قوی یقین رکھتے تھے اور ان کا سارا روحانی نظام اسی عقیدہ پر قائم تھا۔ وہ روحانی منازل کو طے کرنے کے لیے سالہا سال مجاہداتِ عالیہ اور ریاضاتِ شاقہ کیا کرتے تھے، جو عام آدمی کے بس کا کام نہ تھا۔ علاوہ ازیں شطاریہ مشائخ اپنے حلقۂ ارادت کے لیے عام آدمیوں کو نظر انداز کرتے اور اپنی نظریں شاھی محلّات کی طرف اُٹھاتے۔ انھوں نے غرباء کے مسائل کو سمجھنے میں دِلچسپی نہ لی اس لیے غرباء بھی اُن کی طرف راغب نہ ہوئے۔ اس سلسلہ کے مشائخ نے چونکہ اپنے آپ کو حکمران طبقہ سے وابستہ کر لیا تھا، اِس لیے اس کی عزّت و حُرمت میں فرق آ گیا۔ بادشاہ بابر اور بادشاہ ھمایوں نے اس سلسلہ کے مشائخ کی شاھی سرپرستی کی اور اُن کے عہدِ حکومت میں یہ سلسلہ بامِ عروج کو پہنچ گیا لیکن بادشاہ اکبر کی مذہبی بے پروائی اور مذہبی پالیسی سے اِس سلسلہ کی شان و حُرمت میں فرق آ گیا اور جب کچھ عرصہ بعد اس برِصغیر ہند و پاکستان میں نقشبندیہ سلسلہ کا سورج طلوع ہوا تو شطاریہ سلسلہ پر دُھند چھا گئی۔

---

[۱] سلاطینِ دھلی کے مذھبی رجحانات ص ۴۵۱

حصّہ دھم

بابِ اوّل

مہدوی تحریک

یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قیامت سے پہلے حضرت امام مہدیؑ کا ظہور ہوگا اور وہ تمام دینی اور دُنیاوی معاملات کی اصلاح کریں گے۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے اِس عقیدہ پر مؤرخ و فلسفی علاّمہ ابنِ خلدون نے باقاعدہ روشنی ڈالی۔ وہ اپنے "مقدمہ" میں لکھتے ہیں کہ ہر دور میں مُسلمانوں کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ آخری زمانہ میں حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خاندان میں سے ایک ایسا شخص ظاہر ہوگا جو مذہب کی از سرِ نو اصلاح و تنظیم کرے گا اور اس کی ذات سے ہر جگہ انصاف کا بول بالا ہوگا۔ تمام مُسلمان اُس کے پیرو ہو جائیں گے اور تمام عالمِ اسلام پر اس کا اقتدار قائم ہو جائے گا۔ وہ شخص "امام مہدیؑ" کہلائے گا۔ اِس زمانے میں "دجال" ظاہر ہوگا اور اس کے ساتھ قیامت کی وہ تمام نشانیاں ظہور پذیر ہو جائیں گی جو صحیح بخاری شریف میں بیان ہوئی ہیں۔ امام مہدیؑ کے ظہور کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا نزول ہوگا اور وہ "دجّال" کا خاتمہ کریں گے۔ یا پھر یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اور امام مہدیؑ کا ظہور بیک وقت ہوگا اور وہ دجال کو قتل کرنے میں امام مہدیؑ کی مدد فرمائیں گے اور ان کے پیچھے وہ مقتدی کی حیثیت سے نماز ادا کریں گے۔[1]

---

[1] Rosenthal F., The Muqaddimah, London 1958, Vol. II, p. 156۔

لفظ "مہدی" کے لغوی معنی بھی یہی ہیں یعنی ایک ایسا شخص جو "ہدایت یافتہ" یا "تبلیغ شدہ" ہو، "رہبر" یا "سردار" ہو یعنی دُوسروں کا رہبر بننے کا ملکہ رکھتا ہو۔ بہت سے محدّثین نے "مہدی" کے متعلق احادیث بیان کی ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص مہدی کے نزول میں اعتقاد نہیں رکھتا، اس کا عقیدہ ناقص ہے اور جو دجّال کے ظاہر ہونے پر یقین نہیں رکھتا، وہ جھوٹا ہے[۱]۔ اسی طرح حضرت رسُول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ایک حدیث ہے کہ ایک ایسا وقت آئے گا جبکہ تمام دُنیا میں ظُلم و جبر اور ناانصافی کا دور دورہ ہوگا۔ اس وقت خداوند تعالےٰ میرے خاندان میں سے ایک ایسا شخص پیدا کریں گے جو میرا ہم نام ہوگا اور اس کے والدِ بزرگوار کا نام بھی میرے والدِ بزرگوار ہی کا نام ہوگا۔ وہ تم میں سات، آٹھ یا نو برس رہے گا اور تمام دُنیا کو اسی طرح انصاف و مساوات سے بھر دے گا جس طرح کہ وہ ناانصافی اور جرائم سے بھرپور تھی[۲]۔ بعض محدّثین نے امام مہدیؑ کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے کتنی مخصوص قسم کی نشانیوں کا ذکر کیا ہے اور اُن کی شکل و شباہت کو بھی انداز اً بیان کیا ہے[۳]۔ لیکن علامہ ابنِ خلدون کے نزدیک یہ سب باتیں محض قیاس آرائیاں ہیں۔ ان کے بقول امام بخاریؒ نے بھی امام مہدیؑ کے متعلق کوئی ایسی حدیث بیان نہیں فرمائی[۴]۔

دراصل لفظ "مہدی" مختلف ادوار میں مختلف معنوں میں استعمال ہوتا رہا — "لسان العرب" میں مہدی کا لقب پہلے چار خُلفا کو دیا گیا اور انھیں خُلفاء الراشدین المہدیّین کہا گیا ہے[۵]۔ علّامہ ابنِ جریر نے یہ لقب حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلم کو

۱؎ The Muqaddimah London 1958, Vol. II, p. 159.

۲؎ Ibid, pp. 182-83.

۳؎ Ibid, p. 166 & pp. 159-86. مکتوباتِ امام ربّانی۔ حضرت مجدد الف ثانی جلد سوم خط ۶۷-۶۸۔ ان خطوں میں آپ نے شیخ ابنِ حجر کے ایک رسالہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جو امام مہدی کے ظہور پذیر ہونے کے متعلق دو سو احادیث پر مشتمل ہے۔

۴؎ The Muqaddimah. Ibid. pp. 177-185.

۵؎ مکتوباتِ امام ربّانی جلد اوّل خط نمبر ۲۵

دیا تھا۔[۱] سلیمان بن صرد نے حضرت امام حسینؓ کو اُن کی شہادت کے بعد مہدی ابن مہدی کے لقب سے یاد کیا تھا۔[۲] اُموی دَور کے عربی کے مشہور شاعر فرزدق اور علامہ ابن جریر نے اِس لقب سے خلفائے اُمیّہ کو بھی ملقّب کیا۔[۳] حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کی وفات (۳۵ھ/۶۵۶ء) کے ساتھ جب اسلامی فتوحات کا پہلا دَور ختم ہوا تو لفظ مہدی کا استعمال بھی خاص معنوں میں کیا جانے لگا۔ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے مسندِ خلافت پر بیٹھتے ہی عالمِ اسلام سیاسی کشمکش کی وجہ سے مختلف گروہوں میں بٹ گیا اور مسلمان اس طوائف الملوکی سے پریشان ہو گئے تو وہ یہ اُمید اور آرزو کرنے لگے کہ انھیں ان حالات سے نکالنے والا کوئی نجات دہندہ آئے گا۔ چنانچہ جب امام حسینؓ میدانِ کربلا میں شہید کر دیے گئے (۶۱ھ/۶۸۰ء) تو مختار بن علی عبید الثقفی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے بیٹے محمد بن الحنفیہ کے مہدی ہونے کا اعلان کر دیا۔[۴] اس کے بعد جب بھی کبھی کسی مسلمان ملک میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی بحران پیدا ہُوا تو وہاں کے بعض من چلے صُوفیاء "مہدی" ہونے کا دعویٰ کرتے رہے۔ تاریخِ اسلام میں ایسے واقعات پائے جاتے ہیں کہ مختلف ادوار میں مختلف لوگوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا اور انھوں نے بعض حدیثوں میں بھی ردّ و بدل کر کے ان کو اپنے دعویٰ کے ثبوت میں اِستعمال کیا۔ خاص طور پر فاطمیوں نے ایسے سیاسی حالات اور احادیث سے فائدہ اُٹھایا کیونکہ ان کے مذہبی عقائد کے مطابق ایسے دعوے داروں کے پھلنے پھولنے کے مواقع موجود تھے۔

---

۱ Encyclopaedia of Islam, Vol II, pp. 289-89.

۲ Ibid, Vol. IV, pp. 521-22.

۳ Ibid, Vol. II, pp. 60-61 & Vol. III, p. 112.

۴ وہ حضرت علیؓ کی زوجۂ محترمہ الحنفیہ کے بطن سے تھے لیکن وہ بذاتِ خود اس دعویٰ کے حق میں نہیں تھے۔

افریقہ اور اسلامی ممالک کے دُور دراز گوشوں میں جہاں فاطمیوں کی حکومت قائم ہوئی اور جہاں مہدویت کے خلاف آواز اُٹھانے والے بھی کم تھے۔ وہاں یکے بعد دیگرے کئی لوگوں نے اپنے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔[1] ایسے لوگوں میں سے ایک ابن تومارات تھا جس نے مراکش میں الموحد خاندان کے دورِ حکومت میں ۱۱۲۲ء میں مہدی ہونے کا دعوےٰ کیا تھا، اس کی سیاسی تحریک بڑی اسم مذہبی تحریک بن گئی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ احیائے اسلام کا علمبردار ہے۔ اسے اپنے مقاصد میں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی تھی۔[2]

شاہ نعمت اللہ ولیؒ[3] کی "فتنۂ آخرالزماں" اور نزولِ مہدی سے متعلق پیش گوئیوں نے بھی پندرھویں صدی عیسوی میں اس عقیدہ کو بڑی تقویت دی۔ ان کی نظمیں جو انھوں

---

[1] The Muqaddimah. Vol II, p. 197.

علامہ ابنِ خلدون نے مقدمہ میں بعض ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اُن میں سے ایک صوفی التویزری تھے جنھوں نے چودھویں صدی میں رباط میں اور العباس نے تیرھویں صدی میں غمارہ میں اپنے مہدی ہونے کا اعلان کیا تھا۔ تاریخ الفی میں بعض ایسے مہدیوں کا ذکر ہوا ہے جنھوں نے مختلف ملکوں میں مختلف ادوار میں اپنے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔

[2] Encyclopaedia of Islam, Vol. II, pp. 426-27.

[3] E. G. Brown, A History of Persian Literature under Tatar Dominion, pp. 463-73.

ان کا اصل نام امیر نورالدین نعمت اللہ تھا اور اُن کے والدِ بزرگوار کا نام میر عبداللہ تھا۔ وہ حلب میں ۷۸۰ھ/۱۳۲۹ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۲۴ سال کی عمر میں مکہ معظمہ کی زیارت کی۔ اس کے بعد زیادہ تر زندگی سمرقند، ہرات اور یزد میں گزاری۔ زندگی کے آخری ۲۵ سال انھوں نے کرمان کے قریب مہان میں گزارے اور وہیں ۲۲ رجب ۸۳۴ھ المطابق ۵ اپریل ۱۴۳۲ء کو وصال کیا۔ شاہ رُخ ابن امیر تیمور نے ان پر بڑی عنایات کی تھیں۔ سلطان احمد شاہ بہمنی نے اُن کے ایک پوتے کو دربار میں مدعو کیا۔ بعد میں ان کے دوسرے دو پوتے بھی اپنے والدِ بزرگوار کے ہمراہ وہاں پہنچے تھے۔ شاہ نعمت اللہ ولی کے خاندان کے جو لوگ ایران میں رہے۔ انھوں نے صفوی شاہی خاندان میں شادیاں کر لی تھیں۔

نے الہامی انداز میں لکھی تھیں۔ اب تک بعض ضعیف الاعتقاد حضرات پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں[۱]۔ پھر ایران میں علاقہ گیلان کے محمود اور اُس کے پیروکاروں نے بھی مہدوی خیالات کو بڑا مقبول بنایا۔ اُس نے اپنے مہدی ہونے کا دعویٰ ۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء میں کیا تھا اور اُس کی تحریک ایران میں شاہ عباس صفوی کے عہدِ حکومت تک بڑی کامیاب رہی تھی[۲]۔

برصغیر ہند و پاکستان میں سُلطان فیروز شاہ (۱۳۵۱ء - ۱۳۸۸ء) کے دورِ حکومت میں "مہدی" عقیدے کو بڑی شہرت حاصل ہُوئی۔ اس کے عہد میں ایک شخص رُکن الدین نے مہدیِ آخرالزماں ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ وہ دہلی کا رہنے والا تھا اور اُس نے اپنے خیالات کی وضاحت میں کتابیں بھی لکھیں اور اعلان کیا کہ وہ اسے پیغمبر تسلیم کریں۔ علماء نے اس فتنہ کی طرف جب سُلطان فیروز کی توجہ دلائی تو انھوں نے اس کو اس کے ساتھیوں اور معتقدوں سمیت قتل کروا دیا[۳]۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک کسی شخص کو مہدی ہونے کا دعویٰ کرنے کی جُرأت نہ ہُوئی۔

پھر حضرت سیّد محمد جونپوریؒ نے جب پندرھویں صدی میں مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تو تاریخِ مہدویہ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہُوا۔ ان سے پہلے جن لوگوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا اُن میں سے اکثر و بیشتر کا مقصد مذہب کے لبادے میں اپنے دور کی یا اپنے ملک کی سیاسیات پر اثر انداز ہونا تھا مگر سیّد محمد جونپوریؒ کے عزائم اُن سب سے مختلف تھے اور وہ صرف احیائے اسلام کے لیے اُٹھے تھے۔

---

[۱] E. G. Brown, A History of Persian Literature under the Tatar Dominion, pp. 463-73.

Muslim Revivalist Movements in Norther India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, pp. 73-74.

[۲] Ibid.

[۳] فتوحاتِ فیروز شاہی۔ علی گڑھ ۱۹۵۴ء ص ۷-۸

سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۴۲۷۔ اس موقعہ پر سب خاص و عام جمع ہو گئے تھے اور اس کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا تھا۔

باب ۲ دوم

سیّد محمّد جونپوری کی مہدوی تحریک

سیّد محمد جونپوریؒ سلطان محمود شرقی (۱۴۴۰ء - ۱۴۵۷ء) کے عہد میں سوموار ۱۴ ار جمادی الاول ۸۴۷ھ کو بمطابق ۹ ستمبر ۱۴۴۳ء جونپور میں پیدا ہوئے[1]۔ ان کے والد بزرگوار کا نام سیّد خاں اور والدہ محترمہ کا نام بی بی آغا تھا جو بعد میں ان کے مریدوں نے بدل کر ظہورِ مہدی کی روایات کے مطابق سیّد عبداللہ اور بی بی آمنہ کر لیا تھا[2]۔ ان کا شجرۂ نسب حسب ذیل ہے:

سیّد عبداللہ بن عثمان بن موسیٰ بن قاسم بن نجم الدین، بن عبداللہ بن یوسف بن یحییٰ، بن نعمت اللہ بن اسماعیل بن موسیٰ کاظم بن جعفرِ صادق بن محمد باقر بن علی بن زین العابدین بن سیدنا امام حسینؑ بن امیر المومنین سیدنا علی بن طالب کرم اللہ وجہہ[3]۔

سیّد محمد جب چار سال اور چار دن کے ہوتے تو ان کے والد نے ان کو بڑے بھائی سیّد احمد کے ساتھ شیخ دانیال خضری جونپوریؒ کی شاگردی میں دے دیا[4]۔ آپ بچپن ہی سے بڑے ہونہار اور بلا کے ذہین تھے۔ انھوں نے سات سال کی عمر میں

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۸ [2] ایضاً، تذکرہ علمائے ہند کے مصنّف ان کے والد کا نام سیّد بدہ اویسی لکھتے ہیں۔ خزینۃ الاصفیاء کے مصنّف (جلد اوّل ص ۴۶۷) یوسف۔ تجلّی نور (جلد اوّل ص ۵۷) سیّد یوسف بڈہ اویسی اور ابوالفضل آئین اکبری (جلد سوم ص ۱۷۴) شیخ بدھ لکھتے ہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی (نجات الرشید (قلمی) ورق ۳۷ ب) پر سیّد خاں لکھتے ہیں [3] تذکرہ علامہ شیخ محمد بن مثنیٰ ص ۵
[4] خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل ص ۴۶۷ تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۹۸، تجلّی نور جلد اوّل ص ۵۸

حفظِ قرآن اور بارہ سال کی عمر میں تمام علومِ ظاہری کی تحصیل مکمّل کر لی تھی۔ اُن کی وسیع معلومات، کثرتِ مطالعہ اور غیر معمولی ذہانت سے بڑے بڑے علماء دنگ رہ جاتے، اسی بنا پر انھیں اسد العُلماء کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا[۱]۔

مہدویوں کے علاوہ معاصرین اور متاخرین علماء و صُوفیاء نے بھی اُن کی علمی استعداد قابلیت اور زہد و تقویٰ کی تعریف کی ہے۔ مولانا عبد القادر بدایونیؒ لکھتے ہیں کہ کوئی شخص اُن کی قابلیت اور خوبیوں سے انکار نہیں کر سکتا[۲]۔ مولانا جمال الدینؒ[۳]، علامہ ابوالفضل[۴]، میاں حاتم سنبھلیؒ[۵] اور شیخ علی متقیؒ[۶] جیسے علمائے نامدار نے بھی ان کی علمی قابلیت اور زہد و ورع کی تعریف کی ہے اور اُن کی بزرگی کو تسلیم کیا ہے۔

مہدوی کتابوں میں لکھا ہے کہ ان کو بہت چھوٹی عمر ہی میں یہ رُوحانی اشارے ہُوا کرتے تھے کہ وہ مہدیِ آخر الزماں ہوں گے اور یہ بھی کہ خواجہ خضر علیہ السّلام اُن کو غائبانہ طور پر رُوحانی تعلیم دیا کرتے تھے۔ انھوں نے اُن کو ذکرِ خفی بھی سکھایا تھا جس کا وظیفہ وہ کھوکھر مسجد جونپور میں دریائے گومتی کے کنارے کیا کرتے تھے[۷]۔

سید محمد جونپوری نے تعلیم سے فارغ ہو کر چھوٹی عمر میں ہی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا اور ان کے درس میں بے شمار طلبا اور عقیدت مندوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ ان کے درس میں امیر و غریب ہر سطح کے لوگ شامل ہوتے۔ اُن میں سے ایک سلطان حسین شاہ شرقی والیِ جونپور بھی تھے[۸]۔ وہ اُن کے علم و معرفت کے بڑے گرویدہ تھے اور اُن سے اپنی وابستگی کا اظہار بڑے فخر سے کیا کرتے تھے۔

---

۱ سیرت امام مہدیِ موعود ص ۱۸-۱۹، مطلع الولایت ص ۱۱-۱۲، شواہد الولایت ص ۳۸، جنت الولایت ص ۹-۱۰، تجلیِ نور جلد اوّل ص ۵۸ ۲ نجات الرشید قلمی نسخہ، حبیب گنج، علی گڑھ یونیورسٹی۔

۳ ابوالکلام آزاد: تذکرہ (لاہور) ص ۳۲۔ مولانا جمال الدین نے ان کے حق میں ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

۴ آئینِ اکبری (لکھنؤ ۱۸۹۲ء) جلد سوم ص ۱۷۴ ۵ منتخب التواریخ جلد سوم ص ۶۷

۶ شیخ علی متقی: رسالہ درجواب عبدالملک (قلمی نسخہ رام پور لائبریری ورق ۹ ب - ۱۲ ا) (جاری ہے)

بعض تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان حسین راؤ دلپت رائے والی گوڑ سے خائف تھا۔ چنانچہ سید محمدؒ نے اُن کو نصیحت کی کہ تمھیں بحیثیت ایک مسلمان کے کافر راجہ کے سامنے دب کر نہیں رہنا چاہیے۔ سلطان حسین نے عرض کیا کہ اگر آپ اس معاملہ میں میری مدد فرمائیں تو میں راؤ دلپت رائے کے خلاف جنگ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ انھوں نے ان کو فتح و نصرت کا یقین دلایا اور اس جنگ میں خود بھی شرکت کی۔ اس معرکہ میں سلطان حسین شرقی کے پاس ۵۰ ہزار فوج تھی۔ علاوہ ازیں ۱۵ ہزار بیراگیوں کی فوج بھی سید محمدؒ کے زیر کمان تھی۔ اس کے مقابلہ میں راجہ راؤ دلپت رائے کے پاس ۷۰ ہزار فوج تھی۔ چنانچہ اس جنگ میں سید محمدؒ نے بڑی جرأت و بہادری کا ثبوت دیا۔ انھوں نے راجہ کو شکستِ فاش دی لیکن جب انھوں نے اس کو قتل کیا تو اس کا دل سینے سے باہر گر پڑا جس پر اس بُت کا نشان نقش تھا جس کی وہ پوجا کیا کرتا تھا۔[1] اس واقعہ سے ان کے دل پر بڑا اثر ہوا اور انھوں نے سوچا کہ اگر ایک بُت اپنے پوجا کرنے والے پر اس قدر گہرا اثر چھوڑ سکتا ہے تو اس ذاتِ باری کی تجلیات کا دل پر کس قدر اثر ہوتا ہوگا۔ جو کہ کل کائنات کا مالک ہے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ بارہ سال تک عبادات اور ریاضاتِ شاقہ میں ہمہ تن مصروف رہے۔ روایت ہے کہ وہ اس دوران میں پہلے سات سال بالکل بھوکے رہے اور آخری چند سال صرف چند نوالے اور چند گھونٹ پانی پر گزارہ کر لیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان حسین شاہ شرقی نے ایک ایک دفعہ ان کو درگاہ اور مریدوں کے اخراجات کے لیے سات قصبات بطور عطیہ پیش

(گزشتہ سے پیوستہ) ے مطلع الولایت ص ۱۲ شواہد الولایت ص ۳۹ ۵ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۸

لے سیرت امام مہدی موعود ص ۲۳-۲۴۔ مطلع الولایت ص ۱۳-۱۸

شواہد الولایت ص ۴۴-۵۲

کیے مگر انھوں نے اس سے متعلقہ شاہی فرمان کو پھاڑ کر پھینک دیا[1]۔

جب سیّد محمد چالیس سال کے ہوتے تو سلطان حسین شاہ شرقی کے کئی بار درخواست کرنے کے باوجود ۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء میں جونپور سے ہجرت کر گئے تاکہ وہ ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی جاکر تبلیغ کریں۔ اِس سفر میں ان کے ہمراہ اُن کی زوجہ محترمہ اللہ دی بیٹے سیّد محمود، خلیفہ میاں شاہ دلاور اور شیخ بھیک اور بہت سے دُوسرے احباب بھی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ داناپور (عظیم آباد، پٹنہ) پہنچے تو اُن کی زوجہ محترمہ، بیٹے سیّد محمود اور خلیفہ شاہ دلاور کو رُوحانی اشارہ ہُوا کہ وہ مہدی ہیں اور اپنے مہدی ہونے کا اعلان کر دیں۔ انھوں نے خُود بھی اس اشارہ کی تصدیق تو کی مگر فرمایا کہ اِس حقیقت کا اعلان ہم خدا کے حُکم سے ایک معیّنہ وقت پر کریں گے[2]۔ داناپور سے پھر وُہ کالپی و چندیری ہوتے ہُوتے مانڈو پہنچے۔ وہاں کے بے شمار لوگ ان کے پاکیزہ اخلاق، سُنّتِ نبوی کے اتّباع اور مواعظِ حسنہ سے ہدایت یاب ہُوتے۔ سلطان غیاث الدّین خلجی (۱۴۶۹-۱۵۰۰ء) والیِ مالوہ کو جب ان کے علم و معرفت کی خبر ہُوئی تو اس نے بھی اُن کی زیارت کی خواہش کی لیکن اس وقت وہ اپنے بیٹے نصیر الدّین (۱۵۰۰-۱۵۱۱ء) کے زیرِ حراست تھا۔ اِس لیے اپنی اس حسرت کو پُورا نہ کرسکا۔ تاہم اس نے اُن کو پیغام بھجوایا کہ وہ اپنے چند مریدوں کو میرے پاس ضرور بھیجیں تاکہ میں اُن سے مستفید ہو سکوں۔ اس پر انھوں نے اپنے دو مریدوں سیّد سلام اللہ اور میاں ابوبکر کو اس کے پاس بھیجا[3]۔ سلطان غیاث الدّین خلجی نے اُن پر سونے اور چاندی کے سِکّوں کی بارش کر دی اور اُن

---

[1] سیرت امام مہدیؑ موعود ص ۲۲-۲۳، مطلع الولایت ص ۱۲-۱۸، شواہد الولایت ۴۲-۵۲
[2] سیرت امام مہدیؑ موعود ص ۳۶-۳۷، مطلع الولایت ص ۱۹-۲۰، شواہد الولایت ص ۵۲-۵۳، تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۹۹
[3] طبقات اکبری جلد سوم ص ۳۵۲-۳۵۴، لکھتے ہیں کہ سلطان غیاث الدّین خلجی بڑا خُوش اعتقاد انسان تھا۔ ایک بار اُن کے پاس ایک شخص کسی گدھے کا کھُر لایا اور بتایا کہ یہ خرِ عیسٰےؑ کا کھُر ہے۔ تو وہ بڑا خُوش ہُوا اور اسے ۵ ہزار تنگہ دے کر وہ کھُر خرید لیا۔ اسی طرح بعض دوسرے اشخاص نے (جاری ہے)

سے سیّد محمدؒ کے متعلق بڑی تفصیل سے دریافت کیا۔ اُن کے جوابات سے وہ بڑا متاثر ہوا، اور اُن کے مہدیٔ آخرالزماں ہونے پر ایمان لے آیا۔ اُس نے اُن کو بطورِ فتوح کے بہت سے مال و زر بھی نذر کیا لیکن انھوں نے اس کی طرف نگاہ تک نہ کی اور خود رکھنے یا مریدوں میں تقسیم کرنے کے بجائے اس کو سلطان کے ملازموں ہی میں بانٹ دیا۔ جب لوگوں نے ان سے سوال کیا کہ انھوں نے اس رقم کو کیوں قبول نہیں کیا تو فرمایا کہ میرے مرید اور ارادتمند کسی دُنیاوی مال و متاع کے لالچ کے بغیر خدائے برحق کی تلاش میں ہیں اور انھیں ایسی چیزوں کی ضرورت نہیں[1]۔

اِس موقعہ پر سُلطان غیاث الدین خلجی کے خاص امرا میں سے ایک میاں الہداد حمید بھی اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے[2]۔ وہ بڑے پایہ کے عالم، عمدہ شاعر، اور بلند پایہ مُصنّف تھے اور بڑی شہرت کے مالک تھے۔ بعد میں وُہ مہدویوں کے خلیفۂ ششم ہوتے۔ اُن کی کثیر التعداد تصنیفات ہیں جن میں سے مرثیہ مہدیٔ موعود، ایک دیوان، رسالہ بارِ امانت اور رسالہ در ثبوت مہدیت بڑی مشہور ہیں۔ ان کی اِن تصنیفات سے مہدوی تحریک کو بھی بڑی تقویت اور شہرت حاصل ہوتی۔ ان کے ایک قابلِ قدر شاگرد ابن خواجہ طٰہٰ صاحب دیوانِ مہری بھی بڑے قابلِ قدر انسان تھے[3]۔

اس کے بعد سیّد محمدؒ نے ۸۸۸ھ/۱۴۸۴ء میں جاپانیر پہنچ کر وہاں کی جامع مسجد میں ڈیرے جما دیے[4]۔ وہاں بے شمار لوگ اُن کی وعظ و تلقین سننے آتے تھے۔ اُن

(گزشتہ سے پیوستہ) اس کے پاس دھو کے سے تین گھوڑ ۵۰ ہزار تنگہ فی گھوڑ کے حساب سے بیچ دیے۔ پھر پانچویں بار ایک دھوکے باز اُن کے پاس ایک گھوڑا لایا تو اسے بھی اُس نے ۵۰ ہزار تنگہ دے دیے۔ اس بار اس کے ایک شاہی امیر نے عرض کیا کہ شاید خرِ عیسٰے کی پانچ ٹانگیں تھیں؟ اُس نے کہا شاید اس پانچویں شخص نے صداقت سے کام لیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ غلط ہی ہوں۔

[1] سیرت امام مہدیٔ موعود ص ۴۴-۴۷، مطلع الولایت ص ۲۱-۲۶ شواہد الولایت ص ۵۹-۶۴ [2] ایضاً ص ۶۵ نجات الرشید ص ۲۶ [3] تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۹۹

ہیں سے ایک سلطان محمود بیگڑہ (۱۴۵۹ء-۱۵۱۱ء) بھی تھے۔ وہ ان سے بہت متاثر ہوتے اور انھوں نے بھی ان سے ذاتی طور پر ملاقات کی خواہش کی مگر بعض اُمراء نے ان کی ملاقات کو مصلحتِ حکومت کے خلاف سمجھا۔ سیّد محمد وہاں تقریباً ڈیڑھ سال رہے اور اس دوران میں ہزاروں لوگ ان سے مستفیض ہوئے۔ اسی زمانے میں میاں نظام بھی اُن کے مرید ہوگئے۔ وہ ان دنوں مدرسہ مسجدِ اسلام کے طالب علم تھے اور بعد میں مہدوی تحریک کے بڑے اہم رُکن ثابت ہوئے۔[۲] اسی جگہ ان کی اہلیہ وفات پاگئیں اور وہیں قلعہ میں دفن ہوئیں۔[۳]

وہاں سے پھر وہ برہان پور ہوتے ہوئے دولت آباد پہنچے اور اس جگہ کے صوفیا کے مزارات کی زیارت کی۔[۴] پھر وہ احمد نگر پہنچے، اِن دنوں وہاں ملک احمد نظام شاہ اوّل (۱۴۹۰ء-۱۵۰۸ء) کی حکومت تھی۔ وہ بھی اِن کا گرویدہ ہوگیا اور اس نے ان سے بیٹے کی ولادت کے لیے دُعا کی خواہش کی۔ چنانچہ اُن کو اللہ تعالےٰ نے بیٹا عطا فرمایا۔ جس کا نام انھوں نے بُرہان نظام رکھا۔ بعد میں وُہ سات برس کی عُمر میں سُلطان بُرہان نظام شاہ اوّل کے نام سے (۱۵۰۸ء-۱۵۵۳ء) سلطنت کا وارث ہوا۔[۵]

احمد نگر سے پھر وہ بیدر پہنچے۔ وہاں اُن دنوں ملک قاسم برید کی حکومت تھی اور وہاں بھی بے شمار لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے۔[۶] ان میں سے بعض جیّد علما بھی تھے۔ جن میں سے شیخ مومن توکلی، مُلّا ضیا، قاضی علاءالدین اور قاضی منتخب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے بعد میں قاضی منتخب نے مہدوی عقائد پر ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔[۷]

---

۱ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۹

۲ ایضاً ۳ ایضاً ۴ مطلع الولایت ص ۲۷-۲۹ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۹

۵ مطلع الولایت ص ۲۹-۳۴ ۶ شواہد الولایت ص ۴۷-۸۴

۷ تذکرہ علمائے ہند ایضاً تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی ص ۵۳ ۸ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۹

احمد نگر سے پھر وہ گلبرگہ گئے اور وہاں مخدوم سید محمد گیسو دراز بندہ نوازؒ کے مزار کی زیارت کی[1]

اس سفر کے بعد پھر وہ اپنے ۳۶۰ پیروکاروں کے ساتھ ۹۰۱ھ/۱۴۹۵-۱۴۹۶ء[2] میں بندرگاہ دابھول سے بحری جہاز میں مکہ معظمہ چلے گئے جہاں انھوں نے طوافِ کعبہ کے بعد مقام رکن یمانی اور مقامِ ابراہیم کے درمیان (۹۰۱ھ/۱۴۹۵-۱۴۹۶ء میں) کھلم کھلا اپنے مہدی ہونے کا اعلان کیا۔[3] اُن کے مریدوں میں سے میاں نظام اور قاضی علاءالدین کے علاوہ ایک عرب نے بھی اُن کی مہدویت کی شہادت دی۔ تاریخِ مہدویہ کے مطابق یہ اُن کے مہدی ہونے کا سب سے پہلا اعلان اور دعویٰ سمجھا جاتا ہے[4]۔ اس کے بعد وہ چند ماہ مزید مکہ معظمہ میں رہے مگر مدینہ منورہ میں حاضری دیئے بغیر ہندوستان واپس چلے آئے۔[5] جدہ سے وہ کھنبائت یا دیو پہنچے اور پھر دوبارہ احمد آباد چلے گئے جہاں انھوں نے جمال دروازہ کے قریب مسجد تاج خاں بن سالار میں اپنے ڈیرے جما دیئے۔ وہاں وہ ڈیڑھ سال تک مقیم رہے اور اس دوران میں ہزاروں لوگوں نے اُن کا درس و وعظ سُنا۔ وہاں بہت سے لوگ ان کے مرید بھی ہوئے جن میں سے ملک گوہر اور ملک بُرہان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو بعد میں ان کے خلفائے اجل میں سے ہوئے[6]۔ اس بار پھر سلطان محمود بیگڑہ نے ان کی زیارت کی خواہش کی لیکن اُمراء حکومت نے سلطنت کی فلاح و بہبود کے پیشِ نظر انھیں اُن کی ملاقات سے محروم رکھا[7]۔ ایک روز احمد آباد میں انھوں

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۹ - ۲۰۰

[2] ایضاً ص ۲۰۰ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی ص ۵۲

[3] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۰ [4] ایضاً

[5] ایضاً۔ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی ص ۵۲-۵۴، مطلع الولایت ص ۳۶ - ۴۱۔ شواہد الولایت ص ۸۹-۹۴۔ مرآۃ سکندری ص ۱۳۶ [6] تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی ص ۵۶

نے لوگوں سے کہا کہ میں ان مادی آنکھوں سے تمھیں اسی دُنیا میں خُدا دکھا سکتا ہوں۔ اس پر وہاں کے بعض عُلما اُن کے خلاف ہو گئے اور انھوں نے ان کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا لیکن وہاں کے ایک اور عالم مولانا تاج نے اس فتویٰ کی مخالفت کی اور کہا کہ تم لوگ ایک سید کے خلاف فتویٰ جاری نہیں کر سکتے[1]۔ اسی مسجد تاج خاں بن سالار میں انھوں نے دوبارہ ۹۰۳ھ/ ۱۴۹۷ء-۱۴۹۸ء میں اپنے مہدیٔ آخر الزماں ہونے کا دعوےٰ کیا[2]۔ اس موقعہ پر بہت سے علماء، وُزراء، شہزادے اور سپاہی اُن کے معتقد ہو گئے۔ ان حالات میں بعضوں کو یہ شک گزرا کہ اُن کی یہاں موجودگی کہیں سلطنت کے لیے خطرے کا باعث نہ ہو۔ اس لیے بعض اُمراء نے سلطان محمود بیگڑہ کو مجبور کیا کہ وہ اُن کو یہاں سے ملک بدر کر دیں۔ جب یہ حکم اُن کے پاس پہنچا تو انھوں نے فرمایا" یہ ممکن نہیں کہ تمام باطنی و رُوحانی حقائق تمام لوگوں کو بتا دیے جائیں۔ اگر میں ایسا کہ نا شروع کر دوں تو پھر دُنیا جل کر راکھ ہو جائے گی۔ میں تو صرف شریعتِ محمدیؐ کا پرچار کرتا ہوں[3]"

احمد آباد سے اُٹھ کر وہ اس کے نواح میں ایک گاؤں سولا سنتج چلے گئے۔ جہاں اُن کے حلقۂ ارادت میں ایک مشہور ڈاکو میاں نعمت شامل ہو گئے۔ جو بعد میں اُن کے خلفائے کبار میں سے ہوئے[4]۔ وہاں سے پھر وہ پٹن/ نہر والہ اور احمد آباد کے درمیان سودا نام کے ایک گاؤں اور بالآخر پٹن پہنچ گئے جہاں انھوں نے اپنے ڈیرے حوض خان سرور کے پاس لگا دیے۔ یہاں بھی بے شمار لوگ اُن کے مرید ہو گئے جن میں سے بعض ذی مرتبت صوفیاء

---

[1] مرآۃ سکندری ص ۱۳۸

[2] شواہد الولایت ص ۱۱۳، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۰

[3] سیرت امام مہدیٔ موعود ص ۷۰-۷۲، مطلع الولایت ص ۴ ۵-۵۷، شواہد الولایت ص ۱۱۷-۱۱۸

[4] سیرت امام مہدیٔ موعود ص ۷۰-۷۲، تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۰۰

اور کئی مجذوب بھی شامل تھے۔ اُن میں سے ایک میاں سیّد خوندمیر بھی تھے جو اُن ہی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بعد میں مہدوی تحریک کے بڑے اہم رُکن و خلیفہ ثابت ہوتے پھر وہ پٹن سے برلی پہنچے۔ یہاں بھی وہ ڈیڑھ سال رہے اور اس جگہ بھی انھوں نے ایک بار پھر اپنے مہدی ہونے کا (۹۰۵ھ/۱۴۹۹۔۱۵۰۰ء میں) دعوےٰ کیا۔ یہ اُن کا تیسرا دعویٰ تھا اور تاریخ مہدویہ میں دعویٰ مؤکدہ کے نام سے مشہور ہے[۱]۔ اس موقعہ پر پٹن کے ایک مشہور عالم مُلّا معین الدین کھُلم کھُلا اُن کے مخالف ہو گئے اور اُن کے ساتھ بہت سے دُوسرے لوگ بھی شامل ہو گئے۔ وہ ان سے مناظرہ کرنے کے لیے پٹن کی جامع مسجد میں پہنچے لیکن مُلّا معین الدین اُن کی تاب نہ لا سکے اور لاجواب ہو گئے۔ وہ پھر واپس برلی آ گئے اور وہاں کے عُلماء کے ساتھ بھی مباحثہ و مناظرہ کیا مگر سب کو لاجواب کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے کئی قبیلوں کے بہت سے لوگ اُن کے مرید ہو گئے۔ اُن میں سے بعض فن کار اور بعض سپاہی بھی تھے۔ اس کے بعد وہاں کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے سُلطان نے اُن کو وہاں سے علماء کے ایماء پر چلے جانے کا حکم دے دیا[۲]۔

پہلے انھوں نے یہاں سے دہلی جانے کا ارادہ کیا لیکن بعد میں خراسان ہجرت کر جانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ وہاں اُن دِنوں سُلطان حسین مرزا کی فیاضیوں سے علم و ہنر کے چشمے پھُوٹ رہے تھے اور جگہ جگہ علمی و ادبی مراکز قائم ہو رہے تھے[۳]۔ چنانچہ وہ برلی سے ۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء میں قصبہ نظراد ہوتے ہوتے جالور پہنچے (۹۰۷ھ/۱۵۰۱ء) وہاں کے حاکم ملک بڈھن خان اور اُس کے اُمراء نے بھی اُن کو مہدی آخرالزماں تسلیم کر لیا[۴]۔

---

[۱] تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۰۰ - سیرت امام مہدی موعود ص ۷۲ - ۸۶

[۲] ایضاً ص ۸۲ - ۸۳ - مطلع الولایت ص ۵۴ - ۵۵ ؛ تذکرہ علمائے ہند - تاریخ پالن پور از سیّد گلاب میاں ص ۲۰۰ - ۲۰۱

[۳] بابرنامہ میں بابر بادشاہ نے سلطان حسین مرزا کی علم پروری کی تصویر کشی کی ہے۔

[۴] گلاب میاں تاریخ پالن پور ص ۲۸ - ۳۰ تذکرۂ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدّث پٹنی ص ۵۸ - ۵۹

اس کے بعد وہ جیسلمیر، ناگور، نصر پور ہوتے ہوئے سندھ میں ٹھٹھہ پہنچے اور وہاں بھی ڈیڑھ سال رہے لیکن وہاں کے علماء بھی اُن کے اور اُن کے مریدین کے خلاف ہو گئے اور انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ ان تمام کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا جائے لیکن سندھ کے حاکم جام نندا (۱۴۶۱-۱۵۰۹ء) نے اُن کو روک دیا۔ اس کے بعد وہاں کے قاضی قاضن اور شیخ صدرالدین اور کئی دوسرے علماء بھی اُن کے مرید ہو گئے۔[1]

اُنھوں نے ٹھٹھہ سے اپنے دو خلفاء خوندمیر اور شاہ نعمت کو تو بہت سے مریدوں کے ساتھ واپس گجرات بھیج دیا اور خود اپنے پیروکاروں کے ساتھ ہرات کا سفر اختیار کیا۔ اس وقت اُن کے ساتھ نو سو گھرانے تھے جن میں ۳۶۰ اُن کے خاص مرید تھے۔ بالآخر وہ قندھار پہنچے۔ اُن دنوں وہاں میر ذوالنون کا بیٹا مرزا شاہ بیگ ارغون حکمران تھا۔ اُسے جب ان کے متعلق معلوم ہوا تو دعوئ مہدویت ثابت کرنے کے لیے اُن کو جامع مسجد میں بلوایا اور اس نے اور دوسرے علماء نے جب اُن کا درس و وعظ سنا تو وہ تمام ایسے متاثر ہوئے کہ وہ بھی اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔[2]

اس کے بعد وہ فرہ پہنچے۔ وہاں اُن دنوں سلطان حسین مرزا کی طرف سے میر ذوالنون حاکم تھے اور وہاں ان سے پہلے دو تین شخص دعوئ مہدویت کر چکے تھے جن کو میر ذوالنون نے قتل کروا دیا تھا۔ جب اُس نے اُن کے متعلق سنا تو اُن کو بھی قتل کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ اُس نے ان کو ملاقات کے لیے بلوایا اور دورانِ گفتگو میں ان سے پوچھا کہ سنا ہے، مہدئ آخرالزماں پر تلوار یا آگ کا اثر نہیں ہوگا۔ انھوں نے جواب دیا

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۱۔ سیرت امام مہدی موعود ص ۱۱۹-۱۲۰

S. H. Hodivala, Studies in Indo-Muslim History (Critical commentary on Elliot Dowsons History of India) Vol. I, Bombay 1939, 103.

[2] سیرت امام مہدئ موعود ۱۱۹-۱۲۲، مطلع الولایت ص ۷۵-۷۹۔
شواہد الولایت ص ۲۱۵-۲۱۷

کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی مہدی آخرالزماں کو قتل نہیں کر سکے گا۔ میر ذوالنون نے پہلے ہی سے بندوبست کر رکھا تھا کہ جب ان سے یہ سوال پوچھا جاتے تو انھیں فوراً تلوار کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔ جس غلام کو یہ حکم ملا تھا اس نے جب ان پر تلوار کا وار کرنا چاہا تو وہ ان کی روحانیت وشخصیت سے اتنا متاثر ہوا کہ کچھ نہ کر سکا۔ میر ذوالنون اس صورتِ حال سے بڑے متاثر ہوئے اور وہ بھی اُن کے معتقد ہو گئے[5]۔ اس واقعہ کے بعد فرہ میں اُن کو بڑی عزّت وشہرت ملی۔ جب اُن کا چرچا ہرات پہنچا تو وہاں کے شیخ الاسلام نے اپنے دو شاگردوں کو اُن کے پاس سوال وجواب اور حصولِ معلومات کے لیے بھیجا۔ وہ ان سے ملتے ہی اُن کے مرید ہو گئے۔ جب یہ خبر شیخ الاسلام کو ملی تو وہ بھی وہاں سے اُن کی زیارت کے لیے چل دیے لیکن ابھی وہ سبزوار ہی پہنچے تھے کہ انھیں ان کے وصال کی خبر مل گئی[1]۔

سیّد محمّد جونپوری کا وصال ۶۳ سال کی عمر میں بروز سوموار ۱۹ ذی قعدہ ۹۱۰ھ مطابق ۲۳ اپریل ۱۵۰۴ء کو ہوا اور انھیں فرہ ہی میں سپردِ خاک کیا گیا[2]۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقعہ پر اُن کے خلیفہ میاں الہداد نے ان کی قبر پر ایک بڑا دردناک مرثیہ پڑھا تھا[3]۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کے بہت سے مرید واپس ہندوستان چلے آئے اور جو تھوڑے بہت فرہ میں رہے، اُن میں سے ایک شیخ محمد فراہی تھے جنھوں نے بعد میں اپنے عیسیٰ ہونے کا دعوےٰ کیا تھا[4]۔ ان کی تحریک فرہ میں کافی کامیاب ومقبول ہوئی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب وہاں شاہ اسماعیل صفوی اور شاہ طہماسپ صفوی نے سیّد محمد جونپوری کا مزار

---

[1] سیرت امام مہدی موعود ص ۱۲۶-۱۲۷۔ مطلع الولایت ص ۸۱-۸۴۔ شواہد الولایت ص ۲۱۸-۲۲۸

[2] سیرت امام مہدی موعود ص ۱۲۹ مطلع الولایت ص ۹۸ ۔ شواہد الولایت ص ۳۲۸

[3] ایضاً مطلع الولایت ایضاً سیرت امام مہدی موعود ایضاً۔ میراں سید محمود نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ فی الحقیقت وہ موضع "روج" اور "فرہ" کے درمیان مدفون ہوئے تھے۔ ان کی قبر پر شاہ قسم عراقی نے ایک گنبد بنوایا۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ تاریخ پالن پور (اُردو ایڈیشن) جلد اوّل ص ۸۴

[4] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۱

[5] شواہد الولایت، نجات الرشید (قلمی نسخہ حبیب گنج، علی گڑھ یونیورسٹی) ورق ۳۷ ا - ۳۹ ب

مسمار کرنے کی کوشش کی تو لوگوں نے بے حد مخالفت کی اور وہ اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے[1] بعض مہدویوں نے مہدوی تحریک کو غور، اندخود، ہرات، اور قندھار میں پھیلانے کی کوشش کی لیکن اُن کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی[2] اور اس دور کے ازبکوں اور صفویوں کی سیاسی جدوجہد اور سنی شیعہ کشمکش سدِ راہ ثابت ہوئی۔

مُلا عبدالقادر بدایونیؒ منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں کہ سید محمدؒ ایک عارفِ صادق تھے اور فقر و معرفت کی دُنیا میں وہ بڑے پایہ کی ہستی تھے لیکن اُن کے مریدوں نے غلط راستہ اختیار کر لیا[3] مفتی غلام سرور لاہوریؒ لکھتے ہیں کہ وہ بڑے حال مست بزرگ تھے۔ جس طرح بعض صوفیاء نے جذب و مستی کی حالت میں "اَنَا اللہ" اور "انا الحق" کہہ دیا تھا اسی طرح ان کی زبان سے بھی "انا مہدی" نکل گیا تھا۔ لیکن جب وہ ہوش میں آئے تو تائب ہوئے اور اپنے مہدی موعود ہونے سے انکار کیا۔ تاہم بعض جاہل لوگوں نے اُن کی دُوسری بات کا اعتبار نہ کیا اور اُن کی پہلی بات پر ہی اصرار کیا اور وُہ اُن کو مہدیٔ موعود سمجھنے لگے۔ گویا وہ تمام چاہِ ذِلت میں گِر گئے اور دُوسرے ۷۲ فرقوں کی طرح اپنے فِرقہ کو "مہدویہ" کہنے لگے[4] وہ مزید لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کے خیال میں اُن کے "انا مہدی" کہنے سے مطلب امام مہدیؑ نہ تھا بلکہ اس کا مطلب ہادی و مہدی تھا اور یہ اسی طرح ہے جس طرح کہ بعض لوگ اولیائے کرام کو اُن کی رُوحانی بلندی و وصف کی بناء پر ہادی و مہدی کہہ دیا کرتے ہیں[5]۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خُود سید محمد جونپوریؒ نے اپنے پیروکاروں کو سمجھایا کہ میں مہدیٔ موعود نہیں ہوں لیکن انھوں نے ان کی بات کا یقین نہ کیا اور اپنے ہی

---

[1] نجات الرشید ایضاً ورق ۳۷ ا۔ ۳۹ ب، شواہد الولایت ص ۴۷۰

[2] سید مصطفےٰ تشریف اللہ دیباچہ سراج الابصار حیدر آباد ۱۳۶۵ھ ص ۲۳۱

[3] بحوالہ تجلّیٔ نُور جلد اوّل ص ۵۹

[4] ایضاً

[5] ایضاً ص ۵۹ - ۶۰

عقیدہ پر قائم رہے[۱]۔ شیخ عبدالرحمن چشتیؒ مرآۃ الاسرار میں لکھتے ہیں کہ سید محمدؒ بہت بڑے عارف تھے لیکن کشف میں غلطی کر گئے[۲] اور علامہ ابوالفضل آئینِ اکبری میں لکھتے ہیں کہ سید محمد علومِ ظاہری و معنوی کے بڑے عظیم المرتبت عالم تھے لیکن دیوانگی کی حالت میں دعوئ مہدویت کے مرتکب ہوئے[۳]۔

مولانا ابوالکلام آزاد اُن کی مہدوی تحریک کے متعلق لکھتے ہیں "میرا خیال ہے کہ اس کی بنیاد صداقت و حق پرستی پر تھی۔ یعنی دعوت و تبلیغ و احیاءِ شریعت و قیام فرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس کا مقصدِ اعلیٰ تھا اور خود سید محمدؒ اور اُن کے پیرووں کی پہلی جماعت کے اکثر لوگ بڑے ہی پاک نفس اور خدا پرست لوگ تھے[۴]۔" وہ مزید لکھتے ہیں کہ "عشق کی صداقت اور قلب کی پاکی نے اُن کی دعوت و تذکیر میں ایسی تاثیر پیدا کر دی تھی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں آدمی ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور متعدد سلاطینِ وقت نے اُن سے بیعت کی۔ ان لوگوں کے طور طریق کچھ عجیب عاشقانہ و والہانہ تھے اور ایسے تھے کہ صحابۂ کرام کے خصائصِ ایمانی کی یاد تازہ کرتے تھے۔ عشقِ الٰہی کی ایک جاں سپار جماعت تھی جس نے اپنے خون کے رشتوں اور وطن و زمین کی فانی الفتوں کو ایمان و محبت کے رشتہ پر قربان کر دیا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راہِ حق میں ایک دوسرے کے رفیق و غمگسار بن گئے تھے۔ امیر و فقیر، اعلیٰ و ادنیٰ سب ایک ہی حال اور ایک ہی رنگ میں رہتے اور بجز خلق اللہ کی ہدایت و خدمت اور احکامِ شرع کے اجراء و قیام کے اور کسی کام سے واسطہ نہ رکھتے[۵]۔"

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

---

[۱] بحوالہ تجلّی نور جلد اوّل ص ۵۹
[۲] ایضاً ص ۶۰
[۳] تذکرہ
[۴] ایضاً
[۵] ایضاً ص ۵۹ - ۶۰

"حقیقت یہ ہے کہ سید محمد جونپوریؒ کی تحریک حالاتِ گرد وپیش کے خلاف ایک زبردست بغاوت کا اعلان تھی ۔ مادیت کی وبا ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ شریعت سے انحراف روز بروز ترقی کر رہا تھا۔ علمائے سُوء نے دین کی بے حرمتی پر کمر باندھ رکھی تھی اور سیدھے سادے انسانوں کو گمراہ کر رہے تھے۔ صوفیا نے شریعت و طریقت کی تفریق میں اپنی بے راہ روی کا جواز تلاش کر لیا تھا۔ اُمراء و سلاطین ہنگامہائے ناؤ ونوش میں مدہوش تھے۔ اس صورتِ حال نے سید محمدؒ کے حساس قلب میں کرب و بے چینی پیدا کر دی۔ انھوں نے اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا فیصلہ کر لیا[1]۔"

وہ مزید لکھتے ہیں :

"فقیروں کی عیاشانہ زندگی، طالب علموں کی بے راہ روی، تعویذ گنڈوں میں بے جا اعتقاد، جنوں اور دیووں کے قصّے، چراغِ سلیمان کی داستانیں کسی مضبوط معاشرہ یا محکم اخلاقی نظام میں اسی طرح عام نہیں ہوسکتی تھیں۔ حقیقت میں مہدوی تحریک اس ذہنی انحطاط اور مذہبی جمود کو دُور کرنے کی ایک کوشش تھی[2]۔"

مولانا ابوالکلام آزاد اور پروفیسر خلیق احمد نظامی نے سید محمدؒ اور اُن کی تحریک کا بڑا صحیح جائزہ لیا ہے۔ بھارت و پاکستان کی تاریخ کے جس دور میں سید محمدؒ اور اُن کے رُفقاء نے جنم لیا۔ وہ بڑا بے ثباتی کا دور تھا۔ اس کی اخلاقی پستی، سماجی حالت اور مذہبی

---

[1] حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ص ۲۷۰

[2] سلاطینِ دہلی کے مذہبی رُجحانات ص ۴۵۱

گمراہی کے عجوبۂ روزگار قصّے افسانۂ شاہاں اور تاریخِ داؤدی میں تفصیل سے ملتے ہیں[1]۔
دراصل حکومتِ شرقی کا آفتاب اس وقت غروب ہونے کو تھا۔ صوبائی حکومتوں کا عروج و زوال ایک عام کہانی بن چکی تھی اور کوئی ایسی مرکزی حکومت قائم نہ تھی جو کہ لوگوں کو احکامِ شرعیہ کا پابند بنا سکتی۔ اس وقت ہر طرف مادّہ پرستی، شریعت سے انحراف اور دھوکے اور لوٹ مار کا دَور دورہ تھا۔ فی الحقیقت سیّد محمدؒ کی یہ تحریک اُس دور کے سماجی، سیاسی اور مذہبی بُحران کے خلاف ایک احتجاج تھا۔ انھیں اپنے عزائم میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ جس کا سبب اُن کا خلوص، اُن کا عمدہ کردار اور اُن کا علم تھا۔ ان کے ہم عصر اُن کے متعلق لکھتے ہیں کہ وُہ بڑے بے لوث، محنتی اور عبادت و ریاضت کرنے والے انسان تھے اور کوئی بھی راسخ العقیدہ عالم اُن کے زُہد و تقویٰ اور علم پر نکتہ چینی نہ کر سکا۔ اُن کے نیک اعمال و کردار کا اُن کے مریدوں پر بڑا اثر تھا۔ اُن سے پہلے مہدویت کا دعوےٰ کرنے والوں سے اُن کے عزائم بڑے مختلف تھے۔ وہ لوگوں کی مذہبی و رُوحانی اصلاح و بہبود کے خواہاں تھے۔ انھوں نے یہ کبھی دعویٰ نہ کیا کہ وہ ایک نئے مذہب کا پرچار کر رہے ہیں، بلکہ انھوں نے بار بار یہ اعلان کیا کہ وہ صحیح معنوں میں احیائے اسلام اور صحیح طریقہ سے قرآن و سُنّت و شریعتِ محمدیہ کی پابندی چاہتے ہیں[2]۔ اُن کے حلقہ میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ یہاں تک کہ چور اور ڈاکو بھی اپنا پیشہ چھوڑ کر اُن کے مرید ہو گئے تھے اور انھوں نے باقی ماندہ زندگی خُدا کے لیے وقف کر دی تھی۔ سیّد محمدؒ نے اپنے مریدوں اور ہم عصروں کو انسانیت کا سبق دیا۔ فی الحقیقت اُن کا پُرخلوص جذبۂ

---

[1] افسانۂ شاہاں ورق ۳۵ تاریخِ داؤدی ص ۷۱-۷۳
تاریخِ شاہی ص ۵۲ و ۱۰۴-۱۰۵

[2] مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو بندگی میاں عبدالرشید ـ نقلیات (حیدرآباد دکن ۱۳۶۹ھ)
روایات نمبر ۹، ۱۰، ۱۱ ص ۲۲ ب-۲۶ ـ نجات الرشید، قلمی نسخہ حبیب گنج علی گڑھ یونیورسٹی
ورق ۹۴-۹۵

ایمانداری، بے لوث محبت و وفاداری اور اخلاقی و کردار کی اعلیٰ قدریں ہی ایسی چیزیں تھیں جن سے اُن کے حلقۂ عقیدت میں ہر طرح کے لوگ چلے آتے تھے اور جب وہ وعظ و تلقین فرمایا کرتے تو اپنے سامعین کی رُوح اور اخلاقی کردار کو تابندہ کر دیا کرتے تھے۔

باب سوم

سیّد محمّد جونپوریؒ کی تعلیمات

سید محمدؒ علانیہ کہتے ہیں کہ میں صرف خدا و رسولؐ اور قرآن مجید کی تعلیمات کا پیروکار ہوں۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ میرا ہر قول و فعل عین قرآن حکیم کے مطابق ہے[1]۔ ان کی یہ کوشش تھی کہ جو مسلمان فرقے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لوگوں کی بے سمجھی سے پیدا ہو گئے ہیں اُن میں مطابقت اور یکجائی پیدا ہو جائے۔ وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ جب تک وہ ان کی تعلیمات کو پوری طرح سمجھ نہ لیں اُس پر عمل پیرا نہ ہوں۔ وہ عزلت پسند بزرگ تھے اور عام طور پر شہر کے کسی کونے یا مسجد میں سکونت اختیار کرتے۔ جس جگہ وہ قیام فرماتے اس کو "دائرہ" کے نام سے یاد کیا جاتا اور وہاں اُن کے مرید قانونِ شریعت کے مطابق زندگی بسر کیا کرتے تھے[2]۔

ان کے مریدوں کا خاص شغل باطنی "ذکر" تھا۔ جسے انھوں نے لازم قرار دے رکھا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کوئی چیز بھی جو "ذکر" کی مشق میں رکاوٹ ڈالے ناجائز ہے اور خواہ وہ علم کی تلاش، یا ذریعہ معاش یا کھانا پینا اور سونا ہی کیوں نہ ہو[3]۔ "ہجرت" ان کا ایک دوسرا اصول تھا۔ وہ اور اُن کے مرید کسی ایک جگہ زیادہ عرصہ نہ ٹھہرتے۔ وہ فرماتے کہ جس جگہ

---

[1] مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔
Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, pp. 96-97.

[2] Ibid, p. 97 [3] Ibid, pp. 99-102

میری تعلیمات پر عمل نہ ہوسکے یا جہاں اُن کی تبلیغ ممکن نہ ہو اسے چھوڑ دینا چاہیئے[1]۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ روزی رساں صرف خدائے عزّ و جلّ ہے۔ اور انسان کا فرض ہے کہ وہ ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہے۔ وُہ فتوح و تحائف بھی قبول نہ کرتے[2]۔ اور دائرہ کے لوگ جو کچھ محنت مشقت سے حاصل کرتے اس کو تمام افراد آپس میں مساوی طور پر تقسیم کرلیتے۔ زکوٰۃ کے علاوہ اپنی کمائی کا دسواں حصّہ وہ دائرہ کے بیت المال میں جمع کرتے۔ جس سے دائرہ کے اخراجات پُورے کیے جاتے[3]۔ دائرہ کے لوگوں کو اپنے نئے ساتھیوں کی بیٹیوں سے شادی کی ممانعت تھی۔ ایک سال کے بعد جب اُن کے خلوصِ نیّت کی پرکھ ہوجاتی تب شادی کی اجازت ملتی۔ دائرے کے پرانے لوگوں کو آپس میں شادی کی اجازت تھی[4]۔ ان کے پیروکار سیاسیات سے بالکل الگ رہتے۔ وہ دنیاوی شان و شوکت سے دُور رہتے اور صحیح معنوں میں سادہ زندگی بسر کرتے[5]۔

ان کے پیروکار مندرجہ ذیل آٹھ اصولوں پر بڑی سختی سے عمل کرتے تھے[6]۔

۱۔ ترکِ دُنیا ۲۔ صحبتِ صادقین

۳۔ عُزلت از خَلق ۴۔ توکّل

۵۔ طلبِ دیدارِ حق ۶۔ عشر

۷۔ ذکرِ کثیر ۸۔ ہجرت

---

[1] Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sexteenth and Seventeenth Centuries, p. 102.

[2] Ibid, pp. 102-103.

[3] Ibid, pp. 102-103.

[4] Ibid, pp. 101-102.

[5] Ibid, pp. 104-105.

[6] Ibid, pp. 102-105.

باب ۴ چہارم

مہدوی دائرے

سید محمدؒ کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے اور جانشین سید محمود نے دائروں کی توسیع میں بڑی دلچسپی لی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں کئی نئے دائرے قائم ہو گئے جن کی وجہ سے مہدوی تعلیمات اس برصغیر ہند و پاکستان کے علاوہ افغانستان اور ایران تک پھیل گئیں[۱]۔ سرزمین ہند و پاکستان میں مہدوی اشاعت و تبلیغ کے مراکز یا دائرے گجرات، خاندیش، احمد نگر، دہلی اور ناگور میں قائم ہوئے اور سید محمود کے علاوہ سید خوندمیر، بندگی میاں شاہ نعمت، بندگی میاں شاہ نظام، بندگی میاں شاہ دلاور، بندگی ملک برہان الدین، بندگی میاں ملک گوہر، بندگی میاں ملک، بندگی ملک معروف، بندگی میاں شاہ عبدالمجید نوریؒ، بندگی میاں یوسف، بندگی ملک الہداد اور بندگی شاہ آمین محمد جیسے خلفائے خاص نے ان کی ترقی و ترویج میں بڑا حصہ لیا[۲]۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب مہدویوں کو بعض مقامات سے نکال دیا گیا تو مہدوی دائروں میں مزید توسیع ہو گئی اور نئے نئے مقامات پر مہدوی مراکز اور دائرے قائم ہو گئے۔ ان دائروں میں اکثر لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا جو مہدوی تعلیمات کو بڑے ذوق و شوق سے سنتے اور اُن پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے[۳]۔

---

[۱] Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, pp. 106-107.

[۲] Ibid, pp. 107-113.

[۳] Ibid, pp. 113-134.

سید محمد کے وعظ و درس میں ہندی اور گجراتی الفاظ کا استعمال بکثرت ہوتا تھا اور اُن کی روایات کے مطابق بعض مہدوی خلفا بھی مقامی زبانوں میں وعظ و تلقین کرتے تھے[1] شیخ برہان الدین کالپویؒ اور میاں مصطفےٰ گجراتی نے اِس سلسلہ میں ہندی میں نظمیں لکھیں[2] مہدوی تبلیغ اور تحریروں نے مقامی زبانوں کو نہ صرف نئے الفاظ کا ذخیرہ دیا بلکہ ان کو ایک نئی زندگی بخشی اور ہندی کی ترویج و ترقی میں نمایاں حصّہ لیا۔ مہدوی لوگ مساوات پر سختی سے عمل کرتے تھے جن کے اثر سے عام لوگوں میں بھی بھائی چارے اور اِتحاد کے جذبات و خیالات پیدا ہوگئے۔ یہ باہمی رواداری غربت اور برائی کو دُور کرنے میں بڑی سازگار ثابت ہوئی۔ علمائے وقت نے اس تحریک کی جتنی مخالفت کی۔ یہ اتنی ہی ترقی کرتی گئی۔ سلیم شاہ سوری (۱۵۴۵-۱۵۵۴ء) کے عہدِ حکومت میں شیخ علائی اور شیخ عبداللہ نیازی وغیرہ نے اس تحریک کی توسیع و اشاعت کے لیے بڑا کام کیا[3]۔ اکبر کے عہد میں یہ تحریک اپنے عروج پر تھی[4] گجرات مہدویوں کا خاص مرکز تھا۔ وہاں مصطفےٰ گجراتی کی مسندِ ارشاد بچھی ہوئی تھی اور اس تحریک کا ستارہ بلندیوں پر تھا لیکن جب انھوں نے ۱۵۷۵ء میں وصال فرمایا تو شمالی ہندوستان میں مہدویت کا اثر کم ہوگیا[5]۔ اس کے بعد شیخ علی متقیؒ، شیخ ابن حجر مکیؒ، شیخ عبدالحق محدثؒ اور شیخ مجدد الف ثانیؒ، جیسے عُلماء و صُلحاء اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے[6]۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وقت کے ساتھ ساتھ اِس تحریک کا زور کم ہوتا گیا اور بالآخر یہ تحریک ایک مذہبی

---

[1] اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۵ - ۲۷

[2] گلزار ابرار (قلمی) ورق ۱۹۵ ب؛ منتخب التواریخ جلد سوم ص ۶۰۸

[3] Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, pp. 117-119.

[4] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۷۱

[5] ایضاً

[6] ایضاً

[7] ایضاً ص ۲۷۱-۲۷۲ - مکتوبات امام ربانی جلد دوم خط نمبر ۱۵ - ۶۷ و ۶۸

فرقہ کی حیثیت اختیار کر گئی۔ دراصل یہ تحریک احیائے سُنّت اور اماتتِ بدعت کے لیے وجود میں آئی تھی لیکن اپنے اصلی رنگ میں زیادہ عرصہ تک نہ چل سکی۔ مہدویت کا تصوّر اسلام کے ایک بنیادی اصول ختمِ نبوت سے ٹکرا گیا[1] جس کے نتیجے میں بالآخر یہ ناکام ہو گئی — ہندوستان میں ابھی تک جے پور، گجرات اور دکن میں مہدوی مراکز قائم ہیں اور وہاں سے سید محمدؒ کی تعلیمات کا پرچار جاری ہے۔

---

[1] حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ص ۲۷۱

ضمیمہ اوّل

بابِ اوّل

شرقی عہد میں ہندی ادب

عہد شرقی ہندی ادب کی ترویج و ترقی کے لیے بھی بڑا اہم دور تھا۔ شرقی فرمانرواؤں نے اپنے عہدِ سلطنت میں ہندو رعایا کو ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں اور انھیں پوری مذہبی آزادی دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بھگت کبیر اور اُن کی بھگتی تحریک کو اس عہد میں خاص طور پر پھلنے پھُولنے کا موقعہ ملا۔ اس عہد میں ہندو علماء و شعراء نے بھی ہندی نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا اور ان میں سے میتھلا کے وِدیاپتی ٹھاکر، نندا پتی اور اماپتی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[1]۔ ان تینوں نے ہندی کی پُوربی شاخ میتھلی بولی میں کرشنا بھگتی کے بڑے عمدہ اور میٹھے گیت لکھے۔ ان میں سے اماپتی کی ایک مشہور تصنیف چھندا بھی شاعرانہ نثر کی بلند پایہ تصنیف مانی گئی ہے۔ وِدیاپتی ٹھاکر میتھلی کے علاوہ سنسکرت کے بھی بڑے پایہ کے عالم تھے اور اس میں اُن کی کئی تصنیفات ہیں۔ میتھلی میں اُن کی دو کتابیں "کیرتی لتا" اور "کیرتی پتا کا" بڑی پایہ کی تصنیفات ہیں اور جو اب تک بڑی مقبول ہیں۔ تاہم کرشنا بھگتی کے گیتوں کی وجہ سے انھیں سب سے زیادہ شہرت حاصل ہُوئی۔ ان کے گیتوں میں بڑی مٹھاس اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ میتھلا کی کوئل کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اُن کے رادھا اور کرشن جی مہاراج کی جدائی کے گیت ہندی اَدب میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر انھیں ہندی ادب میں رادھا بھاؤ کا مُوجد قرار دیا جاتا ہے۔ وہ ہندی

---

[1] مزید تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ ہوں۔

کے بہت عمدہ ڈراما نویس بھی تھے بلکہ اس زبان کے وہ سب سے پہلے ڈراما نویس سمجھے جاتے ہیں اور اُن کے دو ڈرامے پاریجات ہرن اور رُکمنی پری نئے بڑے مشہور ہیں۔[1]

اس دور میں بھگت کبیر اور بھگتی کے پرچاروں نے بھی ہندی ادب میں بڑے اضافے کیے۔ کبیر اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ اُنھوں نے ہندی کی پوُربی شاخ کو اپنی شاعری کی زبان بنایا اور معرفتِ الٰہی اور دُنیا کی بے ثباتی پر بڑی عُمدہ نظمیں لکھیں۔ انھوں نے اس ملک کے کتنی علاقوں کی سیاحت کی تھی جس کی وجہ سے ان کے کلام میں مختلف علاقوں کے الفاظ جمع ہو گئے، ان کا کلام جنوبی ہند کے بعض علاقوں کو چھوڑ کر ملک کے ہر حصّے میں آسانی سے سمجھا جاتا ہے۔ اُن کی وجہ سے ہندی زبان کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ وہ اس ملک کی اُس زبان کے بانیوں میں سے ہیں جو ہندوستان کی زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ مولوی عبدالحق رح لکھتے ہیں :

"کبیر کا کلام ہمیشہ تازہ اور ہرا بھرا رہے گا۔ ان کی نظمیں، بھجن، دوہے وغیرہ اب تک لوگوں کی زبانوں پر رواں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ۷۵ کتابوں کے مصنّف تھے۔[2]"

بھگت کبیر کے چیلوں نے بجائے پوُربی کے برج بھاشا کو اختیار کیا۔ جن میں سے دھرم داس کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وہ کتنی کتابوں کے مصنّف بھی تھے اور بڑے شیریں سخن سادھو تھے۔ اُن کی نظموں میں بڑی نغمگی اور خوش آہنگی پائی جاتی ہے۔[3] کبیر کے بیٹے کمال بھی ہندی کے بڑے پُرگو شاعر تھے۔[4]

ہندی کے ان علماء و شعراء اور بھگتوں کی خدمات سے ہندی ادب نے ایک مستقل

---

[1] تفصیلات کے لیے آئندہ صفحات ملاحظہ ہوں۔
[2] ایضاً
[3] ایضاً
[4] ایضاً

اَدبی شکل اختیار کرلی۔ اور ہندی زبان رفتہ رفتہ بڑی موثر اَدبی زبان بن گئی۔ عربی و فارسی کے اثر سے اِس میں نئی نئی اصنافِ سخن کا اضافہ ہُوا۔ پہلے جن روایتی قِصّوں اور کتابوں کا عام رواج تھا اُن میں کمی آگئی۔ ہندی پدوں یا دوہوں کے علاوہ ہندی ڈرامانویسی کی پختہ بنیادیں قائم ہوگئیں اور کرشنا سکول کے بھگتوں نے گیتوں اور کلاسیکی اَدب کے نئے نئے موضوعات کے لیے بھی مواد فراہم کیا۔ اِس طرح اس عہد میں ہندی ادب پرانی راہوں سے نکل کر نئی راہوں پر گامزن ہُوا[1]۔

اِس دَور کے صُوفیوں کے جذب و مستی پر فارسی اور ہندی کی دُوسری اصنافِ سخن کے بجائے بھگتی گیتوں نے زیادہ اثر کیا۔ بعض آزاد خیال صُوفیوں نے ہندو علم الاَصنام کی تلمیحات، تشبیہات، و استعارات کی اِسلامی تلمیحات اور تشبیہات و استعارات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ عبدالوحید بلگرامی نے اِس سلسلہ میں ایک رسالہ حقائقِ ہندی (۹۷۴ھ/۱۵۶۶ء) بھی لکھا[2]۔ جس میں انھوں نے ہندو مذہبی گیتوں کی اکثر تشبیہات اور استعارات کو اسلامی تشبیہات و استعارات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ مثلاً انھوں نے گوپیوں کو فرشتے اور گوبر کو انسان کی عقل اور نقائص وغیرہ سے تعبیر کیا[3]۔

اِس دور میں بعض صُوفیوں نے فلسفۂ ویدانت اور فلسفۂ وحدت الوجود میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بعض ہندو علماء کو فلسفۂ وحدت الوجود پر پُورا عبور حاصل تھا[4]۔ اس دَور کے ایک لودھن برہمن کا اعلان تھا کہ "اسلام حق است و دینِ من نیز درست است"[5]۔

---

[1] مزید تفصیلات کے لیے آئندہ صفحات ملاحظہ فرمائیں۔

[2] Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, pp. 61-62.

[3] Ibid, p. 62. [4] Ibid, p. 63.

[5] طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۲۲۲-۲۲۳۔ سلاطینِ دہلی کے مذہبی رُجحانات ص ۴۴۸

درحقیقت اس دور میں ہندو اور مسلمان دونوں میں ایک دوسرے کے علوم جاننے اور سمجھنے کا شوق بڑھ رہا تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے چچا شیخ رزق اللہ مشتاقیؒ جیسے بزرگ عربی و فارسی کے علاوہ سنسکرت کے بھی عالم تھے۔ ان کو ہندوؤں کے علوم میں کامل مہارت تھی فارسی اور ہندی کے عمدہ شاعر تھے۔ ہندی میں راجن اور فارسی میں مشتاقی تخلص کرتے تھے[1]۔ اسی طرح اس عہد میں ایک طرف اگر شیخ رزق اللہ مشتاقی اور میاں طٰہٰ[2] وغیرہ ہندوؤں کے علوم کے ماہرین سمجھے جاتے تھے[3] تو دوسری طرف ایک ہندو برہمن کو علومِ اسلامی پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ وہ مسلمانوں کو درس دیا کرتا تھا[4] اور شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے بیٹے شیخ رکن الدین گنگوہیؒ جیسے عالم ایک جوگی پال ناتھ سے اسرارِ توحید سمجھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

عہدِ شرقی میں چشتیہ، صابریہ، شطاریہ اور مہدویہ صوفیا نے بھی ہندی نثر و نظم میں بڑے اضافے کیے۔ چشتیہ صوفیا میں شیخ بہاءالدین نتھو جونپوریؒ اور مخدوم شیخ دانیال خضریؒ ہندی کے بڑے اچھے شاعر تھے[6]۔ صابریہ سلسلہ کے بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ (المتوفی ۹۳۸-۹۳۷ھ) عربی و فارسی کے علاوہ ہندوی پر بھی کامل عبور رکھتے تھے اور ہندی کے بڑے عمدہ شاعر تھے۔ وہ اپنا تخلص الکھ داس کرتے تھے۔ اُن کی بعض تصانیف میں اُن کے ہندوی دوہرے بہت کثرت سے ملتے ہیں[7]۔ اس عہد میں شطاریہ سلسلہ نے جونپور میں جنم لیا۔ اس کے صوفیا وحدت الوجود کے ماننے والے تھے۔ وہ یوگیوں کی طرح ریاضاتِ شاقہ کیا کرتے اور فلسفہ ویدانت اور یوگا کا گہرا مطالعہ کرتے۔ ان دونوں چیزوں کا ان پر بڑا گہرا اثر تھا[8]۔

---

[1] سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۴۴۸، صبحِ گلشن ص ۲۱۳ [2] واقعاتِ مشتاقی ص ۱۱۳
[3] منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۲۳ [4] افسانۂ شاہاں ورق ۳۵
[5] شیخ بہاءالدین نتھو جونپوری (المتوفی ۹۴۷ھ) کو ہندی پر بڑا عبور تھا۔ ان کے مجموعۂ خطوط بعنوان — صحائف الطریقہ (قلمی مسودہ برٹش میوزیم ۱۶۸۴۸ Add) میں اُن کے ہندی دوہڑے اور جملے جگہ جگہ ملتے ہیں۔ میں نے اس مسودّہ کو مرتب کیا ہے اور اس وقت زیرِ طبع ہے۔
[6] تجلیِ نور جلد اول ص ۵۵، ان کے متعلق مزید تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ ہوں [7] تاریخِ مشائخِ چشت ص ۲۲۱۔ اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۲۸-۳۰ (جاری ہے)

بعض شطاری صوفیا نے بہت عمدہ ہندی نظمیں لکھیں[۲۸]۔ اور بعض نے اس زبان میں مثنویات اور دوسری قابلِ قدر تصنیفات بھی چھوڑیں۔ اِس سلسلہ کے بزرگوں میں شیخ قطب علی قطبنؒ، شیخ محمد غوث گوالیاریؒ اور شیخ منجھنؒ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[۲۹]۔ شیخ قطب علی قطبنؒ، سلطان حسین شاہ شرقی کے درباری شاعر تھے اور ہندی کے بڑے عمدہ شاعر تھے[۳۰]۔

شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کا بھی بلا واسطہ اِسی عہد سے تعلق سمجھنا چاہیے۔ ان کو عربی و فارسی کے علاوہ سنسکرت پر بھی مکمل عبور تھا۔ جواہرِ خمسہ کے علاوہ انکی دوسری مشہور تصنیف بحر الحیات ہے جو دراصل سنسکرت کی کتاب اَمرت کند کا ترجمہ ہے۔ وہ ہندی کے بڑے عمدہ شاعر تھے اور اُن کے ہندی اقوال اور اشعار کئی کتابوں میں ملتے ہیں[۳۱]۔ شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کے نامور خلیفہ شیخ منجھنؒ شطاریہ سلسلہ کی برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے اور ہندی کے بڑے عمدہ شاعر و مصنف تھے۔ ان کی ایک مشہور تصنیف مدھومالتی ہے[۳۲]۔ حقیقت یہ ہے کہ شطاریہ مشائخ نے ہندوؤں سے بڑے عمدہ مراسم قائم کیے اور اُن کے مذہبی افکار کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کی بہترین مثال شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی مندکرہ بالا تصنیف بحر الحیات ہے[۳۳]۔

سیّد محمد جونپوریؒ کی مہدوی تحریک کی بنیادیں جونپور ہی میں استوار ہوئیں اور یہ تحریک اِسی عہد میں پروان چڑھی۔ سیّد محمدؒ اپنے مریدوں اور پیروکاروں کو ہندی اور گجراتی میں خطبہ دیا کرتے تھے۔ اُن کے خطبات میں ہندی یا ہندوی روزمرہ و محاورہ کا کافی استعمال

(صفحہ نمبر ۴۹۴ سے آگے) ۲۸ Muslim Revivalist Movements in Northern Indian during the Sixteenth and Seventeenth Centuries, p. 62.

۲۹ Muslim Revivalist Movements in Northern India during the Sixteent and Seventeeth Centuries, p. 73.

۳۰ Ibid, p. 63. مزید تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ ہوں

۳۱ A. Halim, J.A.S.P. Vol. II, 1957, p. 85.

۳۲ Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, p. 64.

اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۹.

۳۰- اُن کی بحر الحیات دہلی میں ۱۸۹۰ء میں چھپی تھی۔ اب تقریباً نایاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ (جاری ہے)

ہوتا تھا۔ وہ ہندی کے بڑے عمدہ شاعر بھی تھے۔ ان کے ہندی کے دوہے اور اشعار مہدوی کتابوں میں بکثرت ملتے ہیں[1]۔ ان کے وصال کے بعد اُن کے بارہ خلفاء نے اُن کی ان روایات کو قائم رکھا اور وہ بھی اپنے مریدوں اور پیروکاروں کو خطبات دیتے یا پند و نصائح کرتے وقت ہندی، گجراتی اور دوسری زبانوں کا کافی استعمال کرتے۔ اسی طرح سید محمدؒ کے بعد کی دو صدیوں میں اُن کی تعلیمات پر مہدویوں نے فارسی نظم و نثر اور مقامی زبانوں میں بے شمار تصنیفات قلمبند کیں[2]۔ مثلاً میاں علی محمد نے برج بھاشا میں رسالہ چاند شریف (۱۵۳۳ء اور ۱۵۳۸ء کے درمیان) لکھا[3]۔ ملک یوسف نے پریم سنگرام، سلطان ابوالحسن تانا شاہ (۱۶۷۲-۱۶۸۷ء) کے عہد میں برج بھاشا میں لکھی[4]۔ میاں سید حسن نے ۱۶۵۷-۱۶۵۸ء میں تیغ نامہ ہندی میں لکھا[5]۔ سید ابراہیم المعروف بابا میاں صاحب حیدرآبادی نے گنج شہداء دکنی اردو میں لکھا[6]۔ میاں عبدالمومن نے مثنوی اسرار عشق دکنی میں ۱۶۸۲ء میں لکھی[7]۔ میاں نجم الدین شہید نے ایک طویل مثنوی اُردو میں ۹ ہزار اشعار پر مشتمل لکھی[8]۔ یہ تمام تصنیفات سید محمدؐ کے ایک اجل خلیفہ خوندمیر کی وفات سے متعلق تھیں[9]۔ اور اپنے عہد کی مایہ ناز ادبی شاہکار مانی جاتی تھیں۔ اسی طرح میاں مصطفےٰ گجراتی اور اُن کے جانشینوں نے بھی فارسی کے بجائے مقامی زبانوں میں لکھا اور جسے وہ ہندی یا "ہندوی" کہتے۔ اس سلسلہ میں ایک مثنوی فیض عام بھی مہدویوں میں بڑی مقبول تھی جو عبدالمجید نے ۱۷۲۹ء میں لکھی تھی[10]۔ قطب میاں نے ایک بڑی طویل مثنوی ہندی

(گذشتہ سے پیوستہ) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں "عبدالسلام Collection" میں ہے۔

۵ گلزار ابرار (قلمی) ورق ۲۳۹ ۶ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۴۵۱

1 اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۵-۲۷

2 Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, pp. 96-109.

3 Ibid, p. 109.

4 Ibid, p. 110. 5 Ibid, p. 110.

6 Ibid, p. 110. 7 Ibid, p. 110. 8 Ibid p. 110.

9 Ibid, p. 109. 10 Ibid, p. 118.

میں لکھی۔ اس کا نام تاریخ غربی تھا اور اس میں تمام پیغمبروں اور بزرگ ہستیوں کے علاوہ حضرت سید محمد جونپوریؒ کا بھی ذکر کیا گیا۔ یہ ۱۷۵۶ء-۱۷۵۷ء میں مکمل ہوئی اور غیر مہدویوں میں بھی بڑی مقبول ہوئی۔[1] ادھین مہدوی نے ۱۷۶۱ء-۱۷۶۲ء میں وفات نامہ، شہادت امام حسنؑ و حسینؑ، رسالہ راگ ۱۷۶۷ء-۱۷۶۸ء اور زینت المصلیٰ جیسی کتابیں لکھ کر اس زبان کے مایہ ناز ادبی شاہکاروں میں مزید اضافہ کیا۔[2]

عہدِ شرقی میں براہِ راست یا بالواسطہ جن اصحاب نے ہندی ادب میں اضافے کیے اُن میں سے شیخ بُرہان الدین کالپوی (المتوفیٰ ۱۵۶۲ء-۱۵۶۳ء) اور ملک محمد جائسی کے نام کبھی فراموش نہیں کیے جا سکتے۔ اوّل الذکر سید محمد جونپوریؒ کے خلیفہ میاں اللہ داد کے مرید تھے اور ہندی کے بڑے عمدہ شاعر تھے۔ اُن کی ہندی نظمیں بڑی وجد انگیز ہوتیں اور اُن کی ایک ہندی مثنوی "فراق نامہ" بڑی مشہور و مقبول ہوئی۔[3] ملک محمد جائسی نے بھی ہندی میں کئی تصنیفات چھوڑیں، جن میں سے اکھروٹ اور پدماوت ہندی ادب کے شاہکار مانے جاتے ہیں۔[4]

اس عہد میں جن ہندو اور مسلم علماء و شعراء، بھگتوں یا صوفیاء نے ہندی میں لکھا اور ہندی ادب کی خدمات کیں اُن کی تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ ہوں۔

۱؎ Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Ceenturies, p. 118.

۲؎ Oriental College Magazine, Feb. 1941, pp. 11-34.

۳؎ منتخب التواریخ جلد سوم ص ۶-۸ گلزارِ ابرار (قلمی) ورق ۱۹۵ - اخبار الاخیار ص ۲۷۶

۴؎ Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, pp. 132-133.

باب ۲ دوم

شرقی عہد کے
ہندی ادب کے ہندو مسلم علماء شعرا اور صوفیا

وِدیا پتی ٹھاکر

وِدیا پتی ٹھاکر ریاست میتھلا کے شہر بسپاپی (ضلع دربھنگہ صوبہ بہار) میں (۱۳۶۳ء) پیدا ہوتے۔[1] ان کے والد کا نام گن پتی ٹھاکر اور دادا کا نام جے دت تھا۔[2] وہ شیوا برہمن تھے اور ریاست میتھلا کے راجاؤں کے درباری شاعر تھے۔[3] میتھلا ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس کے عروج و زوال کا زمانہ پندرھویں صدی تھا اور جس کے راجہ شرقی فرمانرواؤں کے باجگذار تھے۔ اس کی تصدیق وِدیا پتی ٹھاکر کی ایک تصنیف "کیرتی لتا" سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں وہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب باغی ارسلان ریاست میتھلا پر قابض ہو گیا اور اس نے راجہ شیو اسنگھ کو گرفتار کر لیا تو وہ راجہ کی طرف سے سلطان ابراہیم کے دربار میں مدد حاصل کرنے کے لیے پہنچا۔ سلطان نے اُس کو تحفے تحائف سے سرفراز کیا اور پھر وہ فوج لے کر میتھلا کی راجدھانی پر حملہ آور ہوا۔ بالآخر باغی ارسلان کو شکست ہوئی اور راجہ ایشور سنگھ کو دوبارہ گدی پر بحال کیا گیا۔[4] وہ سلطان ابراہیم شاہ کی فوج کی آمد اور اُس کی شاہانہ پریڈ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

---

[1] Frank E. Keay, A History of Hindu Literature 3rd Edition, Calcutta, 1860. p. 28.

[2] G. A. Grierson, Modern Literature of Hindustan, Calcutta, 1889, A History of Hindu Literature. Ibid. P. 9

[3]

[4] کیرتی لتا۔ ص ۱۴-۱۸

"فوج کی تعداد کون جانے۔ فوج کے سپاہی زمین پر اس طرح بکھرے ہوئے تھے جیسے تالاب میں کنول کے پھول" ..... "خوف سے پہاڑ اپنی جگہ چھوڑنے لگے۔ زمین کو زلزلہ آگیا۔ چہرۂ خورشید گرد و غبار کے پردے میں چھپ گیا۔ ہر طرف طبلِ جنگ بجنے لگے اور قیامت کے آثار نظر آنے لگے۔ آدمیوں کی آوازیں دب گئیں۔ سینکڑوں ترک جوان ہنسنے لگے۔ تلواریں مارتے جاتے اور آگے بڑھتے جاتے تھے۔ دشمن خوف سے ہراساں ہونے لگا۔ مسلمان سپاہی جب اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر دشمن پر حملہ کرتے تو آسمان سے فرشتے داد و تحسین کا شور بلند کرتے۔ پیدل فوج نے پیدل چل کر دریا کا پانی خشک کر دیا۔ کوئی پکڑ کر لایا گیا، کسی نے خود حاضر ہو کر جان بخشی چاہی" ..... "دشمن کو داخلِ جہنم کرنے والے محمد مدگامی نے سب سے پہلے اپنا گھوڑا دریائے گنڈک میں ڈالا تھا۔ یہ جنگ رائے پور سے پوربی جانب دوپہر کے وقت کھیتوں میں ہوئی تھی اور ملک ارسلان کیرتی سنگھ سے کئی گھنٹہ کے جدال و قتال کے بعد شکست کھا کر میدان سے بھاگ نکلا۔ کیرتی سنگھ کو فتح ہوئی۔ ابراہیم شاہ نے ترہت کا علاقہ پھر کیرتی سنگھ کے حوالے کر دیا"[1]

لیکن جب سلطنتِ شرقی کا چراغ گل ہوا تو سلطان سکندر لودھی نے اس ریاست کو بھی فتح کر کے (۱۴۹۴ء) اپنی قلمرو میں شامل کر لیا[2]۔ اس کے بعد ودیاپتی ٹھاکر نے ترہت کے راجہ کے دربار میں پناہ لے لی اور باقی ماندہ زندگی وہیں بسر کی۔

ودیاپتی سنسکرت کے بڑے پایہ کے عالم تھے اور اس زبان میں اُن کی کئی تصنیفات ہیں[3]۔ اُن کو میتھلی زبان پر بھی مکمل عبور حاصل تھا اور وہ اس کے بلند پایہ شاعر و

۱؎ کیرتی لتا ص ۱۴-۱۸

۲؎ منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۱۶

۳؎ A Halim, J.A.S.P. Vol. II, 1957, p. 58.
A History of Hindu Literature, p. 28.
Modern Literature of Hindustan, p. 10.

مصنف تھے[1] اس زبان میں اُن کی دو مشہور کتابیں "کیرتی لتا" اور "کیرتی پتا کا" ہیں جن کو بڑی شہرت حاصل ہوئی[2] بنگال کے لوگ اُن کو بنگالی کا شاعر خیال کرتے ہیں لیکن ہندی کے علماء اُن کو ہندی ہی کا شاعر سمجھتے ہیں کیونکہ میتھلی ہندی کی پوربی شاخ کی بولی ہے[3]۔

اُن کے میتھلی گیتوں میں بڑی مٹھاس اور موسیقیت پائی جاتی ہے اور خاص طور پر اُن کے رادھا اور کرشن جی مہاراج کی جُدائی کے گیت اور اُن کا اندازِ بیان ہندی ادب میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس بنا پر اُن کو رادھا بھاؤ کا مُوجد بھی قرار دیا جاتا ہے[4]۔ اُن کے رادھا اور کرشن کی محبت کے گیت خُدا سے رُوح کی جدائی کے گیت تصوّر کیے جاتے ہیں۔ بھگت چیتنیا ان گیتوں کو خاص طور پر بہت سراہا کرتے تھے۔ اور اُن کو اپنے ایک شاگرد دامودر سوارُوپ سے بڑے شوق سے سُنا کرتے تھے[5]

ودیاپتی بڑے عمدہ ڈراما نویس بھی تھے بلکہ ادب ہندی کے سب سے پہلے ڈراما نویس مانے جاتے ہیں۔ ان کے ہندی کے دو ڈرامے پاریجات ہرن اور رکمنی پری نیے بڑے مشہور ہیں[6]

ان کی ان تصنیفات سے اس دَور کی سماجی قدروں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اُن کے مُربّی راجاؤں اور شرقی فرمانرواؤں کی فیاضیوں کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ اُن کی نظموں اور گیتوں میں اعلیٰ درجہ کی ادبیت پائی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اندازِ بیان اور طرزِ تحریر نے مشرقی ہندوستان کے ادب پر بڑا گہرا اثر چھوڑا۔ بعد میں کئی شعراء نے ان کے

---

[1] A History of Hindu Literature, p. 28, Ibid, p. 10.

[2] A History of Hindu Literature, p. 8. Ibid. [3] کیرتی لتا ص ۱۴-۱۸
Modern Literature of Hindustan. Ibid.

[4] A. Halim. Ibid, p. 59.

[5] A History of Hindu Literature. Ibid.
Modern Literature of Hindustan. Ibid.

[6] Modern Literature of Hindustan. p. 11.

اُسلوب کی نقل کرنے کی کوشش کی۔[1] بنگال کے دو مشہور شاعر چنڈی داس اور بجے دیو اُن کے ہم عصر تھے اور اوّل الذکر سے اُن کے بڑے دوستانہ مراسم تھے۔[2] اُن کے ادبی کارناموں سے میتھلا کے دُوسرے دو شاعر سَنداپتی اور اماپتی بھی بہت متاثر ہوتے۔ غالباً موخرالذکر اُن کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے بھی بنگالی اور میتھلی میں کرشنا بھگتی کے گیت لکھے اور اُن کی ایک مشہور کتاب چھنداشاعرانہ نثر کی بڑی پایہ کی تصنیف مانی گئی ہے۔[3] ہندی ادب کے بعض علما۔ وِدیاپتی کو میتھلی زبان کا سب سے بلند پایہ شاعر مانتے ہیں اور ان کو ہندی کا بھی نامور شاعر و ادیب خیال کرتے ہیں۔[4]

شاہ کبیر

شاہ کبیر یا بھگت کبیر کی تاریخِ ولادت و وفات کے متعلق مختلف روایتیں ہیں بعض کے خیال میں وہ ۱۳۹۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۴۹۲ء میں فوت ہوئے اور بعض کے خیال میں وہ ۱۴۴۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۱۸ء میں فوت ہوتے لیکن زیادہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ ان کی تاریخِ پیدائش ۱۴۲۵ء ہے، البتہ تاریخِ وفات ۱۴۹۲ء یا ۱۵۱۸ء ہے۔[5]

وہ ایک برہمن بیوہ کے بیٹے تھے جس نے اپنی شرم کو چھپانے کی خاطر انھیں بنارس کے ایک تالاب لاہر کے کنارے ڈال دیا تھا۔[6] جہاں سے ان کو جولاہے نیرو اور اُس کی بیوی نعیمہ نے اُٹھایا اور اپنا بیٹا بنا لیا۔[7] یہ لوگ بہت غریب تھے اِس لیے اُن کو باضابطہ طور پر تعلیم نہ دلا سکے۔ شاہِ کبیر کے سرپرست گو مسلمان تھے مگر وہ بنارس کے ہندو ماحول ہی میں پلے

---

۱ A History of Hindu Literature, p. 28.

Modern Liteerature of Hindustan, p. 10.

۲ Misra Bandu Vinode, History of Hindi Literature, Vol. 1, p. 177.

۳ A History of Hindu Literature, p. 28.

۴ Modern Literature of Hindustan, p. 11.

۵ A History of Hindu Literature, p. 22.

۶ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۱۸۳-۱۸۴

۷ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۱۸۴

بڑھے اور جب سنِ شعور کو پہنچے تو رام نند کے چیلے بن گئے جس نے اُن کو ہندو مذہب و فلسفہ سے روشناس کرایا[1]۔ تاہم بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے ساتھ زیادہ عرصہ نہ رہے اور وہاں سے سیر و سیاحت کے لیے نکل گئے۔ اس دوران میں وہ کئی درویشوں اور سادھوؤں سے ملے مگر انھوں نے زیادہ تر وقت مسلمان صوفیوں ہی کی صحبت میں گزارا[2]۔ جب انھوں نے مانک پور میں گھر بنایا تو وہاں شیخ تقیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ اور کافی عرصہ تک ان سے وابستہ رہے[3]۔ وہ جونپور اور جھوسی بھی گئے اور وہاں کے علماء وصوفیاء سے بھی استفادہ کیا[4]۔ انھوں نے اپنے اُستادوں سے جو کچھ بھی سیکھا وہ سب بانی تھا۔ بعد میں وہ کچھ عرصہ مزید سیر و سیاحت کرتے رہے۔ بالآخر بنارس میں مقیم ہو کر اپنی تعلیمات کا پرچار کرنے لگے[5]۔ عمر کے آخری حصہ میں وہ مگہر (ضلع گورکھپور) چلے گئے اور پھر وہیں فوت ہوئے[6]۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ کبیر ہندو روایات و نظریات سے بڑے متأثر تھے۔ لیکن اُن کی تعلیمات بڑی آزادانہ نوعیت کی تھیں اور ان کو آغاز میں ہندو اور مسلمان دونوں ناپسند کرتے۔ مگر وہ ان کے پرچار سے باز نہ آتے۔ سلطان سکندر لودھی کو جب اُن کے متعلق معلوم ہوا تو انھوں نے اُن کو کچھ عرصہ کے لیے شہر بدر کر دیا[7]۔ مگر وہ دوبارہ بنارس آ کر ان کی تبلیغ میں مشغول ہو گئے[8]۔ اس کے بعد اُن کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اُن کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی[9]۔ اُن کا مذہب اتنا وسیع المشرب اور غیر جانبدارانہ تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ان کو اپنا تصور کرنے لگے۔ دراصل وہ ایسی محبت کے پجاری تھے جو تمام مذہبوں

---

[1] اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۱۸۴-۱۸۵ [2] ایضاً ص ۱۸۵ - ۱۸۶

[3] ایضاً ص ۱۸۵۔ مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۹۹، خزینۃ الاصفیا۔ جلد اوّل ص ۴۶۴

[4] اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۱۸۵ [5] ایضاً ص ۱۸۵-۱۸۶

[6] ایضاً ص ۱۸۷۔ ان کی وفات کے بعد ہندو اور مسلمانوں میں جھگڑا پیدا ہو گیا کہ اُن کے جنازے کو کیسے اٹھایا جائے۔ ہندو انھیں جلانا چاہتے تھے اور مسلمان انھیں دفن کرنا چاہتے ہیں ۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ

اور فرقوں کو متحد کر دے اور انھوں نے اسلام اور ہندو مت کی اُن تمام باتوں کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ جو ان کے خیال میں انسان کی رُوحانی فلاح کے لیے غیر اہم تھیں۔ انھوں نے مُسلمانوں اور ہندوؤں کی ظاہری رسُومات کی مذمّت کی اور دونوں مذاہب کی داخلی باتوں کو اہمیت دی اور دونوں کی الگ الگ تقسیم کو قصداً ترک کر کے اور اُن کی مشترک باتوں کو منتخب کر کے ایک درمیانی راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی اور تمام عمر اسی کا پرچار کرتے رہے[۱]۔ دراصل جس دور میں وہ پیدا ہوتے تھے، اس دَور میں مساواتِ انسانی اور وحدتِ ادیان کی صدائے بازگشت گُونج رہی تھی۔ اگر ایک طرف وہ اور گورو نانک ہندو مذہب اور اِسلام کو قریب لانے کے لیے وحدتِ ادیان پر زور دے رہے تھے تو دُوسری طرف وحدت الوجود کے پُجاری بھی اس فکر کو تقویت پہنچا رہے تھے۔

بھگت کبیر سچے عارف و صُوفی تھے۔ انھوں نے معرفتِ الٰہی اور دُنیا کی بے ثباتی پر بڑی عمدہ نظمیں لکھیں۔ ان کے افکار و اُسلوب پر صُوفی درویشوں اور شاعروں کی بڑی گہری چھاپ تھی اور بعض نظموں اور اشعار سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان پر فرید الدین عطارؒ، مولانا رومؒ اور سعدی شیرازیؒ کا بڑا اثر تھا[۲]۔ ایک عام روایت کے مطابق وہ پچھتّر[۵] کتابوں کے مصنّف تھے۔ جن میں سے "کبیر پریچے کی ساکھی" "کبیر پنجی" "کبیر کی بانی" اور بیجک، سب سے زیادہ مشہور ہیں[۳]۔ لیکن ان کی سوانح عُمری کے مصنّف رام مکند دو ما لکھتے ہیں کہ انھوں نے ۵۶ کتابیں لکھی ہیں جن میں محمد بُدھ، بلخ کا بیاز، کبیر گورکھ کی گوشٹھی بھی شامل ہیں[۴]۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ زُود نویس صُوفی مصنّف تھے لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ ان کی بعض کتابوں کے

وہ اِتنے وسیع المشرب اور غیر جانبدار تھے کہ ہندو مسلمان دونوں انھیں اپنا کہنے لگے۔

[۵] اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۱۸۶   [۶] ایضاً   [۷] ایضاً ص ۱۸۶-۱۸۷

[۱] اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۱۸۶-۱۸۷   [۲] ایضاً ص ۱۸۹-۱۹۰

[۳] History of Hindi Literature, Vol. I, p. 78.

[۴] A. Halim. J.A.S.P. Vol. II, 1957, p. 73.

مصنف غالباً ان کے چیلے اور مرید ہوں گے اور انھوں نے اپنے گرو کی شان بڑھانے کے لیے اپنی کتابوں کو ان کے نام منسوب کر دیا ہو گا۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے بہت سے شلوک اور پد بھی لکھے جن میں سے بہت سے گرنتھ صاحب میں بھی شامل ہیں[۱]۔ ان کی سب سے آخری کتاب کا سن تصنیف ۱۵۱۰ء ہے مگر وہ اب تک نایاب ہے[۲]۔

کبیر بڑے اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے اور انھوں نے پوربی کو اپنی شاعری کی زبان بنایا جیسا کہ وہ خود بھی لکھتے ہیں ؎

میری بولی پوربی تاہی نہ چھینے کوئے
میری بولی سو لکھے جو پورب کا ہوئے[۳]

پوربی بولی ہندی زبان کی ایک شاخ ہے جو آج بھی بنارس کے گرد و نواح میں بولی جاتی ہے۔ لیکن بھگت کبیر کی پوربی، سائیں تلسی داس، یا ملک محمد جائسی کی سی پوربی نہیں کہ جسے سمجھنے کے لیے کسی شرح کی ضرورت ہو۔ ان کی تصنیفات میں پنجابی، کھریا، برج، راجستھانی عربی اور فارسی کے الفاظ عام پائے جاتے ہیں جنھیں وہ بلا تکلف اور بہت برمحل استعمال کرتے ہیں۔ اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ان کی ملاقاتیں عربی و فارسی کے علماء اور مسلمان صوفیاء سے اکثر رہیں اور انھوں نے ہند و پاکستان کے اکثر علاقوں کی سیر و سیاحت بھی کی جس کی بنا پر ان کا کلام جنوبی ہند کے بعض علاقوں کو چھوڑ کر ہند و پاکستان کے ہر حصے میں آسانی سے سمجھا جاتا ہے[۴]۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ :

"تلسی داس اور ملک محمد جائسی کی زبان پرانی اور مردہ ہو جائے گی لیکن

---

[۱] History of Hindi Literature, Vol. I, p. 78.

[۲] Ibid

[۳] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۷۷

[۴] ایضاً ص ۷۸

کبیر کا کلام ہمیشہ تازہ اور ہرا بھرا رہے گا"

اور

"یہی وہ زبان ہے جو نویں اور دسویں صدی ہجری میں تقریباً ہندو پاکستان کے ہر خطے میں بولی یا سمجھی جاتی تھی اور اسے اس ملک کی عام زبان بننے کا حق حاصل تھا۔"[1]

فی الحقیقت جس طرح انھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذاہب کو ایک کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح ان دونوں کی زبان کو بھی انھوں نے اپنے کلام میں ملا کر ایک کر دیا مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ :

"اُن ہی سے اُردو یا ہندوستانی کی بنیاد شروع ہوتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کبیر اُس زبان کے اوّلین بانیوں میں سے ہیں جو ہندوستان کی عام زبان کہلانے کی مستحق ہے۔"[2]

شاہ کبیر نے صحیح معنوں میں کسی مدرسہ یا مکتب میں تعلیم نہیں پائی تھی اور نہ انھوں نے کوئی کتابی علم حاصل کیا تھا۔ چونکہ وہ ایک مذہبی ریفارمر کی حیثیت سے عام لوگوں کو متاثر کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے جو بھی زبان استعمال کی اس کو گرامر کی قیود سے آزاد رکھا۔ وہ ایسی سادہ اور عام فہم زبان میں بات کہتے جو سامعین کے دلوں کو موہ لیتی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین اپنی روزمرہ کی شیریں اور سادہ زبان میں معمولی تمثیلوں اور تشبیہات و استعارات کے ذریعے اس خوبی اور صفائی سے بیان کرتے کہ دل پر چوٹ لگتی۔ فی الواقعہ وہ عام فہم زبان کے لباس میں بڑے قیمتی و عمدہ خیالات کا اظہار کر جاتے۔"[3]

اُن کے بے شمار اشعار گرنتھ صاحب میں شامل ہیں اور خاص طور وہ ایسے اشعار

---

[1] اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۷۷۔۷۸
[2] ایضاً ص ۷۸
[3] ایضاً

ہیں۔ جن میں پنجابی الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اُن کی تحریروں سے کبھی ان کے پیر ہونے کبھی صوفی، کبھی وشنوا اور کبھی ویدانت کے طالب علم ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ لاگ لپٹ بالکل نہیں رکھتے اور جو کہتے ہیں ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں۔ ہندو مسلمان سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں:

"اُن کے کلام اور زبان کی سادگی و تاثیر اور صداقت و خلوص نے انھیں دونوں فرقوں میں یکساں مقبول بنا دیا ہے۔ ہندو انھیں کبیر داس اور مسلمان شاہ کبیر کہتے ہیں[1]۔"

کبیر کی نظمیں، بھجن اشلوک یاد وہے عرصۂ دراز تک لوگوں کی زبانوں پر رواں رہے ان کو سب سے پہلے اُن کے ایک چیلے دھرم داس نے جمع کر کے کتابی صورت دی تھی[2]۔ اُن کا اُسلوب بیان جیسے کہ پہلے بیان ہوا ہے، بڑا سادہ، میٹھا اور عام فہم ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خواص کو نہیں عوام کو مخاطب کرتے ہیں۔

کبیر کے بے شمار چیلے اور مرید تھے جنھوں نے بجائے پوربی کے برج بھاشا میں لکھا۔ اُن میں سے خاص طور پر دھرم داس کا نام قابلِ ذکر ہے، جن کی مشہور تصانیف دواوش پلنتھ، نربھے گیان اور کبیر بانی ہیں۔ ان میں سے آخری کتاب کبیر بانی ۱۴۶۴ھ/۱۵۲۱ سمت میں لکھی گئی تھی[3]۔ وہ بھی بڑے شیریں سخن سادھو تھے۔ ان کی نظموں میں بڑی نغمگی اور خوش آہنگی پائی جاتی ہے اور اُن میں عربی کی طرح ردیف و قافیہ کا بھی عمدہ التزام ہوتا ہے[4]۔

کبیر کی خانگی زندگی بڑی سادہ تھی۔ انھوں نے لوئی نام کی ایک لڑکی سے شادی کی

---

[1] اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۷۷-۷۸

[2] A. Halim, J.A.S.P. Vol. II, 1957, p. 74.

[3] R. C. Sukla Hindi Sahitya Ka Itihasa, p. 63.

[4] Ibid, p. 63.

بھی جسے وہ گنگا کے کنارے ایک بیراگی کی کٹیا میں ملے تھے۔ اس سے ان کا ایک لڑکا اور لڑکی بھی۔ لڑکے کا نام کمال اور لڑکی کا نام کمالی تھا۔[1] شاہ کبیر اپنی معاش کے لیے کپڑا بنتے اور اس کے ساتھ وعظ و تلقین کا سلسلہ بھی باقاعدہ جاری رکھتے۔[2] اُن کے بیٹے کمال بھی ہندی کے بڑے عمدہ شاعر تھے لیکن انھوں نے بہت کم لکھا۔ اُن کا ایک پد یا مصرعہ مصرا بندھو ونود نے اپنی کتاب میں بطورِ حوالہ دیا ہے۔ وہ کبیر کے بارہ فرقوں میں سے ایک فرقہ کے بانی بھی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے والد کی بعض باتوں کے خلاف آواز بھی اُٹھائی تھی۔[3]

کبیر کے بعض اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

جاگ پیاری اب کا سووے — رین گئی دن کاہے کھووے
ایسا کوئی نہ ملے جا سوں رہے لاگ — سب جگ جلتا دیکھیے اپنی اپنی آگ
کبیر سکھ کو جائے تھا آگے آیا دکھ — جلی سکھ گھر اپنے ہم جانیں اور دکھ
بہت دنن بچھڑے ہری پاتے — بھاگ بڑے گھر بیٹھے آئے
کبیر یہ گھر پریم کا خالہ کا گھر ناہیں — سیس اتارے ہاتھ سے سو بیٹھے گھر ماہیں
میرا مجھ میں کچھ نہیں جو کچھ ہے سو تیرا — تیرا تجھ کو سونپتے کیا لاگے میرا[4]

رہنا نہیں دیس بیگانا ہے[5]
یہ سنسار کاگد کی پڑیا[6]
بوند پڑے گھل جانا ہے[7]

---

[1] اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۱۸۷ [2] ایضاً
[3] History of Hindi Literature, Vol. I, p. 105.
[4] اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۷۹
[5] ایضاً
[6] کاغذ [7] ایضاً ص ۷۸

کبیر ناؤ ہے جرجری کوڑے[1] کھیون ہار ہلکے ہلکے تر گئے بوڑے[2] جن سر بھار

سُکھیا سب سنسار ہے کھاتے اور سووے[3]

دُکھیا داس کبیر ہے جاگے اور روے

شیخ بہاء الدّین نتھّو جونپوریؒ

شیخ بہاء الدّین نتھّو جونپوریؒ جونپور کے متبحر عُلماء اور عظیم المرتبت صُوفیاء میں سے تھے۔ وہ شیخ محمّد عیسیٰ جونپوریؒ کے خاص مریدوں میں سے تھے مگر انھیں خرقۂ خلافت سیّد راجی حامد شاہ مانکپوریؒ نے عنایت کیا تھا[4]۔ ترک و تجرید اور صدق و ورع میں وہ بے مثال تھے[5]۔ ان سے ہزاروں طلباء نے علومِ ظاہری پڑھے اور لاکھوں بندگانِ خدا نے رُوحانی استفادہ کیا[6]۔ وہ عربی و فارسی کے علاوہ ہندی پر بھی کامل عبور رکھتے تھے، جس کا ثبوت ان کے مجموعۂ خطوط "صحائف الطریقہ" سے بھی ملتا ہے۔ یہ خطوط انھوں نے اپنے ہم عمر و ہم عصر صُوفیاء، دوستوں اور مریدوں کو لکھے تھے[7]۔ ان میں انھوں نے آیاتِ قرآنی، عربی کے مقولوں اور فارسی کے اشعار کے علاوہ ہندی کے مقولوں، جگتوں اور دوہوں کا بھی کثرت سے استعمال کیا ہے اور ان کو اس طرح برمحل نقل کیا ہے کہ ان سے خطوط کی عبارت بڑی مؤثر و عام فہم بن گئی ہے[8]۔ ان کا وصال (۹۴۷ھ میں) جونپور میں ہوا[9]۔ ان کے ہندی کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

کہہ جو کت کو ہاتھ پسارے

تو رو والدھری کو بارے

---

[1] کوڑے (بیوقوف) [2] ڈوبے [3] اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۸۰

[4] اخبار الاخیار ص ۱۹۲

[5] ایضاً [6] ایضاً [7] صحائف الطریقہ (قلمی) یہ مجموعۂ خطوط راقم الحروف نے مرتب کیا اور شائع کیا ہے۔ [8] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۱۸

رات دیس بہت رکھوارا۔

نین جو دیکھی جای سو مارا[۱]

مخدوم شیخ دانیال خضریؒ

مخدوم شیخ دانیال خضریؒ کا شمار شرقی عہد کے متبحر علما اور عظیم المرتبت صوفیا میں ہوتا ہے۔ وہ بلخ میں پیدا ہوئے تھے۔ ہجرت کر کے دہلی چلے آئے اور وہاں ایک عرصہ شاہی ملازمت میں رہے لیکن پھر ملازمت چھوڑ کر بنارس اور مانکپور میں رہنے لگے۔ بالآخر سلطان حسین شاہ شرقی کے عہدِ حکومت میں جونپور چلے آئے[۲]۔ جہاں انھوں نے ۱۲ ربیع الاول ۹۹۴ھ/ ۱۵۸۵-۱۵۸۶ء کو انتقال فرمایا[۳]۔

مخدوم دانیال سید راجی حامد شاہ مانکپوریؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ علاوہ ازیں اُن کو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت خواجہ خضرؑ سے بھی بہت زیادہ رُوحانی فیض حاصل ہوا تھا[۴]۔ وہ خواجہ خضرؑ سے اپنا رُوحانی تعلق ہونے کی بنا پر اپنا لقب خضری کرتے تھے۔ جونپور میں اُن کے حلقۂ ارادت میں ہزاروں لوگ شامل تھے اور وہاں وہ علومِ ظاہری کی درس و تدریس بھی کیا کرتے تھے[۵]۔ سید محمد جونپوریؒ اور ان کے بھائی سید احمد خضریؒ جیسے متبحر علما اور عظیم المرتبت مشائخ ان ہی کے شاگرد و مرید تھے[۶]۔ مخدوم دانیال خضریؒ عربی و فارسی کے علاوہ ہندی پر بھی کامل عبور رکھتے تھے اور ہندی کے بڑے عمدہ شاعر تھے[۷]۔ اُن کے مندرجہ ذیل ہندی اشعار ملاحظہ ہوں ۔

---

۱ صحائف لطریقہ مرتبہ میاں محمد سعید ورق ۱۲۰ ب

۲ تجلّیٔ نُور جلد اوّل ص ۵۵-۵۶

۳ ایضاً

۴ ایضاً ص ۵۶-۵۷، خزینۃ الاصفیا جلد اول ص ۴۴۳

۵ تجلّیٔ نور ایضاً ص ۵۶

۶ ایضاً ص ۵۶-۵۷ سید محمد جونپوریؒ کے مزید حالات ص ۴۷۰-۴۹۰ پر ملاحظہ ہوں۔

۷ تجلّیٔ نور ایضاً ص ۵۶-خزینۃ الاصفیا ایضاً

جگ جگ عمر حضرت جی خواجی　　حضرت بنتی رسول نواجی
دانیال جیو پر گھسٹ کینا　　حضرتِ خواجہ خضر ستھ دینا[1]

شیخ عبدالقدّوس گنگوہیؒ

شیخ عبدالقدّوسؒ شیخ محمدؒ بن شیخ عارفؒ بن شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ کے مرید و خلیفہ تھے[2] اُن کو شیخ احمد عبدالحقؒ سے بھی غائبانہ عقیدت تھی۔ ان سے بھی انھیں بے حد رُوحانی فیض حاصل تھا[3] اور انھوں نے ان کے ملفوظات بھی انوار العیون کے نام سے مرتّب کیے[4]

اُن کی ولادت ۸۶۰ھ/۱۴۵۵ء میں ہُوئی اور وُہ ابتدائے حال میں زیادہ عرصہ ردولی میں رہے لیکن جب سلطنتِ شرقی کا ستارہ گردش میں آیا تو وہ سکندر لودھی کے ایک امیر عمر خان کی دعوت پر شاہ آباد چلے گئے اور وہاں پر ۳۵ سے ۳۸ سال تک وعظ و تلقین کرتے رہے[5] شاہ آباد جب مُغلوں کے حملہ کی وجہ سے زیرِ عتاب آیا تو وہ ۱۴۹۱ء میں گنگوہ (ضلع سہارنپور) چلے گئے۔ اور پھر وہیں ۸۴ سال کی عمر میں ۹۴۵ھ/۳۸-۱۵۳۷ء میں انتقال فرمایا[6] پہلے لودھی سلاطین ان کے معتقد تھے اور بعد میں بادشاہ بابر اور ہمایوں بھی ان کے علم و معرفت کے بڑے گرویدہ ہو گئے[7] چنانچہ انھوں نے سکندر لودھی، بابر، ھمایوں اور بہت سے اُمرائے وقت کو شریعت کی پابندی اور عُلماء و صُوفیاء کی حفاظت و نگہبانی کے لیے متعدّد خطوط لکھے۔ یہ خطوط اس زمانے کے ماحول کی اصلاح کے لیے کتنی طرح مفید اور

---

[1] تجلّی نور جلد اوّل ص ۵۶۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۴۴ مگر وہاں "دانیال جیو پر گھسٹ کینا" کو "دانیال جو رگٹ کینا" لکھا ہے۔

[2] اخبار الاخیار ص ۲۱۵

[3] ایضاً　[4] ایضاً　[5] اخبار الاصفیاء (قلمی) ورق ۴۸

[6] اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۸　[7] مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۸۴ ب ۴۸۵ ا

[8] ایضاً۔ تاریخ مشائخ چشت ص ۲۱۸

[9] S. Nur-ul-Hasan, M.I.Q., Vol. I, No. 1, July 1950, p. ..

مددگار ثابت ہوتے[۱]۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مادر زاد ولی تھے[۲]۔ اور بڑے عظیم المرتبت عالم و صوفی تھے[۳]۔ وہ بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ اُن کی تصنیفات: حاشیہ فصوص الحکم، شرح عوارف المعارف، رسالہ قدسیہ، غرائب الفوائد، رُشد نامہ[۴]، مظہر العجائب اور مکتوبات قدوسیہ وغیرہ بڑی مشہور ہوئیں[۵]۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں مسئلہ وحدت الوجود کو سمجھنے اور سمجھانے پر خاص طور پر زور دیا ہے[۶]۔ اُن کو عربی و فارسی کے علاوہ ہندی پر بھی مکمل عبور تھا۔ وہ ہندی کے بڑے عمدہ شاعر تھے اور اپنا تخلص الکھ داس کرتے تھے۔ اُن کی تصانیف میں ہندی دوہے بہت کثرت سے ملتے ہیں اور خاص طور پر اُن کا "رُشد نامہ" ہندی دوہوں سے بھرا پڑا ہے[۷]۔ اُن میں سے چند ایک ملاحظہ ہوں ؎

یہ جگ ناہیں باج پی بوجھ برھسم گیان
سو پانی سو بلبلا سوئی سمدر جان
ایکی او ہو، ایکی ماس، ایکی سرُر، ایکی ہانس
گرمکھ بوجھ برھسم گیان تیں ترلوک ایک کے جان

دھن کارن پی آپ سنوارا	بن دھن سکھی کنت کنھارا
نہ کھیلے دھن ماہیں ایوال	باس پھول مہنن اپچتے جیوال
کیوں نہ کھیلوں تجھ سنگ بیتا	مجھ کارن تیں اِتنا کیتا
الکھ داس آکھے سُن ہوتی	سوئی پاک اور نہ پہن ہوتی

---

[۱] S. Nur-ul Hasan M.I.Q. Vol. I, No. 1, July 1950, p. 49.
لطائفِ قدسی (مطبوعہ مطبع احمدی دہلی) "تاریخ مشائخ چشت" ص ۲۲۰-۲۲۲

[۲] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۱۷ [۳] اخبار الاخیار ص ۲۱۵-۲۱۶

[۴] "تاریخ مشائخ چشت" ص ۲۲۱ [۵] ایضاً

[۶] ایضاً [۷] ایضاً ـ اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۸-۲۹

جدھر دیکھوں ہے سکھی دیکھوں ہور نکو تے
دیکھا بوجھ بچار میں سبھی آپیں سوتے[1]

انھوں نے ایک شعر ریختہ میں بھی لکھا ہے ؎

صدق رہبر، صبر توشہ، دشت منزل دِل رفیق
ست نگری دھرم راجا جوگ مارگ[2]

شیخ قطب علی قطبنؒ

شیخ قطب علی قطبنؒ کے ابتدائی زندگی کے حالات معلوم نہیں ہو سکے مگر وہ ہندی کے مشہور شعرا، میر سیّد منجھن اور ملک محمّد جائسی کے ہم عصر تھے۔ گلزارِ ابرار میں لکھا ہے کہ پہلے وُہ شیخ برھان الدّین کالپویؒ کے مرید ہوئے لیکن بعد میں انھوں نے سلسلۂ شطاریہ کے کسی بزرگ سے بیعت کر لی تھی۔[3]

وُہ سلطان حسین شاہ شرقی (المتوفی ۱۵۰۵ء) کے درباری شاعر تھے اور انھوں نے اپنی مشہور مثنوی مرگاوتی بھی انھی کے نام منسوب کی۔ یہ مثنوی اودھی زبان میں ہے اور ۱۵۰۱ء میں مکمل ہوئی تھی۔[4] سلطان حسین ان دنوں کلکنگ (کحل گاؤں) میں بنگال کے سلطان علاء الدّین حسین شاہ (۱۴۹۳ء - ۱۵۱۸ء) کے ہاں مہمان کی حیثیت سے مقیم تھے اور شکست خوردگی کی حالت میں زندگی کے آخری دن پورے کر رہے تھے۔[5] اِس مثنوی میں وہ سلطان حسین شاہ شرقی کو "ساہو حسین" کہتے ہیں اور لکھتے ہیں :

---

[1] اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۸ - ۲۹ [2] ایضاً

[3] A. Halim, J.A.S.P. Vol. II, 1957, p. 85.

[4] Misra Bandu Vinode, Vol. I, p. 199. A Halim. Ibid, p. 71.

[5] ایضاً مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب

[6] The Sharqi Sultanate of Jaunpur: A Political & Cultural History, pp. 100, 112 & 200.

"ساہو حسین ہے بڑا راجہ" اور اُن کی مزید تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ پنڈت ہے"، "بڑا سیانا ہے"، "یدھشٹر کی طرح منصف مزاج ہے"، "بہادری میں بالی اور کرن سے زیادہ بہادر ہے" اور جب "تحفے تحائف دیتا ہے تو گنتا تک نہیں"۔ وغیرہ وغیرہ۔[1]

اُن کے مندرجہ ذیل چند اشعار اس سلسلہ میں ملاحظہ ہوں ؎

۱ ساہو حسین ہے بڑا راجہ چھتر سنگھاسن ان کو چھاجا

۲ پنڈت او بدھی وان سیانا پڑھے پران ارتھ سبھ جانا

۳ دھرم یدھشٹر ان کو چھاجا ہم سر چھاہ کیو جگ راجہ

دان دیہہ او گنت نہ آ بے بلی او کرن نہ سردر پا بے[2]

ان اشعار میں قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ وہ اپنے مربی سلطان حسین کا مقابلہ نوشیرواں، رستم یا حاتم کے بجائے ہندو دیومالا کے سورماؤں سے کرتے ہیں۔ ان کے قصوں کے ہیرو اور ہیروئن ہمیشہ ہندو شہزادے اور شہزادیاں ہوتی ہیں۔ وہ بھی اپنے ہم عصر شعرا میر سید منجھن اور ملک محمد جائسی کی طرح اپنی مثنویوں کی حسن و عشق کی داستانوں کو ہندوؤں کے ثقافتی اور روایتی پس منظر میں بیان کرتے ہیں۔ اس بنا پر اُن کی تحریروں میں اور بھی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی مرگاوتی ایک المیہ قصہ ہے جس میں وہ اپنے ہیرو کا ملاپ روحِ ازل سے کراتے ہیں۔ ان کی یہ چیز بھی اُن کی ہندو محبت و شادی کی روایات کے مطابق ہے۔[3]

---

[1] A. Halim J.A.S.P. Vol. II, 1957, p. 71.

[2] History of Hindi Literature, p. 199. Ibid.

[3] The Sharqi Sultanate of Jaunpur A Political and Cultural History, pp. 200-201.

شاہ محمدؐ غوث گوالیاریؒ

شاہ محمد غوثؒ ۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء-۱۵۰۱ء میں پیدا ہوئے[1] اور ۹۶۰ھ/۱۵۶۲ء-۱۵۶۳ء[2] میں آگرہ میں فوت ہوئے لیکن دفن گوالیار میں ہوئے[3] وہ سلسلۂ شطاریہ کی بڑی اہم اور برگزیدہ ہستی تھے۔ انھوں نے اپنے بھائی شیخ بہلولؒ کے ساتھ چنار کی پہاڑیوں کے دامن میں ۱۲ سال تک ریاضاتِ شاقہ کی تھیں۔ وہ وہاں غاروں میں رہتے اور درختوں کے پتّوں پر گزارہ کیا کرتے تھے[3]۔ وہ دونوں بھائی بڑے صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ ان کی ایک مشہور عربی تصنیف "جواہرِ خمسہ" ہے جو انھوں نے ۲۲ سال کی عمر میں لکھی تھی اور جس کا انھوں نے بعد میں فارسی میں بھی (۹۵۶ھ) ترجمہ کیا تھا[4]۔ ان کی دوسری مشہور کتاب بحرالحیات ہے جو دراصل سنسکرت کی کتاب "اَمرت کنڈ" کا ترجمہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کو سنسکرت اور ہندی دونوں پر مکمل عبور تھا۔ اس کتاب میں انھوں نے ہندو مذہب کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے[5]۔ مقصود المراد (ملفوظات سیّد ہاشم) میں اُن کا مندرجہ ذیل ہندی قول اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ ان کو ہندی پر بھی عبور تھا۔

"بھیگی بچّہ خدا کو نہ میلے"۔ یعنی بھکاری کو خدا نہیں ملتا[6]

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ ان کی نظر سے ان کے اس طرح کے کئی اور اقوال اور ہندی اشعار بھی گزرے ہیں[7]۔

حضرت شاہ محمد غوث گوالیاریؒ اور ان کے بھائی شیخ بہولؒ کے بادشاہ بابر، ہمایوں اور اکبر سے

---

[1] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۴
[2] منتخب التواریخ ایضاً
[3] اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۸
[4] گلزارِ ابرار (قلمی) ورق ۱۸۷ الف-۱۹۲ الف
[5] بحرالحیات ۱۸۹۰ء میں دہلی میں چھپی تھی لیکن اب نایاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے
[6] اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۹-۳۰ [7] ایضاً

بھی بڑے عمدہ مراسم تھے[1] اور اُن کے خلیفہ شیخ وجیہہ الدین علوی گجراتی اور شیخ منجھن رحؒ بھی بڑے صاحبِ مرتبہ بزرگ تھے۔[2] مؤخر الذکر بھی شرقی عہد کے ہندی کے بلند پایہ شاعر تھے۔

شیخ منجھن رحؒ

شیخ منجھن رحؒ کے والدِ بزرگوار عبداللہ قاضی خیر الدین لکھنوتی کے رہنے والے تھے[3] شیخ منجھن حضرت شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کے مرید تھے اور اُن سے انھوں نے جواہرِ خمسہ بھی پڑھی تھی۔ اُن کی وہ بے حد تعظیم و تکریم کرتے اور جب اُن کو خرقۂ خلافت سے نوازا تو انھیں وہی خرقہ عنایت فرمایا جو وہ خود ریاضت کرتے وقت چنار کی پہاڑیوں میں پہنا کرتے تھے[4] وہ قلعہ رائے سین میں رہنے کے لیے اسی سال پہنچے، جس سال اس کو شیر شاہ سوری نے فتح کیا تھا[5] شیر شاہ نے ان کو شیخ الاسلام کا عہدہ دے کر قلعہ کی خانقاہ داری پر مامور کیا تھا[6] لیکن جب یہ قلعہ راجپوتوں نے دوبارہ فتح کر لیا تو وہ سارنگ پور (مالوہ) چلے گئے[7] اور وہاں اس علاقہ کے تمام عُلما و صُلحا بھی اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ تاہم کچھ عرصہ بعد وہ شہر چھوڑ کر وہاں سے کچھ فاصلہ پر ایک ویرانے میں عزلت نشین ہو گئے[8] وہ سلسلہ شطاریہ کے برگزیدہ مشائخ میں سے تھے اور بعد میں جس سال انھوں نے "ذکرِ جہر" کی ایک جماعت بنائی اسی سال وہ انتقال فرما گئے[9]

---

[1] Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, p. 64.

[2] اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۳۰ ؛ اذکارِ ابرار (اردو ترجمہ گلزارِ ابرار) ص ۲۷۱، ۲۷۲

[3] ایضاً ص ۲۷۱۔۲۷۳

[4] ایضاً۔ شیخ غوثی شطاریؒ نے وہ خرقہ ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵-۱۶۰۶ء میں اُن کے بیٹے عثمان کے پاس دیکھا تھا۔

[5] ایضاً [6] ایضاً [7] ایضاً [8] ایضاً

[9] ایضاً غالباً انھوں نے ۱۵۹۳ء میں وصال کیا۔

شیخ منجھن ہندی کے بڑے عمدہ شاعر و مصنّف تھے۔ اس کا بہترین ثبوت اُن کی ایک مشہور کتاب "مدھو مالتی" ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے حضرت شاہ محمّد غوثؒ گوالیاری کے حوالے بھی کئی جگہ دیے ہیں۔[1]

سیّد محمّد جونپوریؒ

سیّد محمد جونپوریؒ سلطان محمود شرقی کے عہد میں (۱۴ جمادی الاوّل ۸۴۷ھ مطابق ۹ ستمبر ۱۴۴۳ء) جونپور میں پیدا ہوئے[2] وہ شیخ دانیال خضریؒ کے شاگرد تھے[3]۔ انھوں نے سات سال کی عمر میں قرآنِ پاک حفظ کر لیا اور بارہ سال کی عمر میں تمام علومِ ظاہری کے مستند عالم ہو کر اسد العلماء کا خطاب پایا تھا[4]۔ اس کے بعد کئی سال تک وہ درس و تدریس کرتے رہے اور ان کے درس میں شاہ و گدا ہر طرح کے لوگ جمع ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک سلطان حسین شاہ شرقی بھی تھے[5]۔ بالآخر وہ ہمہ تن عبادات و ریاضات میں مصروف رہنے لگے[6]۔ بعض کی رائے ہے کہ انھوں نے مہدیٔ آخر الزماں ہونے کا بھی دعوےٰ کیا تھا کیونکہ اُن کے مرید اور پیروکار انھیں مہدیٔ آخر الزّماں مانتے تھے[7]۔ سلطان حسین شاہ شرقی کے عہدِ حکومت میں ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ بعد میں ان کا بہت سا زمانہ لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے سیاحت میں گزرا لیکن وہ جہاں بھی گئے اُن کے حلقۂ ارادت میں ہزاروں لوگ شامل ہوتے گئے[8]۔ ان کا وصال فرہ واقعہ افغانستان میں ۹۱۰ھ/۴-۱۵ء میں ہوا اور وہ وہیں دفن ہوئے[9]۔

---

[1] مدھو مالتی مرتبہ منوہر لال گپتا۔ الٰہ آباد ۱۹۶۱ء ص ۱۴

[2] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۸

[3] تجلّی نور جلد اوّل ص ۵۸

[4] ایضاً۔ تذکرہ علمائے ہند ایضاً

[5] ایضاً۔ تجلّی نور ایضاً

[6] ایضاً

[7] ایضاً ص ۵۹ - ۶۰

[8] ایضاً ص ۵۸ - ۶۰ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۸-۲۰۱

[9] ایضاً ص ۲۰۱

اُن کی زندگی کے باقی ماندہ حالات تفصیل کے ساتھ اِس کتاب کے باب" مہدوی تحریک" میں لکھے گئے ہیں۔ یہاں صرف اُن کی ہندی زبان کی خدمات کا ذکر کیا جاتا ہے سید محمد جونپوری عربی و فارسی کے عالم و فاضل تھے لیکن وعظ و تلقین وہ ہمیشہ ہندی یا گجراتی میں کرتے تھے۔ وہ ہندی کے بہت عمدہ شاعر بھی تھے[1]۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اُن کے بعض اقوال فرقہ مہدویہ کی کتابوں میں اب تک محفوظ ہیں[2]۔ اُن میں سے چند ایک ملاحظہ ہوں۔ مثلاً ایک موقعہ پر انھوں نے شیخ احمد کھٹوؒ (المتوفی ۸۴۹ھ) کے متعلق فرمایا: " رو پیٹنے خدا کوں پو پنچے۔"

(بحوالہ تاریخ سلیمانی جلد اوّل[3])

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ جب وہ اپنے مریدوں اور پیرو کاروں کے ساتھ خراسان پہنچے تو سلطان حسین کی فوج نے انھیں بڑی تکلیف پہنچائی لیکن جب سلطان کو اس کی خبر ملی تو اس نے ان سے معذرت کی۔ اس وقت سُلطان کے سفیر کے سامنے انھوں نے ہندی کا یہ جملہ کہا: "سشر گی چوٹ شکر کی پوٹ[4]۔"

حج کے سفر میں انھوں نے یہ دوہا کہا ؎

ہوں بلہاری سجنا ہوں بلہار
ہوں سرجن سہرا ساجن مجھ گل ہار[5]

وفات سے کچھ پہلے انھوں نے یہ دوہا ارشاد کیا ؎

ہیر ونت[6] پکھال توں کان پر دھوے مدھوے
او جھل ہو دیں نچھوت سی سکھ نندری ناسوے[7]

[1] Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, pp. 96-106.

[2] اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۵

[3] ایضاً

[4] ایضاً

[5] ایضاً ص ۲۵-۲۶

[6] ایضاً ص ۲۶ ہیرونت/ ہرانت

[7] ایضاً ص ۲۶

اور یہی دوہا انھوں نے بیدر میں ایک موقعہ پر قاضی علاءالدین بیدری کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔ (از شواہد الولایت)

مولوی عبدالحق مزید لکھتے ہیں کہ ذیل کے دو دوہے انھیں موہن ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء کے ایک قدیم نسخے میں ملے تھے جس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے:

"ایں کتاب مسمّٰی بہ اسرارِ عشق محض اِبتدا تا اِنتہا شرح نقل مقدسہ سیّد محمّد مہدی موعود است وسوائے ایں حرف نیست نقل اینست کہ مہدی علیہ السّلام فرمود" تمام عالم مصطفٰی کے ولایت کا صفت کرنے : ہیچ ہوا۔ ہمارے ملانے دو گوجری دھیان میں مصطفٰی کی ولایت کی صفت کیے"۔[۱]

دوہا: ۔

چندر کے ترائیں[۲] کوں سورج دیکھو آئے
ایسا بھگونت جو بیٹھے دشت پاپ چھٹر جائے

دوہا دیگر:

تو روپ ایکو جگ موہیا تراہن[۳] بھان
انھیں روپ پہن ہوئے کو دوسی نہ ہوئے آن[۴]

اس طرح سیّد محمد جونپوری کے پند و نصائح اور خطبات میں ہندوی یا ہندی روزمرہ و محاورہ کا استعمال بڑا عام تھا۔ اُن کے وصال کے بعد ان کے خلفاء نے مہدوی تحریک کو جاری رکھا اور وہ بھی ان کی روایات کے مطابق اپنے پیروکاروں کو پند و نصائح کرتے یا خطبات دیتے وقت ہندی و گجراتی کا استعمال کرتے[۵] ان کے بعض

[۱] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۶
[۲] نسخہ میں ترائین/ تراامن ہے۔
[۳] نسخہ میں ترایں/ تراھن ہے
[۴] ایضاً ص ۲۶-۲۷
[۵] Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, pp. 106-134.

خلفاء نے مقامی زبان میں کتابیں بھی لکھیں جن کی تفصیلات ہم پہلے ان کے حال میں لکھ چکے ہیں۔[1] اُن کے خلیفہ سیّد خوندمیر، میاں مصطفےٰ گجراتی، اور خلیفہ میاں الہ داد کے مرید شیخ برہان الدّین کالپویؒ نے بھی ہندی میں نظمیں لکھیں۔[2] اس طرح سیّد محمدؒ کی مہدوی تحریک نے ہندی زبان کی بڑی خدمات کیں اور اسے عوام النّاس میں مقبول کیا۔

شیخ بُرہان الدّین کالپویؒ

شیخ برھان الدّین کالپیؒ کے رہنے والے تھے اور شیخ تاج الدّین انصاریؒ کے بیٹے تھے۔[3] زہد و ورع میں بے مثال تھے اور اپنے دَور کے عظیم المرتبت بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ میاں الہ دادؒ کے مرید تھے۔[4] انھوں نے اپنے لیے ایک چھوٹا سا حجرہ بنا رکھا تھا۔ جہاں وہ دن رات بیٹھے عبادات اور مہدوی وظیفہ "پاسِ انفاس" میں مشغول رہتے۔[5] انھوں نے عربی زبان یا علومِ ظاہری کی تعلیم کو باقاعدہ کسی مدرسہ یا استاد سے حاصل نہیں کیا تھا لیکن اس کے باوجود قرآنِ مجید کا بڑا فصیح و بلیغ اور عمدہ درس دیا کرتے تھے۔[6]

شیخ بُرہان الدّین ہندی کے بڑے عُمدہ شاعر تھے۔ ملّا عبدالقادر بدایونی اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ ایک بار وہ چنار سے واپس آتے ہوتے کالپی میں ان سے ملے تھے۔ اس موقعہ پر انھوں نے ان کو اپنی ہندی نظمیں سنائیں۔ یہ نظمیں رُوح کی غذا سے

---

[1] Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, pp. 109-119.

[2] ایضاً [3] گلزارِ ابرار (قلمی) ورق ۱۹۵ ب [4] Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, p. 130.

[5] Ibid, p. 130 [6] کہا جاتا ہے کہ جب وہ جوان تھے تو شیخ عبدالملک کے مدرسہ میں پڑھنے جایا کرتے تھے اور علی الصبح ہی مدرسہ چلے جاتے تا کہ دوسرے لڑکوں سے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔ ایک روز راستے میں انھیں ایک بزرگ ملے جنھوں نے اُن سے کہا کہ برہان جو کام تم کر رہے ہو وہ بے فائدہ ہے۔ اسے چھوڑ کر عزلت نشینی اختیار کر لو اور دن رات یادِ الٰہی میں گزارا کرو لیکن وہ مدرسہ جانے سے باز نہ آئے۔ وہ بزرگ دوسری بار پھر ملے اور پھر وُہی نصیحت کی لیکن وہ بدستور مدرسہ جاتے رہے۔ تیسری مرتبہ وہ بزرگ پھر (جاری ہے)

مُلاقات اور تصوّف کے موضوعات پر تھیں۔ اور رُوحانی جذبات سے پُر نصیحت آمیز اور وجد آور تھیں[1]۔ شیخ محمد غوثی شطاریؒ لکھتے ہیں کہ اُن کا درس بڑا موثر اور اُن کی گفتگو بڑی معنی خیز اور پُر جوش ہوتی تھی۔ انھوں نے ہندی میں "فراق نامہ" لکھا جس کا اندازِ بیان بڑا موثر اور پُر سوز ہے[2]۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں بھی شیخ بُرہان الدین کالپویؒ کے ہندی دوہے بڑے مقبول تھے اور وُہ رُوحانی تاثیر سے معمور تھے[3]۔

شیخ کے بہت سے مرید تھے، جن میں سے ایک ملک محمّد جائسی تھے جو اکھروٹ اور پدماوت کے مشہور مصنّف ہیں۔ انھوں نے تقریباً سو سال عمر پائی اور ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء میں وصال کیا۔ وہ جس حُجرہ میں عبادت و ریاضت کیا کرتے تھے اِسی میں مدفون ہُوئے[4]۔

ملک محمّد جائسی

ملک محمّد جائسی سلطنتِ شرقی کے آخری دَور میں پیدا ہُوئے۔ وہ شیخ بُرہان الدین کالپویؒ کے مرید تھے۔ اِس بات کا ذکر انھوں نے اپنی پدماوت اور اکھروٹ میں بھی کیا ہے[5]۔ لیکن خزینۃ الاصفیاء کے مصنّف اُن کو مہدوی لکھتے ہیں[6]۔

اُن کی تاریخ ولادت کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ بعض لکھتے ہیں کہ وہ بادشاہ اکبر کے عہدِ حکومت میں زندہ تھے اور ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء-۱۶۴۰ء میں فوت ہُوئے۔

(گزشتہ سے پیوستہ) اُن سے ملے اور اُن کو گلے سے پکڑ کر اس زور سے نیچے گرا دیا کہ اُن کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں اس بزرگ نے اُن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں تمھاری ٹانگیں نہ توڑتا تو تم مدرسہ جانے سے باز نہ آتے۔ اس کے بعد وُہ دنیائے تصوّف میں گم ہو گئے اور ایک چھوٹا سا حجرہ بنا کر دن رات اس میں عبادت میں مصروف رہنے لگے۔ اس حجرہ میں وہ اپنی ٹانگیں مشکل سے پسار سکتے مگر ہر وقت عبادت میں مصروف رہتے اور صرف دودھ اور دہی پر گزارہ کیا کرتے تھے۔ گلزارِ ابرار ورق ۱۹۵ ب [1]

Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, p. 131.

[1] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۶-۸ [2] گلزارِ ابرار (قلمی) ورق ۱۹۵ ب

[3] اخبار الاخیار ص ۲۷۶ [4] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۶-۸ (جاری ہے)

اور بعض کا خیال ہے کہ وہ ۱۴۹۴ء میں پیدا ہوئے اور ۵ار رجب ۹۴۹ھ بمطابق ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء کو فوت ہوئے۔ چونکہ انھوں نے مثنوی پدماوت شیر شاہ سوری کے عہد میں ۹۴۷ھ/۱۵۴۰-۱۵۴۱ء میں لکھی تھی۔ اس لیے اُن کی تاریخ ولادت ۱۴۹۴ء معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے چونکہ یہ بات بھی ثابت ہے کہ وہ بادشاہ اکبر کے عہد میں حیات تھے اس لیے اُن کی تاریخ وفات ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء-۱۶۴۰ء یقیناً غلط ہے[1]

خزینۃ الاصفیاء کے مصنف لکھتے ہیں کہ ملک محمد جائسی بادشاہ اکبر کے عہدِ حکومت میں بہت عمر رسیدہ اور بوڑھے ہو چکے تھے۔ ایک بار وہ دربار میں بلائے گئے۔ اکبر نے جب انھیں دیکھا تو مسکرایا۔ اس پر انھوں نے فوراً اُس سے پوچھا "اے بادشاہ! کیا تم اُس کوزہ پر ہنس رہے ہو یا کوزہ گر پر؟" بادشاہ فوراً متنبہ ہوا اور اُن کی ذہانت کی بڑی داد دی[2]

ملک محمد جائسی ہندی ادب پر مکمل عبور رکھتے تھے اور وہ ہندی کے بڑے پایہ کے مصنف و شاعر تھے۔ چنانچہ اُن کو "محقق ہندی" کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے[3] انھوں نے ہندی میں بہت سی کتب و رسائل اور مثنویاں لکھیں اور اُن کی بعض تصانیف تو ہندی ادب کا شاہکار مانی جاتی ہیں۔ اُن کی تصنیفات پدماوت، (پدماوتی)، لہناوت (لہناوتی) اکھروت (اکھروتی)، کہرا نامہ۔ پوستی نامہ اور ہولی نامہ ہیں[4] اِن میں سے اکھروتی ایک مذہبی مثنوی ہے لیکن ان کی سب سے زیادہ مشہور و مقبول مثنوی پدماوت (پدماوتی) ہے جس میں انھوں نے راجہ رتن سین،

(گزشتہ سے پیوستہ)

ؒ S.A. Askari; "A Newly discovered volume of Awadhi Works including Padmawat and Akharwat of Malik Muhammad Jiasi" (Journal of the Bihar Research Society, March and June 1953) p. 31.

[5] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۷۲

[6] Muslim Revivalist Movements in Northern India in the Sixteenth and Seventeenth Centuries, pp. 132-133.

[1] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۴۷۲ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً

پدماوتی / پدمنی شہزادی، سلطان علاءالدین اور محاصرۂ قلعہ چتوڑ کا قصہ ایک طوطے کی زبانی بیان کیا ہے اور آخر پر چتوڑ کو جسمِ انسانی، رتن سین کو روح، پدمنی کو عقل اور علاءالدین کو خام خیال یا وسوسہ اور طوطے کو گرو ثابت کیا ہے[1]۔ یہ مثنوی اصل میں فارسی رسم الخط میں لکھی گئی ہے مگر ہندی ادب کے شاعرانہ کمال اور حسن و جمال کا ایک شاہکار تسلیم کی گئی ہے۔ اُن کی تصنیفات سے یہ بھی ثبوت ملتا ہے کہ وہ ہندو رسم و رواج سے پوری طرح واقف تھے۔ امیٹھی کا راجہ ان کا بڑا گرویدہ تھا اور کہا جاتا ہے کہ ان کی دعاؤں سے اُس کے گھر لڑکا پیدا ہوا تھا۔ جب انھوں نے وفات پائی تو اس راجہ نے امیٹھی میں اُن کی قبر پر ایک شاندار مزار تعمیر کروایا تھا[2]۔

---

[1] خزینۃ الاصفیاء، جلد اول ص ۴۷۳ A History of Hindi Literature, pp. 31-32.

[2] Ibid, p. 31.

ضمیمہ دوم

شرقی عہد کے حکماء

حکیم فریدالدین سرمست

حکیم فریدالدین سلطان الشرق ملک سرور کے ہمراہ دہلی سے جونپور آئے اور شاہی طبیب کے عہدہ پر سرفراز ہوئے[1] سلطان مبارک شاہ شرقی اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہدِ سلطنت میں بھی وہ اسی عہدہ پر متمکن رہے[2] وہ اعلیٰ درجہ کے نبّاض اور قیافہ شناس تھے[3] سلطان ابراہیم شاہ شرقی اُن کی بے حد عزّت و تکریم کرتا تھا، اور اُس نے ان کو جونپور میں ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی تھیں[4]۔ اُن کی وفات بھی اسی کے عہد میں (۸۱۵ھ/۱۴۱۲-۱۴۱۳ء) ہوئی۔ ان کا مزار جونپور شہر کے محلّہ ڈھالگر ٹولہ میں میر رستم علی کے باغ کے اندر ہے[5]

حکیم سیّد محمّد ابراہیم

حکیم سیّد محمّد ابراہیم کا سلسلۂ نسب حضرت عباس رضؓ علمبردار سے ملتا ہے[6]۔ وہ پندرہ برس کی عمر میں (۸۰۷ھ میں) دہلی آئے جہاں انھوں نے علومِ ظاہری کی تکمیل مولانا

---

[1] تجلیات العارفین (قلمی)
[2] ایضاً
[3] ایضاً
[4] ایضاً
[5] ایضاً
[6] تاریخ شیرازِ ہند جونپور ص ۴۸۹-۴۹۰

ظہیرالدین سے کی[1] پھر امیر تیمور کے حملے کے وقت دہلی سے جونپور پہنچے اور علوم باطنی کی تکمیل انھوں نے حضرت قاضی نصیرالدین گنبدیؒ سے کی[2]۔ انھوں نے علم طب حکیم فریدالدین سرمست سے حاصل کیا تھا[3]۔ وہ اپنے فنی کمالات کی وجہ سے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے مقربین میں شامل تھے اور جب حکیم فریدالدین سرمست انتقال فرما گئے تو اُن کی جگہ شاہی طبیب مقرر کیے گئے[4]۔ اپنی وفات تک وہ سلطان محمود شاہ شرقی کے عہدِ سلطنت میں بھی اسی عہدہ پر متمکن رہے۔

وُہ اعلیٰ درجہ کے نباض اور قیافہ شناس تھے۔ جڑی بُوٹیوں کی شناخت اور اُن کے خواص کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ جونپور میں ہندی طب اور یُونانی طب کی آمیزش کو رواج انہی نے دیا تھا[5]۔ وہ اعلیٰ درجہ کے خُوش نویس بھی تھے۔ خطِ نسخ، ثلث اور طُغریٰ میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ یہ فن انھوں نے قاضی شہاب الدین ملک العلماء سے سیکھا تھا[6]۔ جو خُود عالی مرتبت عالم و فاضل ہونے کے علاوہ ہفت قلم بھی تھے[7]۔ علاوہ ازیں وہ ماہرِ فلکیات اور اعلیٰ درجہ کے شاعر بھی تھے۔ عربی و فارسی میں فی البدیہہ شعر کہتے اور تخلص حسینی کرتے تھے[8]۔

سُلطان ابراہیم شاہ شرقی اُن کی بہت عزت کرتا تھا۔ علاوہ دُوسری سہولتوں کے اس نے ان کے لیے مسجد اٹالہ کے متصل دکھن کی جانب ایک بلند جگہ پر ایک مکان، خانقاہ اور مدرسہ تعمیر کروایا تھا[9]۔ سُلطان شام کے کھانے پر بھی ان کو دسترخوان پر اپنے قریب بٹھاتا۔ یہ کھانا بہشت باغ کے حوض کے چبوترے پر چنا جاتا جو سنگِ موسیٰ سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس موقعہ پر بڑے بڑے قضاۃ، علماء و فضلا اور معززین بھی جمع ہوتے اور کھانے سے قبل

---

[1] تاریخ شیراز ہند جونپور ص ۴۸۹ - ۴۹۰ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً
[5] تاریخ شیراز ہند جونپور ص ۴۹۰ [6] ایضاً [7] ایضاً [8] ایضاً
[9] ایضاً

مجلس مذاکرہ قائم ہوتی جس میں مختلف اُمور پر بحث و مباحثہ ہوتا[1]

حکیم سیّد ابراہیم کی وفات ۱۷ ربیع الاوّل ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء کو ہوئی۔ اور وہ اپنی خانقاہ کے صحن میں دفن ہُوئے[2]۔ اُن کا مزار اب بھی شکستہ حالت میں موجود ہے تاہم مکان، خانقاہ اور مدرسہ منہدم ہو کر اینٹوں کا ڈھیر بن چکے ہیں۔

حکیم حُسام الدّین

حکیم حُسام الدّین کے آباؤ اجداد غالباً تیمور کے وقت سے جونپور میں آباد تھے[3]۔ وہ سُلطان حسین شاہ شرقی کے عہدِ حکومت میں شاہی طبیب کی حیثیت سے دربار سے وابستہ تھے[4]۔ سُلطان حسین اُن کی فنّی صلاحیتوں کا بڑے قدر دان تھا۔ وہ اُن کی بے حد قدر و منزلت کرتا اور اُن پر کامل اعتماد رکھتا تھا[5]۔ بہلول لودھی نے جب جونپور پر قبضہ کیا تو اس وقت وہ وہاں موجود تھے[6]۔ ان کی سکونت جونپور کے محلہ جہانگیر آباد میں تھی اور وفات کے بعد اسی محلّہ کی مسجد سے متصل دفن ہُوئے تھے۔ جہاں اُن کا مزار اب بھی موجود ہے[7]۔

---

[1] تاریخ شیراز ہند جونپور ص ۴۹۰ [2] ایضاً ص ۴۹۰-۴۹۱

[3] A. Halim, J.A.S.P. Vol. 1 1956, pp. 57. [4] ایضاً

[5] ایضاً [6] ایضاً

[7] ایضاً

ضمیمہ سوم

شرقی عہد کے اُمراء و وُزراء

عماد الملک بختیار خاں

عماد الملک بختیار خاں شیخ حاجی خان اعظم کے صاحبزادے تھے جو سلطان الشرق ملک سرور کے ہمراہ سردار لشکر ہو کر دہلی سے جونپور آتے تھے اور اسی کے ہمراہ وہ جونپور پہنچے تھے[1] علومِ عقلی و نقلی میں وہ کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ذہین اور نیک طینت تھے اور بے حد شجاع تھے۔ اس لیے انھوں نے بہت جلد تقربِ سلطانی حاصل کر لیا اور سلطان کے معتمد علیہ ہو گئے[2]

سلطان الشرق نے جب سلطنتِ جونپور کی آزادی کا اعلان کیا تو تمام مصاحبین میں سے اُن کو وزیرِ سلطنت منتخب کیا اور عماد الملک کے خطاب سے سرفراز کیا[3] اس عہدۂ وزارت پر وہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہد میں بھی فائز رہے۔ سلطان کو اُن کے علم و فضل اور قابلیت پر اس قدر بھروسہ تھا کہ وہ تمام بڑی بڑی ملکی و جنگی مہمات انھی کے سپرد کرتا اور وہ ہمیشہ اس فکر و تدبیر میں لگے رہتے کہ کسی طرح سلطنتِ دہلی پر قبضہ کیا جائے اور بموقع بادشاہ کو اس کی ترغیب بھی دیتے رہتے تھے[4]

سلطان ابراہیم ان کی بڑی پاسداری کرتا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ قاضی شہاب الدین

---

[1] مشاہیرِ جونپور (قلمی) حصہ سوم ص ۶۹-۷۰

[2] ایضاً

[3] ایضاً

[4] ایضاً

کے ساتھ علماء کے بارے میں ان کی بحث چھڑ گئی۔ اس موقعہ پر قاضی نظام الدین کیکلانیؒ نے بھی اُن کی طرفداری کی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ان دونوں میں شکر رنجی پیدا ہو گئی اور اُس کا اثر امورِ سلطنت پر بھی پڑنے لگا تاہم بعد میں سُلطان ابراہیم نے ان دونوں کی آپس میں صُلح کرا دی اور دونوں پھر باہم شیر و شکر ہو گئے۔[1]

بختیار خاں نہایت خلیق اور منکسر المزاج انسان تھے۔ اُن کے سامنے دربار میں جو بھی حاضر ہوتا وہ خُوش ہو کر جاتا۔ یہاں تک کہ دشمن بھی سامنے آجاتا تو سرِ نیاز خم کر دیتا۔ ان خوبیوں کی وجہ سے وہ بہت ہر دلعزیز تھے اور ان کا زمانۂ وزارت بہت شاندار گزرا۔[2]

ان کا عالیشان مقبرہ فیض باغ (جونپور) میں موجود ہے مگر مرمت نہ ہونے کی وجہ سے اب خستہ حالت میں ہے۔[3]

قاضی سماء الدین دبیر الملک قتلغ خاں

قاضی سماء الدین، عماد الملک بختیار خاں کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے اور ان کے انتقال کے بعد وزیرِ سلطنت منتخب ہوئے تھے۔[4] انھوں نے امورِ وزارت کو اپنے والد بزرگوار سے بھی زیادہ قابلیت سے سرانجام دینے کی کوشش کی اور سلطنت کی مالی و ملکی مہمات میں اپنی خُوش انتظامی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ سلطان ابراہیم شاہ نے خُوش ہو کر ان کو دبیر الملک کا خطاب بخشا تھا۔[5]

وہ ملک العلماء قاضی شہاب الدینؒ کے شاگرد و مرید تھے[6] اور بڑے بلند پایہ

---

[1] مشاہیر جونپور (قلمی) حصہ سوم ص ۶۹۔۷۰ [2] ایضاً
[3] ایضاً
[4] تذکرۃ الامراء (قلمی) حصہ سوم ص ۷۱۔۷۳ اُن کا حقیقی نام قاضی شمس الدین تھا۔ ملاحظہ ہو طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۰۹، تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۳۲۵ [5] تذکرۃ الامراء ایضاً
[6] ایضاً

عالم اور ذی مرتبت صوفی تھے۔ ان کا شمار اس دور کے عالی مرتبت مشائخ میں ہوتا تھا[1]۔ دراصل ان کی طبیعت شروع ہی سے تحصیلِ علوم اور درس و تدریس کی طرف مائل تھی اور جب ان کے والدِ بزرگوار نے انتقال فرمایا تو وہ تمام مشاغلِ دنیا سے دست بردار ہو کر تصوف کی طرف راغب ہو گئے۔ تاہم سلطان ابراہیم شاہ کے پیہم اصرار پر ان کو منصبِ وزارت قبول کرنا پڑا[2]۔ اس منصب پر وہ سلطان حسین شاہ شرقی کے عہد تک فائز رہے[3]۔

قاضی صاحب کا تعلق سلسلہ چشتیہ سے تھا۔ وہ خود بھی خلفا میں سے تھے اور اُن کے کئی مرید تھے[4]۔ ان کا وصال ۸۷۹ھ میں ہوا اور اُن کا روضہ باغِ کہنہ (جونپور) میں ہے جہاں اُن کا عرس ہر سال ۲۳، ۲۴ اور ۲۵ ذی قعدہ کو بڑی شان سے منایا جاتا ہے[5]۔

سیّد صدر جہاں اجمل

سیّد صدر جہاں اجملؒ بھی سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہد میں کچھ عرصہ تک وزیرِ سلطنت کے عہدہ پر فائز رہے[6] لیکن ان کا مزاج تصوف کی طرف زیادہ راغب تھا۔ اس لیے تھوڑے ہی عرصہ بعد مستعفی ہو گئے[7]۔ وہ بڑے بلند پایہ عالم تھے اور اپنے زمانہ کے عظیم المرتبت مشائخ میں شمار ہوتے تھے[8]۔ اُن کے مزید حالات سہرور دیہ مشائخِ جونپور کے سلسلہ میں ملاحظہ ہوں[9]۔ انھوں نے ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں وصال فرمایا تھا[10]۔

---

[1] تذکرۃ الامراء (قلمی) حصّہ سوم ص ۷۱-۷۳ [2] ایضاً

[3] ایضاً۔ آپ سلطان حسین کے ساتھ بہلول لودھی کے خلاف جنگوں میں بھی باقاعدہ حصّہ لیتے رہے۔ ۱۴۷۸ء میں جب سلطان حسین کو شکست ہوئی تو ان کو بھی ملکہ جہاں بی بی خونزہ اور دوسرے چالیس اُمراء کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا اور اس موقعہ پر بہلول لودھی نے اُن کو زنجیروں میں جکڑ کر قطب خاں لودھی کے حوالے کر دیا تھا۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو طبقاتِ اکبری جلد اوّل ص ۳۰۹۔ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۲۵ [4] تذکرۃ الامراء ایضاً

[5] ایضاً تذکرۂ علمائے ہند ص ۸۰ [6] ریاض الاولیاء (قلمی) ورق ۱۳۶ ا۔ تجلی نور جلد اوّل ص ۹

[7] ایضاً۔ ریاض الاولیاء ایضاً [8] تجلی نور ایضاً

[9] حصّہ سوم باب دوم ص [10] تذکرۂ علمائے ہند ص ۷۲

ملک شجاع الملک

ملک شجاع الملک عماد الملک کے نواسے تھے اور عوام میں ملک بڈھو کے نام سے مشہور تھے[1] پہلے وہ سلطان حسین شاہ شرقی کے نائب وزیر تھے[2]۔ لیکن وزیر سلطنت، دبیر الملک قتلغ خاں کی وفات کے بعد ان کی جگہ مسندِ وزارت پر متمکن ہوتے اور شجاع الملک کا خطاب پایا تھا[3] علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے[4]۔ انھوں نے سلطان حسین شاہ کے ساتھ بہلول لودھی کے خلاف متعدد جنگیں لڑیں مگر جب وہ شکست خوردہ ہو کر بنگال کی طرف بھاگ گیا تو بہلول لودھی نے اُن کو گرفتار کر کے قلعہ جونپور میں قید کر دیا اور وہاں اُن کی وفات ہوئی[5]۔ اُن کی قبر جونپور میں عماد الملک کے مقبرہ کے احاطہ میں ہے[6]۔

ملک خالص و مخلص

بعض کے خیال میں یہ ایک ہی شخص کا نام ہے لیکن تاریخی حوالوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ دو بھائی تھے۔ ایک کا نام ملک خالص تھا اور دُوسرے کا نام ملک مخلص[7]۔ وہ ماژندران (ملک ایران) کے رہنے والے تھے اور وہاں سے ہجرت کر کے پہلے دھلی پہنچے اور وہاں ایک عرصہ شاہی فوج میں ملازم رہے۔ وہ پہلے سپاہی تھے پھر افسر ہو گئے[8] اور جب سلطان الشرق ملک سرور جونپور آتے تو وہ بھی اُن کے ساتھ چلے آئے[9]۔ ان میں سے ایک بھائی تو سلطان الشرق کے عہد میں کچھ عرصہ جونپور کے ناظم بھی رہے تھے[10] اس کے بعد دونوں بھائیوں کو سلطان ابراھیم شاہ شرقی کے عہدِ سلطنت

---

[1] طبقات اکبری جلد اوّل ص ۳۰۹ [2] ایضاً [3] تجلی نور (قلمی) حصہ سوم [4] تجلی نور ایضاً
[5] ایضاً۔ طبقاتِ اکبری ایضاً ص ۳۰۹-۳۱۴، تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۳۲۵-۳۲۸
[6] تجلی نور (قلمی) جلد سوم [7] تاریخ شیراز ہند جونپور ص ۲۵۱ [8] ایضاً
[9] ایضاً۔
[10] ایضاً

میں بڑی ترقی ملی۔ اور وہ ان کے اُمرائے خاص میں شمار ہونے لگے[1]۔

بعض کا قول یہ ہے کہ وہ سُلطان ابراہیم کے عہد میں کسی صُوبہ سلطنت کے گورنر تھے[2]۔ جونپور کے مشہور بزرگ سیّد عثمان شیرازیؒ کے ساتھ دونوں بھائیوں کو والہانہ عقیدت تھی اور ان کے لیے انھوں نے جونپور میں ۱۴۳۰ء میں مسجد "خالص مخلص" بنوائی[3] جو دربیہ مسجد یا "چہار انگلی مسجد" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اور شرقی عہد کے فنِ تعمیر کی ایک عمدہ وحسین یادگار ہے[4]۔ ان دونوں کی قبریں بھی اسی مسجد کے صحن میں ہیں[5]۔ ان میں سے ملک خالص کا بسایا ہُوا ایک گاؤں موضع خالص پور اب تک آباد ہے[6]۔

بعض مُصنّفین کی رائے میں وہ دونوں سلطان ابراہیم شرقی کے بھائی تھے۔ بعض کی رائے میں غلام، بعض کی رائے میں اُمراء خاص اور بعض کی رائے میں اس کے عہد میں کسی صُوبہ کے گورنر تھے[7]۔

۱؎ جونپور نامہ ص ۵۰
۲؎ The Sharqi Architecture of Jaunpur, No. I, p. 141.
۳؎ جونپور نامہ ص ۵۰-۵۱
۴؎ ایضاً The Sharqi Architecture of Jaunpur, Ibid.
مزید تفصیلات کے لیے خاکسار کی کتاب ملاحظہ ہو
The Shaqri Sultanate of Jaunpur: A Political & Cultural History, pp. 136-137.
۵؎ تاریخ شیراز ہند جونپور ص ۲۵۱ ۶؎ ایضاً
۷؎ جونپور نامہ ص ۵۰-۵۱ - مختصر حالات جونپور - (قلمی) ورق ۱۷ اب D.G. Jaunpur, p. 242.
The Sharqi Architecture of Jaunpur. Ibid.

ضمیمہ چہارم

شرقی عہد کی موسیقی

عہدِ شرقی میں سُہروردیہ اور چشتیہ صُوفیاء نے سماع و قوّالی کی روایات کو ذوق و شوق سے جاری رکھا اور میر سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ، شیخ حسام الدّین مانکپوریؒ، شیخ شمس الدّین بدہ حقّانی جونپوریؒ، شیخ علاء الدّین لاجوری جونپوریؒ، شیخ بہاء الدّین نتھو چشتی جونپوریؒ، شیخ ادھن چشتی جونپوریؒ، شاہ سیّد دُ مانکپوریؒ، اور شیخ یوسف بدہ ایرجیؒ جیسے مجلسِ سماع کے شائقین اور باذوق مشائخ نے اس ذوق اور فن کو عام لوگوں میں رواج دیا۔[۱] ان میں سے شیخ علاء الدّین لاجوریؒ خُود بھی اعلےٰ درجہ کے شاعر اور ہندوستانی موسیقی کے ماہر تھے۔[۲] علاوہ ازیں اس دَور کے ہندو شُعراء اور بھگتوں نے بھی ہندی گیت اور بھجن لکھ کر راگ کے شوق کو عام کیا۔ خاص طور پر وِدیاپتی ٹھاکر نے میتھلی اور ہندی میں بڑے میٹھے گیت لکھے جن کو چیتنا بہت پسند کرتے اور اپنے چیلے دامودر سوارُوپ سے بڑے شوق سے سنا کرتے تھے۔[۳] بلکہ انھوں نے ان کے گیتوں کو اپنے چیلوں میں سنکرتن کی صُورت میں گانے کو رواج بھی دیا۔[۴]

---

۱ اخبار الاخیار ص ۱۷۱-۱۷۲ و ۱۸۹-۱۹۲ و ۲۲۶ - تجلّی نور جلد اوّل ص ۲۴ و ۲۷-۲۹ و ۴۶-۴۷ - خزینۃ الاصفیا - جلد اوّل ص ۴۱۸-۴۱۹ و ۴۳۱-۴۳۲ - بحر زخار (قلمی) ورق ۲۲۹ - سفینۃ الاولیا ص ۱۹۲ - مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق ۴۵۷ ل

۲ تجلّی نور جلد اوّل ص ۴۸-۴۹

۳ A. Halim, J.A.S.P. Vol. II, 1957, p. 79.

۴ Ibid, pp. 79-80.

سلطان حسین شاہ شرقی کا نام نہ صرف اِس دَور کے موسیقاروں میں بلکہ ہندو پاکستان کے موسیقاروں کی صفِ اوّل میں شمار ہوتا ہے۔ حضرت امیر خسرو دہلویؒ کے بعد وہ اس برِصغیر کے بڑے اہم موسیقار مانے جاتے ہیں اور گندھرو (گندھروا) کے لقب سے مشہور تھے[1]۔ انھوں نے علمِ موسیقی کو باقاعدہ اصُول و قواعد کے ساتھ سیکھا تھا اور اپنے زمانہ کے بہت بڑے نائک مانے جاتے تھے۔ انھوں نے نئے نئے راگ بھی ایجاد کیے۔ اُن میں سے ایک راگ خیال ہے[2] جسے آج بھی بڑے بڑے گویّے گا کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اِس خیال کا دھرپد پر بڑا اثر ہُوا حالانکہ اس سے پہلے دھرپد کو بڑی اہمیّت حاصل تھی۔ دھرپد کو راجہ مان تنوار نے چودھویں صدی میں ایجاد کیا تھا اور اس کو کبت، چھندا اور پربند جیسے راگوں کے مقابلہ میں رواج دیا تھا۔ خیال سے پہلے ہندوستان کی ساری گائیکی کا اِنحصار اِسی پر تھا اور وہ خاص طور پر دیوتاؤں کو بطورِ نذرانہ پیش کیا جاتا تھا، لیکن خیال کی گائیکی نے آہستہ آہستہ ایسا رنگ جمایا کہ وہ سب راگوں اور طرزوں پر حاوی ہوگیا[3]۔ خیال کی زبان زیادہ تر فارسی، اودھی اور پُوربی ہوتی ہے اور اس کا مضمون عام طور پر عاشقانہ ہوتا ہے۔ اس میں جذبۂ عشق کا اظہار عورتوں کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کے مضمون میں محبوب کی جدائی اور ملاپ کی تمنّا ظاہر کی جاتی ہے مثلاً فارسی میں ؎

من شمع جانگدازم تو صُبحِ دلکشائی
سوزم گرت نہ بینم میرم چو رُخ نمائی[4]

---

[1] A. Halim, J.A.S.P. Vol. I, No. I, May 1957, pp. 59-60.

[2] Ibid.

سیّد صباح الدّین عبدالرحمٰنؒ، ہندوستان کے مسلمانوں کے عہد کے تمدّنی جلوے ص ۵۲۸

[3] معارف النغمات

[4] معارف النغمات ص ۲۴۵

ہندی میں ؎

درگن بدرا ابھر آتے برسائے پریم رس بام
اے ری سکھی میں تو سے پوچھت ہوں اجھوں نہ آئے شام [1]

؎ پیا بن جیا مورا اکھو جات ہے کاسے کہوں اپنے من کی بات
رین دنا موہے کل نہ پرت ہے سگرا سکھ گیا اُن کے ساتھ [2]

ویسے ٹھمری اور دادرا کے مضامین بھی عاشقانہ ہوتے ہیں لیکن دادرا اپنے خاص ٹھیکے کی وجہ سے خیال سے بالکل الگ ہو جاتا ہے۔ ٹھمری کو اکثر گائک خیال کے ڈھنگ سے گاتے ہیں جس سے بعض اوقات دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن دونوں میں ایک فرق یہ ہے کہ خیال کے بول معشوق کی عدم موجودگی کو ظاہر کرتے ہیں اور ٹھمری کے بول اس سے سامنا ہونے اور چھیڑ چھاڑ کو ظاہر کرتے ہیں مثلاً ؎

(۱) سوہنی سوہنی موہنی موہنی مورت واری رے سلونے سنوریا رے
من مال بست رست چھب چتون کی چوری ہی ہلاہل ہن موہنیا
نند للن چپل درگ نہارے رے دُلارے اے [2]

؎ (۲) موہے چھیڑو نا کنہائی۔ کاہے کو رار مچائی
(ٹھمری)

سلطان حسین شاہ شرقی اپنے خیالوں میں حسینی تخلص کرتے تھے اور انھوں نے سینکڑوں خیال ہر راگ میں تصنیف کیے تھے ـــــ محمد شاہ مغل بادشاہ کے عہد میں شاہ

---

[1] معارف النغمات ص ۱۹۵
[2] سرمایہ عشرت ص ۸۷
[3] معلم النغمات

سدارنگ نے خیال کو بڑا رواج دیا[1]۔ اور پھر کئی گھرانوں کی گائیکی کا دار و مدار اسی راگ پر قائم ہوا جن میں سے ادارنگ، من رنگ، ہر رنگ وغیرہ مستند مانے جاتے ہیں۔ مگر شاہ سدارنگ کی بندش ان سب میں زیادہ مستند سمجھی جاتی ہے۔ وہ اپنے خیالوں میں اپنا تخلص سدارنگ کیا کرتے تھے[2]۔

علاوہ ازیں سلطان حسین شاہ شرقی نے بارہ شیام ایجاد کیے جو گور شیام، ملار شیام، بھوپال شیام، گنبھیر شیام، ہوہو شیام، پوربی شیام، رام شیام، میگھ شیام، بسنت شیام، براری شیام، کبراتی شیام اور گونڈ شیام ہیں۔ راگنی جونپوری اور جیج سنگیت بھی ان ہی کی ایجاد ہے۔ ٹوڑیوں میں سے ــــــــ جونپوری ٹوڑی، راما ٹوڑی، رسولی ٹوڑی، سہلی ٹوڑی بھی انھوں نے ہی ایجاد کیں۔ سِندھ بھیروی، ہمندی، جونپوری آساوری، جونپوری بسنت، حسینی کانہرہ، اور حسینی ٹوڑی بھی اُن ہی کی ایجاد ہیں[3]۔ چونکلہ راگ بھی اُن کی ایجاد ہے[4]۔ مگر اُسے ہر گویا نہیں گا سکتا تھا اور اب تو وہ کسی گائک کی زبان سے بھی سُنا نہیں جاتا۔ اس دور میں ان کے سینکڑوں چونکلے زبان زدِ خلق تھے۔ صرف یہی نہیں انھوں نے کئی راگوں کو ٹوڑیوں میں ملا کر نئے نئے سنگیت ایجاد کیے تھے مثلاً رام کلی اور مالسری کو رام ٹوڑی میں ملا کر ایک نیا سنگیت اور ملتانی اور دھنسری کو رسولی ٹوڑی میں ملا کر ایک دُوسرا نیا سنگیت بنایا تھا[5]۔ امیر خسرو کے بعد قوالی میں بھی سب سے زیادہ کامل مانے جاتے ہیں۔

سُلطان حسین شاہ شرقی کی شہرت و کمال کا اثر اس کے ہم عصر گویوں پر بھی پڑا اور

---

[1] معارف النغمات [2] ایضاً

[3] راگ درپن (قلمی) ورق ۱۱-۱۲۔ مرآۃ آفتاب نما (قلمی) ورق ۱۲۷۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے عہد کے تمدنی جلوے ورق ۵۳۱-۵۳۲۔ معدن الموسیقی۔ تحفۃ الہند۔ سرمایۂ عشرت

[4] معارف النغمات [5] مرآۃ آفتاب نما (قلمی) ورق ۱۲۷۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے عہد کے تمدنی جلوے ص ۵۳۱-۵۳۲۔ راگ درپن (قلمی) ورق ۱۱-۱۲

گوالیار کے راجہ مان سنگھ جو ان کے باجگذار بھی تھے۔ اس نے اُن کی روایات کو چار چاند لگا دیے۔ وہ بڑے پایہ کے مغنّی تھے اور سلطان حسین کے رنگ میں گانے کے ماہر کامل تھے۔ اس نے اس فن کی بڑی خدمات انجام دیں اور اپنے دور تک کے تمام راگوں اور راگنیوں کو ایک کتاب کی صورت میں قلمبند کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ اس کتاب کا نام مان کوتوہل ہے؛ شمالی ہند کی راگنیوں میں وہ سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے[1]۔ کھرکپور کے راجہ رام شاہ اور گوڑ کا راجہ عید سنگھ بھی امیر خسروؒ اور سلطان حسین کے رنگ میں بڑے اعلیٰ درجہ کے مغنی تھے[2]۔ سلطان سکندر لودھی گو پابندِ شریعت تھے مگر گانا سنے بغیر سو نہیں سکتے تھے۔ اس کے پاس چار ماہرینِ موسیقی ہمیشہ رہتے جو چنگ، قانون، وینا اور تنبورا کے ماہر تھے[3]۔ اُن کو کیدار، مالی گود، کلیان اور سلطان حسین کی ایجاد حسینی کانھڑہ راگ بہت پسند تھے[4]۔ سلطان بہادر شاہ گجراتی کا بھی اسی دور سے تعلق تھا اور وہ بھی راگ کے بڑے دلدادہ تھے۔ بیجو نائک کی آخری عمر ان کے ہاں گزری تھی اور وہاں اپنے قیام کے دوران میں انھوں نے ایک نئی قسم کی ٹوڑی ایجاد کی جس کا نام سلطان بہادر کے نام پر بہادری ٹوڑی رکھا تھا جو آج تک مروّج ہے[5]۔

سلطان حسین شاہ شرقی کے گویّوں میں راما پنڈت، رسول خاں اور بہول وغیرہ اُستادِ زمانہ مانے جاتے تھے[6]۔ مگر ان سب کے اور سلطان حسین کے بھی گرو دُھنڈو ڈھاری تھے جو اس سے پہلے راجہ کیرتی سنگھ والئ ترہت کے ہاں مقیم تھے۔ ان کے لائق شاگرد دول

---

۱ A. Halim, J.A.S.P., Vol. 1, No. 1, 1957, pp. 59-60.

A. Halim, I.C. XIX, No. 1, Jaunary 1945, p. 355.

۲ A. Halim, J.A.S.P. Vol. I, No. I, 1957, p. 59.

Ibid. p. 359.

۳ Ibid. p. 59.

۴

۵ معارف النغمات ۶ خلاصۃ العیش۔ سرمایۂ عشرت۔ برناوہ کے شیخ بیر ٹڈھن بھی اپنے مربی سلطان حسین کے ساتھ مقابلہ میں گایا کرتے تھے۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو گلزار ابرار ورق ۱۳۱ (جاری ہے)

میں سے ایک عبدالرحمٰن بھی تھے جو بڑے اعلیٰ پایہ کے فن کار تھے اور جس کے شاگردوں کی نسل کے لوگ اب بھی موجود ہیں۔ بخشو جونپور کے محلّہ ڈھاڑیانہ ٹولہ میں رہا کرتے تھے جو اب بگڑ کر ڈڈھیانہ ٹولہ ہو گیا ہے۔ بخشو نائک کا قیام جونپور میں مستقلاً نہیں رہتا تھا۔ وہ اکثر بڑے بڑے راجاؤں اور مہاراجاؤں کے ہاں محفلِ رقص و سرود کے موقعہ پر مدعو کیے جاتے تھے اور راجہ مان سنگھ گوالیاری انھیں اکثر بلایا کرتے تھے۔ بخشو نے راجہ مان سنگھ کے بعد اُن کے بیٹے راجہ بکرماجیت کے ساتھ بھی کافی عرصہ گزارا۔ بخشو کی مشہور ایجاد بہاری، پہاڑی، جھنجھوٹی سُلطان حسین کے عہد میں مروّج تھی جو شرقی سلطنت کے علاقہ کے مغنیوں سے بہتر اور کوئی نہیں گا سکتا تھا۔[۱]

جونپور کے ایک اور قابلِ تحسین مغنّی شیخ منجھو قوّال جونپوری تھے جو جونپور ہی میں پیدا ہوئے۔ وہ شیخ ادھن جونپوریؒ کے مرید تھے اور انھوں نے انھی کے کہنے پر اس فن کو باقاعدہ سیکھا تھا۔ اُس نے گلا اور آواز خُداداد پائی تھی۔ وہ شیخ ادھنؒ کی سماع کی مجلسوں میں برابر حاضر رہتے بلکہ اُن کے دربار کو چھوڑ کر کہیں اور جانا پسند بھی نہ کرتے۔ وہ بادشاہ اکبر کے شاہی گویّے میاں تان سین کے ہم عصر تھے۔ مولانا محمّد حسین آزاد ان کے متعلق دربارِ اکبری میں لکھتے ہیں:

"مُلّا فرماتے ہیں۔ شیخ منجھو قوال صُوفیانہ وضع رکھتا تھا۔ شیخ ادھن جونپوریؒ کے مریدوں میں سے تھا۔ ان ہی دِنوں میں اکبر نے اسے حوضِ مذکور[۲] کے کنارے پر بلایا۔ اس کا گانا سُن کر بہت خُوش ہوئے

(گزشتہ سے پیوستہ) طبقاتِ شاہجہانی (قلمی) ورق ۱۴۷ ب - ۱۴۸ ب

[۱] خلاصۃ العیش۔ مرآۃ سکندری۔ سرمایۂ عشرت۔ معارف النغمات

[۲] یعنی انوپ تلاؤ۔

تان سین اور اچھے اچھے گویّوں کو بُلا کر سنوایا اور فرمایا اس کیفیت کو تم میں سے ایک نہیں پہنچتا۔ پھر اس سے کہا "منجبو اجاسب نقدی تو ہی اُٹھا لے جا۔" اس سے کیا اُٹھ سکتی تھی۔ عرض کی، حضور یہ حکم دیں کہ جتنی یہ غلام اُٹھا سکے اتنی لے جائے۔ منظور فرمایا۔ غریب ہزار روپے کے قریب ٹکے باندھ لے گیا۔"[1]

---

[1] دربار اکبری ص ۱۲۵

ضمیمہ پنجم

شرقی عہد کا فنِ خوش نویسی

مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں تقریباً ہر مدرسہ میں خوش نویسی کی تعلیم لازمی ہوتی تھی۔ اور مسلمان جہاں بھی گئے۔ وہ اس فن کو اپنے ساتھ لے گئے۔ سلطنتِ شرقی کے وجود سے پہلے اس علاقہ میں ظفرآباد علم و فن کا مرکز تھا۔ وہاں علماء، صوفیا بھی پیدا ہوئے، اور خوش نویس بھی۔ حضرت مخدوم شیخ صدرالدین چراغ ہند سہروردیؒ (المتوفی ۱۲۹۲ء) کے روضۂ اقدس کے صدر دروازہ کا کتبہ اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے کہ اُس دور میں وہاں بڑے قابل خوش نویس موجود تھے۔ اِس کتبہ کے کاتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ کتبہ حضرت مخدوم چراغِ ہندؒ یا حضرت مخدوم آفتابِ ہندؒ کے کسی شاگرد و مرید یا اُن کے گھرانے کے کسی فرد کا شاہکار ہے جس کو اُس نے گہری عقیدت کے ساتھ بڑے ہی فنکارانہ انداز میں خطِ ثلث میں لکھا ہے۔ اِس کتبہ کے الفاظ کی نشست اور خوش سلیقگی و فنکاری اس کے ایک ایک نقطہ سے عیاں ہے۔ اس سے اِس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آج سے سات سو برس قبل خطِ نسخ اور خطِ ثلث کی ارتقائی منزل کیا تھی[۱]۔

جب سلطنتِ شرقی نے جنم لیا تو ظفرآباد کی جگہ جونپور نے لے لی اور وہاں بھی علم و فن کے مراکز قائم ہو گئے۔ جونپور کے ایک اعلیٰ درجہ کے خوش نویس حکیم سید محمد ابراہیم تھے جو فنِ خوش نویسی میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی ہفت قلمؒ کے نامور شاگرد تھے[۲]۔ وہ شاہی طبیب

۱۔ تاریخ شیراز ہند جونپور ص ۵۲۳-۵۲۴ ۲۔ ایضاً ص ۴۹۰

بھی تھے[1] اور اس فن کے ماہر ترین اُستادوں میں شمار ہوتے تھے۔ اُن کے ہاتھ کا لکھا ہُوا اٹالہ مسجد کے اندرونی محراب کا کتبہ صرف اپنے وقت کا شاہکار نہیں بلکہ اس پورے دور کا بھی شاہکار مانا جاتا ہے۔ اس کتبہ میں جو آیت لکھی گئی ہے اس کو انھوں نے اس انداز سے طغرائی شکل میں پیش کیا ہے کہ ایک نئے طرز کا خط وجود میں آ گیا ہے۔ یہ اپنی جگہ جدید بھی ہے اور جاذبِ نظر بھی۔ اِس کتبہ کو انھوں نے اب سے ساڑھے پانچ سو سال پہلے سُلطان ابراہیم شاہ شرقی کی فرمائش پر لکھا تھا اور آج تک سحر انگیز ہے[2]۔ حکیم سیّد محمد ابراہیم کے ہاتھ کا لکھا ہُوا ایک اور کتبہ مخدوم جہانیاں کی مسجد واقع محلّہ بلوچ ٹولہ (جونپور) میں لگا ہوا تھا جو مسجد کے گر جانے کی وجہ سے سینکڑوں برس زمین پر پڑا رہا لیکن اب اسے صاف کر کے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ یہ کتبہ بھی حکیم صاحب موصوف کے فن کا دُوسرا شاہکار ہے[3]۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو خطِ نسخ، ثلث اور طغرائی سبھی میں کمال حاصل تھا۔ یہ دونوں کتبے پتھر پر اس طرح کندہ کیے گئے ہیں کہ حروف اُبھرے ہُوئے ہیں اور زمین کو تراش کر نیچا کر دیا گیا ہے۔ ان کے سنگ تراش نے ان کتبوں کو کندہ کرتے وقت اُن کے حروف کے خد و خال کو مع ان کی نزاکتوں کے برقرار رکھنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دی اور اس طرح اُس کا کام بھی بذاتِ خود قابلِ ستائش ہے[4]۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ عالم و فاضل ہونے کے علاوہ ہفت قلم بھی تھے اور فنِ خوشنویسی میں اپنے وقت کے اِمام مانے جاتے تھے۔ ان کے ہاتھوں کا لکھا ہُوا آیۃ الکرسی کا ایک کتبہ سنگِ مرمر پر کندہ ہے۔ یہ کتبہ پہلے سراج الدین منہاج کی مسجد میں تھا اور اب محلّہ سیاہ کی مسجد مسماۃ ننھی بی بی کی محراب میں لگا ہُوا ہے اور خطِ ثلث کے عروج و زوال کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ اس کتبہ کے الفاظ کی نشست و کرسی سے ظاہر ہوتا

---

[1] تاریخ شیراز ہند جونپور ص ۴۹۰ [2] ایضاً ص ۵۲۴ - یہ مسجد ۱۴۰۸ء میں تعمیر ہوئی تھی۔
[3] ایضاً ص ۵۲۴ - ۵۲۵ - [4] ایضاً ص ۵۲۵

ہے کہ قاضی صاحب موصوف واقعی اپنے فن کے امام تھے[1]۔ اس ملک کے بہت سے ماہرین فنِ خوش نویسی نے مختلف مقامات پر آیتہ الکرسی کو خطِ ثلث میں پیش کیا ہے مگر قاضی صاحب کے مذکورہ کتبے میں وصل و فصل اور الفاظ کی نشست دیکھنے کے بعد باقی تمام کتبے پھیکے پڑ جاتے ہیں۔

جونپور کی جھنجری مسجد کی مرکزی محراب کا کتبہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہد کی ایک بڑی اہم یادگار ہے۔ یہ مسجد محلہ سپاہ میں ہے اور اس کو سلطان نے سید صدر جہاں اجمل سہروردیؒ کے لیے تعمیر کروایا تھا[2]۔ اس مسجد کی محراب کی گولائی میں آیت الکرسی خطِ ثلث میں اُبھری ہوئی کندہ ہے اور تقریباً ساڑھے پانچ سو سال پرانی ہے۔ اس کا کاتب کون تھا، یہ معلوم نہیں ہو سکا مگر شانِ خط بتاتی ہے کہ وہ کمال درجہ کا فنکار تھا۔ اس کتبہ کی تحریر میں اُس نے اپنے فنی کمال کا پوری طرح اظہار کیا ہے۔ اس میں وہ پٹی جو اُتر سے دکھن کو گئی ہے، چھ انچ چوڑی ہے اور اس کے حروف کی جسامت بھی چھ انچ ہے اور یہاں وہ حدیث کندہ ہے جو تعمیر مسجد کے فضائل میں ہے[3]۔

جونپور کی لعل دروازہ مسجد کے چہرے کا کتبہ سلطان محمود شاہ شرقی اور اُن کی جلیل القدر ملکہ بی بی راجی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ یہ مسجد "مسجد بی بی راجی" کے نام سے مشہور ہے اور اس کو ملکہ نے حضرت سید علی داؤدؒ کے لیے بنوایا تھا[4]۔ اس مسجد کے ساتھ ان کا مدرسہ و خانقاہ بھی تھی[5]۔ اور اس مدرسہ میں خوش نویسی کی تعلیم بھی لازمی تھی۔ اس مسجد کے چہرے کا کتبہ اور اندرونی محراب کے کتبے بہت ممکن ہے کہ اسی مدرسہ کے زیر اہتمام ہی تیار کیے گئے ہوں۔ مسجد کے چہرے کے کتبے کی عبارت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

---

[1] تاریخ شیراز ہند جونپور ص ۵۲۵-۵۲۶

[2] جونپور نامہ ص ۸۵ و ۸۹-۹۰۔ یہ مسجد ۱۴۷۷ء میں مکمل ہوئی تھی۔

[3] تاریخ شیراز ہند جونپور ص ۵۲۶

[4] جونپور نامہ ص ۵۱-۵۳

[5] ایضاً۔ مسلم خواتین کی تعلیم ص ۳۶

ہے۔ کلمہ طیبہ کی عبارت کے کتبے اکثر و بیشتر مساجد میں ہوتے ہیں لیکن یہ کتبہ کئی لحاظ سے اس کے کاتب کے کمالِ فن کا بیّن ثبوت ہے۔ اس کلمہ شریف کے پانچ سات الفاظ میں کاتب نے بڑی سحر نگاری سے کام لیا ہے اور اس پر جتنا جتنا غور کیجیے لطف بڑھتا جاتا ہے[۱]

اس مسجد کی اندرونی محراب کا کتبہ بھی اسی فنکار کا شاہکار معلوم ہوتا ہے۔ اس کی اُوپر کی آیتہ میں اس نے نشستِ الفاظ میں کافی ریاض اور محنت کی ہے[۲] اس کتبہ کے لفظوں کا بھراؤ کا انداز بڑا اچھوتا ہے اور اس کے فنکار کی پختہ کاری پر دلالت کرتا ہے۔ محراب کی عبارت اُوپر کی عبارت کی بہ نسبت اِس لیے زیادہ قابلِ تعریف ہے کہ اُوپر کی پٹی سیدھی ہے اور محراب کی عبارت میں گھماؤ ہے۔ دراصل ایسے ہی مقامات پر فنکار کی فنّی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ بہرکیف یہ کتبہ بھی اپنی خوبیوں کے لحاظ سے داد کے قابل ہے[۳]

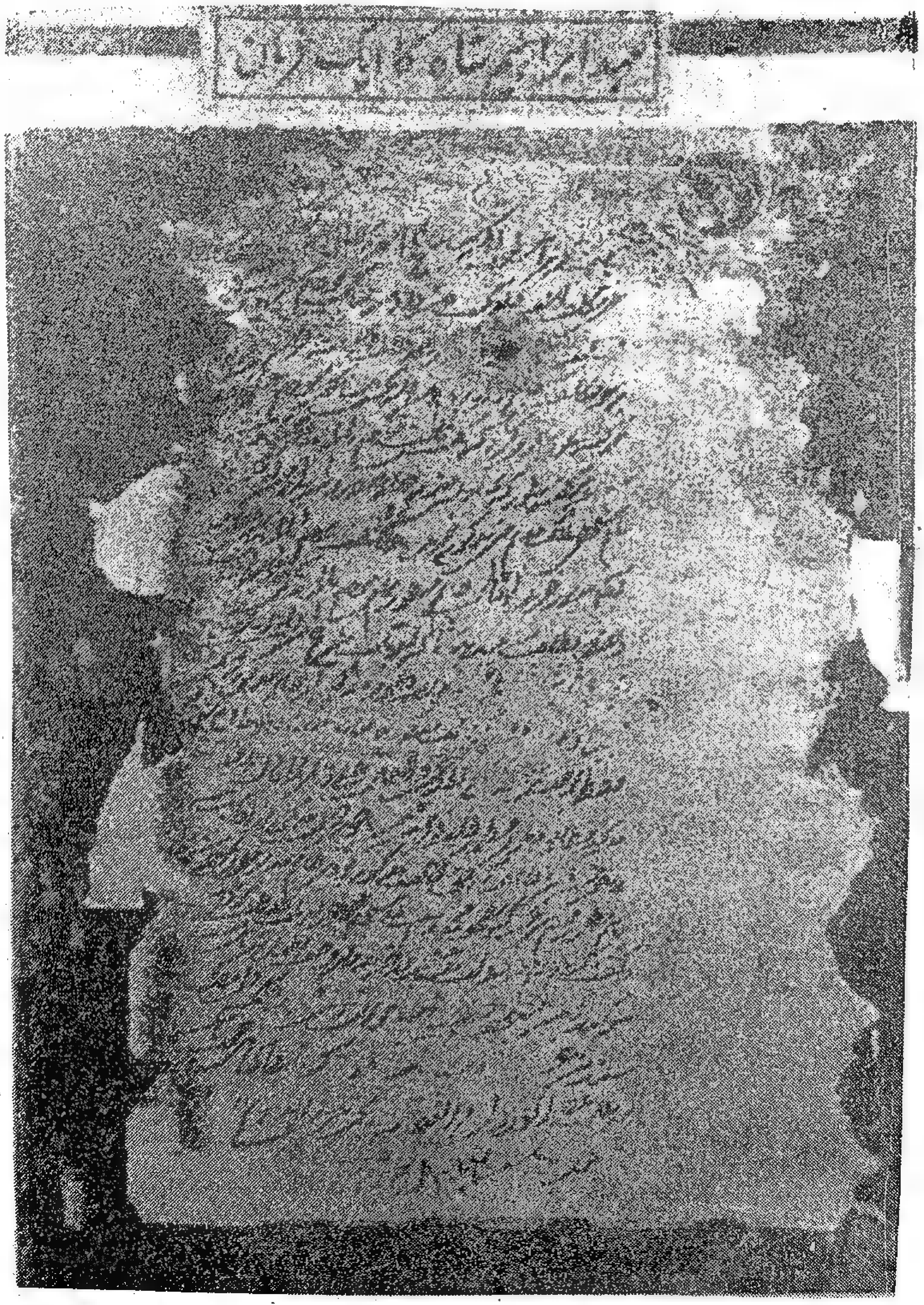
۱؎ تاریخ شیراز ہند جونپور ص ۵۲۶

۲؎ ایضاً

۳؎ ایضاً ص ۵۲۶ - ۵۲۷

ضمیمہ ششم

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہد کا ایک فرمان



سلطان حسین شاہ شرقی کے عہد کا ایک فرمان



عہد حسین شاہ کا ایک فرمان

مآخذ

عربی و فارسی

احسن التواریخ / منتخب التواریخ :
حسن بن محمد شیرازی (۱) دہلی ۱۸۹۱ء
(۲) قلمی نسخہ، برٹش میوزیم لندن

احوالِ جونپور : میر کاظم علی (قلمی نسخہ)

اخبار الاخیار : شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ
مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۹ھ

اخبار الاصفیاء : عبدالصمد
(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

اسرار الاولیاء : ملفوظاتِ بابا فرید گنج شکرؒ
(قلمی نسخہ)

اسنادِ اشغالِ شطاریہ :
(قلمی نسخہ، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)

اصول المقصود : تراب علی کاکوروی
(قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)

افسانہ شاہان : محمد کبیر بن شیخ اسماعیل
(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

افضل الفوائد : ملفوظات شیخ نظام الدین اولیاؒ
مطبع رضوی۔ دہلی ۱۳۰۵ھ

اورادِ درویشیہ : شاہ فتح محمد سہروردی
(قلمی نسخہ)

آئینِ اکبری : ابوالفضل
مرتبہ سرسید احمد خاں (دہلی)

بابر نامہ : ظہیر الدین بابر
(۱) فارسی مطبوعہ بمبئی ۱۸۹۰ء
(۲) انگریزی ترجمہ مسز بیورج لندن ۱۹۲۱ء

بحر الحیات : شیخ محمد غوث گوالیاریؒ
دہلی ۱۸۹۰ء (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری)

بحرِ ذخار : وجیہ الدین اشرف
(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

بلونت نامہ : مولوی خیر الدین محمد
(مطبوعہ)

بیاضِ درویشیہ : سید محمد اسماعیل درویش
(قلمی نسخہ)

بیان الانساب سادات زیدیہ
(مطبوعہ ۱۹۱۴ء)

تاریخ حقی / ذکر الملوک :
شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (قلمی نسخہ)

تاریخ داؤدی : عبداللہ
(۱) قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن
(۲) بہ تصحیح پروفیسر شیخ عبدالرشید : علی گڑھ

تاریخ شاہی / تاریخ سلاطین افغانہ :
احمد یادگار - ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۹۳۹ء

تاریخ شیر شاہی : عباس خاں شیروانی
قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن

تاریخ فرشتہ / گلشن ابراہیمی
محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ
نول کشور ۱۲۸۱ھ و بمبئی ۱۸۳۲ء

تاریخ فیروز شاہی : مولانا ضیاء الدین برنی
ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۸۶۲ء

تاریخ فیروز شاہی : شمس سراج عفیف
ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۸۹۱ء

تاریخ مبارک شاہی : یحییٰ بن احمد سرہندی
ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۹۳۱ء

تاریخ معصومی / تاریخ سندھ
میر معصوم بھکری مرتبہ ڈاکٹر داؤد پوتا
پونا ۱۹۳۸ء

تاریخ محمدی : محمد بہامد خانی
(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

تجلی نور : سید نورالدین زیدی
جلد اول و دوم مطبوعہ جونپور ۱۸۹۹ء و ۱۹۰۰ء
جلد سوم (قلمی نسخہ)

تجلیات العارفین :
شیخ محمد یوسف سہروردی (قلمی نسخہ)

تحفہ اکبر شاہی : (تاریخ شیر شاہی)
عباس خاں شیروانی (قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

تحفۃ الہند : مرزا محمد بن فخرالدین محمد
(قلمی نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری)

تذکرۂ درویشیہ : شاہ وارث علی (قلمی نسخہ)

تذکرۃ الصالحین : سعیدن میاں صاحب
(قلمی نسخہ پروفیسر سید اطہر عباس رضوی)

تذکرۃ الاولیاء : خواجہ فریدالدین عطار
(لاہور)

تذکرہ علمائے ہند : مولوی رحمان علی
(نول کشور ۱۸۹۴ء)

تحفۃ الکرام : میر علی شیر قانع ٹھٹھوی
لکھنؤ ۱۸۰۴ء

تکملہ سیر الاولیاء : خواجہ گل محمد احمد پوری

مطبع رضوی دہلی ۱۳۱۲ھ

جونپور نامہ : مولوی خیر الدین محمد

جونپور ۱۸۹۹ء

جونپور نامہ : غلام حسین

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

حجۃ اللہ البالغہ : (عربی) شاہ ولی اللہ

حمایت الاسلام پریس لاہور ۱۳۲۲ھ

خزینۃ الاصفیاء : مولانا مفتی غلام سرور

لاہوری - لاہور ۱۸۶۸ء

خلاصۃ التواریخ : سبحان رائے

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

خیر المجالس : ملفوظات حضرت شیخ

نصیر الدین چراغ دہلوی

مرتبہ حمید قلندر، بہ تصحیح پروفیسر خلیق احمد نظامی

علی گڈھ

ذکر جمیع الاولیاء - دہلی - محمد حبیب اللہ

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

راگ درپن (فارسی) : فخر اللہ

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

رحلۃ : (عربی) ابن بطوطہ

مصر - ۱۳۴۶ھ

اردو ترجمہ : عجائب الاسفار : مولوی محمد حسین

لاہور ۱۸۹۸ء

رسالہ در جواب عبد الملک :

شیخ علی متقی

(قلمی نسخہ رام پور - لائبریری)

رسالہ شطاریہ : شیخ بہاء الدین شطاریؒ

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

رُشد نامہ : شیخ عبد القدوس گنگوہی

(قلمی نسخہ)

روضۃ الاقطاب : محمد بلاق چشتی

مطبع محب ہند دہلی ۱۸۸۷ء

روضۃ الطاہرین : طاہر محمد سبزواری

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

ریاض الاولیاء : محمد بقا در بخاور خاں

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

ریاض السلاطین : غلام حسین سلیم

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۹۹ - ۱۸۹۸ء

ریاض الانشاء : خواجہ محمود گاواں

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

زبدۃ التواریخ : شیخ نور الحق محدث دہلوی

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

سراج الابصار : سید مصطفٰے

تشریف اللہ - حیدر آباد ۱۲۶۵ھ

حیدرآباد ۱۳۶۵ھ
سفینۃ الاولیاء : دارا شکوہ
(۱) قلمی نسخہ (ذاتی - غیر مطبوعہ)
(۲) مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۰۰ء
سفینۃ العارفین : محمد امان بن محمد یوسف
قلمی نسخہ
(برٹش میوزیم لندن)
سواطع الانوار : محمد اکرم بن شیخ
محمد علی
(قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری، لندن)
سیر الاقطاب : شیخ اللہ دیا چشتی
مطبع نول کشور ۱۹۱۳ء
سیر العارفین : مولانا جمالی
(۱) قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن
(۲) مطبوعہ دہلی
سیر الاولیاء : سید مبارک کرمانی المدعو بہ
امیر خورد
(۱) قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن
(۲) چرنجی لال ایڈیشن دہلی
سیرت امام مہدی موعود : شاہ عبدالرحمٰن
حیدرآباد دکن ۱۹۵۰ء
سیرت فیروز شاہی (قلمی نسخہ)
انیس الانوار : مولانا رحیم بخش فخری
(قلمی نسخہ پروفیسر خلیق احمد نظامی)
شواہد الولایت : بندگی میاں سید برہان الدین
حیدرآباد دکن ۱۹۶۰ء
صبح صادق : محمد صادق بن صالح اصفہانی
(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)
صحائف الطریقہ : شیخ بہاء الدین ننتھو جونپوری
(مجموعۂ خطوط - قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)
مرتبہ پروفیسر میاں محمد سعید
طبقات اکبری : نظام الدین احمد بخشی
ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۳۵-۱۹۲۷ء
طبقات شاہجہانی : محمد صادق ہمدانی
(قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن)
طبقات ناصری : منہاج السراج جوزجانی
ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۸۶۲ء
ظفر الوالہ : عبداللہ محمد بن عمر حاجی الدبیر
مرتبہ سر ڈینی سن راس لندن ۲۸-۱۹۲۱ء
عوارف المعارف : شیخ شہاب الدین سہروردی
(قلمی نسخہ)
فتوحات فیروز شاہی : فیروز شاہ تغلق
رضوی پریس دہلی ۱۳۰۲ھ
فتوح السلاطین : عصامی
مرتبہ ڈاکٹر مہدی حسن - آگرہ ۱۹۳۸ء

فوائد الفوائد: ملفوظات شیخ نظام الدین اولیاؒ
مرتبہ: امیر حسن علا سجزی نول کشور ۱۳۰۲ھ
فیوض الابرار: قلمی نسخہ
کرامات اولیاء: نظام الدین احمد بن محمد صالح
(قلمی نسخہ برٹش میوزیم، لندن)
کشف المحجوب: شیخ علی ہجویریؒ المعروف داتا گنج بخش
مطبوعہ لاہور
کلمۃ الصادقین: محمد صادق ھمدانی
(قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری)
گلزار ابرار: محمد غوثی شطاری
(۱) قلمی نسخہ پروفیسر خلیق احمد نظامی
(۲) اردو ترجمہ مولوی فضل احمد آگرہ ۱۳۲۶ھ
(۳) اذکار ابرار (اردو ترجمہ گلزار ابرار) لاہور ۱۹۷۵ء
لطائف اشرفی: سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ
مرتبہ: مولانا نظام الدین یمنی المعروف
بہ نظام حاجی غریب یمنی
نصرت المطابع دھلی ۱۲۹۵ھ
لطائف قدوسی: ملفوظات و حالات شیخ
عبدالقدوس گنگوھی از شیخ رکن الدین
(۱) قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن
(۲) مطبع مجتبائی دھلی ۱۳۱۱ھ
مآثر الامراء: شاہ نواز خان۔ کلکتہ ۱۸۸۸-۹۱ء
مآثر الکرام: مولانا غلام علی آزاد بلگرامی
(۱) قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)
(۲) مطبع مفید عام۔ آگرہ ۱۹۱۰ء
مآثر رحیمی: عبدالقادر نہاوندی
ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۹۲۴ء
مجمع الاولیاء: میر علی اکبر حسینی اردستانی
(قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن)
مکتوبات قدوسیہ: مرتبہ: شیخ بدھن جونپوری
دھلی ۱۸۷۰ء
مخزن افغانی / تاریخ خان جہانی و
مخزن افغانی: نعمت اللہ
(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)
مرآۃ آفتاب نما: شاہ نواز خاں
(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)
مرآۃ الاسرار: مولوی عبدالرحمٰن چشتیؒ
(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)
مرآۃ جہاں نما: (مرآۃ العالم کا بڑا ایڈیشن)
شیخ محمد بقاء
(قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن)
مرآۃ سکندری: سکندر بن محمد منجھو
(۱) قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن
(۲) بمبئی ۱۳۰۸ھ

مرآۃ العالم : شیخ محمد بقا

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

مرآۃ مداریہ : مولوی عبدالرحمٰن چشتیؒ

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

مرآۃ مسعودی : مولوی عبدالرحمٰن چشتیؒ

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم، لندن)

مشاہیر جونپور : (حصّہ سوم)

(قلمی نسخہ)

مطلع السعدین : عبدالرزاق کمال الدین

(۱) قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن

(۲) مرتبہ مولوی محمد شفیع لاہور ۱۹۴۲ء

مطلع الولایت : بندگی میاں محمد یوسف

حیدرآباد دکن ۱۹۵۵ء

مطلوب الطالبین : محمد بلاق چشتی

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

مکتوبات امام ربانی : مکتوبات شیخ احمد

سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانیؒ

مطبع نولکشور ۱۸۷۷ء

مکتوبات اشرفی : (مکتوبات سید اشرف جہانگیر)

سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

مکتوبات قدوسی : مکتوبات شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ

مطبع احمدی دھلی ۱۸۷۰ء

ملفوظات قطب عالم : یعنی سراج الہدایہ

ملفوظات مخدوم جہانیاںؒ

(قلمی نسخہ)

مناقب درویشیہ : شاہ فتح محمد سہروردیؒ

(قلمی نسخہ)

مناقب غوثیہ : (قلمی نسخہ)

منبع الانساب : سید معین الحق

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

منتخب اللباب : خافی خاں

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۸۹۶ء / و ۱۹۲۵ء

منتخب التواریخ : ملا عبدالقادر بدایونی

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۶۹-۱۸۶۸ء

مونس الارواح : جہاں آرا بیگم

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

نجات الرشید : ملا عبدالقادر بدایونی

(قلمی نسخہ حبیب گنج علی گڈھ مسلم یونیورسٹی)

نزہۃ الخواطر : حکیم سید عبدالحئی

دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن

نشاط آرام : شاہ نواز خاں

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

نقلیات : بندگی میاں عبدالرشید
حیدرآباد دکن ۱۹۵۰ء

واقعات مشتاقی : رزق اللہ مشتاقی
(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

ہفت اقلیم : امین احمد رازی
(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

ہفت گلشن محمد شاہی : ہادی کامور خاں
(قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)

اُردو

اذکارِ ابرار (اُردو ترجمہ گلزار ابرار)
فضل احمد جیوری - لاہور ۱۹۷۵ء

اُردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام : مولوی عبدالحق
مطبع انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ ۱۸۶۸ء

اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر :
ڈاکٹر تارا چند مترجم چوہدری رحم علی الہاشمی
دوسرا ایڈیشن دہلی ۱۹۷۲ء

الندوہ : ندوۃ العلماء لکھنؤ

امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق :
سید حسین شور
دہلی ۱۹۶۱ء

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (اُردو)
فیروز سنز، لاہور

اوراقِ مصوّر : پروفیسر خلیق احمد نظامی
دہلی ۱۹۷۲ء

آبِ کوثر : شیخ محمد اکرام ، لاہور ۱۹۵۲ء

بزمِ صوفیہ : سید صباح الدین عبدالرحمن
مطبع (دار المصنفین) اعظم گڑھ ۱۹۷۱ء

تاریخ آئینہ اودھ : (مطبوعہ)

تاریخ آثارِ بنارس (مطبوعہ)

تاریخ اودھ : ابوالحسن مانکپوری
(مطبوعہ)

تاریخ پالن پور : سید گلاب میاں
دہلی ۱۹۱۲ء

تاریخ جونپور : منشی نظیر الدین
مطبوعہ

تاریخ شیرازِ ہند : سید اقبال احمد
جونپور ۱۹۶۳ء

تاریخ ظفرآباد (مطبوعہ)

تاریخ مشائخ چشت : پروفیسر خلیق احمد نظامی
ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۲ء

تاریخ ہند : ذکاء اللہ
مطبع علی گڈھ
تجدید و احیائے دین : مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ
تذکرہ : مولانا ابوالکلام آزاد (لاہور)
تذکرہ شاہ ولی اللہ : (الفرقان بریلی)
تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی :
(ترجمہ رسالہ مناقب مولفہ شیخ عبدالوہاب
ترجمہ سید ابوظفر ندوی
ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۴ء
تذکرۃ الواصلین : رضی الدین بسمل
منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز پریس، لاہور ۱۳۱۸ء
ترجمان القرآن : مولانا ابوالکلام آزاد
دہلی ۱۹۳۱ء
جغرافیہ جونپور : جلد اول (مطبوعہ ۱۹۷۲ء)
جغرافیہ دارالسرور : ذوالفقار علی
(قلمی نسخہ)
جونپور نامہ : شیخ مہدی حسن چتر ساروی
(قلمی نسخہ)
جونپور نامہ : مولوی محمد سلیم
(قلمی نسخہ)
جونپور نامہ : مولوی شکر اللہ (قلمی نسخہ)
چراغِ نور : مولوی نورالدین زیدی
جونپور ۱۹۳۲ء
حاشیہ چراغِ نور : علی ضامن ترمذی
(قلمی نسخہ)
حیاتِ خسرو : منشی سعید احمد مارہروی
نولکشور اسٹیم پریس، لاہور ۱۹۰۹ء
حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی :
پروفیسر خلیق احمد نظامی
ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۴ء
حیات غوث العالم : مولانا سید محمد کچھوچھوی
خلافت اور ہندوستان : مولانا سید
سلیمان ندویؒ
مطبع اعظم گڈھ ۱۳۴۰ھ
دربارِ اکبری : مولانا محمد حسین آزاد
(لاہور)
رودِ کوثر : شیخ محمد اکرام
لاہور ۱۹۷۰ء
سرمایۂ عشرت : (مطبوعہ)
سلاطینِ جونپور : مولوی غوث علی وکیل
(قلمی نسخہ ۱۲۴۶ھ)
سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات :
پروفیسر خلیق احمد نظامی
ندوۃ المصنفین (دہلی) ۱۹۵۸ء

سیرت النبی : مولانا شبلی و
مولانا سید سلیمان ندوی
مطبع معارف اعظم گڑھ

شعر العجم : مولانا شبلی
(دار المصنفین اعظم گڑھ)

شجرہ خاندانی راجہ سید ارادت جہاںؒ
(نائب ناظم اضلاع جونپور۔ اعظم گڑھ۔
سلطانپور، پرتاپ گڑھ اور فیض آباد)
(قلمی نسخہ)

عجائب الاسفار : مولوی محمد حسین
(اُردو ترجمہ رحلۃ ابن بطوطہ)
لاہور ۱۸۹۸ء

عرب و ہند کے تعلقات : سید سلیمان ندویؒ
(ہندوستانی اکاڈیمی۔ الہ آباد)

غازی نامہ مسعود : عنایت حسین بلگرامی
کانپور ۱۸۷۶ء

مرقع بنارس : (مطبوعہ)

مسلم خواتین کی تعلیم : محمد امین زبیری
کراچی ۱۹۵۶ء

مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت :
مولانا مناظر احسن گیلانی
ندوۃ المصنفین ۱۹۴۴ء

معارف : اعظم گڑھ

معارف النغمات : راجہ نواب علی خاں
(تعلقدار سیتاپور) (مطبوعہ)

معدن الموسیقی : حکیم محمد اکرم
امام خاں (رئیس سندیلہ) مطبوعہ

مقدمہ ابن خلدون : اُردو ترجمہ مولوی عبدالرحمٰن
مطبع حمیدیہ، لاہور ۱۹۰۴ء

ملا محمود : مہدی علی خاں

وجد و سماع : اُردو ترجمہ رسالہ السماع والرقص
ابن تیمیہ از مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی۔ لاہور

ہندوؤں میں اُردو : رفیق مارہروی
لکھنؤ ۱۹۵۷ء

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں :
مولوی ابوالحسنات ندوی
امرتسر ۱۳۴۱ھ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے :
سید صباح الدین عبدالرحمٰن
اعظم گڑھ ۱۹۶۲ء

یاد ایام : مولانا سید عبدالحی
علی گڑھ ۱۹۱۹ء

ہندی

جونپور کا اتہاس : پنڈت بھاسکر
(مطبوعہ)

کیرتی لتا : ودیاپتی ٹھاکر مرتبہ رام بابو سکسینہ
الہ آباد ۱۹۲۹ء

مدھو مالتی : شیخ منجھن
مرتبہ : ماتا پرشاد گپتا
الہ آباد ۱۹۶۱ء

ہندی ساہتیہ کا سنکشپت اتہاس :
سکھ دیو بہاری مصرا، الہ آباد ۱۹۲۴ء

ہندی ساہتیہ کا اتہاس :
آر۔ سی۔ شکلا، الہ آباد ۱۹۲۴ء

ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا اتہاس :
ہری اودھ۔ پٹنہ ۱۹۳۴ء

ہندی بھاشا اور اس کی ساہتیہ کی وکشا
ہری اودھ
پٹنہ۔ ۱۹۳۴ء

ENGLISH

Abdullah Yousaf Ali; : The Holy Quran (Lahore).

" " Medieval India; Social and Economic Conditions, London, 1932.

Afifi, A. E; : The Mystical Philosophy of Muhy-ud-Din Ibnul 'Arabi' Cambridge, 1939.

Ahmad Aziz; : Studies in Islamic Culture in the Indian Environment, Oxford 1966.

Ahmad M. G. Zubaid; : The Contribution of India to Arabic Literature, Allahabad, 1946.

Ameer Ali, S; : The Spirit of Islam, London, 1931.

Arberry, A.J; : Sufism, London, 1959.

Arnold, T.W; : The Preaching of Islam, London, 1935.

" " " : The Caliphate, Oxford, 1924.

Askari, S.A; : "A newly Discovered volume of Awadhi works including Padmawat and Akhrawat of Malik Muhammad Jasisi," J.B.R.S. March, and June, 1933, p. 31.

" " " : Discursive Notes on Sharqi Monarchy of Jaunpur, Indian History Congress Proceedings of the Twenty-Third session, Aligarh, 1960, part I, pp. 154-60.

Aziz Ahmad; : "The Sufi and The Sultan in Pre-Mughul Muslim India," Der Islam, Berlin 38, 1-2-(962) pp. 142-53.

" : Political History and Institutions of the Early Turkish Empire of Delhi, Lahore, 1949.

Bailey, T.G; : A History of Urdu Literature, Calcutta, 1932.

Baksh, S. Khuda : Essays: Indian and Islamic, London, 1912.

" " : Contribution to the History of Islamic Civilization, 2 vols, Calcutta 1959.

Basham A.L; : The Wonder that was India, London 1954.

Boer, J. De; : The History of Philosphy in Islam, London, 1903.

Brown Percy; : Indian Architecture; The Islamic Period, Bombay, 1956.

Browne, E G; : A literary History of Persia, 4 vols., Cambridge, 1928.

Burges, J; : The Ahmadabad Architecture Part 1, London, 1910.

" " : The Muhammadan Architecture of Ahmadabad, 1900-1905.

(The) Cambridge; : History of India, Vol. III, Turks and Afghans ed. Sir W. Haig.

Chaghtai, M. Abdullah; : Paintings During the Sultanate Period, Lahore, n.d.

Chandra Moti; : Jain Miniature Paintings from Western India, Ahmadabad 1949.

Commisariat, M. S; : A History of Gujrat, London, 1938.

Crooke, W; : The Tribes and Castes of N.W. Provinces and Oudh. Vol. I, II, III, and IV (Calcutta, 1896).

Diwakar R R; : Bihar Through the Ages, Calcutta, 1959.

Elliot, H. M and Dowson, J; : The History of India as told by its own Historians. Vol.II. (Revised edition by Professor Habib, S.A. Rashid and K. A. Nizami (Aligarh, 1952).

Farquhar, J.N; : Modern Religious Movements of India, London, 1924.

Faruqi, Burhan Ahmad; : The Mujaddid's Conception of Tawhid, Lahore 1940.

Ferguson, J; : History of Indian and Eastern Architecture, London 1910.

Frazer, Sir, James; : The Sharqi Architecture of Jaunpur with Drawings and Architectural Descriptions by Edmund Smith, Ed. by J. Burgess (Calcutta, 1889).

Fuhrer, A; : The Monumental Antiquities Inscriptions of the N.W. provinces and Oudh. Vol.II. Allahabad, 1891.

Fuhrer, A. and Smith; : The Sharqi Architecture of Jaunpur (Arch. Sur. Ind.)Vol. I. Calcutta, 1889.

Ghani Muhammad, A; : A History of Persian Language and Literature at the Mughal Court, 3 parts Allahabad.

" " : Pre-Mughal Persian in Hindustan, Allahabad, 1941.

Gibb, H.A.R; : Muhammadanism, London, 1951.

Griersson, G.A;: Modern Vernacular Literature of Hindustan, Calcutta, 1889.

" " ": Modern Trends in Islam, Chicago, 1946.

Habib Muhammad: Sultan Mahmud of Ghazni, Aligarh, 1927.

" : Life and Work of Hazrat Amir Khusrau of Delhi, Aligarh, 1927.

" : Hazrat Amir Khusrau of Dehli, Bombay 1927.

" : Chishti Mystics Records of the Sultanate Period, Medieval India Quarterly, Vol. I No. 2, October, 1950.

" : Politics and Society during Early Medieval Period Vol.I ed by Professor K.A. Nizami, Delhi, 1974.

Habibullah, A. B. M; : The Foundation of Muslim Rule in India, Lahore 1945.

Hakim Khalifa Abdul;: The Metaphysics of Rumi, Lahore.

Halim, A; : History of the Lodhi Sultans of Delhi and Agra, Dacca, 1961.

" " : Music in Muslim India. I.C XV No. I January, 1941. pp.356-59.

" : "Music and Musicians of the court of Shah Jahan" I.C, XIX No. 4 January 1945. pp.354-60.

" " : "History of the Growth and Development of North Indian Music during the Sayyid Lodi

Period," J.A.S.P. Vol I No. 1, May, 1957, pp 59-60

: Origin and Evolution of Khayal in Pak-India." J.P H.A., Part II April, 1957, pp. 100-112.

: Mystics and Mystical Movements in Sayyid Lodi Period," J.A.S.P. vol. VIII, No. 2, December, 1963, pp 71-108,

: "Growth and Development of Hindi Literature during the Sayyid-Lodi Period", J A S P. Vol II, 1957 pp. 68-89.

Hamidullah, Muhammad : Introduction to Islam, Paris, 1959.

Hardy, P; : Historians of Medieval India, Studies in Indo-Muslim Historical writings, London, 1960.

Havel, E. B; : A History of Ancient and Medieval Architecture of India London, 1918.

" " " : Architecture of India, London, 1918.

Hitti, P.K; : History of the Arabs, London, 1951.

Hodivala, S.H; : Studies in Indo-Muslim History, Bombay, 1939.

Hussain Agha Mahdi; : Rise and Fall of Muhammad Bin Tughlug, London, 1938.

" " : The Tughlug Dynasty, Calcutta, 1963.

Hussain Yusuf; : Medieval Indian Culture, Bombay, 1957.

" " : "The Influence of Islam on the cult of Bhakti in Medieval India", I.C. Vol. Vii, 1933."

Ikram, Shaikh Muhammad; : Muslim civilization in India, New York, 1961.

" " : History of Muslim Rule in India and pakistan, Lahore, 1961.

Iqbal, Sir Muhammad; : Reconstruction of Religious Thought in Islam, Lahore, 1944.

" " : The Development of Metaphysics in Persia, London, 1908.

Ishaq, Muhammad; : India's Contribution to the Study of Hadis Literature" Dacca, University Bulletin No. XXII, Dacca 1955.

Ishwari Prasad; : History of Medieval India, Allahabad, 1928.

" " : A History of Qaraunah Turks in India, Allahabad 1936.

Jaffar, S M; : Some Cultural Aspects of the Muslim Rule in India, Peshawar, 1938.

Kaumudi; : "The Mingling of Islamic and Indigenous Traditions in Indian Music," I.H.Q. vol XXVI, June 1950, pp. 130-133.

Keay, Frank, E; : A History of Hindu Literature, 3rd ed., Calcutta 1960.

" : Kabir and his Followers, London, 1931.

Khan Bahdur Moulvi Fasih-ud-din; : Kings of the East, Banaras, 1923.

" " : Sharqi Monuments

Lal, K S; : History of the Khaljis (1290-1320), Calcutta, 1967.

" " " : Twilight of the Sultanate, Bombay, 1963.

Lane Poole, Stanley; : Medieval India Under Muhammadan Rule, London 1926.

Law, H.N; : Promotion of Learning in India During Muhammadan Rule by Muhammdans, London, 1916.

Major, R.H; : India in the Fifteenth Century London, 1857.

Majumdar, R. C (ed); : The Dehli Sultanate, Bombay, 1960.

Margoliouth, D S; : On Mahdi and Mahdism, London, 1915,

" " : Early Development of Muhammadanism, Lahore, 1915.

Masum Bhakhari, Mir; : Tarikh-i-Sind (Tarikh-i-Ma'Sumi), ed. UM. Daudpota, Poona, 1938,

Mirza Muhammad Wahid; : The Life and works of Amir Khusrau, Calcutta 1935.

Moreland, W H; : The Agrarian System of Moslem India, Cambridgo, 1932.

Nazim, M; : The Life and Times of Sultan Mahmud of Ghazna, Cambridge, 1931.

Nicholson, R. A; : A Literary History of the arabs, Cambridges, 1930.

" " : Studies in Islamic Mysticism, Cambridge, 1921

" " : The Mystics of Islam, London, 1914.

Niyogi, R; : The History of the Gahadvala Dynasty, Calcutta, 1959.

Nizami, K. A; : Studies in Medieval Indian History, Aligarh, 1956.

" " " : The Life and Timnes of Shaikh Farid-ud-din Ganj-i-Shakar, Aligarh, 1955.

" " " : The Suhrawardi Silsilah and its influence on Medieval Indian Politics, Delhi, 1957.

" " " : Some Aspects of Religion and Politics During the 13th Century Delhi, 1961.

" " " : "Illtutmish the Mystic" I. C XX (1946). 165-80.

" " " : "Early Indo-Muslim Mystics and Their Attitude toward the state" IC XXII No. 4 (1948) pp 387.98, XXIII (1949) XXIV, No. 1 (1950), pp. 60-71.

" " " : Some Religious and Cultural trends in the Tughlug Period, J P. H. S. July 1953. pp. 63-75.

" " " : Shattari saints and their attitude towards the state MIQ Vol. 1 No. 2, October, 1950, pp. 56-70.

" " " : The Religious Life and Learnings of Illtutmish, I. C. Aril, 1946. pp. 15-47.

Nural Hassan, Saiyid; : The Chishti and Subrawardi Movements in Medieval India. Thesis written for the degree of Doctor of Philosophy under the supervision of Professor H. A R. Gibb, Oxford, 1948. (Unpublished).

Oman, J. C; : The Mystics, Ascetics and Saints of India London, 1903.

Qureshi, Ishtaq Hussain; : The Administration of the Sultanate of Delhi, Lahore, 1944.

" " : The Muslim Community of the Indo-Pakistan Sub-continent (610-1947), S'Gravenhage, 1962.

Raghbir Singh; : Malwa in Transition , Bombay, 1936.

Rahim, M.A; : History of the Afghans in India (1545-1631) Karachi

Ray, H C; : The Dynastic History of Northern India, Calcutta, 1931.

Riaz-u'l-Islam; : "A review of the Reign of Firoz Shah IC. XXIII (1949), 281-97.

" " " : A survey in Outline of the Mystic Literature of the Sultanate Period, J.P.H.S vol. III, part 3 July, 1955, pp. 201-208.

Rizvi, Saiyid Athar, Abbas; : Muslim Revivalist Movements in Northern India in the sixteenth and seventeenth Centuries, Agra, 1965.

" " : The Mahdavi Movement in India, M.I.Q. vol. 1. No. i, July, 1950. pp. 10-25

" " : A History of Sufism in India vol I, Delhi, 1978.

Rizvi, S. N. Haider; : 'Music in Muslim India" I.C XV. 1941. pp 331-40.

Rosenthal, F; : The Muqaddimah: An Introduction of History 3 Vols. (London, 1958).

Rushbrook Williams L.F; : An Empire Builder of the Sixteenth Century, London, 1918.

Saeed, Mian Muhammad; : The Sharqi Sultanate of Jaunpur: A Politcal and Cultural History, Karachi, 1972.

" " : Saha'if ul Tariqah by Shaikh Bahauddin Nathu Jaunpuri, Introduced and annotated. (in press).

Saksena Ram Babu; : A History of Urdu Literature, Allahabad, 1940.

" " : Evolution of Awadhi, Allahabad, 1950.

Salim (Dr.); : History of Early Chisti Silsila (Unpublished Thesis of Aligarh University).

Sarkar, Jadunath; : History of Bengal, Vol. II, Dacca, 1948.

Sen. D.C; : Chaitanya and His Age, Calcutta, 1922.

Sell, E; : The Religious Orders of Islam, Madras 1908.

Sewell, R; : A Forgotten Empire, London, 1900.

Shere, S. A; : 'Kings of the Jaunpur Dynasty and their Coinage,"JBORS, Vol. XXVIII, pp. 285-95, Patna, March, 1942.

Sherwani, Harun Khan; : The ;Bahmanis of the Deccan. Hyderabad, 1953.

Siddiqi Mahmudul Hasan; : Mahdi of Jaunpur in Sind J.R.S.P vol. II part II April 1965 pp. 101-109.

Smith, V. A; : The Oxford History of India, London, 1958.

Stephen, Carr; : The Archaeology and Monumental Remains of Delhi (Calcutta, 1876).

Subhan, J; : Sufism its Saints and Shrines, Lucknow, 1938.

Swarup, S; : The Arts and Crafts of India and pakistan Bombay 1957.

Tagore, R.N; : One Hundred Poems of Kabir, London 1914.

Tara Chand; : Influence of Islam on Indian Culture Allahabad, 1936.

Terry John; : The Charm of Islamic Architecture London, 1955.

Thomas Edward; : Chronicles of the Pathans Kings of Delhi London 1871.

Thomas, F.W; : Mutual Influences of Muhammadans and Hindus in India, Cambridge, 1892.

Titus Murray Thurston; : Islam in India and Pakistan, Calcutta 1959.

Tripathi, R.P; : Some Aspects of Muslim Administration Allahabad 1936.

Tritton, A.S; : Muslim Theology.

Trimmingham I. S; : The Sufi Orders in Islam, Oxford University Press, new York, 1971.

Vinode Misra Bandhu; : History ;of Hindi Literature Vol. I (nd.).

Watt, W. M; : Muhammad at madina, Oxford 1956.

Yasin Muhammad; : A Social History of Muslim India (1605-1748) Lucknow 1958.

Yazdani, G; : Manau, the City of joy, Oxford, 1929.

Zutshi, Pandit Manohar lal; : Kabir Sahib, Allahabad, 1930.

BOOK OF REFERENCES

CATALOGUES, ENCYCLOPAEDIAS EPIGRAPHY, GAZETTEERS, JOURNALS, NUMISMATICAL WORKS, AND REPORTS

Ahmad, Shamsuddin; : Catalogue of the Coins in the Indian Museum, Calcutta (Supplement to Vol. II of H.N. Wright, Delhi, 1939.)

Allen, J; : Catalogue of the coins in the Indian Museum, Calcutta, Oxford, 1928.

Asiatic Researches.

Bendrey, A.L; : Studies in Muslim Inscriptions, Bombay, 1944.

Blumhardt, J F; : Catalogue of the Hindustani Manuscripts in the Library of the India Office, Oxford, 1926.

" " : Catalogue of the Hindi, Punjabi and Hindustani manuscripts in the Library of British Museum London, 1899.

Browne, E.G; : A Catalogue of The Persian Mss in the Library of the University of Cambridge, Cambridge 1896.

Bulletin of the Deccan College Research Institute.

Cunningham, A; : Archaeological Survey of India, Reports (1863-65, 1871-72, 1884-85), vol. 11, 12, 15, 17 and 24.

District Gazetteer Azamgarh.

District Gazetteer Jaunpur, Allahabad, 1908.

Elliot, H. M; : Biographical Index to the Historians of Muhammadan India (Calcutta, 1849).

Encyclopaedia of Islam, Leyden/London, 1913-38, new edition, 1960.

Encyclopaedia of Religion and Ethics, edited by James Hastings, Edinburgh, 1914.

Epigraphica Indo-moslemica, ed. E. Denison Ross; Calcutta, 1907-18 ed. G. Yazdani 1919-40.

Ethe, H; : Catalogue of Persian Manuscripts in the India office Oxford, 1903, 1937.

G.S.P. Freeman-grenville; : The Muslim and Christian Calendars London, 1963.

Hughes, T.P; : (A) Dictionary of Islam, London, 1935.

Husain, Hidayat; : Descriptive Catalogue of Arabic Manuscripts in the Royal Asiatic Society of Bengal Calcutta 1939.

Imperial Gazetteer of India, Oxford, 1909.

Indian Historical Quarterly, Calcutta.

Islamic Culture, Hyderabad, Deccan.

Islamic Literature, Lahore.

Ivanow, W; : Concise Descriptive Catalogue of the Persian Manuscripts in the collection of Asiatic Society of Bengal Calcutta; 1924.

" " : Concise Descriptive Catalogue of the Persian manuscripts in the Curzon Collection Asiatic Society of Bengal, Calcutta, 1926.

Journal of Indian History.

Journal of the Asiatic Society of Bengal.

Journal of the U.P. Historical society.

Journal of the Pakistan Historical Society.

Journal of World History.

Khare, G.H; : Persian Sources of Indian History, Poona, 1937.

Lane-Poole, Stanley; : The Coins of the Sultans of Delhi, in the British Museum, (Vol. II The Muhammadan States) London, 1885.

Marshall, J.H; : Archaeological Survey of India, Annual Reports, 1902-03, 1903-04.

Maulvi Abdul Muqtadir; : Catalogues of the Arabic and Persian Manuscripts, Bankipore Library, Vol VI (1918), VII (1921), VIII (1925) and XVI (1929).

Medieval Indian Quarterly, Aligarh.

Muslim Review Calcutta.

Oriental College magazine, Lahore.

Pearson, J.D; : Index Islamicus, Cambridge, 1958-1962 and supplement.

Philip, C.H; : Handbook of Oriental History, London, 1951.

Proceedings of Indian History Congress.

Reports of the Archaeological Survey of India,

Reports of The Indian Historical Records Commission.

Rieu. C; : Catalogues of The persian Manuscripts in the British Museum London, 1879-95.

Rodgers, C.J; : Catalogue of The Indian Museum, Part I, The Sultans of Delhi and Their Contemporaries (in Bengal, Gujarat, Jaunpur, Malwah, The Deccan and Kashmir) Calcutta, 1893.

" " " : Catalogue of the Coins in the Government Museum Lahore, Calcutta, 1891.

Journal of Royal Asiatic Society of Great Britain & Ireland.

Sachau, E. and Ethe, H; : Catalogue of the Persian. Turkish, Hindustani and Pushtu manuscripts in the Bodleian Library, Oxford, 1889-1920.

Steingass F; : Persian English Dictionary, London, 1892-1963.

Storey, C.A; : Persian Literature, A Bio-Bibliographical Survey London, 1927-58.

U.P. District Gazatteer.

Whitell, H.M; : Numismatic Supplement (36) JASB, 1922.

" " " : Catalogue of the Coins in the Indian Museum, Calcutta.

Wright, H.N; : The Coinage and Metrology of the Sultans of Delhi, 1936.

" " " : Catalogue of the Coins in the Indian Museum, Calcutta, Vol. II (Muhammadan Series), Oxford, 1907.

Zafar Hasan M; : List of Muhammadan and Hindu Monuments in the Province of Delhi, 4 vols. Calcutta, 1916-22.

شخصیات

(ا)

آبِ کوثر ۶۳-۱۰۹-۱۸۰-۵۵۵
آدم عثمان ۳۷۵
آذری ۶۲
آزاد بلگرامی ۵۹
آئینِ اکبری حصّہ دوم ۲۳۱-۲۳۲-۳۹۵-۴۴۱-۴۴۳-۴۴۴-۴۴۶-۴۵۲-۴۵۴-۴۷۴-۴۷۵-۵۴۹
آیۃ الکرسی ۴۴۳-۴۴۵
ابراہیم المعروف بابا میاں صاحب ۵۰۰
ابراہیم ایرجی سید ۲۳۱-۲۳۲-۴۶۲
ابراہیم بن ادھم (سلطان التارکین) ۱۸۶-۲۰۴
ابراہیم حکیم (سیّد محمد) ۹۷
ابراہیم خاں شیردانی ۴۱۸
ابراہیم شاہ ۴۷
ابراہیم شاہ شرقی سلطان ۷۰-۷۱-۷۲-۷۳-۷۴-۷۸-۷۹-۸۱-۸۹-۹۱-۹۲-۹۳-۹۴-۹۵-۹۶-۹۷-۹۸-۹۹-۱۰۰-۱۰۱-۱۰۲-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵-۱۰۶-۱۰۹-۱۳۳-۱۳۶-۱۳۷-۱۳۸-۱۳۹-۱۴۰-۱۴۱-۱۴۲-۱۴۳-۱۴۴-۱۴۶-۱۴۷-۱۴۸-۱۴۹-۱۵۰-۱۵۱-۱۵۲-۱۵۹-۱۶۵-۱۶۶-۱۶۷-۱۶۸-۱۶۹-۱۷۰-۱۷۲-۱۷۷-۱۷۸-۱۹۵-۱۹۸-۱۹۹-۲۰۲-۲۰۳-۲۰۴-۲۰۶-۲۱۱-۲۱۲-۲۱۵-۲۱۸-۲۶۰-۲۶۴-۲۶۶-۲۶۷-۲۷۴-۲۷۵-۲۸۷-۲۹۱-۳۱۲-۳۱۷-۳۴۶-۳۵۲-۳۶۷-۳۶۸-۳۷۵-۴۰۲-۴۰۳-۴۴۱-۴۴۴-۴۴۷-۴۵۷-۴۵۸-۵۰۲-۵۰۳-۵۲۷-۵۲۸-۵۲۹-۵۳۰-۵۳۱-۵۳۲-۵۳۳-۵۳۴-۵۹۰-۵۴۳-۵۴۴
ابراہیم شاہی ۱۳۸-۲۵۶
ابراہیم لودھی سلطان ۲۷۲-۴۱۷
ابنِ بطوطہ ۴۲-۵۱-۵۲
ابنِ تومارات ۴۷۲
ابنِ حجر ۴۷۰
ابنِ حجر مکی ۴۹۳
ابنِ حریرہ ۴۷۱
ابنِ خلدون ۴۶۹-۴۷۰
ابو اسحاق ۴۴۲
ابوالبقاء (شیخ) بن شیخ موسیٰ بن شیخ ضیاءالدین کرمانی ۲۲۴
ابوالحسن خرقانی (خواجہ) ۴۵۱
ابوالغوث (مخدوم شاہ) گرم دیوان ۲۶۸
ابوالفتح جونپوریؒ ۲۲۴-۲۲۹-۲۹۰-۳۵۱-۳۵۲
ابوالفتح سہروردی ۲۵۴-۴۶۲-۴۶۳
ابوالفتح سوبرنیسؒ خواجہ ۹۶-۱۴۳-۱۴۴-۲۶۱-۲۸۴-۲۸۶-۲۸۷-۲۸۸-۲۸۹
ابوالفتح علامی ۲۲۰

ابوالفضل ۴۷۴-۴۷۵-
۴۸۶
ابوالکلام آزاد (مولانا) ۴۸۶
۴۸۷-۳۹۶-۴۲۰-۴۷۵
ابواللیث شیخ ۳۰۲
ابوالمظفر لکھنوی ۳۷۵-۴۵۱
ابوالواصل شیخ ۳۷۶
ابوالوفا خوارزمی ۳۷۶
ابوبکر سلطان ۵۶-۸۲
ابوبکر شبلی ۶۹
ابوبکر صدیق (حضرت) ۲۱۱-
۲۹۰
ابوبکر طوسی حیدری ۴۲۷
۴۷۷
ابوحنیفہ ۳۷۱-۳۸۲
ابوسعید چشتی ۳۱۱
ابوسعید خاں ۱۰۵
ابوسعید خزری ۷۶
ابوسعید سلطان ۶۴
ابومحمد چشتی ۴۰۱
ابومحمد عرف معاین حفص ۳۷۵
ابوہریرہ ۴۴۳
ابی یزید العشقی ۴۵۱
اتابک اعظم ۸۴
اثبات الاحدیہ ۳۵۴
اجمل جونپوری ۳۴۱

اجمل سید ۱۴۰
اجمیری چشتی شاہ ۳۱۶
احسن التواریخ (قلمی)
منتخب التواریخ (قلمی) ۹۰-۹۲
۱۰۷-۱۱۹-۱۲۶-۱۲۷-۵۴۹
احسن شاہ ۴۷
احمد ایاز ۵۰
احمد بہاری ۵۹
احمد بن حنبل ۳۷۱
احمد بن عبداللہ چشتی ۳۱۹
احمد تھانیسری ۱۹۹-۲۱۹
احمد خاں میواتی ۱۱۸
احمد خضری ۳۱۲-۳۲۱-
۵۱۲
احمد زین جونپوری شیخ
۳۱۱
احمد سید ۳۸۱-۳۹۸
احمد شاہ بہمنی سلطان ۴۷۲
احمد شاہ سلطان ۶۱-۶۶
۶۹
احمد شیخ ۳۹۹-۴۱۹
احمد عبدالحق شیخ ردولوی
۷۳-۱۴۷-۲۲۹-۲۵۰-
۳۸۵-۳۹۴-۳۹۵-۳۹۷-
۳۹۹-۴۰۲-۴۰۴-۴۰۶-
۴۰۸-۴۱۰-۴۱۱-۴۱۲-۴۱۳

۴۱۶-۴۲۳-۵۱۴-
احمد علوی ۳۶۸
احمد عیسی (شیخ) ۲۹۰
۲۹۲-۲۹۴
احمد غزالی ۲۳۱
احمد فیاض امیٹھوی (شیخ)
۳۹۲
احمد فیاض شیخ ۲۲۵-۳۹۴
احمد کبیر سید ۲۳۵
احمد کھٹو شیخ ۵۲۱
احمد ماہرو ۲۸۹
احمد مجدد شیبانی ۳۱۹
احمد منجھلی سید ۲۷۲
احمد نظام شاہ ۶۷-۱۰۲-
۴۷۹
احمد نہروالہ (شیخ) ۲۳۲
احمد یسوی ۳۹۴
احوال جونپور (قلمی) ۸۱
۸۵-۸۶-۵۴۹
اخبار الاخیار ۲۱-۷۳-۸۴-
۹۱-۱۳۲-۱۳۳-۱۳۷-۱۴۳
۱۴۴-۱۴۹-۱۵۰-۱۶۱-۱۹۶
۱۹۸-۱۹۹-۲۰۸-۲۰۹-۲۱۵
۲۱۶-۲۱۷ تا ۲۲۴-۲۳۲ تا
۲۳۵-۲۶۱-۲۷۷-۲۷۸-۲۸۱
۲۸۴ تا ۲۸۸-۲۹۰-۲۹۳

۲۹۴-۲۹۶ تا ۳۰۰-۳۰۰ تا
۳۰۸-۳۱۰-۳۱۱-۳۱۵ تا
۳۱۸-۳۲۲ تا ۳۳۶-۳۳۷
تا ۳۴۴-۳۴۸ تا ۳۵۰-۳۵۳
تا ۳۵۶-۳۵۸-۳۵۹-۳۶۷
۳۷۰-۳۷۷-۳۹۳-تا ۴۰۲-
۴۰۴-۴۰۶-۴۰۷-۴۱۱-
۴۱۲-۴۱۶-۴۲۰-۴۲۱-
۴۲۴ تا ۴۲۷-۴۲۹-۴۳۴
۴۳۷ تا ۴۴۴-۴۴۵-۴۵۱
۴۵۴-۴۵۶-۴۵۷-۴۶۱
۴۶۲-۵۰۱-۵۰۸-۵۱۴
۵۱۵-۵۲۴-۵۳۵-۵۴۹
اخبار الاصفیاء (قلمی) ۲۷۰-
۳۲۳-۳۵۰-۵۱۴-۵۴۹
اختیار الدین عمر ایرجیؒ ۳۲۹
۳۳۰-۴۲۶
اخی جمشید راجگیری ۱۳۳
۱۳۴-۱۴۳-۲۷۰-۲۷۱-
۲۷۳-۲۷۴-۲۷۵-۲۷۶
۴۴۴
اخی سراج راجگیریؒ (مخدوم)
۸۵-۳۵۱-۳۶۴-۳۶۵
آداب السالکین (رسالہ) ۳۴۹
ادہم خاں ۶۵
ادھن شیخ جونپوریؒ ۲۵۹

۲۹۸-۳۰۰-۵۳۵-۵۴۰
ادھین بہدری ۵۰۱
اڈھن شیخ ظفرآبادی ۴۳۵
اذکار ابرار ۲۱۴-۲۱۵-۴۶۲
۴۶۷-۵۱۹-۵۵۵
اذکار اولیہ ۳۶۳
اردو کی نشوونما میں صوفیائے
کرام کا کام ۶۲-۴۱۷-۴۱۹
۴۲۷-۴۴۶-۴۶۶-۴۹۳-
۴۹۹-۵۰۰-۵۰۸ تا ۵۱۲-
۵۱۴ تا ۵۱۶-۵۱۸-۵۱۹
۵۲۱-۵۲۲-۵۵۵
ارسلان ملک ۹۰-۱۶۷-
۵۰۲-۵۰۳
اژدر خاں بدخشی ۱۶۶
۲۷۵
اسحاق شامی خواجہ ۲۷۹
اسحاق مغزلیؒ ۴۲۳
اسدالدین آفتاب ہند ۵۹-
۱۸۲-۱۸۳-۱۸۵-۱۸۷ تا
۱۹۲-۲۲۸-۲۳۸-۲۳۹
۲۴۰-۲۴۱-۲۴۲-۲۴۴-
۲۴۶-۲۴۷ تا ۲۵۱-۲۵۹
۵۴۲
اسدالدین حسینیؒ ۲۴۰
اسدالعلماء (سید محمد جونپوریؒ)

۴۷۵-۵۲۰
اسلام خاں ۵۰-۸۲
اسلام شاہ سوری ۳۳۳
اسلام کا ہندوستانی تہذیب پہ
اثر ۵۰۴ تا ۵۰۷-۵۱۱-
۵۱۵
اسماعیل بہزدی ۲۶۸
اسماعیل سید ۳۱۲
اسماعیل سید مخدوم شاہ ۳۱۶
اسماعیل شیخ ۲۸۹-۳۸۳
۳۸۴-۳۸۶
اسمٰعیل صفوی ۴۸۴
اسماعیل کرویؒ ۵۹-۲۳۹
اسناد اشغال شطاریہ ۵۴۹
اشتیاق حسین قریشی ڈاکٹر
اشرف جہانگیر سمنانی ۹۶
۱۳۶-۱۴۵-۱۴۶-۱۶۵-۱۶۶
۲۰۰-۲۰۱-۲۲۹-۲۵۲-
۲۵۳-۲۷۶-۲۸۹-۳۱۴-
۳۴۵-۳۶۰-۳۶۱-۳۶۲-
۳۶۴-۳۶۵-۳۶۹-۳۷۰
اشرف سلطان ہنر سید ۱۴۶
اشرف قاضی سید ۳۶۶ تا ۳۶۹
۳۷۲-۳۷۳-۳۸۰-۳۸۱
۳۸۴
اشرفیہ سلسلہ ۳۶۰-۳۶۱

۳۹۱
اصول المقصود (قلمی) ۱۶۱-۱۶۲-۴۲۴-۴۲۵-۴۲۹-۴۳۸-۵۴۹
اصیل الدّین ۳۷۵
اطہر عباس رضوی ۴۵۹
اعزالدین خواجہ ۳۴۲
اعزالدّین لنگر جہانگش ۲۴۵
اعظم ثانی لکھنویؒ (شیخ) ۲۲۴-۳۴۱
اعظم لکھنوی (مولانا) ۲۲۱
افتخارالدین خواجہ ۳۴۲
افسانۂ شاہاں ۱۲۰-۱۲۱-۱۲۲-۱۷۴-۲۰۹-۳۸۴-۴۸۸-۴۹۸-۵۴۹
اکبر شہنشاہ ۶۷-۱۸۸-۳۹۶-۴۲۰-۴۴۳-۴۴۹-۴۶۴-۴۶۸-۵۲۴-۵۲۵-۵۴۰
اکرام اللہ ۱۰۱
اکھروت ۵۰۱-۵۲۴-۵۲۵
التمش سلطان ۵۳-۵۶
العوارف جنتہ المشرق ۶۹
الکھ داس ۵۱۵-۴۱۹
المشرع الردی ۶۹
الن قلندر ۴۳۵
النور السافر ۶۹
النّاصر خلیفہ ۲۳۲
الہٰداد جونپوریؒ ۳۱۱-۵۰۱-۵۲۳
الہداد جونپوریؒ ۱۹۳-۱۹۹-۲۰۹-۲۱۰-۳۲۵
الہٰ داد مجذوب ۲۹۴
الہٰداد محشیؒ ۱۵۹-۲۰۸-۴۷۸-۴۸۴
اللہ دی ۴۷۷
اللہ یار ۲۲۳
اماپتی ۴۹۵-۵۰۵
امام السالکین ۳۷۳
امام بخاریؒ ۴۷۰
امام حسن و حسین (شہادت نامہ) ۵۰۱
امام رضاؒ ۳۷۱
امام زین العابدین سیدالساجدینؒ ۲۳۹
امام غزالیؒ ۳۳۱
امام محمود دی ۴۴۱-۴۴۲
امام مہدی ۴۷۰
امان پانی پتی شیخ ۳۰۷ تا ۳۰۹-۳۵۴
امرت کند ۵۱۸-۴۶۵
امیران صدّہ (صدہ) ۴۷
امیر تیمور ۴۷۲
امیر خسرو دہلوی ۷۷-۱۲۹-۳۳۳-۴۲۷-۵۳۶-۵۳۸
امیر شیخ ابوالمکارم ۳۷۵-۳۷۶-۳۸۴-۴۸۵-۴۱۵
امیر شیخ جمشید بیگ ۳۷۵
امیر عمر خاں ۵۱۴
امیر ماہ بہرائچی سید ۵۸-۳۴۲-۳۴۴
امیر نورالدین نعمت اللہ (شاہ نعمت اللہ ولی) ۴۷۲
امیر ملاجوں ۴۷
امین الدین اعلیٰ (شاہ) ۶۲
امین الدین شیخ ۳۴۱
انتخاباتِ درویشیہ ۲۴۵
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۴۲۲-۴۲۴-۵۵۵
انوار العیون ۱۴۷-۱۴۸-۴۰۰-۴۰۲-۴۰۳-۴۰۵-۴۰۷-۴۱۲-۴۱۳-۵۱۴
اورادِ غوثیہ ۳۴-۳۶۱
اوراق مصوّر ۷۶-۱۷۵-۵۵۵
اورنگ زیب شہنشاہ ۶۸-۱۴۱
اویس قرنی خواجہ ۳۶۳
اہیرن ۲۶۷

اِشوری سنگھ ۱۰۸-۱۵۳-
۱۷۱
ایبک سلطان ۵۳

(ب)

باباعبدالرحمنؒ ۲۵۶
باباکمال پنڈت ۲۷۲-۱۶۵
بابر بادشاہ ۳۵۵-۴۶۸-
۴۸۲
بابرنامہ ۴۸۲-۵۴۹
بابوتاج الدینؒ ۲۶۴
بابو (شیخ) شیرسوارؒ ۳۴۵
باچگوٹی ۱۲۴-۱۷۴
باربک شاہ ۱۲۳-۱۲۴-۱۷۳-
۱۷۴-۳۰۵
بارہ پیر ۱۱۳-۱۵۶
بارہ وفات ۱۱۳-۱۵۶
بازبہادر ۶۵
باقربن علی بن زین العابدینؒ
۴۷۴
بال ناتھ ۱۷۶
باہن سنگھ ۱۶۸
بایزید بسطامی (خواجہ) سلطان
العارفین ۳۵۱
بحرالحقائق ۳۶۶

بحرالحیات ۴۶۴-۴۶۵-۴۶۸-
۴۹۹-۵۱۸-
بحرالمواج (کتاب تفسیر) ۲۰۱
بحر ذخار ۲۱۷-۲۹۱-۲۹۳-
۲۹۴-۲۹۸-۳۰۲-۳۰۴-۳۰۷-
۳۰۰-۳۲۷-۳۴۵-۳۴۶
۳۶۲-۳۶۳-۵۲۵-۵۴۹
بختیار خاں ۵۳۱
بختیار صابری شیخؒ ۴۰۸-
۴۱۰-۴۱۱
بختیار کاکیؒ شیخ ۴۰۱
بخشو نائک ۱۷۴-۵۳۹
تا ۵۴۱
بدائع البیان ۲۰۱
بدرالدین اسحاقؒ ۲۸۱
بدرالدین بدر غزنویؒ ۹۷-
۱۹۰-۲۸۰-۳۱۶
بدہ حقانی شیخ ۳۰۴
بدہ کھڈی شیخؒ ۲۹۲
۲۹۸
بدھن قاضی ۲۲۱
بدھ مت ۱۷۲
بدیع الدین شاہ مدارؒ شیخ
۷۳-۱۴۸-۱۸۵-۲۰۰-۲۳۳-
۲۵۵-۳۴۱-۳۴۵-۳۷۰-
۴۴۱-۴۴۲-۴۴۳-۴۴۵

بڈہ اویسی سید یوسف ۴۷۴
بڈھن شیخؒ ۱۶۱-۲۹۳
۳۵۲-۴۶۱-۵۳۵
بڈی شیخ ۳۴۱
برج بھاشا ۴۹۶-۵۰۰
برہان الدین جانمؒ ۶۲
برہان الدین شہید ۵۸-۱۷۶
برہان الدین غریبؒ ۶۲-۴۲۶
برہان الدین کالپوی ۴۹۳
۵۰۱-۵۱۶-۵۲۳-۵۲۴
برہان الدین مرغینانیؒ ۲۱۹
برہان العاشقین ۳۷۳
برہان ملک ۴۸۰
برہان نظام ۴۷۹
برہمن ۱۷۲
بزم صوفیہ ۱۴۶-۱۴۷-
۲۷۷-۳۶۹-۳۷۰-۳۷۲
۳۷۴-۳۷۶-۳۸۹-۳۹۷-
۳۹۸-۴۰۱-۴۰۲-۴۰۵-
۵۵۵
بسنت معمار ۱۰۱-۱۶۸
بشارت المریدین ۳۷۴
بقر عید ۱۱۳-۱۵۶
بکرماجیت ۵۴۰
بلبن (سلطان) ۵۳-۵۶
بندگی جلال الحق قاضی خاں

ناصحیؒ ۱۸۷-۱۸۸-۱۹۲-۲۱۹
۲۵۹-۳۰۶-۳۰۷-۳۵۶-۳۵۷
۳۵۸
بندگی خلیلؒ ۳۰۱
بندگی شاہ آمین محمد ۴۹۲
بندگی شاہ شمس الحق ۱۹۸
بندگی شاہ نظام الحق ناصحیؒ ۱۸۸
بندگی شیخ ۳۱۱-۳۱۴
بندگی ملک الہداد ۴۹۲
بندگی ملک برہان الدین ۴۹۲
بندگی ملک معروف ۴۹۲
بندگی میاں شاہ نعمتؒ ۴۹۲
بندگی میاں عبدالرشید ۴۸۸
بندگی میاں شاہ عبدالمجید نوری
۴۹۲
بندگی میاں یوسف ۴۹۲
بندھو ونود ۵۱۱
بہاءالدین چشتی ۱۲۸
بہاءالدین زکریا ملتانی ۱۸۹-
۲۳۲ تا ۲۳۷-۳۱۹-۴۲۰-۴۲۷
بہاءالدین قادری شطاریؒ ۳۳۲
بہاءالدین ننھو جونپوری شیخ ۱۷۶
۲۹۳-۲۹۶-۲۹۸-۲۹۹-
۳۱۷-۳۲۶-۴۹۸-۵۱۲-۵۳۵
بہاءالدین نقشبندی ۳۷۱
بہادر شاہ ۶۷

بہادر شاہ گجراتی سلطان ۶۵
۵۲۹
بہادر ناہر میواتی ۵۵
بہاری راگ ۵۴۰
بہرام خاں ۴۷
بہرام شیخ ۲۰۵-۴۱۰-
۴۱۱
بہرام منطقی ۲۵۵
بہرلیہ ۱۶۶
بھردں (ایک قوم) ۳۸
بھرن رائے ۵۲
بھکاری جونپوریؒ ۲۰۹-۲۱۰
بھگت چتینیا ۵۰۴
بھگت کبیر ۷۶-۱۷۵-۴۹۵
۴۹۶-۵۰۵-۵۰۶-۵۰۷
۵۰۸ تا ۵۱۰-۵۱۲
بھگتی تحریک ۷۶-۲۳۰-
۴۹۵-۴۹۶
بہلول شیخ ۴۶۳-۵۱۸
بہلول لودھی سلطان ۲۱-۱۰۸
۱۰۹-۱۱۴-۱۱۵-۱۱۸ تا ۱۲۳
۱۲۹-۱۵۹-۱۶۰-۱۷۳-۲۰۷
۲۱۴-۲۱۵-۴۴۰-۵۲۹-
۵۳۲-۵۳۳
بہمنی نامہ ۶۲
بہور شیخ ۴۲۰

بہوحل ۷۷-۱۷۴-۵۲۹
بہید راجہ ۱۲۲-۱۲۵-۱۲۶
۱۷۳-۱۷۴
بھیک (شیخ) ۴۷۷
بھیکن ۱۰۹-۱۱۴
بھیکہ شیخؒ ۲۵۰
بیاض درویشیہ (قلمی) ۱۸۸
بیان الانساب سادات زیدیہ
(مطبوعہ) ۸۱-۸۵-۸۶
بی بی آغا ۴۷۴
بی بی آمنہ ۴۷۴
بی بی خونزہ ملکہ جہاں ۵۳۲
بی بی راجی ۷۴-۷۵-۹۲-۱۰۸
۱۰۹-۱۱۱-۱۱۲-۱۱۳-۱۱۵-۱۷۹
۱۲۰-۱۵۵-۲۱۳-۵۴۴
بیجک ۵۰۷
بیجو نانک گویا ۵۳۹
بیر افغان ۵۴
بیرم خان خانخاناں ۲۱۴
۴۶۴

(پ)

پاریجات ہرن (ڈرامہ) ۵۰۴
پدماوت ۵۰۱-۵۲۴-۵۲۵
پدماوتی ۵۲۵-۵۲۶
پدمنی شہزادی ۵۲۶-۵۲۷

پربند (راگ) ۵۳۶
پرتھوی راج ۲۷۹
پنڈت بال دت ۲۵۴
پنڈت پال ناتھ ببر ۲۵۵
۴۹۸
پوربی بولی ۵۰۸-۵۳۶
پورنماشی (معمار) ۱۰۱
پوستی نامہ ۵۲۵
پہاڑی جھنجھوٹی (ایک قسم کا راگ) ۵۰۴
پیارے شیخ ۲۸۹
پیر بڈھن شیخ ۵۳۹
پیرک شیخ ۴۴۰
پیر محمد (جرنیل شہنشاہ اکبر) ۶۵

(ت)

تاتار خاں ۳۷-۹۸
تاج الدین انصاری (شیخ)
۳۷۵-۵۲۳
تاج الدین سید ۲۳۹-۴۸۱
تاج الدین فاروقی (قاضی) ۱۸۶
۱۸۸
تاج الدین ناصحی (قاضی)
۱۸۶-۳۵۶
تاریخ آثارِ بنارس ۱۱۰-۱۱۳
۱۵۵-۱۵۶
تاریخ بدایونی ۷۷-۱۴۰-
۱۷۳-۲۱۵-۲۲۹-۴۶۳-
۴۶۴
تاریخ پالن پور ۴۸۲-۴۸۴
۵۵۵
تاریخ حقی/ذکر الملوک (قلمی)
۸۳-۹۲-۵۵۰
تاریخ خان جہان و مخزن افغانی
(قلمی) ۱۰۸-۱۰۹-۱۱۸-۱۲۰
۱۲۱-۱۲۲-۱۲۳-۱۲۴-۱۲۵-
۱۲۷
تاریخ داؤدی ۱۰۸-۱۰۹
۱۲۰-۱۲۱-۱۲۴-۱۲۶-۱۷۳
۴۴۸-۵۵۰
تاریخ شاہی ۱۱۵-۱۲۳-
۴۸۸-۵۵۰
تاریخ شیراز ہند (جونپور) ۷۹
۱۷۸-۱۴۵-۵۲۷ تا ۵۲۹
۵۳۳-۵۳۴-۵۴۲ تا ۵۴۵
۵۵۵
تاریخ ظفر آباد ۱۶۳-۱۸۸
۲۴۱-۲۴۴-۲۴۵-۲۴۶-
۲۴۸-۲۴۹-۲۵۱-۲۵۲
۲۵۶ تا ۲۵۹
تاریخ غربی (مثنوی) ۵۰۰
تاریخ فرشتہ ۴۸-۵۱-۶۱
۶۳-۶۴-۶۵-۷۱-۷۹-۸۲
۸۵-۸۶-۹۰-۹۱-۹۲-۹۳
۱۰۷-۱۰۹-۱۱۰-۱۱۴-۱۱۵-
۱۱۶ تا ۱۲۱-۱۲۳-۱۲۶-۱۶۷
۱۷۳-۲۰۳-۲۱۴-۵۳۱ تا
۵۳۳-۵۵۶
تاریخ فیروز شاہی (برنی) ۴۸-
۴۹-۵۲-۴۷-۲۳۴-۲۳۵
۵۵۰
تاریخ فیروز شاہی (عفیف)
۳۹-۵۰-۵۴-۷۱-۷۲
۸۲-۸۸-۹۰-۹۲-۵۵۰
تاریخ مبارک شاہی ۴۷-۴۸
۵۰-۵۲-۵۴-۷۰-۸۱ تا
۸۵-۹۷-۹۰-۱۶۴-۵۵۰
تاریخ محمدی ۷۲-۸۲-۸۴
۸۵-۸۸-۹۲-۱۳۱-۱۳۷
۱۶۴-۱۶۵-۱۶۸-۴۲۰
تاریخ مشائخ چشت ۵۸-۶۰
۲۳۴-۲۸۱-۳۲۵-۴۱۸ تا
۴۲۱-۴۹۹-۵۱۴-۵۱۵
-۵۵۵
تاریخ مہدویہ ۸۲
تان سین گویا ۵۴۰-۵۴۱
تجلی نور ۳۶-۳۷-۳۹-۵۹
۷۶-۷۲-۷۳-۹۲-۹۳-۱۰۶
۱۱۳-۲۰۳-۲۴۳-۲۵۲-۲۵۳

۲۶۳-۲۶۷-۲۸۷-۲۹۰-۲۹۲
۲۹۴-۳۰۰-۳۱۰-۴۲۵ -
۴۵-۱۱۴-۱۱۵-۱۳۲-۱۳۳
۱۳۸-۱۳۹ تا ۱۴۲-۱۴۴-۱۴۵
۱۵۴-۱۵۶-۱۵۸-۱۶۰-۱۶۱
۱۶۳-۱۶۷-۱۷۸-۱۸۱ تا
۱۹۳-۱۹۵ تا ۲۰۰-۲۰۲ تا
۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۲۱۰ تا
۲۱۴-۲۳۸ تا ۲۴۴-۲۴۹ تا
۲۵۳-۲۵۹ تا ۲۶۸-۲۸۸
تا ۲۹۶-۲۹۸ تا ۳۰۴-۳۰۶
۳۰۸ تا ۳۱۴-۳۱۶-۳۱۸ تا
۳۲۱-۳۵۶ تا ۳۵۹-۴۲۹
تا ۴۳۱-۴۳۳ تا ۴۳۷-۴۵۰
۴۷۴-۴۸۵-۴۸۶-۴۹۸
۵۱۳-۵۱۴-۵۲۰-۵۳۲ -
۵۳۳-۵۵۵
تحفۂ اکبر شاہی (قلمی) ۱۰۸-۵۵۰
تحفۃ الکرام ۱۳۳-۱۳۵-۵۵۰
تحفۃ الہند ۵۳۸-۵۵۰
تختِ طاؤس ۶۸
تردی بیگ ۴۱۸
ترک الطوسی (مولانا) خواجہ
ابو المظفر ۴۵۱
تذکرہ (مولانا ابو الکلام آزاد)
۴۸۶-۵۵۶

تذکرۃ الامرا ۵۳۱-۵۳۲
تذکرۃ الصالحین ۲۴۹-۲۵۴
۲۵۵-۲۵۰
تذکرہ شیخ علامہ شیخ محمد بن
طاہر محدث پٹنی ۴۷۹ -
۴۸۰-۴۸۲-۵۵۶
تذکرہ علمائے ہند ۱۹۷-
۱۹۸-۱۹۹-۲۰۲-۲۰۳-۲۰۹
۲۱۰-۲۱۱-۲۱۴-۲۱۵-۲۱۹
۲۲۳ تا ۲۲۵-۲۳۱-۲۳۲-
۲۶۲-۳۳۲-۳۳۳-۳۴۰
۳۴۱-۳۷۷-۳۸۲-۳۸۳ تا ۳۸۶
۳۹۲-۳۹۶-۴۶۴-۴۶۵
۴۷۴-۴۷۹ تا ۴۸۳-۴۸۴
۵۲۰-۵۳۲
تذکرہ غوثیہ ۲۵۴-۲۵۶
تغلق سلاطین ۵۳-۵۵
تغلق سلطنت ۵۳-۵۶
۸۳
تفسیر بیضاوی ۲۰۷
تقی الدین شیخ ۲۹۷-۲۹۸
۵۰۶
تکملہ سیر الاولیاء ۵۵۰
تکملہ لطائف قدوسی ۴۱۹
تلسی داس سائیں ۵۰۸
تلوک چند راجہ ۱۲۲-۱۲۳

تیغ نامہ ۵۰۰
تیرہ تیزی (مہینہ) ۱۱۲-۱۵۶
تیمور امیر ۵۶-۶۰-۶۱
۷۰-۸۳-۱۴۱-۱۴۴-۱۶۵
۱۹۶-۱۹۸-۲۰۶-۲۱۸
۲۱۹-۲۶۲-۲۶۶-۲۷۵
۲۸۲-۲۸۵-۲۹۰-۳۱۲
۳۱۷-۳۵۱-۳۶۱-۳۷۵-
۳۸۲-۳۹۹-۴۲۹-۵۲۸

(ٹ)

ٹوڑیاں ۷۷-۱۷۴
ٹوڑی سہلی ۵۳۸
ٹوڑی جونپوری ۵۳۸
ٹوڑی حسینی ۵۳۸
ٹوڑی راما ۵۳۸
ٹوڑی رسولی ۵۳۸
ٹھمری ۵۳۷

(ج)

جادو ۹۱-۱۳۷
جام ۵۷
جام نندا ۴۸۳
جان جونپوری ۴۰۵
جائلدہ شیخ ۱۵۲-۳۱۰
جعفر صادق ۴۵۱

جعفر عرف شاہ لاڈ ۳۸۱
جگ دیو ۹۱
جلال الحق قاضی خاں ناصحی ظفر آبادی (بندگی مخدوم) ۱۸۷-۱۹۹
جلال الدین بخاریؒ ۲۷۰-۳۱۱-۳۲۴-۳۳۱-۳۳۴
جلال الدین پانی پتیؒ ۴۱۳-۴۱۴
جلال الدین تبریزیؒ ۲۳۲
جلال الدین تھانیسریؒ ۳۹۹-۴۰۴-۴۰۹
جلال الدین جہانیاں جہاں گشت ۳۲۴
جلال الدین خلجی ۴۲۷
جلال الدین رومیؒ ۳۷۰-۳۷۲-۳۷۴
جلال الدین سرخ پوشؒ ۲۳۳-۲۴۹
جلال الدین صابریؒ ۴۰۵
جلال الدین عثمانؒ بن عمر المشہور ابن الحاجب ۲۰۱
جلال الدین مانکپوریؒ ۳۲۲
جلال الدین محمد سلطان ۹۱-۱۳۷-۱۶۶
جلال خاں ۹۲-۱۲۳
جلالؒ سجادہ نشین ۲۶۵
جلال شہزادہ ۱۰۹
جلال شیخ ۲۶۳
جلالی ۹۷
جمال الدین پانی پتی ۲۲۹
جمال الدین سادا ۴۲۴
جمال الدین شیخ ۲۸۴-۳۵۰-۴۷۵
جمال الدین ہانسویؒ ۲۷۰-۳۱۱-۳۲۴-۳۳۱-۳۳۴
جمال خاں سارنگ ۱۲۷
جمال گوجریؒ ۳۴۹-۴۰۳
جمشید قلندر ۳۷۷
جمن بہاری ۴۴۹
جمیل الدین ۳۷۵
جنیدؒ ۳۸۸
جوالق ۲۳۷-۴۲۲-۴۲۴
جواہر خمسہ ۴۶۴-۴۶۵-۴۶۶-۵۱۸-۵۱۹
جوگا (مجگا) ۱۲۴-۱۷۴
جونپور نامہ (مولوی خیر الدین محمد) ۳۹-۴۰-۴۱-۷۱-۷۲-۷۴ تا ۷۶-۸۵-۸۷-۹۲-۹۴ تا ۹۶-۹۸-۱۱۱-۱۱۲-۱۲۸-۱۵۴-۱۵۵-۱۵۶ تا ۱۵۸-۱۶۴-۱۷۹-۲۶۱-۲۶۲-۵۲۴-۵۴۴-۵۵۱
جہاں آرا ۱۱۱
جہاں دریا آبادیؒ شیخ ۲۸۹
جہانگیر سہروردیؒ شیخ ۱۲۸-۱۶۱-۲۶۵
جہانگیر شہنشاہ ۱۵۱-۳۴۱-۴۶۰
جہانیاں مخدوم ۱۰۵-۱۲۵-۱۴۰-۱۴۳-۲۲۲-۲۳۵-۲۶۰-۲۶۳-۲۷۰-۲۷۱-۲۷۴-۲۷۷-۳۱۷-۳۲۴-۳۲۵-۳۳۱-۳۳۴ تا ۳۳۷-۳۷۶-۳۸۱
جے پال پنڈت ۲۵۵
جے پال جوگی سہروردیؒ ۲۵۵
جے چند ثانی راجہ ۳۵-۸۵
جے دت ۵۰۲
جے دیوان ۵۰۵
جیر شاہ ۳۱۳-۳۱۴
جاین کلپ سوترا ۷۶

(چ)

چاند سہروردیؒ شیخ ۲۴۶
چراغن ۱۰۱
چراغ نور ۳۶-۳۷-۵۹-۱۶۳-۱۷۲-۱۹۰-۲۴۱-

۲۴۸-۲۵۱-۲۵۲-۲۵۵
۲۵۸-۲۵۹-۵۵۶
چشتیہ سلسلہ ۷۳-۹۵-۲۱۸
۲۲۸-۲۲۹-۲۳۶-۲۶۲
۲۷۹-۲۸۲-۲۹۳-۲۹۹-
۳۰۰-۳۰۷-۳۰۹-۳۲۶
۳۳۷-۳۴۱-۳۴۹-۳۸۵
۳۹۴-۴۰۱-۴۲۳-۴۵۹
۴۹۸-۵۳۵
چشتیہ صابریہ ۳۶۰-۳۸۵
۳۹۳-۴۰۴-۴۰۵
چشتیہ مشائخ ۲۲۸
چشتیہ نظامیہ ۳۶۰-۳۹۳
چمپارن ۷۱
چھندا ۵۹۵-۵۰۵-۵۳۶
چندرپال راجہ ۳۵
چندن داس ۵۰۵
چہل روزہ
چیتنا ۵۳۵

(ح)

حاتم سنبھلیؒ ۴۷۵
حافظ جونپوریؒ ۱۶۱-۲۳۰
۴۵۶
حافظ شیرازیؒ ۶۱-۳۵۸
۴۲۳

حسام الدین اندرپتی ۴۲۷
حسام الدین عرف شیخ بڈھن
۱۹۲-۲۲۹-۳۳۸-۳۵۲
حسن المعروف علاء الدین بہمن شاہ
۶۱
حسن بصریؒ ۲۵۰
حسن بن طاہرؒ جونپوری ۲۰۹
۳۰۴-۳۰۵-۳۰۶-۳۰۷
حسن جلال بخاریؒ ۲۴۹
حسن (شیخ) حسام الدین بلخیؒ
۳۱۹ -
حسن خاں (شرقی شہزادہ)
۱۱۴-۱۱۵-۱۱۶
حسن سید ۴۸۰-۵۰۰
حسن طاہر چشتی ۳۲۶-۳۵۳
۳۵۶
حسین اصغرؒ ۳۱۳
حسینؓ امام ۴۷۱
حسین بلگرامیؒ ۳۱۰
حسین بہلول ۱۱۸
حسین خان - ۱۱۵-۱۱۶
حسین خلیفہ مخدوم علاء الحق
۱۳۶
حسین دولقہ ۲۹۶
حسین سید ۳۸۰-۵۰۰
حسین شاہ (سلطان) ۱۱۶

۱۲۱ تا ۱۲۶
حسین شاہ شرقی سلطان
۲۱-۴۰-۷۱-۷۵-۷۶-
۷۷-۱۱۱-۱۱۵-۱۱۸-۱۲۰ تا
۱۲۷ تا ۱۲۹-۱۵۴-۱۵۷-۱۵۸
۱۵۹ تا ۱۶۲-۱۷۲ تا ۱۷۶-
۲۰۷-۲۰۸-۲۱۴-۲۱۵-۲۶۵
۲۹۲-۳۱۹-۳۲۱-۳۳۱-
۴۶۱-۴۷۵ تا ۴۷۷-۴۹۹
۵۱۶-۵۲۰-۵۲۱-۵۳۲
۵۳۳-۵۳۶-۵۳۷ -
۵۳۸ تا ۵۴۰
حسین شریفؒ سید ۳۸۱
حسین عبدالغفور ۳۷۹
حسین قلندر بلخی ۴۲۳
حسین مرزا سلطان ۴۸۲
۴۸۳
حسینی کا نغرہ (راگ) ۵۳۹
حل التراکیب کافیہ ۳۸۲
حلاج قریشی دہلوی ۳۹۱
حمید الدین ناگوریؒ ۲۳۲-
۲۸۰-۲۹۶-۴۱۹
حمید خاں ۱۰۸-۴۶۳
حمید قلندر بلخی ۴۲۵
حوض سردرخاب ۴۸۱
حیات شیخ عبدالحق محدث

دہلوی ۵۸-۵۹-۲۶۷
۲۸۷-۲۹۳-۲۹۴-
۵۵۲
حیدر قلندر ۲۲۳-۲۳۲

(خ)

خاصہ بن شیخ خضر صاحیؒ
۳۹۰-۳۹۱-۳۹۲
خالص مخلص ۱۵۴
خانِ اعظم حاجی ۵۳۰
خان بہادر مولوی فصیح الدین ۸۶
خان جہان ملک مقبول ۵۰
خاندیش ۵۷
خداقلی (شیخ) ماوراء النہریؒ
۴۵۱
خدیجہ بیگم ۳۶۲
خراسان ۴۶
خزانۂ جلالی (کتاب) ۲۲۲
خزینۃ الاصفیاء جلد دوم
۸۵-۱۴۰-۱۴۵-۱۴۹-۱۵۹
۱۷۷-۱۹۸-۲۰۰-۲۰۲-
۲۰۸-۲۱۸ تا ۲۲۰-۲۲۲
۲۲۴-۲۲۹-۲۳۱-۲۵۳
۲۶۱-۲۷۰-۲۷۴ تا ۲۷۸
۲۸۶-۲۸۸ تا ۲۹۰-۲۹۲
۲۹۳-۲۹۶ تا ۳۰۰-۳۰۴
۲۵۲-۲۶۳-۳۷۰-۴۰۴
۴۱۶-۳۰۸-۳۰۹-۳۱۸-
۳۲۰-۳۲۳-۳۲۴-۳۲۹ تا
۳۳۱-۳۳۵ تا ۳۴۰-۳۴۲ تا
۳۴۷-۳۴۹-۳۵۰-۳۵۲ تا
۳۵۴-۳۵۶ تا ۳۵۹-۳۶۶
۳۷۱-۳۷۶-۳۹۴-۳۹۹
۴۰۵ تا ۴۰۷-۴۱۲ تا ۴۱۷-
۴۲۶-۴۲۷-۴۴۱-۴۴۳
۴۴۴-۴۴۶-۴۴۷-۴۷۴
۵۰۶-۵۱۲ تا ۵۱۴-۵۲۵
۵۲۶-۵۳۵-۵۵۱
خضر رومی ۴۲۴-۴۲۵-۴۲۹
خضر خاں ۸۶
خضر علیہ السلام ۳۲۰
۳۲۵-۳۴۴-۳۶۳-۳۸۳
۴۷۴-۵۱۳
خضر مخدوم ۲۶۶
خطِ ثلث ۵۴۲-۵۴۳
خطِ طغرائی ۵۴۴
خطِ نسخ ۵۴۲-۵۴۳
خلاصۃ التواریخ ۴۲۰-۵۵۱
خلاصۃ العیش (قلمی) ۷۷-
۵۳۹-۵۴۰
خلجی ۴۶-۵۳
خلیفۂ مصر ۶۴
خلیق احمد نظامی ۴۸۶-
۴۸۷-۲۴-۲۸۱
خلیل اللہ ۶۲
خواجہ احمد لپوریؒ ۳۶۲-
۳۷۱
خواجہ اویس قرنیؒ ۳۶۳
خواجہ جہاں ۸۲
خواجہ حافظ ۶۱
خواجہ سرور ۵۰
خواجہ مانکپوری ۳۲۲
خواجگی مخدوم ۳۹۱
خواجگی مولانا ۱۹۷ تا ۲۰۰
۲۱۷ تا ۲۱۹-۳۱۷-۳۹۰
۳۹۱-
خواص خاں ۴۱۸
خوندمیر سید میاں ۴۸۲-۴۸۳
۴۹۲-۵۰۰-۵۲۳
خونزہ ملکہ بی بی ۱۱۸-۱۱۹-۱۲۱
۱۲۲
خیالی شاہ ۳۰۸
خیرالدین سوھلدیؒ قاضی ۳۷۵
۳۸۹ تا ۳۹۱
خیرالدین محمد ۲۶۱-۳۷۳
خیراللہ قاضی ۱۰۲
خیرالمجالس ۲۳۳-۲۸۳
۴۲۲-۴۲۴-۵۵۱

(د)

دارا شکوہ ۴۶۵ ـ ۴۶۸
دامودر سواروپ ۵۳۵
دانیال خضریؒ ۱۲۶ ـ ۱۷۶
۳۱۹ تا ۳۲۱ ـ ۴۷۴ ـ ۴۹۸
۵۱۳ ـ ۵۲۰
داؤد شیخ ۳۹۷ ـ ۴۳۱
۴۳۷ ـ ۴۳۸ ـ ۴۳۹
دبیر الملک ۵۳۱
دجّال ۴۶۹ ـ ۴۷۰
دربارِ اکبری ۷۷ ـ ۵۴۱ ـ ۵۵۶
درویش ابی محمد ۲۹۹
درویش کلاں ۲۵۹
دریا خاں ۶۹ ـ ۹۸ ـ ۱۰۸
دریا خاں نوہانی ۱۲۷
ڈھیانہ ٹولہ ۵۴۰
دستور المبتدی ـ (تصنیف)
دکنی شاہوں ۶۷
دلاور خاں ۵۱ ـ ۶۳
دوادش ـ پنتھ ۵۱۰
دولت خاں لودھی ۹۰
دھارا دھر ۵۲
دھرپد راگ ۵۳۶
دھرم داس ۵۱۰
دھولکا

دیوان امیر کوہی ۴۹
دیوان لوہرویؒ ۲۶۸ ـ ۴۷۸
دیو سنگھ راجہ ۹۰ ـ ۱۳۶
۱۶۷
دیو گڑھی (دولت آباد) ۴۸
۴۹ ـ ۵۰ ـ ۵۲

(ذ)

ذکر جمیع الاولیا ۳۰۴
ذوالنون میر ۴۸۳ ـ ۴۸۴

(ر)

راجہ فتالؒ ۲۵۴ ـ ۳۳۱ ـ
۳۳۶ ـ ۳۳۷
راجہ راؤ دلپت ۴۷۶
راجہ رتن سین ۵۲۵ ـ ۵۲۶
راجہ سید ارادت جہاں ۸۱
راجہ شاہ مانک پوریؒ ۳۲۵
راجہ عید سنگھ ۵۲۹
راجہ فاروقی ۵۱
راجہ گوڑ ۷۷
راجہ مان سنگھ گوالیاری ۷۷
راجہ منہیج گڑھ ۲۴۰
راجی سید نورؒ ۳۲۶ ـ ۳۲۷
۳۹۰
رادھا ۵۰۴

(راگ) ادا رنگ ۵۳۸
راگ درپن (قلمی) ۷۷ ـ ۱۲۹
۱۳۰ ـ ۱۷۴ ـ ۵۳۸
راگ خیال ۵۳۶ ـ ۵۳۷
۵۳۸
(راگ) سن رنگ ۵۳۸
راگ ہر رنگ ۵۳۸
راگنی جونپوری ۵۳۸
راما پنڈت ۷۷ ـ ۱۴۵ ـ
۵۳۹
رام چندرجی ۳۸
رام شاہ ۷۷ ـ ۱۷۴ ـ
۵۳۹
رام کبیر ۱۰۱
رام گمند ۵۶۷
رام نند ۵۰۶
رانا کنبھ ۶۳
رائے سنگھ ۱۶۸
رائے سین ۴۶۶
رائے کرن ۱۰۹
رتن (ہندو) ۵۱
رجب علی سپہ سالار (دیکھو سپہ سالار
رجب علی) ۸۱
رجب علی سید ۸۱ ـ ۸۶
رحلتہ ۴۷ ـ ۵۱ ـ ۵۲ ـ ۵۵
۲۳۶ ـ ۵۵۱

رحمان علی مولوی ۳۸۲
ردولی ۳۸۳
رزق اللہ مشتاقیؒ ۱۱۸-
۱۷۶-۴۶۱-۴۶۷-۴۹۸
رسالہ بار امانت ۴۷۸
رسالہ تقسیم علوم ۲۰۲
رسالہ در صنائع ۲۰۲
رسالہ راگ ۵۰۱
رسالہ شطاریہ ۴۶۲
رسالہ عینیہ ۳۱۰
رسالہ قدسیہ ۴۱۹-۵۱۵
رسالہ مطلوب فی عشق المحبوب
۵۸
رسالہ مکیہ ۳۳۱
رستم خاں ۱۱۸-۵۱۷
۵۲۷
رسول خاں ۷۷-۹۸-۱۷۵
۵۳۹
رشد نامہ ۵۱۵-۵۱۹
رضی الدین مولانا ۵۸-۳۸۲
رضی قاضی ۱۴۸-۵۱۷-
۵۲۷
رفیع (درباری شاعر سلطان ابراہیم
شاہ شرقی) ۹۷
رفیق العارفین ملفوظات ۳۲۳
رکن الدین ابوالفتح ۲۳۵-
۲۳۶-۲۶۴
رکن الدین جونپوری ۲۰۴-۲۰۵
رکن الدین سہروردیؒ ۱۴۱
۲۶۲-۲۶۴-۲۶۵
رکن الدین علاؤ الدولہ سمنانیؒ
۲۶۳
رکن الدین قاضی ۱۰۲
رکن الدین گنگوہیؒ ۳۵-۱۷۶-
۱۸۵-۳۳۳-۳۴۱-۳۵۸-
۴۱۹-۴۲۰-۴۷۳-۴۹۸-۱
رکن الدین ملتانیؒ ۲۳۸-۲۳۹
۲۴۷-۲۵۱-۲۶۶-۴۲۰
رکن الدین یک لکھی ۱۸۸-۲۴۶
۲۴۹-۴۳۵
رکمنی پری نتے (ڈرامہ) ۵۰۴
روح اللہ ۴۲۵
رود کوثر ۳۱۰
روزہ (مہینہ) ۱۱۳-۱۵۶
روضۃ الاقطاب ۲۸۰
روضۃ الطاہرین (قلمی) ۸۲
۸۴-۹۲-۱۱۸-۵۵۱
رومی خاں ۶۷
ریاض الاولیاء (قلمی) ۱۴۰-۲۱۷
۲۶۰-۲۶۱-۳۰۷-۳۲۲
تا ۳۲۴-۳۳۷-۳۴۲-۵۳۲-
۵۵۱
ریاض السلاطین ۹۱-۱۳۷-
۱۶۷-۵۵۱

(ز)

زاہد کڑویؒ ۵۹-۲۳۹
زبدۃ التاریخ (قلمی) ۸۱-۸۴
۱۰۷-۱۱۰-۱۱۷-۵۵۱
زبدۃ المحدثین ۱۸۱
زر بخش ۶۶
زغیر خاں ۹۲
زیب النساء ۱۱۱
زین العابدینؒ ملا نظام الدین
علامیؒ ۳۱۳
زینت المصلیٰ ۵۰۱

(س)

سارنگ شیخ ۳۳۱-۳۳۶
تا ۳۳۸-۳۴۰
ساکیت سنگھ راجہ ۳۶-۱۶۳
۲۴۰-۲۴۱-۲۵۱-۲۵۴-۲۵۵
سالار مسعود غازی (سلطان الشہید) ۲۲۱
سالباہن ۱۲۶-۱۷۴
سالونت سنگھ ۹۸-۱۶۸
ساہو حسین ۵۱۶-۵۱۷
سپہ سالار رجب ۸۱
سخا قاضی ۹۷

سدھا جونپوریؒ ۳۸۸
سدھوری قاضی ۳۷۳
سراج الابصار ۴۸۵-۵۵۱
سراج الدین منہاج ۵۴۳
سراج الہدایہ (قلمی) ۲۳۳
سراج سوختہ شیخ ۲۷۷-۲۷۸-۴۴۵-۴۴۶
سراج عفیف ۳۹
سرحلقۂ عارفاں ۳۷۴
سرسید احمد خاں ۳۹۵
سرمایۂ عشرت (قلمی) ۷۷-۱۷۴-۱۷۵-۵۳۷ تا ۵۴۰-۵۵۶
سُرہرپور ۴۲۹
سعدالدین خیرالدین ۲۲۱ تا ۲۲۴
سعدالدین شیخ ۳۴۱
سعدالدین لکھنویؒ ۲۲۵
سعداللہ بجنوریؒ ۲۸۸
سعداللہ خیرآبادی ۲۷۱
سعداللہ شیخؒ (کنڈری فرازؒ) ۲۹۳-۳۴۰-۳۴۱
سعداللہ کیسہ دار ۳۴۲-۳۴۳ تا ۳۴۵
سعدی شیرازی ۵۰۷
سعید جعفری مخدوم ۹۶
سعید صرصری حاجی ۴۶
سفینۃ الاولیاء ۲۹۹-۴۴۱-۴۴۳-۵۳۵-۵۳۶-۵۵۲
سکندر تغلق سلطان ۵۶
سکندر شاہ سلطان (لکھنوتی) ۳۸
سکندر شہزادہ ۱۰۹
سکندر لودھی سلطان ۴۱-۶۶-۷۷-۱۰۰-۱۱۱-۱۱۲-۱۲۳ تا ۱۲۷-۱۴۰-۱۵۹ تا ۱۶۱-۱۶۳-۱۷۴-۲۰۷-۲۰۹-۲۱۰-۲۱۵-۲۱۶-۲۷۲-۳۰۵-۴۱۶ تا ۴۱۸-۴۳۶-۴۶۱-۵۰۶-۵۳۹
سکینت ۱۲۳
سلاطینِ تغلق ۴۰-۴۱-۴۴-۵۷
سلاطینِ جونپور ۷۰-۱۳۰
سلاطین جونپور (قلمی) ۷۴-۷۸-۸۱-۸۴-۸۶-۸۷-۸۹-۹۳ تا ۱۰۶-۱۱۰-۱۱۴-۱۱۶-۱۶۸ تا ۱۷۰
سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات ۵۸-۵۹-۱۶۰-۴۴۸-۴۶۵-۴۶۸-۴۷۳-۴۸۷-۴۹۹-۵۰۰
سلاطینِ شرقی (قلمی) ۸۱-۹۴-۱۱۱-۱۵۵
سلام اللہ سید ۴۷۷
سلسلۂ اشرفیہ ۳۶۰-۳۹۱
سلسلۂ بسطامیہ ۴۵۲
سلسلۂ طیفوریہ ۴۳۳
سلسلۂ علویہ ۴۳۳
سلسلۂ فردوسیہ ۴۵۲-۳۴۹
سلسلۂ مداریہ ۱۴۸-۲۰۰-۲۳۰-۲۵۶-۴۴۱-۴۴۴
سلطان احمد شاہ بہمنی ۴۷۲
سُلطان الشرق ۵۴-۱۳۳
سلطان الشرق ملک سرور ۴۰-۵۳-۷۰-۷۱-۷۲-۸۲-۸۴-۸۶-۸۷-۹۹-۱۰۱-۱۳۱-۱۳۲-۱۳۴-۱۳۵-۱۶۴-۱۶۵-۱۹۴-۱۹۵-۲۷۱-۲۷۲-۵۲۷-۵۳۰-۵۳۳
سلطان المشائخ ۳۳۳
سلطان بہرائچی ۳۵۴ تا ۳۵۶
سلطان حسین مرزا ۴۸۲-۴۸۳
سلطان محمد ۳۳۶-۳۶۴
سلطان محمود ۴۳۶-۴۴۱
سلطان محمود گجراتی ۴۶۴
سلطان ولد ۴۷۰
سلطان مملکت الدنیا والدین ۴۷۴

سلیم شاہ سوری ۴۹۳
سلیمان بن سہرا ۴۷۲
سلیمان شیخ ۳۷۵
سماء الدین ۱۲۱-۱۶۰-۲۱۴-
۲۶۲-۳۴۰-۳۷۲-۳۷۵
۳۸۴
سمرقندیؒ شاہ ۲۲۴
سمن سہروردیؒ ۲۵۶-۲۵۷
سندھ بھیروی (راگ) ۵۲۸
سہروردیہ سلسلہ ۲۳۱-۲۳۷
سہیل خاں ۹۸
سیر الاقطاب ۳۹۳-۳۹۹-
۴۰۵-۵۵۲
سیر الاولیاء ۱۴۸-۱۴۹-۲۲۳-
۲۳۵ تا ۲۳۷-۲۷۹ تا ۲۸۱-
۲۸۲-۲۹۳-۲۹۴-۴۴۴-
۴۴۶-۴۴۷-۵۵۲
سیر المتاخرین (قلمی) ۹۳-۷۰
سیرۃ الاشرف ۳۶۸
سیرت امام مہدی موعود ۴۷۵
تا ۴۷۸-۴۸۱ تا ۴۸۴
سید اسد الدین آفتاب ہندؒ ۳۵
سید حسن عسکری ۸۱-۹۱-
۱۰۱
سید خاں ۳۶۶
سید خضر خاں ۸۱
سید رجب علی ۸۱
سید سالار مسعود غازی ۵۸
سید سلیمان شاہ صوفی
۱۱۳
سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۵۳۶
سید علاء الدین المعروف بہ علی
جاوری ۵۸
سید علی داؤد جونپوری ۱۱۲
۱۱۳
سید گلاب میاں ۴۸۲
سید محمد ۲۳۱
سید محمد جونپوری ۲۲۱-۵۱۳
سید محمود ۷۷-۴۹۲
سید مصطفےٰ تشریف اللہ ۴۸۵
سیدو شاہ ۳۲۳-۴۵۵
۵۳۵
سید یوسف بڈہ اویسی ۴۷۴
سیف الدین حمزہ شاہ ۹۰
سیف الدینؒ شیخ ۳۰۸
سیف خاں نواب ۳۷۲

(ش)

شاہباز سفید ۴۲۷
شاہباز قلندر ۲۳۷
شاہ بدہ شیخ ۳۹۲-۴۰۹
شاہ بیگ ارغون ۴۸۳
شاہجہان (شہنشاہ) ۴۱-۶۸-
۸۰-۱۳۰-۱۷۹-۳۴۷
شاہ داؤد سرمست ۴۳۴
شاہ رخ ۴۷۲
شاہ رومیؒ ۴۲۴-۴۲۵
شاہ مجاز ۴۳۵-۴۲۲
شاہ محمد سہروردی ۲۴۷
شاہ مدار ۹۶-۱۲۸
۱۵۸-۲۷۸-۴۴۵ تا ۴۴۸-
۴۵۰
شاہ موسیٰ عاشقاں ۴۳۹-۴۴۷
شاہ نامہ فردوسی ۶۲
شاہ نعمت اللہ دلی ۴۷۲
شاہ نور نورپوریؒ ۱۸۸
شاہ نور ثانی ۴۲۴
شبلیؒ ۳۸۸
شجاع الملک ۵۳۳
شجرۃ الانوار ۲۷۹-۴۷۴
۵۵۲
شجرہ خاندانی راجہ سید ارادت
جہاں (قلمی) ۸۶-۵۵۷
شرح بیضاوی ۲۰۸
شرح جامی ۲۲۲
شرح رسالہ مکیہ ۲۲۲
شرح صراط المستقیم ۱۶۲
۴۳۱

شرحِ کافیہ ۲۰۲-۲۰۸
۲۰۹-۲۲۲-۲۹۰
شرح مختصر الوقایہ (تصنیف) ۴۲۵
شرحِ مدارک ۲۰۸
شرحِ مصباح ۲۲۲
شرحِ میزان المنطق ۲۱۰
شرحِ ہدایہ ۲۰۸-۲۰۹
شرحِ ہندی ۲۰۴-۲۰۵
شرف الدین بو علی قلندرؒ ۴۲۳
۴۲۶
شرف الدین لاہوری ۱۳۲
شرف الدین یحیٰی منیریؒ ۵۹
۱۹۴-۲۴۹-۳۶۹
شرقی سلاطین ۲۲۸-۲۸۲
شطاریہ سلسلہ ۴۳-۱۴۹-۱۶۱
۱۷۵-۲۳۰-۳۳۲-۳۵۵-
۴۵۱-۴۵۴-۴۵۶-۴۶۰-
۴۹۸-۴۹۹-۵۱۶-۵۱۸
۵۱۹
شطاری صوفیا ۴۵۲-۴۵۳
شمس الحق بدہ حقانی جونپوریؒ
۲۹۳-۲۹۴-۳۰۱-۳۰۴-
۵۳۳
شمس الحق بڈھن ۱۸۶-۲۵۴
شمس الحق بشیخ ڑے ناصحی

۱۸۷-۲۵۴-۲۵۵-۲۹۵
شمس الدین (معمار) ۱۰۱
شمس الدین احمد شاہ ۹۲-۱۰۶
۱۳۷-۱۴۰
شمس الدین التمش سلطان ۴۲-
۲۳۳-۲۸۰-۳۲۴
شمس الدین بنگالی ۱۵۲
شمس الدین تبریزیؒ ۴۲۳
شمس الدین ترک ۳۹۳-۴۲۳
شمس الدین سید ۴۸۰
شمس الدین شیخ ۲۶۵
شمس الدین صدیقی اودھی
۳۷۲-۳۷۵-۳۷۶-۳۸۹-
۳۹۱
شمس الدین صدیقی فریادرس
۳۸۷-۳۸۸
شمس الدین غازیؒ ۲۴۵-۳۲۴
شمس الدین قاضی ۵۳۱-۵۸
شمس الدین مکیؒ ۲۲۴
شمس خاتون ۱۱۵
شمس سراج عفیف ۵۳
شمس ملک ۱۱۸
شمعون ملک ۱۹۶-۲۷۶
شیخ ابن حجر ۴۷۰
شیخ احمد ۲۹۶
شیخ احمد خضری ۳۲۱

شیخ احمد فیاض امیٹھوی ۳۹۲
شیخ احمد یحییٰ ۲۹۴
شیخ اسماعیل ۳۸۲
شیخ الاسلام ۲۱۹-۲۲۵-
۲۳۳-۳۸۹-۴۸۴-۵۱۹
شیخ الاسلام گجراتی ۳۷۵-۳۷۶
شیخ بدر الملک ۵۲۳
شیخ بدہ حقانی ۳۰۴
شیخ بہاء الدین نتھو جونپوریؒ
۴۹۸
شیخ پیر بڈھن ۵۳۹
شیخ پیر ک ۴۳۴
شیخ پیر میرٹھی ۴۶۰
شیخ جانیلاہ ۱۰۷
شیخ حبیب اللہ عرف
مخدوم منجھن ۴۱۵
شیخ حمید الدین ۳۹۶
شیخ خیر الدین سدھوری ۲۹۱
شیخ رکن الدین ۲۹۶
شیخ سعدیؒ ۱۹۹-۲۲۵
۲۴۳-۲۷۶
شیخ شرف الدین یحییٰ منیری
۳۴۹
شیخ صدھا ۳۹۱
شیخ عبد الحق محدث ۳۲۸
شیخ عبد الرحمٰن چشتی ۲۲۵-

۳۴۵-۴۴۲-۴۴۷-۴۶۲
شیخ عبدالصمد ۴۱۴
شیخ عبدالقدوس ۳۹۶
شیخ عبدالمجید ۳۹۶
شیخ عبدالملک ۵۲۳
شیخ عبدالنبی ۳۹۶
شیخ عزیزاللہ ۴۱۵
شیخ علائی ۴۹۳
شیخ علی متقی ۴۶۴-۴۶۵-۴۷
شیخ فیروز ۲۱
شیخ کالوؒ ۳۲۳
شیخ کبیر ۳۸۷
شیخ محمدؒ ۱۴۱-۱۴۲
شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی
۴۷۴-۴۷۹-۴۸۰
شیخ محمد عرف شیخ قاضی ۲۲۵
شیخ محمد عیسیٰ ۲۹۴
شیخ محمد غوثی شطاری ۴۶۷
۴۶۳-۵۱۹
شیخ محمد غوث گوالیاری
۴۶۴
شیخ مسکن مخدوم ۲۶۴
شیخ نظام الدین ۳۴۲
شیخ نور قطب عالم ۳۹۵
شیخ وجیہ الدین گجراتی
۴۶۴

شنکراچاریہ ۱۷۲
شہاب الدین (علامہ)
ابن حجر مکی ۶۷
شہاب الدین احمد بن محمد
۱۳۹-۲۱۱
شہاب الدین بایزید ۹۰
شہاب الدین دولت آبادی
(قاضی) ۱۰۲-۱۳۲-۱۳۷ تا
۱۳۹-۱۴۱-۱۴۴-۱۴۵-
۱۴۰-۱۰۰-۱۷۸-۱۸۴-
۱۸۵-۱۹۶-۱۹۸ تا ۲۰۹-
۲۰۸-۲۱۲-۲۱۸-۲۶۱-
۲۶۴-۲۸۷-۲۹۰-۳۶۷
۳۷۵-۳۸۲-۴۴۶-۴۵۴
۵۲۸-۵۳۰-۵۳۱-۵۴۲
تا ۵۴۴
شہاب الدین سلطان ۳۵
شہاب الدین سہروردی ۲۲۱
تا ۲۲۳-۲۲۴-۲۲۵
شہاب الدین قاضی ۴۳-
۹۶-۹۷-۱۴۶
شہاب الدین قدوائی ۴۴۴-
۴۴۷
شہاب الدین محمد غوری سلطان
۵۸
شہ قاضی ۲۸۸-۳۲۴

۳۲۷
شہباز قلندر ۲۳۷-۴۲۷
شہر اللہ سہروردیؒ ۲۵۴
شہید نفس ۲۰۶
شیام (راگ) ۷۷
شیام براری ۵۳۸
شیام بسنت ۵۳۸
شیام بھوپال ۵۳۸
شیام پوربی ۵۳۸
شیام رام ۵۳۸
شیام کیرانی ۵۳۸
شیام کھنبیر ۵۳۸
شیام گود ۵۳۸
شیام گونڈ ۵۳۸
شیام ملار ۵۳۸
شیام میگھ ۵۳۸
شیام ہوہو ۵۳۸
شیرشاہ سوری ۱۲۷-۴۶۴
۴۶۶-۵۱۹-۴۳۵-
۵۲۵
شیو پرشاد راجہ ۱۷۱
شیوسنگھ ۱۴۳-۱۶۷
۱۷۲-۵۰۲

(ص)

صابریہ سلسلہ ۷۳ - ۹۵
-۱۴۷-۲۲۹-۳۹۴-۳۹۵-
۴۰۰-۴۱۷-۴۱۹-۴۹۸
صباح الدین عبدالرحمٰن سید
۵۲۶
صبح صادق ۱۰۱-۵۵۲
صبح گلشن ۱۷۶
صدرالدین اجمل ۱۴۰-۱۴۸-
۱۴۹-۲۶۰-۴۴۶
صدرالدین چراغِ ہند ۱۸۵
۱۸۶-۲۲۸-۲۳۸-۲۴۱
۲۵۰ تا ۲۵۸-۲۶۹-۲۷۰
۲۷۳-۳۶۶-۳۸۶-۳۸۷-
۴۳۵-۵۴۲
صدرالدین حکیمؒ ۳۴۸
صدرالدین راجو بخاریؒ ۲۹۵
صدرالدین شیخ ۲۹۴ -
۳۳۵
صدرالدین شیخ نابت مداری
۴۴۸-۴۴۹
صدرالدین عارف شیخ ۲۲۴
۲۳۵-۳۰۳
صدرالدین مخدوم شاہ سید
۵۹-۳۱۵-۳۱۶

صدرالدین مکیؒ ۲۴۴-۲۴۵
صدر جہاں اجمل سید ۹۶-
۲۶۱-۲۶۲-۴۴۴-۵۳۲
۵۴۴
صدھا شیخؒ ۳۹۰-۳۹۱
صراط المستقیم (شرح قصیدہ
کبریٰ) ۱۶۲-۴۳۱
صحائف الطریقہ ۲۹۷-۲۹۸
۴۹۸-۵۰۸-۵۱۲-۵۱۳-
۵۵۲
صفی الدین ۳۸۲
صفی الدین صفیؒ ۳۷۲-۳۷۵
۳۸۲-۳۸۳-۳۸۴-۴۱۵
صفی جونپوریؒ مولانا ۴۱-۴۳
صفی سائیں پوری شیخ ۲۲۱-۲۲۳
صفی لکھنوی مولانا ۴۲-۴۳
۱۲۸-۱۳۸-۱۵۹-۱۹۹
۲۰۶-۲۰۷
صلاح الدین قاضی ۱۰۲-۱۶۰
۲۱۳
صمصام الدولہ ۶۸

(ض)

ضیاءالدین برنی ۴۹-۵۱
۲۳۵
ضیاءالدین رومیؒ ۲۳۲
ضیاءالدین زاہد کڑویؒ ۲۲۹
ضیاءالدین محمد سہروردیؒ ۲۵۸
ضیاءالدین مخدوم ۵۹
ضیاءالدین کرمانی ۲۲۴
ضیاء لکھنوی ۲۲۴

(ط)

طاہر حسن چشتی شیخؒ ۲۹۳
طاہر شیخ ۳۰۴
طبقات اکبری جلد سوم ۵۱
۶۱-۷۱-۷۲-۷۴-۷۵-
۸۱ تا ۸۳-۸۶-۸۷-۹۰
۹۱-۹۲-۱۰۷ تا ۱۱۰-۱۱۴
تا ۱۲۷-۱۲۸-۱۳۱-۱۵۲-
۱۶۱-۱۶۴-۱۶۷-۱۷۳ تا
۱۷۶-۲۱۴-۲۱۵-۴۷۷
۵۳۱-۵۳۳-۴۹۷-۵۵۲
طبقاتِ ناصری ۹۳-۲۸۰
۵۵۲
طبقاتِ شاہجہانی (قلمی) ۱۶۱-
۴۵۴-۴۵۹-۵۴۰-۵۵۲
طغی ملک ۵۳
طہماسیاں ۱۷۶-۴۷۸-۴۹۸
طہماسپ صفوی ۱۷۹-۴۸۴

(ظ)

ظفرالوالہ ۶۱-۶۲-۶۷
۶۹-۵۵۲
ظفرخاں ۲۴۱
ظفرخاں شہزادہ ۳۵ تا ۳۷
۵۱-۶۵-۱۶۳-۱۹۱-۲۴۱-۲۵۱
ظہیرالدین مولانا ۳۱۷
ظہور حاجی ۴۶۳

(ع)

عادل شاہ فاروقی ۶۳
عادل شاہی سلطنت ۶۲
عادل شیخ ۱۴۱-۲۶۴
عارفؒ شیر سوار شیخ ۳۱۱
عارف شیخ ۴۰۶-۴۰۷-۴۱۶
۵۱۴-۲۸۱-۳۹۵
عالم سہروردی شیخ ۲۴۶
عالم مداریؒ ۴۴۷
عباس خلیفہ زادہ غیاث الدین
۴۶
عباس خلیفہ مصر ۴۶
عباس صفویؒ ۴۷۳
عباس علمدار ۵۲۷
عبدالاحد شیخ ۳۹۶-۴۲۰-
۴۲۱
عبدالاول (سید) محشی ۲۱۳
عبدالحیؒ چشتی جونپوریؒ ۳۰۰
عبدالحی مولانا ۶۹-۲۰۳
۲۸۴-۲۸۵
عبدالحق محدث دہلوی (شیخ)
۲۱-۱۶۱-۱۹۶-۱۹۷-۲۱۷
۲۲۰-۲۶۱-۲۷۷-۲۸۶-۲۸۷
۲۹۰-۲۹۲-۲۹۶-۲۹۹-
۳۰۲-۳۰۷ تا ۳۱۰-۳۱۵-
۳۱۸-۳۲۳-۳۲۸-۳۳۲
۳۳۸-۳۴۸-۳۵۰-۳۵۴
۳۵۵-۳۵۷-۳۷۰-۳۹۳
۴۰۱-۴۰۳-۴۰۶-۴۰۷-
۴۲۵-۴۲۹-۴۳۸-۴۴۴-
۴۴۵-۴۵۷-۴۵۹-۴۶۱-
۴۶۲-۴۹۳-۴۹۸-۵۱۴
عبدالحق مولوی ۴۶۵-۴۹۵
۵۲۱-۵۲۲
عبدالرحمٰن بن عوفؓ ۴۴۳
عبدالرحمٰن جامی ۲۰۱
عبدالرحمٰن چشتی ۱۳۵-۲۷۱
۲۸۴-۲۸۵-۲۹۴-۳۲۴
۳۲۷-۳۳۵-۳۸۵-۳۸۶
۳۹۱-۳۹۲-۴۰۱-۴۰۹-۴۱۰
۴۲۳-۴۴۷-۴۸۶
عبدالرحمٰن چشتی (شیخ) ۳۴۵
۳۴۷-۳۵۱-۳۵۲-۳۷۰-
۳۸۱-۴۳۹-۴۴۲-۴۴۳
۴۴۵-۴۴۷-۴۵۱-۴۵۹
۴۶۲-۳۲۵
عبدالرحمٰن الخجندی ۳۷۶
عبدالرحمٰن قدوائی ۴۰۹
عبدالرحمٰن گویا ۵۴۰
عبدالرحمٰن لاہرپوری ۴۲۹-۴۳۵
تا ۴۳۷
عبدالرحمٰن مغل ۷۷
عبدالرزاق الملقب نورالعین
۳۷۶
عبدالرزاق بن مخدوم خاصہ
خدا ۴۳۶
عبدالرزاق حاجی ۳۷۸
۳۷۹ تا ۳۸۱
عبدالرزاق خان خوانی نواب
۶۸
عبدالرزاق شاہ ۳۵۳
۳۶۱-۳۷۹-۳۹۲
عبدالرزاق کاشانی ۳۷۱
عبدالرشید دیوان ۴۳۶
عبدالستار سہارن پوری ۳۹۶
۴۲۰
عبدالسلام شاہ ۴۳۶
عبدالسلام شیخ ہردوئیؒ ۳۷۶

عبدالسلام قلندر ۴۳۵-۴۳۶
عبدالصمدؒ ۱۴۰-۲۱۵-۲۱۶
عبدالصمد شیخ ۴۱۵
عبدالعزیز شیخ ۳۰۷-۳۰۸
۳۱۰-۳۳۲-۳۴۳-۳۵۷
عبدالعزیز کیرانوی ۳۹۶
۴۲۰-۴۲۳
عبدالغفار ۲۷۳-۲۷۴
عبدالغفور اعظم پوریؒ ۳۹۶
۴۰۴-۴۲۰
عبدالغفور صدیقی ۴۶۷
عبدالغنی بدایونی ۳۱۰
عبدالقادر بدایونی (ملا)
۸۷-۴۲۰-۴۸۵-۵۲۳
عبدالقادر جیلانیؒ سید ۲۲۱-
۳۷۱-۳۷۹
عبدالقادر حضری ۹۸
عبدالقادر شاہ ۳۱۳-۳۱۴
عبدالقادر صابون گر ۳۲۰
عبدالقدوس شیخ ۴۳۶-۴۳۷
عبدالقدوس شیخ گنگوہیؒ
۱۷۶-۳۳۳-۳۸۴-۳۸۵
۳۹۵-۳۹۶-۴۰۴-۴۰۷
تا ۴۰۹-۴۱۵-۴۱۷ تا ۴۲۰
۴۹۸-۵۱۴
عبدالکریم قدوائی ۲۸۹

عبداللہ انصاری ۲۶۲-۲۸۹
عبداللہ بنارسی ۳۷۵
عبداللہ بیگ ۲۴۲
عبداللہ تلنبی ۲۱۰
عبداللہ جونپوریؒ ۴۳۲
عبداللہ دہلوی ۳۳۲
عبداللہ سید ۹۸-۲۰۸
۲۱۰
عبداللہ شطاریؒ ۷۳-۱۴۹
تا ۱۵۱-۲۲۰-۴۳۰-۴۳۷-
۴۳۸-۴۵۰-۴۵۲ تا ۴۵۵
۴۵۸-۴۵۹-۴۶۱
عبداللہ شیخ ۳۵۸
۴۷۴
عبداللہ قاضی خیرالدین ۵۱۹
عبداللہ مکیؒ عرف عبدالعزیز
مکی ۴۲۴
عبداللہ نیازی ۳۹۳
عبدالملک عادل جونپوریؒ ۲۰۸
عبدالمجید شیخ ۴۱۹
عبدالمحمدؒ ۵۰۰
عبدالمقتدر دہلوی قاضی ۱۳۹
۱۴۳-۱۴۴-۱۶۶-۱۷۷-۱۹۵
۱۹۷-۱۹۸-۲۱۵-۲۱۶-۲۲۹
۲۸۴-۲۸۶ تا ۲۸۸-۳۵۱
-۳۸۲

عبدالملک شیخ ۵۲۴-۵۲۳
عبدالملک عادل فاروقی ۲۰۴
۲۰۵
عبدالمومن میاں ۵۰۰
عبدالنبی شیخ ۳۹۵-۴۲۰
عبدالواحدؒ ۱۴۰-۲۱۵
عبدالواحد شیخ ۲۲۹
عبدالوحید بلگرامی ۴۹۶
عبدالوہاب سید ۳۷۵
عبدالوہاب شیخ ۲۸۷-۲۸۸-۳۰۷
عثمان سید ۳۷۵-۴۱۰
عثمان شیرازی ۱۵۴-۲۱۲
۵۳۴
عثمان صالحؒ ۱۹۵
عجائب الاسفار (اردو ترجمہ
رحلۃ) ۴۷-۵۳-۵۵-۵۷
عرشی (درباری شاعر سلطان
ابراہیم شرقی) ۹۷
عزالدین عبدالعزیز زمزی
۶۷-۳۲۵
عزیزاللہ تلنبی ۲۱۰-۳۸۵
عزیزاللہ شیخ ۴۱۵
علاءالدولہ سمنانیؒ ۳۶۳
علاءالحق شیخ ۹۹-۲۲۹
۳۲۴-۳۶۱-۳۶۴-
۳۶۵-۳۸۶

علاءالدین اجودھنیؒ ۳۵۴
علاءالدین اودھیؒ ۲۸۸
علاءالدین بیدری ۵۲۲
علاءالدین حسین شاہ ۱۲۶
۵۱۶
علاءالدین خلجی سلطان ۴۵
۵۳-۵۶-۲۷۴-۳۹۷
علاءالدین سکندر شاہ ۸۲
علاءالدین سید ۴۲۷
علاءالدین شہزاد ۳۹
علاءالدین شیخ ۳۴۳ -
۳۵۶-۳۹۳
علاءالدین عالم شاہ ۱۰۸
۱۲۰
علاءالدین عطاءالملک شرقی
۲۰۵-۵۲۶
علاءالدین علی احمد صابر ۴۲۲
علاءالدین علاءالحقؒ ۳۶۳
تا ۳۶۵-۳۷۸-۳۸۶
علاءالدین کنتوری ۴۶۷
علاءالدین لاجوری ۲۱۳
۵۲۵
علاءالدین لاہوری ۳۷۶
علاءالدین مالویؒ ۳۳۱
علائی شیخ ۴۹۳
علم الدین بلادن سہروردیؒ
۱۴۳-۱۶۶-۲۷۴-۲۷۵
علم الدین جانسیؒ ۲۷۵
علم الدین سید ۲۷۶
(حضرت) علیؓ ۳۶۶-۳۷۱
علی احمد صابرؒ ۲۸۱-۳۹۳
۳۹۴
علی بازو شیخ ۳۹۰-۴۲۰
علی حلبی ۴۴۲
علی داؤد ۱۵۵-۵۴۴
علی داؤد سید مخدوم ۳۱۳
۳۱۴
علی عاشقاں سرائے میریؒ ۲۹۹
۳۵۸
علی قوام ۴۶۲
علی قوام چشتیؒ ۳۱۷
علی قوام سید ۲۹۸
علی قوام نظام آبادی ۴۳۶
علی متقی ۴۷۵-۴۹۳
علی محمد میاں ۵۰۰
علی ہمدانی میر سید ۳۷۰
عماد الدین ۵۹
عماد الملک بختیار خاں ۸۴
۲۰۴-۲۰۵-۵۳۰
عماد الملک قاضی ۲۶۳
۲۵۶-۵۲۳
عماد شاہ ۴۳۱-۶۷
عماد شاہی سلطنت ۶۲
عمر الزدالی ۱۹۷
عمر خاں ۴۱-۱۱۱-۱۲۴
عمر شیخ ۲۹۷-۴۲۰
(حضرت عمر فاروقؓ) ۳۰۱
۳۱۹-۳۹۷-۴۲۹
عنایت حسین بلگرامی ۴۴۱
عوارف المعارف ۱۸۳
۲۲۰-۲۲۴-۲۳۱-۵۱۵
۵۵۲
عید ۱۱۳-۱۵۶-۱۷۴
عید سنگھ ۲۷
عیسیٰ تاج چشتیؒ ۲۶۵
عین الدین قتال شیخ ۳۴۴
۳۴۵

(غ)

غازی نامہ مسعود ۴۴۱-۵۵۷
غایۃ التحقیق ۳۸۲
غرابت نگار ۹۶
غرائب الفوائد ۴۱۹-۵۱۵
غز (ایک قبیلہ) ۲۲۲
غلام الدین ۳۷۳
غلام رکن الدین رکن عالمؒ
۱۵۳-۲۵۵
غلام سرور مفتی لاہوری ۳۲۰

۲۳۹-۳۷۰-۴۱۶-۴۸۵
غوث الاعظم عبدالقادر جیلانی
۳۵۳
غوث الثقلین حضرت ۳۷۱
غوث الوقت ۳۷۴
غوث گوالیاری ۴۶۲-۴۹۹
غوثی شطاری ۴۶۷-۵۲۴
غیاث الدین ابو محمد درویش
کلال ۲۵۸
غیاث الدین بلبن ۴۴-۳۹۴
غیاث الدین تغلق ثانی ۵۶
غیاث الدین تغلق سلطان
۳۵-۳۶-۵۰-۵۹-۸۱
۱۶۲
غیاث الدین خلجی (والیٔ مالوہ)
۱۵۱-۴۵۸-۴۷۷-۴۷۸
غیاث الدین سلطان (والیٔ
مالوہ) ۶۴

(ف)

(حضرت) فاروقؓ ۲۶۶
فاطمہ ۲۶۳
فاطمیوں (فاطمی حکمرانِ مصر
۴۷۱-۴۷۲
فتاویٰ ابراہیم شاہی (کتاب)
۲۰۲
فتح اللہ اودھیؒ ۱۴۴-۲۹۰
۲۹۳-۳۴۸
فتح اللہ حقانی قادری جونپوریؒ
۲۹۴
فتح اللہ راجگیریؒ ۲۷۳
فتح قلندر ۴۳۷
فتح قلندر قلندر پوریؒ ۱۸۹
فتوحات فیروز شاہی ۴۷۳
۵۵۲
فتوح السلاطین ۲۷۹-۲۸۰
۵۵۲
فخرالدین ۳۸۲-۴۲۳
۴۴۹
فخرالدین بجنوریؒ ۲۸۸
۳۴۱-۳۷۵
فراز لکھنوی ۲۲۵
فراق نامہ (مثنوی) ۵۲۴
فرانز بانگہ ۴۲۴
فراہی ۹۰-۱۵-۸۶
فرائض سراجی ۲۱۴
فردوسی ۶۲
فردوسیہ سلسلہ ۵۹
فرزدق (عربی شاعر) ۴۷۱
فرشتہ محمد قاسم ہندو شاہ
۵۲-۷۹-۹۳-۱۱۰-۲۰۴
فرعون ۳۶۷
فریدالدین شکر گنجؒ ۲۸۰-۳۷۱
۲۹۳-۴۲۳
فریدالدین عطار ۵۰۷-۵۲۶
۵۲۸
فرید جونپوری شیخؒ ۲۹۳
۳۴۱
فرید سید ۲۸۰-۲۸۱
فصوص الحکم (تصنیف) ۱۸۳
۲۴۹-۲۶۷-۳۰۴-۳۱۹
۵۱۵
فضل اللہ دہلوی عرف شیخ
منجھوؒ ۳۰۶-۳۰۸
فضل اللہ سید ۶۴-۴۳۱
فضل اللہ مداری ۴۴۹
فوائد الفواد ۲۳۲-۲۳۳
۲۳۶-۲۳۷-۲۸۰-۲۸۳
۵۵۳
فیروزہ خانم ۱۱۳
فیروز شاہ تغلق سلطان ۳۵
۳۷-۳۸-۳۹-۵۰ تا ۵۴
۵۹-۷۱-۸۴
فیض الباری ۲۱۴
فیض عام (مثنوی) ۵۰۰
فیوض الابرار (قلمی) ۲۰۶
۳۱۷

(ق)

قادرشاہ ۹۰-۹۱-۹۲
۱۳۷-۱۴۵-۲۷۷-۲۷۸
قادریہ مشائخ ۳۵۴
قاسم برید ۴۷۹
قاسم علی ۱۰۱-۴۷۴
قاضن بنگالی ۲۳۰-۴۶۱
۴۶۲-۴۶۵-۴۸۳
قاضی القضاۃ ۱۰۲-۱۹۹
۲۱۲-۲۶۴
قاضی تاج الدین ابراہیم ناصحی ۱۸۶
قاضیؒ جونپور ۲۱۱-۲۱۳
قاضی حمید الدین ناگوریؒ ۲۳۲
قاضی شمس الدین ۴۳۱
قاضی شیخ ۲۲۵-۴۶۲
قاضی صلاح ۲۱۳
قاضی عبدالمقتدر ۱۳۲
۲۲۹
قاضی علاء الدین ۴۷۹-۴۸۰
قاضی مبارکؒ گوپامویؒ
قاضی محمد سدھوریؒ ۳۷۳
قاضی محمود کنتوریؒ ۴۴۳-۴۴۴
قاضی منتخب ۴۷۹
قتلغ خاں ۱۲۱-۱۶۰
۲۱۴-۵۳۳

قدن شیخ ۴۶۱
قدوؒ میاں ۴۰۵
قدوۃ الکبریٰ ۲۷۳
قرآن مجید ۱۸۶-۱۹۲
۲۰۱-۲۲۱-۳۲۲-۵۲۳
قرنفل ملک ۸۶
قصیدۂ کبریٰ ۱۶۲-۴۳۱
قطب الدین الکوا لغیب
۲۴۴-۲۵۰
قطب الدین بختیار کاکیؒ خواجہ
۵۹-۱۱۹-۲۱۶-۲۸۰-
۲۸۱-۲۳۳-۴۲۳ تا ۴۲۷
قطب الدین بینائے دل قلندرؒ
۷۳-۱۶۱-۱۸۸-۲۳۰-
۴۲۵-۴۲۸ تا ۴۳۷
قطب الدین چشتی جونپوری
۳۰۰-۳۳۹
قطب الدین سید ۱۸۴
۲۵۰-۳۱۱-۴۰۹
قطب بندگی شیخ ۳۰۱
قطب خاں ۱۱۴
قطب خاں لودھی ۱۰۹
۱۲۰-۱۲۳-۱۶۰-۲۱۵
قطب شاہی سلطنت ۶۲
قطب عالم شیخ ۳۱۰
قطب علی قطبن شیخ

۷۶-۱۶۲
۱۷۶-۴۹۹-۵۱۶
قطب منیریؒ ۴۳۱
قطب میاں ۵۰۰
قلندریہ سلسلہ ۴۳-۷۳-۲۳۰-
۴۲۲-۴۲۴-۴۲۵-۴۲۷
۴۲۸-۴۲۹-۴۳۰-۴۳۲
۴۳۴-۴۳۶
قمرالدین عراقی شیخ ۳۷۰
قوام الدین چشتی سہروردیؒ
۳۳۴-۳۳۵-۳۳۷ تا
۳۳۹
قوام الدین لکھنویؒ ۴۴۴
قیام الدین سہروردیؒ ۲۴۸
۲۵۳
قیام الدین شیخ ۳۴۱-۳۷۵
قیام الدین ظفرآبادی ملا ۱۸۳

(ک)

کاظمین ۳۷۱
کافور ملک ۵۳
کبیر بانی ۵۰۷
کبیر پر پنچھے کی ساکھی ۵۰۷
کبیر پنجی ۵۰۷
کبیرداس۔شاہ کبیر ۵۱۰
کبیر دانی ۵۱۰

کبیر سہر پوری شیخ ۳۶۷
۳۸۶ - ۳۸۸
کبیر سہروردی شاہ ۲۶۵
کبیر (شیخ) ۳۸۷
کبیر گوشتی ۵۰۷
کپی لیندلیو ۱۱۷ - ۱۷۲
کتاب الہدایہ ۲۰۷
کدار بیر ۳۸
کرخی معروف ۳۷۱
کرشن جی ۴۹۵ - ۵۰۴
کرشنا بھگتی ۴۹۵ - ۵۰۵
کرن رائے ۱۱۸
کریم شیخ ۱۲۸
کلمۃ الصادقین ۵۵۳
کلمۂ طیبہ ۵۴۵
کلید مخزن ۴۶۴
کمال (شاعر عہد سلطان ابراہیم)
۹۷ - ۳۷۳ - ۴۹۶ - ۵۱۱
کمال الدین عارف کالو شاہ ۳۲۲
۳۵۴
کمال الدین علی شاہ ۲۵۰
کمال الدین یمنی ۲۳۳
کمال (بابا) پنڈت ۳۷۲
کمال جائسی ۳۷۵
کمالی ۵۱۱
کعب ابن زہیر رض ۲۰۲

کندوری فراز شیخ سعد اللہ ۳۴۱
کندو ملک ۱۲۶
کنز التوحید ۴۶۴
کنس راجہ ۹۰ - ۹۱ - ۱۳۶ -
۱۳۷ - ۱۶۶ - ۱۶۷
کہزا نامہ ۵۲۵
کیرت سنگھ راجہ ۱۲۱
کیرتی سنگھ راجہ ۹۰ - ۱۶۷
۱۷۳ - ۵۰۳ - ۵۳۹
کیرتی لتا (تصنیف) ۹۰
۱۶۷ - ۱۶۹ - ۴۹۵ - ۵۰۲
۵۰۴ - ۵۵۸

(گ)

گج راج راجہ ۹۱ - ۱۶۷
گدڑی شیخ ۴۶۴
گرنتھ صاحب ۵۰۸ - ۵۰۹
گزیٹر جونپور ۲۴۱
گلاب میاں سید ۴۸۲
گلبدن بیگم ۱۱۱ - ۱۱۳
گلبدن پارچہ ۱۱۳
گلزار ابرار ۱۵۰ - ۱۵۱ - ۱۶۱
۲۰۱ - ۲۱۴ - ۲۱۵ - ۲۹۴ - ۳۱۷
۳۲۳ - ۳۵۴ - ۴۲۵ - ۴۴۱
۴۵۲ - ۴۶۳ - ۴۶۷ - ۴۵۹ -
۴۶۱ - ۴۶۴ - ۴۹۳ - ۵۰۰

۵۰۱ - ۵۱۸ - ۵۲۳ - ۵۲۴
۵۳۹ - ۵۵۳ - ۵۱۶
گن پتی ٹھاکر ۵۰۲
گنج ارشدی ۲۹۲
گنج رشیدی ۲۱۰
گنج شہدا ۵۰۰
گندھروا ۷۷
۱۲۹ - ۱۷۴ - ۵۳۶
گورو نانک ۵۰۷
گوشا ہیں سید ۲۴۴ - ۴۳۱
گوہر ملک ۴۸۰

(ل)

لاڈلی بیگم ۱۱۲
لاڈن میاں ۳۳۲
لسان العرب ۴۷۰
لطائف اشرفی ۴۴ - ۹۳
۱۴۶ - ۱۴۷ - ۱۶۵ - ۲۰۰ - ۳۶۲
۳۶۴ تا ۳۷۰ - ۳۷۲ - ۳۷۷ تا
۳۸۷ - ۳۸۸ - ۳۷۸ -
۴۴۱ - ۴۴۲ - ۴۵۲ - ۴۵۳
لطائف غیبیہ ۴۵۸
لطائف قدوسی ۱۷۶
۲۰۱ - ۳۹۵ - ۵۱۵ - ۵۵۳
لطف اللہ مخدوم بندگی شاہ ۳۱۴
لکھہ بخش ۶۶

لودھن برہمن ۱۷۶-۴۹۲
لوتی .. ۵۱۰
لہناوت (لہناوتی) ۵۲۵

(م)

مآثر الامرا ۶۸-۵۵۳
مآثر الکرام ۱۹۷-۱۹۸-
۲۰۲-۲۰۳-۲۰۸-۲۲۱-
۲۲۲-۵۵۳
مآثر رحیمی ۱۰۷-۱۰۹-۱۱۸
۵۵۳
مان تنوار راجہ ۵۳۶
مان سنگھ ۵۳۹
مان سنگھ گوالیاری (راجہ)
۷۷-۱۱۷-۱۶۲-۱۷۴-
۵۴۰
مان کوتوحل ۵۳۹
ماہردیہ سادات ۲۸۹
مبارز خاں ۴۲۶
مبارک بجنوری شیخ ۳۲۶
مبارک بنارسی ۲۹۳-۲۹۵
۲۹۸-۳۰۱
مبارک خاں جرنیل ۱۲۵
مبارک خاں نوہانی ۱۲۲
۱۲۳-۱۲۶
(شیخ) مبارک سندیلوی ۲۲۲

مبارک شاہ ۸۶-۸۷
۹۱-۹۲-۹۹-۱۰۹-۱۳۳
مبارک شاہ شرقی سلطان ۸۱
۷۱-۷۲-۸۵-۸۸-۸۹
۱۳۵-۱۶۵-۵۲۷
مبارک گوپاموی (قاضی) ۳۹۲
(شاہ) ستا مانڈوی ۴۴۷
(شاہ) مجاز قلندر ۴۲۲
مجدد الف ثانی ۲۹۷-۴۲۱
محمد آب کش (شیخ) ۲۸۹
محمد ابراہیم سید حکیم ۳۶۲
۵۴۲-۵۴۳
محمد بدھ (تصنیف) ۵۰۷
محمد بن الحنفیہ ۴۷۱
محمد بن تغلق سلطان / محمد بن تغلق
جونا خاں / محمد شاہ جونا ۳۷
۳۹-۴۲-۴۵-۴۷ تا ۵۱
۵۹-۶۹-۸۱-۲۳۶-۲۸۱-۳۰۵
محمد بن تغلق کے مذہبی رجحانات
۲۸۱
محمد بن عارف شیخ ۳۸۵
۴۰۴
محمد بہامد خانی ۸۵-۳۳۱
محمد ترک ۴۲۰
محمد جائسی ملک ۱۷۶
۵۰۱-۵۰۸-۵۱۶-۵۱۷

۵۲۴-۵۲۵
محمد جونپوری سید ۷۶-۴۷۴
تا ۴۷۹-۴۸۴-۴۸۸ تا ۴۹۰
۴۹۹ تا ۵۰۱-۵۱۲-۵۲۰ تا
۵۲۳
(سید) محمد جونپوری ۱۲۸
۱۵۸-۲۳۰-۳۱۲-۳۲۱
محمد حبیب پروفیسر ۳۵
محمد حسن چشتی المعروف شاہ
خیالی ۲۹۳-۳۰۶
محمد حسین آزاد ۵۴۰
محمد خاں ۹۸-۱۰۱
محمد دریتیم شیخ ۳۷۶
محمد سادی ایرجی قاضی ۳۲۹
۳۳۰
محمد سدھوری (قاضی) ۳۷۵
محمد سہرپوری شیخ ۳۸۸
۳۸۹
محمد سید گیسو دراز بندہ نواز
۶۱-۶۲-۱۹۸-۲۱۸-۲۲۰
۳۰۲-۳۱۹-۳۲۱-۳۲۳-
۴۸۰-
محمد شاہ (سلطان) (دائی
گجرات) ۶۶
محمد شاہ (مغل بادشاہ) ۸۰
محمد شاہ (سلطان) تغلق ۵۱

۵۲ - ۵۶ - ۶۶ - ۶۷ - ۸۰
۸۲ - ۹۲ - ۱۱۴ - ۱۳۰
محمد شاہ ثانی ۶۱
محمد شاہ سلطان ۵۰ - ۵۱
۶۱ - ۹۲ - ۵۳۷
محمد شاہ شرقی ۷۱ - ۷۵
۱۰۱ - ۱۱۵ - ۱۱۶ - ۱۲۹ - ۱۵۱
۱۷۹
محمد شیخ زدولوی ۲۲۵
۲۶۶ - ۳۲۲ - ۴۰۷ - ۴۱۶
محمد صادق ۱۰۰
محمد صدیقی سدھوری قاضی
۳۷۳ - ۳۸۹
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم ۲۰۲ - ۲۳۳ - ۲۶۱
۲۶۲ - ۲۸۹ - ۴۲۳ - ۴۳۳
۴۴۵ - ۴۵۱ - ۴۶۹ - ۴۷۰
۴۹۰ - ۴۹۲ - ۴۹۳
محمد عارف شیخ ۴۰۴
۴۰۵ - ۴۴۳ - ۴۵۱ - ۴۵۲
۴۵۴
محمد عاشق بن شیخ خدا قلی
۴۵۱
محمد علاء (شیخ) المعروف
شیخ قاضن ۴۶۱
محمد عیسٰی تاج جونپوریؒ ۱۴۴

۱۴۵ - ۱۵۳ - ۱۵۷ - ۱۶۱ -
۱۹۹ - ۲۹۰ تا ۲۹۴ - ۲۹۶
۲۹۷ - ۲۹۹ - ۳۰۱ - ۳۰۶
۳۴۹ - ۵۱۲
محمد عیسٰی چشتی ۲۲۹ - ۲۹۳
محمد غوث گوالیاری ۱۷۵
۴۶۵ تا ۴۶۷ - ۵۱۸ تا
۵۲۰
محمد غوثی شطاری ۳۶۳ - ۳۶۶
۳۶۷
محمد فراہی شیخ ۴۸۲
محمد قطب قلندر ۴۳۱
۴۳۳
محمد ماہ پیرپوری شیخ ۳۰۰
محمد ماہ شیخ ۲۹۲ - ۲۹۳
محمد متوکل (شیخ) ۳۴۵
محمد مدگامی ۵۰۳
(شیخ) محمد کوفی سہروردی ۲۴۵
محمد منزلی ۱۲۸
محمد مینا لکھنوی شیخؒ ۲۳۸
۳۳۹ - ۳۴۰ - ۴۴۴ - ۴۴۷
محمد ناظم ۳۵
محقق ہندی ۵۲۵
(سلطان) محمود بیگڑہ ۶۶
۴۷۹ تا ۴۸۱
محمود ثانی سلطان (والی مالوہ)

۶۴
محمود خلجی سلطان ۶۳
۶۴ - ۱۰۷ - ۱۱۹ - ۱۵۲
(سلطان) محمود شاہ اوّل (والی
گجرات) ۶۶
محمود شاہ تغلق سلطان ۴۰
۵۲ ۵۴
۵۶ - ۸۲ - ۸۳ - ۸۷ - ۹۰
۱۰۸ - ۳۳۷
محمود شاہ ثانی سلطان (والی
گجرات) ۶۷
محمود شاہ شرقی سلطان ۱۰۲
محمود شاہ شرقی ۷۱ - ۷۴
۷۵ - ۹۲ - ۱۰۷ - ۱۰۹ تا
۱۱۱ - ۱۱۴ - ۱۵۲ تا ۱۵۴ - ۱۵۵
۱۷۰ - ۱۷۹ - ۲۹۱ - ۲۹۲ - ۳۱۴
۴۷۴ - ۵۲۸ - ۵۴۴
محمود ظفرآبادیؒ ۲۹۹
محمود غزنوی سلطان ۳۵
۵۸
محمود قطب قلندر شیخ ۴۳۱ -
۴۳۵ - ۴۳۶
محمود کنتوریؒ قاضی ۳۷۵ - ۴۴۱
۴۴۲ - ۴۴۴ - ۴۴۷
محمود گاداں ۶۲
محمودی (سلطان محمود شاہ

شرقی کے عہد کا مشہور ریشمی کپڑا) ۱۱۰
محی الدین شیخ ۲۰۲
محی الدین عربی شیخ ۴۱۹
۴۳۳
مختار بن علی عبید الثقفی ۴۷۱
مخدوم آفتاب ہند ۳۶
۱۶۳-۲۴۲
مخدوم جہانیاں ۱۳۵-۱۴۰
۱۴۳-۱۹۵-۲۲۴-۲۳۱-
۲۳۵-۲۶۰-۲۶۳-۲۷۰
۲۷۱-۲۷۴-۲۷۷-۳۱۷
۳۲۴-۳۲۵-۳۳۱-۳۳۴
تا ۳۳۷-۳۶۹-۳۸۱
مخدوم خضرؒ ۲۶۶
مخدوم خواجگی ۳۹۱
مخدوم زادہ محمد نور ۳۷۰
مخدوم صدر الدین چراغ ہندؒ
۳۶-۲۴۱-۱۶۳-۳۸۶
مخدوم مٹھن ۳۸۵
مخطوبات قدسیہ ۵۱۳
۵۵۳
مخزنِ افغانی / تاریخ خاں جہاں
لودھی ۱۰۸-۱۰۹-۱۱۸-۱۲۰
تا ۱۲۵-۱۲۷-۵۵۰-۵۵۳
مدا (ماہ جمادی الاوّل) ۱۱۳

مدار شاہؒ ۱۵۸-۲۷۸
مدھومالتی ۲۶۷-۴۹۹
۵۲۰-۵۵۸
مرآۃ احمدی ۶۸-۴۸۰
۴۸۱
مرآۃ الاسرار (قلمی) ۸۴
۲۷۱-۲۷۲-۲۷۴-۲۷۵-
۲۹۴-۳۲۷-۳۳۰-۳۳۵
۴۵۱-۴۲-۷۳-۸۱-۸۵
۸۶-۱۰۲-۱۳۳-۱۳۵-۱۴۲
تا ۱۴۷-۱۴۹ تا ۱۵۱-۱۶۶-
۲۲۱ تا ۲۲۳-۲۶۹ تا ۲۷۸
۲۸۴ تا ۲۹۱-۲۹۳-۲۹۴-
۲۹۶-۲۹۸-۳۲۳ تا ۳۲۷
۳۳۰-۳۳۱-۳۳۴ تا ۳۳۸
۳۴۲ تا ۳۴۷-۳۴۹ تا ۳۵۲
۳۶۲ تا ۳۶۷-۳۷۱-۳۷۶
۳۷۸ تا ۳۸۱-۳۸۳ تا ۳۹۲
۳۹۳-۳۹۸ تا ۴۱۰-۴۱۵
تا ۴۱۷-۴۳۸ تا ۴۴۰-۴۴۴
۴۴۶-۴۵۱-۴۵۴ تا ۴۶۵
۴۶۷-۵۱۴-۵۲۵ ۵۵۳
۵۰۶-۳۴۷-۳۵۲-۳۶۳-۳۷۰
مرآۃ العالم (قلمی) ۱۲۴
۵۵۴
مرآۃ جہاں نما ۹۳-۵۵۳

مرآۃ سکندری ۶۶-۵۴۰
۵۵۳
مرآۃ مداریہ (قلمی) ۱۴۸-
۱۴۹-۲۷۵-۴۴۱ تا ۴۴۳-
۴۴۴ تا ۴۴۷-۴۵۴
مرثیہ مہدیٔ موعود ۴۷۸
مردان دولت ۵۴
مرزا آیبن بن رازی ۶۸
مرزا بدو بیگ ۳۰۰
مرزا علی محمد بن محمد علی گجراتی ۶۸
مرقع بنارس ۱۷۱-۱۷۲
مرگاوتی ۱۶۲-۵۱۶
مسان شاہ مداری ۴۴۷
مسعود بک ۴۲۲
مسعود خلوتی ۱۹۲
(سید) مسعود غازی سالار ۵۸
مسلم خواتین کی تعلیم ۷۴
۱۱۲-۱۵۶-۵۵۷
مشاہیر جونپور (قلمی) ۵۳۰
۵۵۴
مصطفیٰ الشیخ ۳۴۷
مطلع السعدین جلد دوم ۷۴
۱۰۷-۱۵۲-۱۷۰-۵۴۰
مطلع الولایت ۳۵۲-۴۷۶
مطلوب الطالبین ۴۲۳
۵۵۴

مطہر قاضی ۴۴۴
مظفر بلخی شیخ ۳۴۹
مظفر گجراتی سلطان ۹۰
مظہر العجائب رسالہ ۴۱۹
۵۱۵
معدن الموسیقی ۱۷۴۰
۵۳۸ - ۵۵۷
معارف النغمات ۱۷۴
۵۳۶ تا ۵۴۰ - ۵۵۷
معراج نامہ ۴۶۴
معراج الولایت ۳۲۹
معروف الدیموی شیخؒ ۳۷۵
۳۷۶ - ۳۸۸
معروف شیخؒ ۳۲۷-۲۰۹
معروف مجذوب شیخ ۴۰۹
بعز الدین عرف سید میٹھہ
۲۹۴
معلم النغمات ۵۳۷
معین لدین چشتی خواجہ ۲۷۹
۳۷۱-۵۱۳ - ۴۴۳
(خواجہ) معین الدین حسن سنجریؒ
۴۲۰
معین الدین شیخ ۳۴۶
معین عبدالقادر الحسنی القادریؒ
۴۳۱
مفتاح العاشقین ۴۲۴
مفتاح الفیض ۳۰۶
مفتی غلام سرور لاہوری ۴۴۷
مقرب خاں ۵۵
مقصود المراد ۵۱۸
مکتوبات اشرفی (قلمی) ۱۲۷
۱۶۷-۵۵۴-۳۴۵-۳۷۴
مکتوبات امام ربانی (حضرت
مجدد الف ثانی) جلد اول، سوم
۴۷۰-۴۹۳-۵۵۴
مکتوبات قدوسیہ ۴۱۹
۵۵۴
ملا آدم ۱۹۰ - ۱۹۱
۱۹۲
ملا ضیاء ۴۷۹
ملفوظات خیر المجالس ۴۲۶
ملفوظات شیخ مینا لکھنویؒ
۳۳۴
ملفوظات سید ہاشم علوی
۴۶۵۰
ملک اکرم شمس الدین المعروف
سلطان ابراہیم شاہ شرقی ۸۹
ملک الامراء محمود ۳۷۲
۳۷۶
ملک حسین ۹۹
ملک خالص ۵۱۳ - ۵۲۳
ملک رسول خاں ۹۸
ملک سرور (سلطان الشرق)
۵۱ - ۸۱
ملک علی گجراتی ۹۸
ملک کالو ۹۸
ملک کندو ۱۲۶
ملک مخلص ۹۸-۱۵۴-۳۱۳
۵۳۳
ملو اقبال ۵۵ - ۸۷
۹۰
ممشاد علی دینوریؒ ۲۷۹
ممن توکلی شیخ ۴۷۹
مناقب السادات (کتاب) ۲۰۲
۲۶۱
مناقب درویشیہ (قلمی) ۳۶
۱۸۸-۲۴۱-۲۴۶-۲۵۰-
۲۵۶ تا ۲۵۹-۵۵۴
منتخب التواریخ ۴۷ - ۴۸
۴۹-۸۳-۸۷-۹۰-۱۲۱-
۱۷۶-۱۷۷-۲۲۲-۴۲۰-
۵۵۴ -۲۹۹-۴۹۳-۴۹۸-
منجھن شیخ ۷۶-۴۶۶
۴۶۷-۴۹۹-۵۱۶-۵۱۹
۵۲۰
منجھو قوال ۷۷ - ۵۴۰
۵۴۱
منصور صوفی ۴۰۴ - ۴۰۹

۴۱۰
منعم خاں خانخاناں ۱۸۷،
۳۰۰،
منہاج السراج ۲۸۰
منہاج العابدین ۳۳۱
موسیٰ عاشقاں شاہ ۳۴۹
۴۲۴
مولانا ابوالکلام آزاد ۳۹۶
۴۲۰
مولانا بدوم ۵۰۷
مولانا صفی جونپوری ۴۱
مولانا صفی لکھنوی ۴۲
مولانا مجدالدین حاجی ۲۲۲
مولوی رحمان علی ۳۸۲
مومن ۵۲۲
مہدی آخرالزماں ۴۷۵
۴۷۸-۴۸۱ تا ۴۸۴
مہدی ابن مہدی ۴۷۱
مہدی امام ۴۶۹-۴۷۰
۴۷۲-۴۷۳
مہدوی تحریک ۴۷۴-۵۰۱
۲۳۰-۵۲۱-۴۷۸-۵۲۳
مہدویہ فرقہ ۴۸۷-۵۲۱
مہربان خاں ۹۸
مہ رجب (ماہ رجب) ۱۱۳
میاں بدیؒ ۱۲۲
میاں شاہ دلاورؒ ۴۷۷
۴۹۲
میاں شاہ عبدالمجید نوری
بندگی ۴۹۲
میاں محمد سعید (پروفیسر) ۲۲
۴۵
میاں مصطفےٰ گجراتی ۴۹۲
۵۲۴
میاں نکی ۲۴۶
میاں نظام شاہ بندگی ۴۹۲
میاں نعمت ۴۸۱-۴۹۲
میر ذاکر علی کسوہ ۲۱۲
میر سید ابراہیم درویش ۳۴۵
میر سید اشرف سلطان ۱۴۶
میر سید خورد زید پوری ۲۲۲
میر سید کمال ترمذی ۲۷۴
میر سید محقق ۴۶۷
میر سید محمد مکی ۴۲۳
میر علی عاشقاں سرائے میریؒ
۲۵۹
میر محمد عسکری نبیرہ ۲۱۲
میر ملہم شہید ۵۸
میراں حسینی شاہ سید ۶۲
میراں سید محمود ۴۸۴
میراں شاہ قلندر ۲۴۸
میر محمد حوض دہلوی ۲۹۴
میزان الصرف ۳۹۸
میتھلی بولی ۴۹۵-۵۰۴
۵۰۵-۵۳۵
مینا لکھنوی ۲۲۱-۲۲۲
۳۳۵

(ن)

نائک (لقب سلطان حسین شاہ
شرقی) ۷۷
نارائن داس پنڈت ۹۷
۱۶۹
ناصر الدین سلطان ۶۴
ناصر الدین سید ۳۳۵
ناصر الدین محمود سلطان (فرمانروا
دہلی) ۲۳۹
نبی بخش ۱۰۱
نجات الرشید (قلمی) ۴۷۴
۴۷۹-۴۸۴-۴۸۵-۵۵۴
نجم الدین شہیدؒ ۵۰۰
نجم الدین شیخ ۴۷۶
نجم الدین غوث الدہر قلندرؒ
۲۳۰-۴۲۴-۴۲۵-۴۲۹
۴۷۴
نجیب الدین عبدالقاہر ۲۳۱
نرسنگھ ۱۲۵
نصرت خاں کوتوال ۲۶۴

نصرت شاہ سلطان (تغلق) ۵۴-۵۶-۸۳-۸۷
نصیر الدین چراغ شیخ دہلویؒ ۱۹۱-۲۱۷ تا ۲۱۹-۲۸۱-۲۸۲-۲۸۸-۳۲۹-۳۳۴-۳۴۲-۳۴۳-۳۴۴-۳۹۷-۴۲۶
نصیر الدین شیخ ۲۲۵-۲۸۲-۴۳۷
نصیر الدین گنبدیؒ قاضی ۱۰۲-۱۳۲-۱۴۲-۱۹۵-۱۹۶-۲۰۶-۲۶۶-۵۲۰
نصیر الدین مدارؒ ۴۵۰
نصیر الدین ہمایوں ۴۱۷
نصیر خاں ۱۰۷-۱۵۲
نصیر خاں (شہزادہ) المعروف ملک بہروز سلطانی ۳۷-۳۹-۴۱
نصیر قلندر ۴۳۱-۴۳۴-۴۳۵
(خواجہ) نظام الدین ۳۸۹
نظام الدین احمد ۱۱۰
نظام الدین امیٹھویؒ ۲۷۱-۳۲۷-۴۳۶
نظام الدین اولیاء خواجہ ۵۰-۱۸۲-۲۳۵-۲۴۰-۲۴۵-۲۴۸-۲۸۱-۳۲۲-۳۳۲-۲۹۳-۴۲۵-۴۲۷
(شیخ) نظام الدین بن شیخ یاسین عثمان (امیٹھوی) ۳۹۱-۳۹۲
نظام الدین سہروردی ۲۵۰
نظام الدین شیخ ۳۸۲-۳۹۲
نظام الدین علامیؒ ۱۸۱-۱۸۳
نظام الدین غزنوی ۴۲۵
نظام الدین قلندر بہاریؒ ۱۶۱-۴۳۱
نظام الدین کیکلانیؒ ۱۰۲-۱۳۹-۱۹۰-۲۱۱ تا ۲۱۳-۵۳۱
نعمت اللہ ولیؒ ۴۷۲-۴۷۴
نعمت شاہ ۴۸۳
نعیمہ ۵۰۵
نقلیات ۴۸۸
ندا پتی ٹھاکر ۴۹۵-۵۰۵
نندلال ۱۶۸
ننھی بی بی ۵۴۳
نوابانِ اودھ ۷۷-۱۳۰
نور الدین ابی محمد ۱۸۳-۱۸۴-۲۴۴
نور الدین زیدیؒ ۱۸۲-۲۰۵
نور الدین سید ۲۴۶
نور الدین شیخ ۳۷۶
نور الدین مبارک غزنوی ۲۲۲-۴۲۵
نور الدین مداری ۴۵۰
نور الحق ۱۱۰
نور ثانی شاہ ۴۳۶-۴۳۹
نور جہاں (ملکہ) ۱۱۱
نور شیخ ۳۰۱
نور قطب عالم شیخ ۳۲۲-۳۹۵-۹۰-۱۳۶-۱۳۷-۱۶۶-۲۲۹
نور قلندر ۴۳۴
نور محمد مداریؒ ۴۵۰
نور ولد شیخ قیام الدین ۲۷۳
نوشیروان عادل ۵۱۷-۳۸۲

(و)

واحد خاں ۲۰۱
واقعات مشتاقی (قلمی) ۱۰۸-۱۱۸-۱۱۹-۱۲۷-۱۶۴-۱۷۶-۵۵۵
واہا (ماہ محرم) ۱۱۳-۱۵۶
وجیہ الدین اشرفؒ ۲۹۳

۳۰۱
وجہ الدین چشتی قادری ۴۳۲
وجیہ الدین قلندر ۴۳۲
وجیہ الدین علوی گجراتی ۴۶۴
۴۶۵-۴۶۷-۴۶۸-۵۱۹
ودیاپتی ٹھاکر ۱۶۹-۴۹۵-
۵۰۲ تا ۵۰۴-۵۳۵
ولی شیخ ۴۶۱

(ہ)

ہردیو ۵۰
ہفت اقلیم ۶۸-۵۵۵
ہفت گلشن محمد شاہی (قلمی)
۹۱-۵۵۵
ہلاکو خاں ۲۲۴-۲۸۲-
۳۹۷
ہمایوں شہنشاہ ۴۱-۱۷۹
۳۵۷-۳۵۸-۳۶۳-۳۶۴ تا ۳۶۵
۳۶۸
ہندوستان کی قدیم اسلامی
درسگاہیں ۸۰-۵۵۷
ہندوستان کے مسلمانوں کے
عہد کے تمدنی جلوے ۵۲۶
۵۳۸-۵۵۷
ہولی نامہ ۵۲۵
ہیبت خاں ۱۲۴
ہیبت خاں شیروانی ۴۱۸

(ی)

یادِ ایام ۶۶ تا ۶۹-۲۰۳
۵۵۷
یاسین عثمان شیخ ۳۹۱
یحییٰ منیری ۵۹-۳۶۹
یعقوب شامی ۱۸۹-۱۹۰
یوسف بدہ ایرجی قاضی ۳۳۰
۳۳۱-۳۳۷-۵۳۵
یوسف قتال شیخ ۴۳۰

مقامات

(ا)

ابراہیم آباد ۷۲ - ۱۰۲
اٹالہ مسجد ۳۹-۲۰۳
۳۱۷
اٹاوہ ۵۲ - ۸۳
۱۰۹ - ۱۲۰ - ۱۶۴ - ۲۵۱
اٹاوہ کی جامع مسجد ۷۸
اجمیر ۲۷۹-۲۸۲-۳۱۹
۳۷۱-۳۴۳-۴۴۱
اجودھن ۲۸۰-۲۸۲
اجودھیا ۳۶۱-۳۶۹
۳۷۲ - ۴۰۰ - ۴۰۲
احد محلہ ۲۴۹
احمد آباد ۶۱-۶۶-۶۸
۶۹ - ۲۱۴-۴۶۵-۴۸۰
۴۸۱
احمد نگر ۶۲-۶۷-۴۷۹
۴۸۰-۴۹۲
آذربائیجان ۳۵۴
ارال ۱۲۵
اربل ۲۳۲
ارزن محلہ ۲۹۲-۲۹۴
۲۹۶
اڑلیسہ ۷۴-۹۳-۹۹
۱۰۷-۱۱۷-۱۵۳-۱۶۴
۱۷۱-۱۷۲
اسوہتو ۳۶۱
اسائی/اسنی ۳۵
آسام ۲۸۲
آستانۂ اجمیری ۳۱۹
اعظم گڑھ ۱۸۰-۲۶۸
۴۳۱ - ۴۳۵ - ۴۶۲
افغانستان ۴۹۲-۵۲۰
اکبرپور ۹۴
آگرہ ۲۰۷ - ۳۰۷
۴۶۴ - ۵۱۸
الدیوقصبہ ۳۸۸
الٰہ آباد ۸۳ - ۱۲۵ -
۱۴۲
امام باڑہ حکیم محمد باقر ۳۲۱
امیٹھی ۲۲۹-۲۹۴-۳۹۱
۳۹۲-۵۲۶
انام ۲۲۵
اناؤ ۱۲۲
انبالہ ۴۳۴-۴۴۴
انچولی ۷۸-۲۲۹-۲۸۲
۲۹۴-۳۴۲-۳۵۲-۳۹۱
اندخود ۴۸۵
امگلی (پرگنہ) ۱۹۰-۴۳۷
انوپ تلاؤ ۵۴۰
انہونہ ۳۷۳-۳۶۱
اجین ۸۴-۹۱-۱۰۸
۱۵۳-۱۶۴-۱۶۷-۱۷۱
اوچ شریف ۲۳۴-۲۳۵
۲۳۷-۲۶۴-۳۷۰-۴۱۸
اودھ (اجودھیا) ۴۷-۵۰
۵۱-۵۲-۵۴-۵۶-۵۸
۶۰-۸۲-۸۹-۱۲۲-۱۴۸
۱۶۴-۲۳۷-۲۵۱-۲۶۹
۲۷۵-۲۸۲-۳۴۸-۳۵۰

۳۷۲-۳۸۴-۴۴۴
ایران ۶۵-۷۳-۷۹
۹۴-۹۵-۱۷۹-۲۳۰-
۲۳۱-۲۲۴-۴۵۱-۴۵۲-
۴۵۵-۴۷۳-۴۹۲
ابرج ۷۸-۲۲۹-۲۸۲
۳۲۹-۳۳۰-۳۳۲
ایلاق ۳۷۰
ایودھیاپور ۳۸

(ب)

باب العمرہ ۶۷
باری ۱۲۳
باغِ کہنہ ۲۰۶-۵۳۲
بالیہ ۷۵-۱۲۹
بانس دہ تحصیل ۷۵-۱۲۹
بجنور ۲۹۴
بجی منڈل ۴۰۳-۳۰۵
بدایوں ۵۸-۵۹-
۱۰۸-۱۲۰-۱۲۳-۲۳۲
بدخشاں ۲۷۵
بدیع منزل ۸۵-۱۰۱-
۳۰۵
بخارا ۵۸-۵۹-۹۴
۱۷۷-۱۷۸-۲۳۳-۲۳۵
۳۷۱

برار ۶۲-۶۷
برلی ۴۸۲
برمک ۳۲۵
برن ۹۰-۱۱۸
برناوہ ۴۱۳-۴۹۵
برھ ۱۲۶
برہان پور ۶۱-۶۳-۶۷
۴۷۹
بساوہ ۲۹۴
بسودھی ۲۸۸
بسوڑھی ۳۶۱
بصرہ ۲۵۰-۲۵۱
۳۶۹
بغداد ۵۸-۱۷۸-۲۳۱
تا ۲۳۳-۲۷۹-۳۶۹-
۳۷۱
بکسر ۱۲۲-۱۷۳
بلخ ۱۷۷-۱۸۶-۳۱۹
۳۵۶-۳۹۷-۵۱۳
بلواگھاٹ ۳۰۳
بلگرام ۵۸-۵۹-
۳۱۰
بلوچ ٹولہ محلہ ۱۲۳
بلہری موضع ۳۵۰
بنادی (اعظم گڑھ) ۲۴۰
۲۴۲

بنارس ۷۸-۱۱۰-۱۱۳
۱۲۵-۱۲۹-۵۵-۱۶۵
۱۷۲-۱۷۴-۲۵۱-۳۰۱
۳۰۲-۳۱۹-۳۶۱-۳۶۹
۴۷۳-۴۴۹-۵۰۵-۵۰۶
۵۰۸-۵۱۳
بندتحصیل کھنڈ ۷۰-۸۴-
۱۱۷-۱۶۴
بنگال ۴۷-۵۱-۵۷-۶۰
۷۰-۷۲-۷۴-۸۴-۸۹
۹۱-۱۲۶-۱۳۶-۱۳۷
۱۹۴-۱۹۶-۱۷۰-۲۳۲
۲۸۲-۴۶۱-۴۶۲-۵۰۴
۵۰۵-۵۱۶-۵۳۳
بہار (شمالی-جنوبی) ۸۴
۸۶-۱۳۶-۱۹۳-۳۰۴
۳۶۳
بہار ۵۴-۵۸-۶۰-۷۰
۸۳-۸۹-۱۲۳ تا ۱۲۷
۱۷۴-۲۱۰-۲۵۶-۲۸۲
۲۹۴-۳۰۴-۳۱۶
بھارت ۳۱۷
بھاگلپور ۱۲۶
بھنواڑہ ۱۲۰
بھٹنڈہ ۱۲۲-۱۲۶-۱۷۳
بہرائچ ۵۸-۷۸-۱۲۸۳

۲۲۹-۲۷۰-۲۸۲-۲۴۲
۴۴۱
بھروچ ۶۶
بھڈوڈ ۳۶۱-۳۶۸
۳۷۲
بھرلیہ (واقع پرگنہ دریاآباد)
۱۶۶-۲۷۵
بہشت باغ ۵۲۹
بھکر ۳۵۰
بہمنی سلطنت ۴۸-۵۷
۶۱-۶۳-۳۹۴
بھوج پور ۸۴
بھونگاؤں ۱۰۹
بھیرہ ۲۶۸
بیانہ قلعہ ۹۱
بیجاپور ۶۲
بیدر ۶۱-۶۲-۴۷۹
بیدولی ۴۸۲
بیساپلی ۵۰۲
بی بی کی مسجد ۶۳
بیگم گنج محلّہ ۱۱۲

(پ)

پاکپتن ۳۷۱
پاکستان ۴۸۷
پاک وہند ۲۰۱-۲۹۱
پاچھوند ۱۲۵
پانی پت ۲۹۴-۳۹۹
۴۱۷
پٹنہ ۱۲۶-۱۹۱-
۴۷۷
پٹن نہروالہ ۴۸۱-۴۸۲
پٹنہ نکھتہ ۱۶۶
پچھٹیا محلّہ ۳۱۹
پریاگ ۱۲۵
پچیریا پور ۳۱۱
پلادن ۷۸-۱۴۳-۱۶۶
۲۷۴-۲۷۶-۲۷۷
پنجاب ۵۰-۵۶-
۴۰۰
پنڈوہ ۶۱-۳۲۳-۳۶۴
۳۶۹-۳۷۰-۳۹۵-۴۰۰
پہاڑپور ۱۰۷-۱۵۳
۱۷۱
پھاپھاماؤ ۱۲۵
پوربی ۴۹۵-۴۹۶
پیران شہر ۳۷

(ت)

تاشقند ۲۰۱
تبریز ۱۷۸
ترکی ۶۵-۴۲۴
ترکستان ۹۴-۳۷۱
۳۹۴
ترہت ۷۱-۷۲-۸۳-
۸۴-۸۹-۹۰-۹۱-
۱۱۷-۱۶۶-۱۶۷-۱۶۹
۵۰۳-۵۲۹
تغلق پور ۱۲۶
تھرٹاد ۴۸۲
تھیلنہ ۶۳

(ٹ)

ٹانڈہ ۳۴۱-۴۳۹-۴۴۰
۴۴۴
ٹھٹھہ ۴۸۳

(ج)

جامع الشرق ۷۵-۱۲۸
۱۵۴
جامع مسجد برہان پور ۶۳
۶۵-۶۹
جامع مسجد جائس ۹۶
جامع مسجد شرقی ۲۹۲
جامع مسجد قنوج ۷۸-۹۶
جالون ۷۰
جانپانیر ۶۶-۴۷۸
جائس ۳۶۱-۳۷۳

۳۹۰
جبل الابواب ۳۷۰
جبل الطور ۳۷۰
جبل الفتح ۳۷۰
جبل القاف ۳۷۰
جبل القدم ۳۷۰
جبل القرون ۳۷۰
جبل النہاوند ۳۷۰
جبل الیسر ۳۷۰
جبل لبنان ۳۷۰
جدّہ ۹۷
جزیرہ صحف ۳۷۰
جلدر ۴۸۲-۹۹
جمال دروازہ ۳۸۰
جم دگن پورہ / جمادگنی / جمادگنی
پورہ ۳۸۰
جمنا ۱۲۴-۱۲۵-۴۲۷
جمیتھا ۳۸
جنادہ قلعہ ۱۴۶-۳۶۷
جنّت محل ۱۰۱
جوالن پور ۴۲۱
جودھپور ۶۹
جھوسی ۵۰۶
جوناپور ۳۹
جونپور شہر ۳۵-۳۷
۳۸-۳۹ تا ۴۲-۵۳-۵۷
۶۰-۶۱-۶۳-۶۹-۷۱ تا ۷۵
۷۷ تا ۷۹-۸۲ تا ۹۰-۹۳-
۹۵-۹۶-۹۸-۱۰۰ تا ۱۰۲
۱۰۸ تا ۱۱۸-۱۲۲ تا ۱۲۵-
۱۲۷-۱۲۸-۱۳۱-۱۳۳ تا ۱۳۵
تا ۱۳۷-۱۳۹ تا ۱۴۱-۱۴۳ تا
۱۴۵-۱۴۷ تا ۱۵۰-۱۵۲ تا ۱۶۱
۱۶۴ تا ۱۶۶-۱۷۱-۱۷۳ تا
۱۸۰-۱۹۰-۱۹۴ تا ۱۹۸-۲۰۰
۲۰۳ تا ۲۱۲-۲۱۶-۲۱۸
۲۲۸ تا ۲۳۰-۲۳۸-۲۴۲
۲۵۰-۲۵۱-۲۵۶-۲۶۰-
۲۶۲ تا ۲۶۶-۲۶۸-۲۷۰
تا ۲۷۲-۲۷۵-۲۸۲-۲۸۵
۲۸۶-۲۸۹-۲۹۰-۲۹۲
تا ۲۹۸-۳۰۰ تا ۳۰۵-۳۰۹
۳۱۱ تا ۳۲۱-۳۲۶-۳۵۱-
۳۵۲-۳۵۷-۳۶۱-۳۶۵
۳۶۸ تا ۳۷۰-۳۸۳-۳۹۰
۴۱۰-۴۱۱-۴۲۵-۴۲۸-
۴۳۰-۴۳۱-۴۳۴ تا ۴۳۷
۴۴۴-۴۴۶ تا ۴۴۸-۴۵۰
۴۵۱-۴۵۳-۴۵۶ تا ۴۵۸
۴۶۱-۴۶۲-۴۷۴-۴۷۵
۴۷۷-۴۹۸-۴۰۹-۵۱۲
۵۱۳-۵۲۷-۵۲۹ تا ۵۳۴
۵۴۰-۵۴۱-۵۴۳-۵۴۴
جونپور قلعہ ۴۰
جوناگڈھ ۶۶
جہاز محل ۶۵
جہانگیرآباد ۵۲۹
جھنجانہ ۹۸-۲۲۹
۲۹۲
جے پور ۴۹۴
جیسلمیر ۴۸۲

(چ)

چاچک پور (محلہ) ۱۹۷
۲۱۲
چترساری محلہ ۴۳۵
چنوڑ (قلعہ) ۴۳-۶۷
۴۵۸-۵۲۶
چہانڈ ۱۲۵
چڑیاکوٹ ۱۸۰
چشت ۲۷۹
چمپارن ۱۲۶
چنار ۱۲۳-۱۲۵-۱۷۰
۱۷۲-۴۶۶-۵۱۶-۵۱۹
۵۲۳
چنارقلعہ ۳۹-۱۲۵
۴۶۳
چندیری ۱۰۷-۴۱۸-

۴۷۷
چوردروازہ ۱۲۸-۱۵۹
چھتری گھاٹ ۱۰۲
چہل ستون محل ۱۰۰
چھند قلعہ ۱۲۴
چین ۴۶

(ح)

حاجی پورہ ۴۶۳
حجاز ۹۴-۴۶۷
حرمین شریف ۳۴۴-۳۶۹
حسام پور ۲۷۰
حسین آباد ۷۵-۱۲۹
حصلان ۳۷۰
حلب ۴۷۲-۴۴۳
حمام دروازہ ۳۱۴-
حوضِ خاص ۸۵

(خ)

خاندیش ۵۱-۶۰-۴۹۲
خراسان ۴۶-۲۳۳-۲۷۹
۳۷۹-۴۲۴-۴۵۴-۴۸۲
۵۲۱
خفچاق ۳۷۵
خفخاق ۳۷۰
خوارزم ۱۷۸-۳۲۹

خیرآباد ۱۸۰-۲۲۰-
۲۲۲-۴۳۷

(د)

دارالسرور ۴۰-۴۲-۷۲
۸۵
دارالعلم ۴۱-۸۰-۱۷۹
دالمو (دالامئو) ۵۴-۷۱
۸۳-۱۰۱-۱۱۵-۱۲۵
۱۶۴
داناپور (عظیم آباد) ۴۷۷
دُجلہ ۲۳۱
دربارِ خاص ۱۰۱
دریاآباد ۱۹۹-۲۷۰
دریائے نربدا ۶۵
دربیر محلہ ۲۹۱-۳۱۲
۳۱۳
دریبہ مسجد ۵۲۴
دربھنگہ ۷۱-۵۰۲
دمن ۶۶
دمشق ۱۷۸-۳۶۹
دمیاط ۴۲۴
دوارس ۴۶
دوارسمدر ۴۷
دولت آباد (دیوگیر) ۴۸
۴۹-۶۱-۶۸-۴۷۹

دہلی ۳۹-۴۵-۴۶
۴۹-۵۱-۵۳-۵۶-۵۹-
۶۰-۶۳-۶۹تا۷۲-۷۸
۸۲-۸۳-۸۷-۹۰-۹۲
تا۹۴-۱۰۱-۱۰۸تا۱۱۰-
۱۱۵-۱۱۷تا۱۲۰-۱۲۴-۱۲۵
۱۳۱-۱۳۳-۱۳۶-۱۴۰-۱۴۱
۱۶۰-۱۶۳-۱۶۴-۱۶۸-
۱۷۷-۱۷۸-۱۸۱-۱۸۶-
۱۸۷-۱۹۵-۱۹۶-۱۹۸-
۲۰۶-۲۱۴تا۲۱۶-۲۱۸-۲۱۹
۲۲۸-۲۲۹-۲۳۲-۲۳۷-
۲۳۹تا۲۴۱-۲۴۸-۲۶۲-
۲۶۳-۲۶۶-۲۸۰تا۲۸۲
۲۸۴-۲۸۵-۲۸۹-۳۰۴
۳۰۵-۳۰۸-۳۰۹-۳۱۲
۳۱۶-۳۱۹-۳۲۲-۳۲۴
۳۳۲-۳۳۶-۳۴۴-۳۴۸
۳۵۱-۳۵۶-۳۷۱-۳۸۲
۳۹۴-۳۹۷-۳۹۹-۴۱۷
۴۲۷-۴۳۶-۴۳۷-۴۶۲
۴۶۴-۴۸۲-۵۱۳-۵۲۷
۵۳۰
دہلی ثانی ۷۹
دہلی دروازہ ۶۳
دھوپاماؤ ۱۲۱

دھولپور (ریاست) ۱۲۳
دھولکا ۶۹
دیو ۶۶
دیوبار ۱۲۶
دیوگڑھی ۵۲
دیوگیر (دولت آباد) ۴۸ - ۴۹
دیوبندر ۷۸
دیوہ ۲۲۵

(ڈ)

ڈابول بندرگاہ ۴۸۰
ڈھالگر ٹولہ ۵۲۷

(ر)

راپری ۸۴ - ۱۰۹ - ۱۲۱ - ۱۶۴
راجپوتانہ ۴۵ - ۵۶ - ۲۸۲
راجگیر ۷۸ - ۱۱۵ - ۱۳۳ - ۱۳۴ - ۲۷۰
راس کماری ۱۷۲
رام داس ۱۹۳
رام نجور ۱۲۱
رانی کا حجرہ ۶۹
رائے بریلی ۵۴ - ۷۰ - ۸۳ - ۸۶ - ۹۸ - ۱۲۹
رائے پور ۵۰۳
رائے سین ۵۱۹
رائے گاؤں ۱۲۲
رتن سرائے ۴۶۳
ردولی ۷۳ - ۷۸ - ۱۴۷ - ۱۹۶ - ۲۲۹ - ۲۷۶ - ۳۶۱ - ۳۶۹ - ۳۸۳ تا ۳۸۷ - ۴۰۰ - ۴۰۱ - ۴۰۵ - ۴۱۱ - ۴۱۶ تا ۴۱۸ - ۵۱۴
رڑکی ۳۹۴
رسول پور ۳۶۱
رشکِ بغداد ۶۰
رضویہ محلہ ۲۱۱
رکن یمانی ۴۸۰
روم ۱۷۸ - ۴۲۴
رنتھمبور (قلعہ) ۶۷
روشن محل ۱۰۱
رونی نوضع ۲۴۵
روہیل کھنڈ ۷۰ - ۸۴ - ۱۱۷ - ۱۶۴
رسے ۱۷۸
ریوا کھنڈ ۶۴

(ز)

زہرانام (گاؤں) ۲۷۰
زین آباد ۹۱

(س)

سارناتھ ۱۷۲
سارنگ پور شہر ۳۳۶ - ۴۶۶
سپاہ محلہ ۱۹۵ - ۲۶۲ - ۲۶۸ - ۲۸۹ - ۵۴۳ - ۵۴۴
سدھور ۱۴۳ - ۲۲۹ - ۲۷۶ - ۳۶۱ - ۳۶۹ - ۳۷۳ - ۳۸۹ تا ۳۹۱
سراندیپ ۳۷۱
سرائے میر ۷۸ - ۱۰۰ - ۴۶۲
سرسوتی ۵۱
سرسہ ۱۷۳
سُہرپور ۴۲۹ - ۴۳۷
سکھیرا ۱۲۰
سکیت گڑھ (ساکیت گڑھ) ۲۴۱
سلون ۳۰۱
سمانہ ۵۲
سمرقند ۱۷۸ - ۳۶۴ - ۳۷۵ - ۴۷۲
سمنان ۳۶۱ - ۳۶۲ - ۳۶۴ - ۳۷۱
سنام ۵۲ - ۳۹۹
سنبھل ۸۴ - ۹۰ - ۱۰۹

سِندھ ۵۱-۵۶-۲۰۰-۲۳۵
سندیلہ ۸۳-۱۶۴
سوال ۲۸۲
سوانہ ۳۱۷
سوداگاؤں ۱۸۴
سورت ۶۶
سولاسنج ۴۸۱
سونگرہ ۴۳۷-۴۳۸
سونہار ۱۲۱
سہارنپور ۳۹۴
سہروَرد ۲۳۱
سیتاپور ۴۳۷
سیتاپیر تحریک ۷۶-۱۷۵
سیدپور بھیتری ۲۵۷-۴۴۹
سیّدعلی پور ۱۱۳-۳۱۴
سیّدواڑہ محلّہ ۱۸۳-۲۴۴
۲۴۷
سیلان ۳۷۰
سیہون ۴۲۷

(ش)

شام ۷۳-۱۴۸-۱۸۹
۲۳۰-۲۷۹-۳۷۰-۴۴۳
شاہ آباد ۱۹۱-۲۳۵
۴۱۷
شاہ پور ۱۰۷
شاہ جیرپور ۳۱۴
شاہ گنج ۳۰۲
شرقی سلاطین ۴۱-۵۸-۷۸
۷۹-۸۱-۸۹-۹۲-۹۵
۹۷-۱۰۸ تا ۱۱۲-۱۱۵-۱۱۶
۱۱۸ تا ۱۲۱-۱۲۶-۱۲۸-۱۳۴
۱۳۷-۱۳۸-۱۴۲-۱۵۴-۱۵۹
۱۶۳-۱۶۵-۱۶۸-۱۶۹-
۱۷۱-۱۷۲-۱۷۶ تا ۱۷۹-
۱۸۱-۱۸۷-۱۹۴-۲۰۴
۲۰۷-۲۲۸ تا ۲۳۰-۲۳۷
۲۳۸-۲۶۰-۲۶۳-۲۸۲
۲۹۲-۳۱۲-۳۱۴-۳۱۶-
۳۲۹-۳۵۶-۳۹۴-۴۲۸
۴۴۱-۴۴۲-۴۴۷-۴۵۱-
۴۵۷-۴۹۵-۴۹۸-۵۰۱
تا ۵۰۴-۵۱۴-۵۳۴-۵۴۰
۵۴۲
شرقی عمارات ۷۸
شرقی مساجد ۷۸
شکستہ باغ ۸۴
شکوہ آباد ۸۴
شمس آباد ۸۳-۱۰۹
۱۱۸
شیخ پور ۴۳۱-۴۴۹
شیراز (ایران) ۳۱۲-۴۶۶
شیرازِ ہند ۴۱-۶۹
۸۰-۱۷۹

(ظ)

ظفرآباد شہر ۳۵ تا ۳۹
۴۷-۵۱-۵۸-۷۸-۱۶۳
۱۸۰-۱۸۳-۱۸۴-۱۸۷ تا
۱۹۱-۱۹۳-۲۲۸-۲۲۹-
۲۳۸-۲۴۰-۲۴۱-۲۴۳ تا
۲۴۹-۲۵۱ تا ۲۵۴-۲۵۶
۲۵۷-۲۶۹-۲۸۲-۳۵۶
۳۵۷-۳۵۹-۳۶۱-۳۶۶
۳۶۷-۳۸۶-۵۴۲

(ع)

عرب ۷۳-۹۴-۹۵
۲۱۴-۲۳۰-۲۳۱-۳۱۶
۴۲۴
عراق ۹۴-۳۶۹-۳۷۵
۳۷۸-۴۵۴
عجم ۳۸۲-۴۲۴
علی پور ۱۵۵-۳۱۲
علی گڈھ ۸۴
عظیم آباد ۱۹۱-۴۳۱-

(غ)

غزنی ۳۷۱ - ۳۸۲
غزنین ۵۸
غور ۵۸ - ۴۸۵

(ف)

فارس ۳۷۰
فتح پور (تحصیل بارہ بنکی) ۳۵۲
فتح پور ۷۸ - ۲۲۹ - ۳۵۱ - ۳۵۲
فتح پور سیکری ۷۸
فتح پور ہنسورہ ۳۱۶
فرخ آباد ۸۳
فرہ ۴۸۳ - ۴۸۴
فرید پرگنہ ۱۲۹
فلسطین ۲۲۳ - ۳۷۰
فیروز شاہ محلہ ۲۰۶
فیض آباد ۱۴۷ - ۳۶۱ - ۴۲۹ - ۴۳۴ - ۴۳۵

(ق)

قاضی نظام (محلہ) ۲۱۲
قرطبہ ۱۷۸
قسطنطنیہ ۳۷۰
قلعہ تھلنڈی ۷۰ - ۹۹
قلعہ دالمو ۷۰ - ۹۹
قلعہ کرار کوٹ ۸۵ - ۹۸
قلعہ کھور راجہ ۸۳
قلعہ موضع ہردوئی ۷۰ - ۹۹
قلعہ نصیر آباد ۷۰ - ۹۹
قلندر پور (موضع) ۲۲۸ - ۴۳۷
قندھار ۳۷۱ - ۴۸۳ - ۴۸۵
قنوج ۵۸ - ۸۳ - ۸۴ - ۸۷ - ۸۹ - ۹۰ - ۹۹ - ۱۱۵ - ۱۲۴ - ۱۳۳ - ۱۳۴ - ۱۶۴ - ۱۶۸ - ۱۷۲ - ۲۷۰ تا ۲۷۴ - ۴۴۴
قوچین ۳۷۵
قونیہ ۳۷۲

(ک)

کابل ۳۷۱
کاشان ۳۷۱
کاغذ کا شہر ۳۷
کالپی ۷۰ - ۷۲ - ۷۳ - ۷۸ - ۹۱ - ۹۲ - ۱۰۷ - ۱۲۳ - ۱۳۷ - ۱۴۸ - ۱۵۲ - ۱۷۳ - ۱۸۰ - ۱۹۸ - ۲۱۸ - ۲۲۰ - ۲۷۷ - ۳۲۹ - ۴۴۴ - ۴۴۵ - ۴۷۷ - ۵۲۳
کالی ندی ۱۲۲
کانپور ۷۰ - ۱۲۲
کٹ گڑھ ۲۰۵ - ۲۰۶
کٹڑہ ۴۷ - ۵۱ - ۵۴
۵۸ - ۵۹ - ۸۳ - ۱۶۴ - ۲۲۹
۲۳۹ - ۲۸۲ - ۳۱۶ - ۳۲۳
۳۵۳
کثرت آباد ۳۶۹
کج گاؤں ۳۱۲
کچھوچھہ (اشرف پور) ۷۸
۹۶ - ۱۴۷ - ۲۲۹ - ۲۵۳ - ۲۸۲
۳۵۷ - ۳۶۱ - ۳۶۵ - ۳۶۸
تا ۳۷۱ - ۴۳۵
کربلا ۱۲۸ - ۳۷۱
کرمان ۲۲۴ - ۴۷۲
کرمینی ۳۶۸
کرناٹک ۴۶
کرنجہ ۱۱۲
کشمیر ۶۸ - ۹۴ - ۱۷۲
کلنگ ۱۲۶ - ۱۲۷ - ۵۱۶
کلیر (شریف) ۳۹۴
کمپل (کمپیلہ) ۸۳ - ۱۶۴
کنتور ۷۸ - ۹۶ - ۱۴۷ - ۳۴۲ - ۳۴۶ - ۳۴۷ - ۳۶۱ - ۳۶۹

کوتوالی ۱۰۲
کوٹ ادور ۲۳۳
کوٹ یا قلعہ کھوراجہ ۸۳
کول ۵۴۔۷۰۔۸۳
۸۴۔۱۱۸۔۱۲۵۔۱۶۴
کوہ ہمالیہ ۷۰۔۸۴
کھرک پور ۱۷۴۔۵۳۹
کھناتٹ ۴۸۰
کھور (شمس آباد) ۸۳۔۱۶۴
کھوکھر مسجد ۴۷۵
کھینل ۵۲۔۲۷۴
کھمبایت ۶۶۔۶۷
کیتھر ۹۱
کیکلان ۲۱۱

(گ)

گاذرول ۳۷۰
گجرات ۴۷۔۵۱۔۵۴
۵۷۔۶۰۔۶۳۔۶۶۔۶۸
۶۹۔۱۳۹۔۲۱۱۔۲۱۴۔۲۹۶
۳۷۱۔۳۹۴۔۴۴۳۔۴۸۳
۴۹۳۔۴۹۴
گجراتی ۱۷۶۔۴۹۳۔۴۹۹
۵۰۰
گردنیز ۳۲۴
گلبرگہ ۶۹۔۳۷۰۔۳۷۱

۴۸۰
گنڈک دریا ۵۰۳
گنگا ۸۷۔۱۰۱۔۱۲۰۔
۱۲۵۔۱۲۶۔۲۷۰
گنگوہ ۳۱۷۔۵۱۴
گوالیار ۱۱۷۔۱۲۱۔۱۲۳
۱۷۲۔۱۷۴۔۴۵۹۔۴۶۴
۴۶۵۔۵۱۸
گورکھپور ۱۲۴۔۵۰۶
گوڑ ۱۷۴۔۴۷۶
گومتی دریا ۳۵۔۳۸۔۴۱
۱۴۰۔۱۹۰۔۲۴۴۔۲۴۸۔
۲۴۹۔۲۶۴۔۴۷۵
گولکنڈہ ۶۲
گیلان ۴۷۳

(ل)

لاچین ۳۷۵
لال دروازہ محل ۱۰۰۔۱۰۱
لال دروازہ محلّہ ۳۱۴
لال دروازہ مسجد ۷۴
لال قلعہ ۶۸
لاہر (تالاب) ۵۰۵
لاہر پور ۴۳۷
لاہور ۴۷۔۹۴۔۱۹۴
لکھنو ۷۸۔۱۴۸۔۱۸۰

۲۲۴۔۲۲۵۔۲۲۹۔۲۸۲
۲۹۴۔۳۳۶ تا ۳۳۹۔۳۴۱
۳۶۱۔۳۶۹۔۴۴۴
لکھنوتی ۳۸۔۶۱۔۸۳
۱۲۶۔۵۱۹
لوھرہ ۲۶۸

(م)

مازندران ۵۳۳
مالوہ ۴۷۔۵۱۔۵۷۔۶۰
۶۵۔۶۷۔۷۰ تا ۷۲۔۷۴
۸۳۔۸۴۔۸۷۔۹۰۔۹۲
۱۰۷۔۱۱۷۔۱۱۹۔۱۵۱۔۱۵۲
۴۵۸۔۴۵۹۔۴۶۷۔۴۷۷
مانڈو ۶۱۔۶۳ تا ۶۵۔۱۵۰
۱۵۱۔۴۲۵۔۴۵۸۔۴۵۹
۴۷۷
مانک پور ۷۸۔۱۳۳۔۱۴۸
۲۲۹۔۲۳۹۔۲۸۲۔۳۱۶
۳۲۳۔۳۲۴۔۳۲۶۔۳۲۷
۳۹۰۔۴۴۴۔۴۵۵۔۵۰۶
۵۱۳
ماوراالنہر ۶۴۔۹۴۔۳۶۱
۳۶۴۔۳۷۰۔۳۷۱
ماہل پرگنہ ۴۳۴
متھرا کا گوبند دیو مندر ۷۸

مچھلی شہر ۱۵۷
محل بدیع منزل ۴۰
محل سرا ۱۰۱
محل نماز گاہ ۱۱۰-۱۱۱
محمد آباد ۶۶-۳۶۱-۳۶۶
۴۶۵
محمد آباد قلعہ ۵۰
محمود آباد ۷۰ - ۳۲۹
۶۶-۶۹-۱۰۷
محمود آباد (کالپی) ۷۰
محلہ دربیہ ۳۲۱
مخدوم شاہ ادھن محلہ ۲۹۸
۳۰۰
مدرسہ مسجدِ اسلام ۴۷۹
مدرسہ نسواں ۱۰۱
مدینہ منورہ ۱۸۳-۲۳۳
۳۰۷-۳۳۷-۳۷۰-۴۴۳
مراد آباد ۸۴
مراکش ۴۷۲
مرزاپور ۱۲۵ - ۱۷۲
۲۴۱ - ۲۵۱
مساجد موضع تھلنڈی ۹۶
مسجد اٹالہ دیوی ۷۸
۹۵-۵۲۸-۵۴۳
مسجد احمد شاہ ۶۹
مسجد تاج خاں بن سالار ۴۸۰
۴۸۱
مسجد جامع الشرق ۷۸
مسجد جھنجری ۷۸-۹۵
۱۴۰-۵۴۴
مسجد چہار انگلی ۹۶
۵۳۴
مسجد خالص مخلص ۷۸
۱۵۳-۹۶-۲۹۱-۳۱۳
۵۳۴
مسجد سیّد عالم ۶۹
مسجد ظفر خاں ۱۹۱-۱۹۲
مسجد عیدگاہ ۱۲۸
مسجد قدم رسول ۹۶
۲۶۲
مسجد قلعہ ۴۰-۱۰۱
مسجد کلاں ۶۳
مسجد لال دروازہ ۷۸
۱۱۰-۱۱۲-۱۵۶-۱۵۸
۳۱۳-۵۴۴
مسجد ہیبت خان ۶۹
مشہد ۳۷۱
مصر ۴۶ - ۴۲۴
مصری معابد ۷۸
مصطفےٰ آباد ۶۶-۶۹
۲۹۴
مظفر پور ۷۱
معبر ۴۶-۴۷- ۵۱
۵۶
مقامِ ابراھیم ۴۸۰
مکن پور ۴۳-۷۸-۹۶
۱۰۱-۱۱۵-۱۲۹-۱۴۸
۲۳۰-۴۴۱-۴۴۲-۴۴۴
۴۴۶-۴۴۷
مکّہ معظّمہ ۶۷- ۹۴
۳۳۷-۳۷۰-۴۴۳-
۴۸۰
مگھر (ضلع گورکھپور) ۵۰۶
ملّا ٹولہ محلّہ ۳۱۶
ملتان ۴۷-۸۶-۱۱۸
۱۸۹-۲۳۳ تا ۲۳۷-۲۳۹
۲۴۶-۲۵۱-۲۶۲-۳۷۱
ملاؤلی ۱۲۳
ملّو پور پرگنہ ۱۹۰
منجھن پورہ ۲۲۹
منجھوارہ ۳۰۱
منڈل ۲۸۲
منڈی ۱۱۰
منڈی نصیر خان ۳۹
منطق ٹولہ (محلّہ) ۱۹۲
منیچ گڑھ ۳۵ - ۳۶
۱۶۳-۲۴۰-۲۴۱
منیر ۴۳۱

موضع سرائے الہدین ۲۱۰
مہاتم ۱۶
میتھلا ۴۹۵-۵۰۲
میمرہ ۵۸
مینارِ شمسی ۳۴۸
میوات ۳۲۴
مین پوری ۸۴

(ن)

نارنول ۲۸۲
ناگور ۲۸۰-۲۸۲-۴۱۸-
۴۸۳-۴۹۲-
نجفِ اشرف ۳۶۹-۴۴۳
نزیلہ ۱۰۸

نورپور ۴۳۵
نصرپور ۴۸۳
نظام شاہی ۶۲
نکہت جاگیر ۲۷۶
نگور ۶۹
نیپال (ریاست) ۷۱
نیگو قصبہ ۴۳۴-۴۳۵

(و)

واسط (عراق) ۲۳۹
وجے نگر ۴۷-۵۲-۵۷
وحدت آباد ۳۶۹
ورنگل ۴۶-۴۷
وسط ایشیا ۴۲۴

ولایت ۲۷۰

(ہ)

ہانسی ۵۱-۲۳۲-۲۸۰
ہانی قصبہ ۴۰۹
ہرات ۳۷۱-۳۸۹-۴۷۲-
۴۸۳-۴۸۵
ہنڈولہ محل ۶۵

(ی)

یاغستان ۳۷۵
یزد ۴۷۲
یمن ہیموں ۶۹

پروفیسر خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت جلد اوّل و جلد دوم

NIZAMI K.A. "ONHISTORY AND HISTORIAN OF MEDIEVAL INDIA"
NIZAMI K.A. "STATE AND CULTURE IN MEDIEVAL INDIA"

تاریخ ادب اردو

(جلد دوم)

ڈاکٹر جمیل جالبی